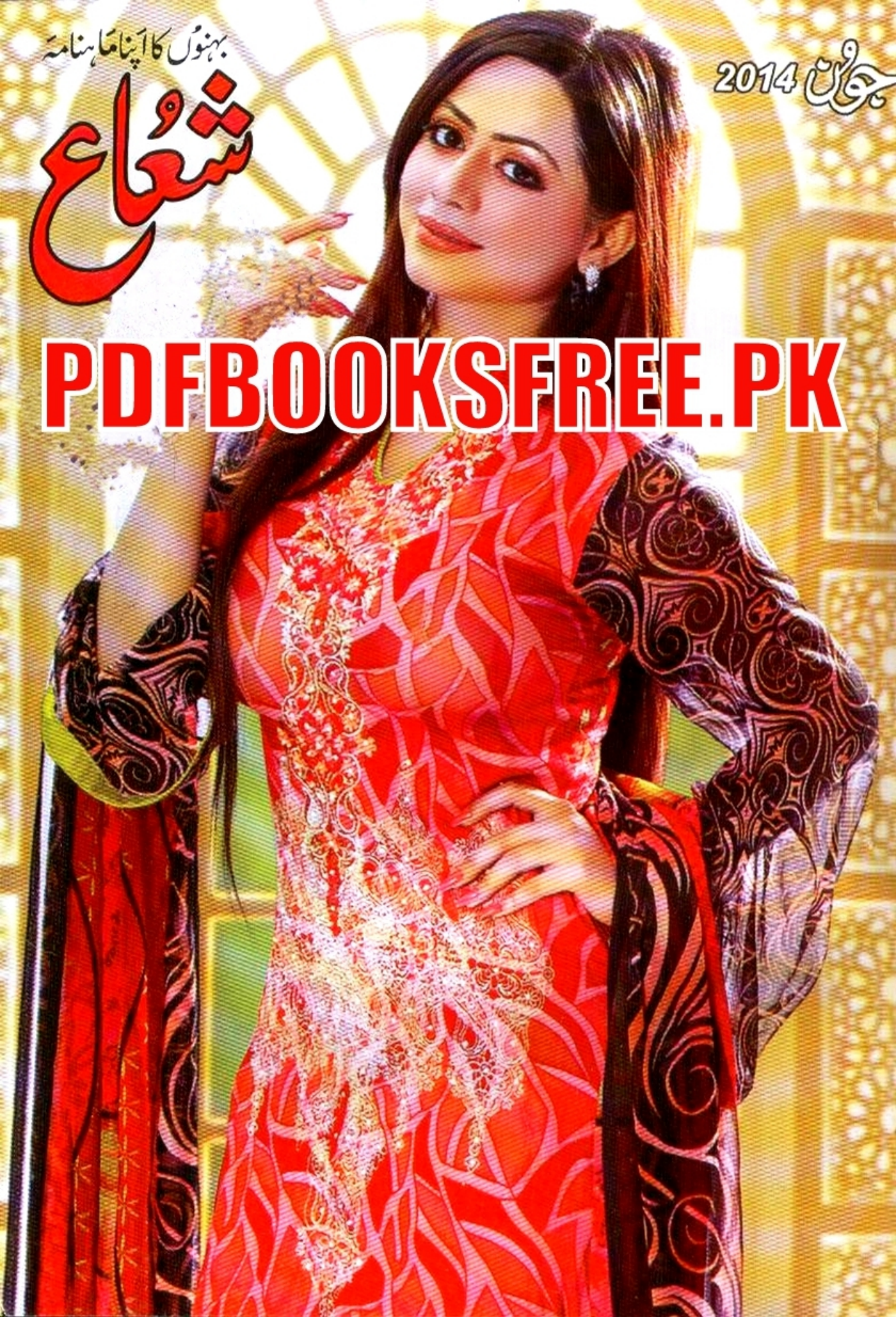


بہنوں کا اپنا ماہنامہ

جولائی 2014

شعاع

PDFBOOKSFREE.PK



منہول لاہوری اینڈ فرینڈز پرائیویٹ
 سٹورس اور بک سٹال کی ہیولٹ بیورو
 سے ادارہ سلسلہ کی خرید و فروخت کی جاتی ہے
 روٹنگان بڑی احمد بازار اورینٹل

www.pdfbooksfree.pk

MEMBER
 APNS
 CPNE
 رکن آل پاکستان نڈز بیورو سائنسی
 رکن کونسل آف پاکستان نڈز بیورو سائنس

مستقل سلسلے

- | | | | | |
|-----|-------------|-----|------------|-----------------|
| 268 | خالہ جیلانی | 27 | رضیہ جمیل | خط آپ کے |
| 288 | خالہ جیلانی | 262 | صباحہ | مُسکراہٹیں |
| 290 | ادارہ | 277 | واصفہ سہیل | ایٹنیہ خانے میں |
| | | 265 | شگفتہ جاہ | پالوں سے خوشبو |
| | | 285 | امت الصبور | تاریخ کے جھروکے |
| | | 17 | آمنہ زبین | سیرِ دو جہاں |

جون 2014
 چاند 28
 قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل فلموں حسن پر شنگ پر لیں سے بچھڑا کر شائع کیا - مقالہ ۲۰۱۱ ایڈیٹوری: سی ایچ ایس ایس ایچ کلچر
 Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
 Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

ناولٹ

- | | | |
|-----|-------------|---------------|
| 142 | امایہ خان | بہت شکن |
| 108 | سداقت النقی | اُسید کا رستہ |
| 68 | وجیہ احمد | گمہاری کا گھر |

افسانے

- | | | |
|-----|------------------|------------|
| 52 | سمیر احمد | عالم لاہوت |
| 62 | نور عین | خود غرض |
| 102 | سمیر اعثمان گل | من پسند |
| 212 | میمونہ صدف | صفائی پسند |
| 257 | قروۃ العین ہاشمی | پیرندے |

نظمیں غزلیں

- | | | |
|-----|-----------------|-----|
| 260 | شکیب جلالی | غزل |
| 261 | احمد فراز | غزل |
| 260 | امجد اسلام امجد | نظم |
| 261 | فاخرہ بمل | غزل |

- | | | |
|----|--------------------|--------------|
| 10 | رضیہ جمیل | پہلی شعاع |
| 11 | امین راحت چغتائی | حمد |
| 11 | پروفیسر اقبال عظیم | نعت |
| 12 | ادارہ | نبی کی باتیں |

انٹرویو

- | | | |
|-----|--------------|---------------|
| 22 | فاتح خان | بندھن |
| 270 | شاین زہد | دستک |
| 280 | نایاب جیلانی | ملنے کی گھڑی |
| 283 | بشری گوہل | شادی مبارک ہو |
| 274 | ادارہ | شعاع کے ساتھ |

ناول

- | | | |
|----|-------------------|---------------|
| 36 | رخسانہ نگار عثمان | ایک تھی مرثاں |
|----|-------------------|---------------|

مسل ناول

- | | | |
|-----|------------------|----------------|
| 222 | کینز نبوی | صنم سے صحت ترک |
| 172 | شہزادی عکاس خلجی | حسین الہ بگڑ |

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے نہ کسی بھی فی وی پیسٹل پر ڈراما، ڈرامائی کھیل اور سلسلہ وار قطع کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

احادیث میں سے حضرت فہید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو باب اکرام اہل بیت رسول اللہ میں گزر چکی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا۔ اللہ کی حمد و ثناء بیان کی، وعظ کیا اور نصیحت فرمائی پھر فرمایا۔

پھر آپ نے اللہ کی کتاب پر عمل کرنے پر ابھارا اور اس کے بارے میں ترغیب دی۔ پھر فرمایا۔

” (اور دوسری چیز) میرے اہل بیت رضی اللہ عنہم
ہیں میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ
یاد دلاتا ہوں۔ (ان کو کوئی زیادتی نہ کرنا)۔“ (مسلم)

قوائد و مسائل : اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بشریت کے حوالے سے فرمایا کہ انسان کی طرح موت سے مجھے بھی مفر نہیں۔ کلمہ موت مجھے بھی بھر حال پینا ہے۔ اس حدیث کو یہاں لانے کا مقصد یہ ہے کہ اس میں وصیت کرنے کا مستحباب ہے۔

اور یہ کہ ان کا معاملہ نہایت نازک ہے اس لیے انسان کو ان کا تذکرہ کرتے وقت نہایت محتاط رویہ اختیار کرنا چاہیے کہ ان کی گستاخی ہو نہ غلو۔

حضرت ابوسلیمان مالک بن حورث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم ایک جیسی عمر کے نوجوان تھے ہم میں رائیں آپ کے پاس قیام پذیر رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے مہربان اور نرم مزاج تھے چنانچہ آپ کو خیال ہوا کہ ہم اپنے گھر والوں (کی ملاقات کے) مشتاق ہو گئے ہیں چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے پیچھے جھوٹے ہوئے ہمارے گھر والوں کی بابت پوچھا تو ہم نے آپ کو اس کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ (جسے سن کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”تم اپنے گھر والوں کے پاس واپس چلے جاؤ اور
وہیں رہو اور انہیں بھی (دین کی باتیں) سکھاؤ اور
انہیں (جھلائی کا) حکم کرو اور فلاں نماز فلاں وقت میں
پڑھو اور فلاں نماز فلاں وقت میں۔ جب نماز کا وقت ہو
جائے تو تم میں سے ایک آدمی اذان کے اور تم میں سے
جو بڑا ہو وہ تمہیں نماز پڑھائے۔“ (بخاری و مسلم)
اور بخاری نے اپنی ایک روایت میں یہ اضافہ کیا
ہے ”اور اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے
نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔“

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں ایک تونوجوانوں کے علم دین حاصل

کرنے کے شوق کا بیان ہے جس کے لیے انہوں نے گھریار چھوڑ کر سفر کیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ طلب علم کے لیے اگر سفر کرنے کی بھی ضرورت پیش آجائے تو اس سے گریز نہ کیا جائے۔

2۔ استادیاءِ معظمہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ طلباء کے حالات سے آگاہ رہے اور اس کے مطابق مناسب اقدامات اور تدابیر کا اہتمام کرے۔

3۔ جن کو دین کا علم اور شعور حاصل ہو جائے ان کو چاہیے کہ وہ ان لوگوں کو بھی دین سکھائیں جو دینی علوم اور دین سے بے سرو ہیں۔

4۔ پورے شوق اور جذبے سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں۔

5۔ نمازوں کے لیے اذان کا اہتمام ضروری ہے۔

6- پیشوائی کی خصوصیات میں سب برابر ہوں تو پھر جو عمر میں بڑا ہو، وہ امامت کا حق دار ہے۔ پیشوائی کی خصوصیات میں سب سے پہلی خصوصیت قرآن کریم کو اچھے انداز سے پڑھنا اور دوسرے نمبر پر قرآن و حدیث کا علم ہے، یعنی جو سب سے اچھا قاری ہو، وہ امامت کا سب سے زیادہ حق دار ہے اس کے بعد جو بڑا عالم ہو، وہ ہے۔

7- اذان اور امامت کی مذکورہ ہدایت کا مطلب ہے کہ ہر جگہ اور ہر وقت اذان دے کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا اہتمام کیا جائے۔ مدرسہ ہویا تجارتی مرکز، سفر ہویا حضر۔

8۔ نماز میں مطلوب صرف رکوع و سجدہ لڑنا ہی نہیں جیسا کہ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ نماز ہی پڑھنی ہے جیسے پڑھ لی جائے اس حدیث میں بتایا گیا کہ نماز اس طرح ادا کرنی ضروری ہے جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کی ہے۔

دعا

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عمرے کی اجازت مانگی تو آپ نے اجازت مرحمت فرمادی اور

...

فرمایا۔
”اے میرے پیارے بھائی! اپنی دعائیں ہمیں نہ بھولنا۔“ یہ آپ نے ایسا کلمہ ارشاد فرمایا کہ اس کے بدلے میں مجھے ساری دنیا بھی مل جائے تو مجھے خوشی نہ ہو (یعنی یہ کلمہ ساری دنیا سے بڑھ کر مجھے عزیز ہے۔

اور ایک روایت میں ہے "اے میرے پیارے بھائی! اپنی دعا میں ہمیں بھی شریک رکھنا۔" (اسے ابو داؤد اور ترمذی سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

الوداع

حضرت سالم بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ آدمی سے فرماتے جب وہ کسی سفر کا ارادہ کرتا۔

میرے قریب ہونا کہ میں تجھے الوداع ہوں جیسا کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں الوداع فرمایا کرتے
تھے آپ فرماتے۔

”میں تیرے دین، تیری امانت اور تیرے آخری اعمال کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔“ (اسے تہذیب نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فائدہ : اس میں مسافر کو الوداع کہنے اور مذکورہ عجائبہ کلمات کے ساتھ اس کے حق میں دعا کرنے کا مستحب ہے۔ وہ دعا ہے۔

استغفر الله ونك وایمانتک و خواتم عملک

زافراہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ
ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر
ہوا اور عرض کیا۔

”یا رسول اللہ! میرا سفر کرنے کا ارادہ ہے“ آپ مجھے
اور اہ عتایت فرمائیں (یعنی میرے حق میں دعا
بادیں)۔

”اللہ تعالیٰ مجھے تقویٰ کے توشے سے آراستہ فرمائیے۔“

13 2014

اس نے کہا ”میرے لیے مزید دعا فرمائیں۔“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”اور تیرے گناہ معاف فرما دے۔“

اس نے کہا ”کچھ اور۔۔۔“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”تو جہاں کہیں
بھی ہو، اللہ تعالیٰ تیرے لیے بھلائی کو آسان کر دے۔“

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ
حدیث حسن درجہ کی ہے)
فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ مسافر کے لیے
بہترین زادراہ اس کے لیے دعائے خیر ہے۔
استحارہ اور باہم مشورہ کرنے کا بیان
اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”اور (اہم) معاملے میں ان سے مشورہ کر۔“
(عمران 159)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
”ان کا کام آپس کے مشورے سے ہوتا
ہے۔“ (العنکبوتی 38)
یعنی اس میں وہ ایک دوسرے سے مشورہ کرتے
ہیں۔

فائدہ آیات : پہلی آیت میں نبی صلی اللہ علیہ
وسلم سے خطاب ہے اس میں آپ کو صحابہ کرام رضی
اللہ عنہم سے مشورہ کرنے کا حکم ہے اور دوسری آیت
میں مسلمانوں کا طرز عمل یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ باہمی
مشاورت سے اپنے کام کرتے ہیں۔ ان دونوں آیتوں
سے واضح ہے کہ ایک دوسرے سے مشورہ کرنا
چاہیے۔

استحارہ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں قرآن کی سورتوں
کی طرح ہر معاملے میں استحارہ کرنے کی تعلیم دیا کرتے
تھے۔

فوائد و مسائل :

1۔ استحارہ کے لغوی معنی ہیں ”خیر طلب کرنا یعنی اس
دعا کے ذریعے سے انسان اللہ سے خیر طلب کرتا ہے۔
یہ دعا قبول ہوتی ہے یا نہیں؟ اس کے معلوم کرنے کا
کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ
استحارہ کرنے والے کو خواب کے ذریعے سے صحیح بات
بتلا دی جاتی ہے۔ یا اس کے دل میں خیر والے پہلو کی
طرف رجحان پیدا کر دیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ
باتیں کسی حدیث میں بیان نہیں ہوئی ہیں۔ ممکن ہے
کچھ لوگوں کو خواب یا رجحان کے ذریعے سے بتلایا جانا
ہو، جن کے لیے اللہ کی مشیت ہو۔ لیکن یہ اصول یا
قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ جو بھی استحارہ کرے گا اسے
ضرور غیبی اشارہ ہو جائے گا۔ اس لیے غیبی اشارے کا
انتظار نہیں کرنا چاہیے بلکہ استحارے کے بعد ”سبح
سمجھ کر ظاہری اسباب کے مطابق جو بات مناسب لگے
اسے اختیار کر لیا جائے۔ اگر اس کی دعائے استحارہ
قبول ہو گئی ہوگی تو یقیناً اس میں اس کے لیے خیر ہی ہو
گی۔ بصورت دیگر نقصان کے امکان کو بھی نظر انداز
نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال ایک مسلمان کو دعا کرنے کا
حکم اور اس کی تاکید ہے اس میں تساہل اور تغافل یا
اس سے اعراض جائز نہیں۔ دعا کی قبولیت یا عدم
قبولیت اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ استحارہ بھی
ایک دعا ہی ہے اور اس کی تاکید و اہمیت حدیث مذکورہ
بالا سے واضح ہے اس لیے ہر اہم کام میں استحارے کا
اہتمام ضرور کرنا چاہیے۔

2۔ یہ استحارہ ان ہی امور کے لیے ضروری ہے جن کا
تعلق مباحات سے ہے جن میں انسان کو خیر اور شر کا
علم نہیں ہوتا۔ باقی جو فرائض و واجبات اور سنن و
مستحبات ہیں ان کی ادائیگی تو ہر صورت میں
ضروری ہے اسی طرح جو حرمت و مکروہات شرعیہ
ہیں ان سے اجتناب ضروری ہے۔ ان اوامرو منہیات
میں استحارہ کرنا جائز نہیں ہے۔ علاوہ ازیں استحارے کا
مسنون طریقہ چھوڑ کر نجو میوں، دست شناسوں اور

دیگر اسی قسم کے فرائضوں کے پاس جا کر مستقبل میں
پیش آنے والے حالات کا علم حاصل کرنے کی کوشش
کرنا جہالت و نادانی کے علاوہ بہت بڑا گناہ ہے۔ غیب کا
علم صرف اللہ کو ہے۔ انسان کو صرف اللہ ہی سے خیر کا
طالب ہونا چاہیے، تمام قدرتوں کا مالک وہی ہے ہر
قسم کی قوت کا مالک وہی ہے اسی سے قوت و طاقت کا
سوال کرنا چاہیے اور اپنے تمام معاملات اسی کو سونپنے
چاہئیں۔

3۔ دعائے استحارہ کسی بھی وقت کی جاسکتی ہے۔
صرف نماز کے مکروہ اوقات میں یہ جائز نہیں کیونکہ
اس کے لیے پہلے دو رکعت پڑھنا ضروری ہیں۔ اکثر
لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کا وقت رات کو سونے سے قبل
ہے۔ یہ بات صحیح نہیں۔ دعائے استحارہ کا پڑھنا دو
رکعت نماز پڑھنے کے بعد بھی صحیح ہے اور نماز ہی میں
تشدد و درود کے بعد سلام پھیرنے سے قبل یا سجدے
کی حالت میں بھی جائز ہے۔ دعایا و نہ ہو تو نماز پڑھنے
کے بعد کتاب سے دیکھ کر بھی پڑھی جاسکتی ہے۔

4۔ دوسروں سے استحارہ کرانے کی قرآن و سنت میں
کوئی دلیل نہیں ہے، البتہ کسی صاحب بصیرت کو
مکمل حالات بتا کر مشورہ کیا جاسکتا ہے نیز نیلی ویشن پر
آن لائن استحارہ بھی بدعت ہے جس کی قرآن و سنت
میں کوئی اصل نہیں بلکہ یہ سنت نبوی کی حیثیت کو کم
کرنے کے مترادف ہے۔

نماز استحارہ

جب کسی کو کوئی (جائز) امر درپیش ہو اور وہ اس میں
متردد ہو کہ اسے کرے یا نہ کرے یا جب کسی کام کا
ارادہ کرے تو اس موقع پر استحارہ کرنا سنت ہے۔ اس
کی صورت یہ ہے کہ دو رکعت نفل خشوع و خضوع اور
حضور قلب سے پڑھے رکوع و سجود اور قومہ و جلسہ
بڑے اطمینان سے کرے۔ پھر فارغ ہو کر یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخْرِیْکَ بِعِلْمِکَ وَاسْتَعِیْزُکَ بِقُدْرَتِکَ وَاسْتَسْقِیْکَ
مِنْ فَضْلِکَ الْعَظِیْمِ، فَاِنَّکَ تَعْدُوْا وَلَا اَقْدُرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ

وَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ۔ اِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنْ هٰذَا الْاَمْرُ
خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَ مَعَاشِیْ وَ عَاقِبَتِیْ اَصْرِیْ۔ فَاَقْدُرْ لِّیْ
وَقِیْرَہُ لِّیْ ثُمَّ بَارِئْ لِّیْ مِنْہٗ وَ اِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنْ هٰذَا الْاَمْرُ
شَرٌّ لِّیْ دِیْنِیْ وَ مَعَاشِیْ وَ عَاقِبَتِیْ اَصْرِیْ فَاصْرِہُ عَنّْیْ
وَ اَصْرِہُ فِیْ عَذَابِکَ وَ اَقْدُرْ لِّیْ الْخَیْرَ حَتّٰی کَانَ
ثَمًّا اَوْ خَیْرًا بِیْہِ

ترجمہ الے اللہ! یقیناً میں (اس کام میں) تجھ سے
تیرے علم کی مدد سے خیر مانگتا ہوں اور (حصول خیر کے
لیے) تجھ سے تیری قدرت کے ذریعے استطاعت مانگتا
ہوں اور میں تجھ سے تیرا افضل عظیم مانگتا ہوں بے
شک تو (ہر چیز پر) قادر ہے اور میں (کسی چیز پر) قادر
نہیں۔ تو (ہر کام کا) انجام دیتا ہے اور میں (کچھ) نہیں
جانتا اور تو تمام غیبیوں کا جاننے والا ہے۔ الٰہی! اگر تو
جانتا ہے کہ یہ کام (جس کا میں ارادہ رکھتا ہوں) میرے
لیے میرے دین، میری زندگی اور میرے انجام کار کے
 لحاظ سے بہتر ہے تو اسے میرے لیے مقدر کر اور آسان
کر، پھر اس میں میرے لیے برکت پیدا فرما۔ اور اگر
تیرے علم میں یہ کام میرے لیے میرے دین، میری
زندگی اور میرے انجام کار کے لحاظ سے برا ہے تو اس
(کام) کو مجھ سے اور مجھے اس سے پھیر دے اور میرے
لیے بھلائی مہیا کر جہاں (کہیں بھی) ہو۔ پھر مجھے اس
کے ساتھ راضی کر دے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ هذا الامر کی
جگہ اپنی حاجت کا نام لو۔ (1)

اگر عربی زبان میں اپنی حاجت کا نام لے سکیں تو بہتر
ہے ورنہ یہ دعائیں ہی الفاظ سے پڑھ کر بعد میں اپنی بولی
میں اپنی حاجت کا اظہار کیجئے۔

جب آپ یہ مسنون استحارہ کر کے کوئی کام کریں
گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ضرور اس میں بہتری کی
صورت پیدا کرے گا اور بے انجام سے بچائے گا۔
استحارہ رات یا دن کی جس گھڑی میں بھی آپ چاہیں
کر سکتے ہیں سوائے اوقات مکروہہ کے۔

حسن سلوک

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”کوئی پڑوسی اپنے پڑوسی کو (اپنی مشترکہ دیوار میں لکڑی یا نیکل وغیرہ) گاڑنے سے نہ روکے۔“

پھر حضرت ابو ہریرہ فرماتے۔
”کیا وجہ ہے کہ (اس فرمان رسول کے باوجود) میں تمہیں اس حکم سے منہ پھیرتے ہوئے نہ دیکھتا ہوں اللہ کی قسم! میں اسے تمہارے کندھوں کے درمیان پھینک کے رہوں گا۔ (یعنی ضرور تمہارے سامنے پیش کروں گا۔) (بخاری و مسلم)“

فائدہ :

اس حکم اور تاکید کی اہمیت ان آیاتوں اور ہدایتوں میں سامنے آتی ہے جو جھوٹپڑیوں اور غیبول پر مشتمل ہوں، یا ایسے علاقوں میں جہاں اب بھی دو پڑوسیوں کے درمیان پختہ دیوار ایک ہی ہوتی ہے (بڑے شہروں کی طرح اپنی اپنی الگ الگ دیوار نہیں ہوتی) تاہم اس سے یہ اصول ضرور معلوم ہوتا ہے کہ پڑوسیوں کے معاملے میں انسان کو بد مزاج اور بد معاملہ نہیں ہونا چاہیے کہ ایک کیل کا ٹھوٹنا یا ایک لکڑی کا گاڑنا بھی اسے ناگوار ہو، بلکہ بعض دفعہ دیکھا گیا ہے کہ صرف ٹھک ٹھک کی آواز ہی سے وہ مشتعل اور لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس پڑوسیوں کے ساتھ باہم ہمدردی اور تعاون کا معاملہ ہونا چاہیے۔ مسلمان تو تمام ایک جسم کی طرح ہیں، چہ جائیکہ دو پڑوسی بھی آپس میں ایک دوسرے کے دست و پاؤں نہ ہوں۔

ایمان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے

پڑوسی کو ایذا نہ پہنچائے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ ہمسایہ کی عزت کرے اور جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ بھلائی کی بات کرے ورنہ خاموش رہے۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس حدیث میں ایمان کے ثمرات کا بیان ہے جس میں مذکورہ خوبیاں نہیں ہیں اسے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ایمان کی برکت سے محروم ہے، اس کا ایمان بے ثمر وخت کی طرح یا اس پھول کی طرح ہے جو خوشبو سے محروم ہے یا ایک ایسا قالب ہے جس میں روح نہیں۔

پڑوس

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے کہا۔

”اے اللہ کے رسول! میرے دو پڑوسی ہیں، ان میں سے میں کس کو بدیہ سمجھوں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
”جس کا دروازہ تیرے زیادہ قریب ہو۔“ (اسے بخاری اور ابوداؤد نے بیان کیا ہے)

فائدہ : جب انسان سب پڑوسیوں کو بدیہ دینے کی استطاعت نہ رکھے اور صرف کسی ایک ہی کو بدیہ دینا چاہے، تو اس کی ترتیب اس میں بیان کر دی گئی ہے کہ الا قرب فالاقرب کا اصول پیش نظر رہے۔

بہتر ساتھی

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ کے ہاں ساتھیوں میں سب سے بہتر ساتھی وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہو۔ اور پڑوسیوں میں سب سے بہتر پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے حق میں بہتر ہو۔“

•

بیٹھ کر سید و جہان کرنا

کہی نہ جلاتے

مصنف: ممتاز مفتی
تبصرہ: ائمہ زین

زندگی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ، کرواروں سے جڑی ہوئی۔ کیفیات کی ارزانی میں جلا و دھواں کی مشاہدے سے منسلک واقعات کا تسلسل لیے نارسائی کی ایک میں جلائے ابتلا۔ نا آسودگی کا اضطراب سمیٹے تجربات کے بھور میں ذوقی ابھری کمانی۔ زندگی ہے۔

مصنوعات کے اس پرجوم دور میں انسان کو رسائی کا زعم حاصل ہے لیکن یہ رسائی احساس کی شرکت مشاہدے کے دھیمے عمل اور بڑے زمین کے رستے جیسی گمراہی کے وصف سے محروم ہے؟ ایجادوں سے قبل کا دور دریافت سے پہلے کی جستجو کا دور تھا۔ زندگی رابطے اور مشاہدے احساس کی پناہیوں کا عنوان تھی۔ چیزوں کی فراوانی سے محرومی کو محرومی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور ایسے ہی دور میں زندگی کو سمجھنے اس کے ساتھ بھڑنے کا آغاز کرنے والی ہمتیوں نے اپنے اپنے گام پر سفر طے کیا اور کس طرح اپنی منفرد لیکن قدرتی صلاحیتوں کے ساتھ نام اور مقام حاصل کیا۔ ممتاز مفتی، شافق احمد قدرت اللہ شہاب احمد بشیر عین انشاء اور دیگر کئی۔ اس کی مثالیں ہیں!

زیر نظر کتاب ”کہی نہ جاتے“ 1943ء سے شروع ہونے والا ان کا ادبی سفر ارتقا کے مختلف مدارج طے کرتا ہوا۔ مختلف جہات کا تجربہ کرتے ہوئے ایک منفرد مقام پر پہنچ چکا تھا۔

انسانی نفسیات کی رچ رچ گھسیوں کو سمجھنے کی خواہش نے انہیں تمام عمر جستجو کے اضطراب میں مبتلا رکھا۔ اور زندگی کے جیتے جاگتے کرواروں کی کیفیات محض تجسس کے سانچے میں ڈھلنے کی چیز نہیں بلکہ رابطہ مشاہدہ اور تجربہ ان کے تجسس کی غذا ثابت

ہوا۔
کس کس نے علی کو کمالی کو بڑھا ہے؟
ممتاز مفتی نے اہلی کو چاہا ہے!
ان کی شخصیت محکم و فن اور زندگی کا جائزہ لینا ایک نشست میں ممکن نہیں۔ مئی الوقت ان کی مختصر کمانیوں سے لطف اٹھاتے ہیں۔
ایکس کمانیوں پر مشتمل کتاب مختصر سی ہے۔
مگر!

”شام کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ شام پڑتی ہے تو اک بے نام اداسی چھا جاتی ہے۔ بنیضیں مدھم پڑ جاتی ہیں۔ دلی میوں لگتا ہے جیسے ڈوبا ڈوبا سا ہو حرکت میں شدت نہیں رہتی۔ پتا نہیں کمال سے ان جانا سا دکھ رستار تھا ہے۔ میں نے تو یہ سمجھا ہے کہ شام وقت نہیں بلکہ ایک عالم ہے۔“

”مکانوں کے متعلق میرے مشاہدے عجیب سے ہیں۔ وہ عقل پر نہیں بلکہ حیات پر مبنی ہیں۔ کوئی مکان ایسا ہوتا ہے کہ آپ کو دیکھتے ہی آگے بڑھتا ہے۔ یا نہیں پھیلا دیتا ہے۔ آئیے آئیے ہم اللہ جی آیاں نوں۔ آپ اس مکان میں یوں سیٹھ ہو جاتے ہیں جیسے پرانے جوتے میں پاؤں کوئی مکان ایسا ہوتا ہے کہ آپ کو دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ ہاتھ پر تو پوری پڑ جاتی ہے۔ کون ہیں آپ، خواہ خواہ اندر گھسے آ رہے ہیں۔ کچھ مکان اداس ہوتے ہیں۔ آہیں بھرتے ہیں۔ کراہتے ہیں۔ کچھ ہنسنے کھینچنے پر مائل کرتے ہیں۔ خواہ خواہ جی چاہتا ہے کہ اٹھ کر بیٹھ جائیں۔ کچھ کریں اور کچھ نہیں تو مل بیٹھیں۔“

سننے ہیں ایک بحث جو طریقہ علاج کے بارے میں مل کر بیٹھے کچھ دوست کر رہے ہیں۔ لیکن کمانی

دراصل اس بحث کا موضوع نہیں ہے۔

”ایلو پیتھی“ نے جو مرض کو دیا دینے کی رسم پیدا کی ہے اس سے امراض میں اضافہ ہو گیا ہے اور صرف اضافہ ہی نہیں اس سپریشن کی وجہ سے مرض نے کیمو فلج کرنا تاکہ لیا ہے لہذا مرض جیسے بدل بدل کر خود کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں اسرار کا عنصر برہمنا جا رہا ہے۔ تشخیص کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ کیوں طاؤس! ہمارا کیا خیال ہے ہم نے پوچھا۔ میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں۔ طاؤس بولا۔ ہمارا طریق علاج یعنی ہومیوپیتھی یقیناً ”روحانی طریقہ علاج“ ہے ڈاکٹر صاحبان! رشید ہنس کر بولا۔ آپ لاکھ کوشش کریں لیکن ایلو پیتھی کو ری پلیس نہیں کر سکتے۔

وہ کیوں؟ حامد نے پوچھا۔

سیدھی بات ہے! رشید نے جواب دیا۔ آج کل مریض کیور نہیں چاہتا۔ وہ صرف ریلیف چاہتا ہے۔ کیور کے لیے صبر چاہیے۔ استقلال چاہیے۔ آج کل لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ کیور کا انتظار کریں۔

ہمارے نوجوان میڈ کروڈ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے اندر کے فرد کو دیا رکھا ہے بالکل ایسے جس طرح اینٹی بائیوٹکس اندر کی بیماری کو دبا دیتے ہیں۔ وہ اکیلے ہونے سے ڈرتے ہیں۔ طاؤس نے ایک جی آہ بھری اور گویا اپنے آپ سے بولا۔ کاش کہ میں کوئی ایسی دوا بنانے میں کامیاب ہو سکتا جو اندر کے فرد کو ریلیف کر سکتی۔ میڈ کروڈ کی نفی کر سکتی۔

”آدمے چرے“ سے لیا گیا یہ مکالمہ کہانی کو زندگی کے حقائق سے جوڑ رکھنے کی مثال ہے۔ ورنہ کہانی تو دراصل حمید اختر اور صفیہ سبیل کی ہے۔ کسی بھی مصنف کی تحریر سے رمز آشنائی کا مرحلہ طویل ہو سکتا ہے مگر یہ سلسلہ شروع تو ایک تحریر سے ہی ہوتا ہے۔ پر مصنف کا ذاتی وصف اس کی تحریر میں

ضرور چمکتا ہے، جیسے اشفاق احمد کو واقعاتی بیان پر ملکہ حاصل تھا۔ اسی طرح ممتاز مفتی کی تحریر سے ان کی بے مثال مشاہداتی حس ہر طرف چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

”اس نے سچ آرام نہ کرے میں ہم دوتھے لیکن دونوں ہی اکیلے تنہا اگر ہم دونوں اکیلے اکیلے ہوتے تو یقیناً“ اس قدر اکیلے نہ ہوتے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت دور تھے بہت دور وہ مجھ سے بے زار تھی، میں اس سے بے زار تھا۔ چالیس سال ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے آئے تھے۔

دن میں دو ایک باریات کرنے کی ضرورت پر جاتی، وہ آلو پیتھی ہونے چاقو سے مخاطب ہو کر کہتی۔

”آلو میں بیٹنگ ڈال لوں؟“

میں شیو کرتے ہوئے استرے سے کہتا۔ ”ڈال لو۔“

اور اب۔ اب ہم دونوں بوڑھے ہو چکے ہیں۔ لڑو، جھگڑو، جھگڑ کر جھک گئے ہیں۔ وہ مجھے گوارا کر رہی ہے۔ مجبوراً۔ میں اسے گوارا کر رہا ہوں۔ وہ کہتی ہے۔ ”اس کا تو دماغ خراب ہے۔ یہ کیا سمجھے گا۔“ میں کہتا ہوں۔ ”اس کا تو دماغ سرے سے ہے ہی نہیں، سمجھانے کی کوشش عبث ہے۔“

ظاہر ہے کہ یہ میاں بیوی کے متعلق خیال آرائی ہے۔ جن کے درمیان رائج ہوئی چپ کو ایک چوہے کی آمدورفت نے توڑا۔ کہانی کا نام ہے ”چوہا“۔ کچھ عناصر جن کا ذکر تو اتر لیکن ہر دفعہ نئے انداز سے اس کتاب میں آپ کو ملتا ہے۔ ان میں میاں بیوی کے اختلاف، رنجشیں، مشام اور ہومیوپیتھی شامل ہیں۔

”جی ہاں جی ہاں۔“ میں کر میرے کان پک گئے ہیں۔ صاحبو! میرا اللہ یہ ہے کہ میں نے ایک ”جی ہاں“ سے شادی کر رکھی ہے۔ اس بدھنہنہی کی تمام تر ذمہ داری خود مجھ پر پڑی ہے۔ میں تین سال جانے ان جانے میں دعا میں مانگا رہا تھا کہ یا اللہ میں اپنی بیوی کے

منہ سے کبھی ”جی ہاں“ بھی سنوں۔ لوگو! ابھی بن سوئے سمجھے دعا نہ مانگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ دعا منظور کرے۔“

”سانپ“ سے لی گئی یہ خود کلائی بھی ایک شوہر کی ہے۔ جس کی پہلی بیوی اس کی بات نہیں مانتی تھی۔ حادثات موت کے بعد دوسری بیوی پر جب دعا منطبق ہو گئی تو صاحب کا چہرہ بدھ ہو گیا۔

”دوستو! ہم مرد بھی کتنے احمق ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دیل دے کر ہم بیوی کو سمجھا سکتے ہیں۔ اب میں جان گیا ہوں۔ اس لیے میں نے ایک ہاتھ کی تالی بجانا چھوڑ دیا ہے۔“

سجدہ گنیمت مسائل اور پیچیدہ انسانی کیفیات کو بیان کرتے کرتے یہ واحد موضوع ہے جو ہلکی پھلکی سی لطافت لیے ہوئے ہے۔

”وہ دونوں میرے کانوں میں سرگوشیاں کرتی رہتی ہیں۔ ایک کہتی ہے۔

دیکھ مریں۔ دوتی کو اپنے جوتے تلے رکھ۔ دوتی کہتی ہے۔ مجھے پتا ہے کہ وہ تیرے کان بھرتی رہتی ہے جو تو اس کی باتوں میں آگیا تو کیا ہو گا۔ ایک کہتی ہے۔ تو نے سنا نہیں کیا ہے کہتے ہیں مگر یہ گفتگو روز اول یہ ہنس کھیاں پہلے بھرائی ہیں پھر چڑیل کی طرح سرچڑھ جاتی ہیں۔

دوتی کہتی ہے۔ ”تو یہ اس کی زبان تو قہنجی ہے۔ کاشنا جانتی ہے جو زنا نہیں جانتی۔“

ایک آنسو چمکتا ہے۔ ہنسہیہ میں نے کیا کر دیا۔ اپنے ہاتھوں مجھے کانوں میں دھکا دے دیا۔ یہ تیرے لائق نہ تھی۔

یہ ایک بے چارے مرد کی کہتا ہے۔ ”ایک“ جس کی ماں ہے اور ”دوتی“ بیوی۔ ساس ہوسکی مھینچا تالی کا شکار بے چارہ بھگت کے کہنے پر جگن ناتھ بن گیا۔ تم خود بدل جاؤ۔ اس کی سنو۔ اس کی سنو۔ اوھر کاٹھ اوھر کاٹھ پیچ پیچ بیٹھا جگن ناتھ۔

جگن ناتھ بنا بہت مشکل تھا۔ خود کو کاٹھ بنا

لینا۔ سنہ لاگ نہ لگاؤ۔ دکھ درد خوشی سب ختم ہو گئے۔ گھر کے جھگڑے چلتے رہے۔ چلی کپات چلتے رہے۔ میں کو کرٹو بن گیا جو نہ گتا ہے نہ پستا ہے۔ دونوں طرف آنسوؤں کی جھڑیاں لگی رہیں لیکن میں سوکھا رہا۔

یہاں ایک بے بات دیکھیں کس آسانی سے ہمارے ہم تنہا سائی حاصل کرتی ہے۔

”مجھ پر بھید کھل گیا کہ سکھ خوشی کا نام نہیں غم اور خوشی دونوں سے بے نیاز ہو جانے کا نام ہے۔ مجھے پتا چل گیا کہ دنیا کو بدلتا خیال خام ہے۔ خود کو بدل لو۔“

لیکن کہانی کا انجام جگن ناتھ کی توقع کے خلاف رہا۔ اور وہ دونوں آپس میں صلح سلوک سے رہنے لگیں۔

جگن ناتھ کے بغیر!

43ء سے جاری ادبی سفر میں مفتی نے جدید زمانے اور نئی پود کے مشاہدے کو بھی اپنے قلم کی بصیرت عطا کی۔ کس جوان کی ذہنی استعداد اور مشاہدے کی قوت کو

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والے عظیم حادثات

کے دلچسپ بیان



میرزا اسد اللہ خان

تبت - 350 روپے

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

عیاں کرتا ہے۔

”مراے زمانے میں لڑکی خاموشی کے ذریعے جواب دیا کرتی تھی۔ آج کل سوال میں جواب دیتی ہے۔ پرانے زمانے میں محل مشہور تھی کہ لڑکی کے نہیں تو مطلب ہوتا ہے شاید۔ شاید کے تو مطلب ہوتا ہے ہاں۔ اور اگر ہاں کہہ دے تو جان لو کہ وہ لڑکی نہیں کوئی اور جنس ہے۔

آج کل لڑکی نہیں کہے تو مطلب ہوتا ہے نہیں۔ شاید کے تو مطلب ہوتا ہے شاید۔ اور ہاں کے تو صاحبو! جان لو کہ لڑکی ہی ہے کوئی اور جنس نہیں۔“

سوالیہ جواب دینا باؤرن لڑکی کی ایجاد ہے۔ وہ پوچھتا ہے ”ریکس بار میں برگر کھاؤ گی؟“ وہ کہتی ہے ”وائے ناٹ۔“

وہ کہتا ہے ”کل مینا بازار چلو گی؟“ وہ کہتی ہے ”نہ جاؤں کیا؟“

وہ کہتا ہے ”یہ کالی شال کتنی اچھی لگتی ہے۔“ وہ کہتی ہے ”کیسے نہ لگے۔“

باؤرن ازم کے نمائندہ نوجوان جوڑے کی دلچسپ کہانی ”بلیک ہاٹ“ سے لیے گئے یہ جملے جدت اور قدامت کے زبردست امتزاج کی کہانی ہے۔ جو مکالموں کے ذریعے ہم پر خود بخود عیاں ہوتی ہے۔ جبکہ لکھاری اپنی ذات (ذاتی رائے) کو کہانی پر مسلط بھی نہ کرے۔ قاری کے لیے یہ تجربہ پر لطف گھرتا ہے۔

”اس کی کامیابی نور بانو کا نتیجہ تھی۔ نور بانو کا نتیجہ ہو تو بانو اکڑ جاتا ہے۔ گردن تن جاتی ہے۔ چہرے پر کلف لگ جاتا ہے۔ یہ بات بھول جاتی ہے کہ بیسیوں بانو نور لگاتے ہیں لگائے رکھتے ہیں لیکن نور لگنا نہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ نور بانو میں صرف بانو کا نور نہیں ہوتا۔ نور بانو کا احساس اللہ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ خود کو خدا بنادیتا ہے۔“

”سیانے کہتے ہیں کہ اگر ”میں“ کے بوجھ سے آزاد ہونا چاہتے ہو۔ اگر ذہنی کشمکش کی گھنچا ٹائی سے بچنا چاہتے ہو تو کسی پھیلاؤ میں جا رہو۔ چاہے وہ پانی کا

پھیلاؤ ہو۔ زیت کا ہو یا آستان کا پھیلاؤ سے رشتہ استوار رکھو گے تو دل تنگ نہ ہو گا۔ آستان سے تعلق قائم کرو گے تو ایک امید سی بندھی رہے گی۔

سیانے کہتے ہیں دنیا ایک مشکل عمل ہے۔ جب آپ دینے لگتے ہیں تو اندر سے ایک بریک لگ جاتی ہے اور ہاتھ آگے نہیں بڑھتا رک جاتا ہے۔ کیا یہ حاجت مند ہے؟ حق دار ہے؟ حق دار نہیں۔ تو مسئلہ ہے۔ مشکل ڈا ہے کام نہیں کرنا دینے کے عمل میں ایک ساؤنڈ ہیرو سی رکاوٹ آجاتی ہے۔ اگر یہ ساؤنڈ ہیرو ٹوٹ جائے تو پھر دینے کے عمل میں ایک لذت ایک نشہ ابھرتا ہے۔ سید اکبر کا ہیرو ٹوٹ چکا تھا۔

”پھیلاؤ کی زبردستی“ سید اکبر کی کہانی ہے جس کی داخلی کیفیت نے اسے صحرا کے پھیلاؤ سے منسلک کر دیا۔

کردار کی کیفیت کو جھیننا اور بلا لحاظ جنس و عمر محسوسات کو بیان کرنا ادا کاروں کے علاوہ لکھاریوں کا بھی انداز ہے۔

عطیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس مخلوق کا بھی جواب نہیں۔ ہوانے کا اپنا ہی سوا ہوتا ہے ایک سے دوسرا نہیں ملتا۔ اللہ نے اپنے رنگ میں بنایا ہے۔ سنبل گھبرا کر بولی ہے۔ میرے میاں تو اتنے اچھے ہیں کیا بتاؤں۔

سنبل نے کہا۔ سنبل تیری بات اور ہے۔ شادی کو ابھی چھ مہینے ہوئے ہیں۔ وہ ابھی میاں نہیں بنا۔ ابھی تو وہ محبت کے چوہے پر چڑھا ہو گا۔ یہ دیک تو ایک دو سال کے بعد تیار ہوتی ہے۔

”میاں“ سے لیا گیا یہ مکالمہ سبیلوں کے درمیان چل رہا ہے اور میاں کی اقسام اور خصوصیات پر سیر حاصل معلومات کے علاوہ عورتوں کا اظہار رائے بھی ملتا ہے۔ کچھ کہانیوں کے آخری جملے فیصلہ کن تاثرات کے حامل ہیں۔ اور یہ کہانی بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔

”دور چاروں کے بعد ایک رجسٹری موصول ہوئی“

کھولا تو اندر طلاق نامہ تھا۔“

ہر اسرار۔ بھید بھری کہانی ”ممتاز کا بھید“ سے کچھ راز اگسا کرتے ہوئے چلتے۔

”نہیں بیٹی۔ بیگیاں بولی۔ ہم عورتوں کا کام مردوں کو بھاننا ہے۔ اگر مرد بے باں پسند کرتے ہیں تو ہم باں بڑھالیں گی۔ اگر انہیں بھرا بھرا جسم اچھا لگے گا تو ہم نیار بن جائیں گی۔ اگر انہیں تر پھرت اچھی لگے گی تو ہم پڑیاں نکال لیں گی۔ پہلے وہ وفا کو پسند کرتے تھے تو عورتوں نے وفا اپنائی تھی۔ اب وہ ہرجائی پسند کرتے ہیں تو عورتیں ہرجائی ہو گئی ہیں۔“

”نہیں ماں! امنا نے کہا۔ وہ عورتیں نہیں، وہ تو ناریاں ہیں جن کا کام مردوں کو بھاننا ہے۔ ناری بن کر عورت نے اپنی قدر گنوا دی ہے۔ عورت تو ممتاز کے لیے بنی ہے جس میں ممتاز جاگ اٹھے۔ وہ تو آپ محبت بانٹنے کی۔ وہ محبت کی بھمک کیوں مانگے۔“

امنا کی بات سن کر بیگیاں چلائی۔ یا اللہ میں اس لڑکی کو کیسے سمجھاؤں۔

امنا مسکرا دی۔ بولی ماں! جسے تو پکار رہی ہے۔ وہ تو آپ ماں ہے جگت ماں۔“

چہرے پڑھنے کا شوق رکھنے والی نفسیات کی طالبہ کی کہانی ”آؤ مجھے چہرے“ سے ہماری تجزیاتی حس کو بھی ممیز عطا ہوتی ہے کہ وہ کون کون سے زاویے ہیں جن سے شخصیت کا بھید پایا جاسکتا ہے۔

البحمoul سے ایوس ہو کر وہ باہر لان میں جا بیٹھتی اور سڑک پر آتے جاتے چروں کو دیکھنے لگتی۔ شہری چہرے ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوتے ہیں۔ ذہانت و مصروفیت اور دکھاوے کی چمک کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ عورتوں کے چہرے میک اپ نے ڈھانپ رکھے ہوتے ہیں۔ متول لوگوں کے چہرے تو بالکل شہیپ ہوتے ہیں۔ نوجوانوں کے چہروں میں زندگی تو ہوتی ہے لیکن بے جق اور ”سواوٹ“ کی مدوجر انہیں مگر گٹ باندھتی ہے۔

پھر کچھ ڈرائنگ روم تھے۔ سوٹ ٹائی۔ شو

شان۔ مسٹف کارمان کا رویا تھا جو اپنے لباس اور برائو کے دھیان میں ڈوبے ہوں۔ ”میں کیسا لگتا ہوں“ میں کھوئے ہوئے ہوں۔ وہ دو بجے کو کیسے توجہ دے سکتے ہیں بھلا۔“

بست کچھ کہتے ہوئے کچھ چلتے۔ ”آج کل خدوخال کا حسن نہیں چلتا۔ انداز کا حسن چلتا ہے۔ اسامہ کے انداز میں بڑی کر لیں تھی۔ حرکت میں ردھم تھا اور بات میں رنگ۔“

”شہر میں خالق اور مخلوق کے درمیان رشتہ قائم نہیں ہوتا۔ اس لیے شہر میں گردنیں تنی رہتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ شہر میں انسان خود کو خالق سمجھتا ہے۔“

”لیکن وہ بولے جو چلتی نہر کے کنارے اگے ہوتے ہیں وہ کیا جانیں پانی کیا ہوتا ہے۔“

”میں دیکھنے کی اتنی دیوانی ہوں کہ بار بار دیکھتی کیسی دکھتی ہوں۔“

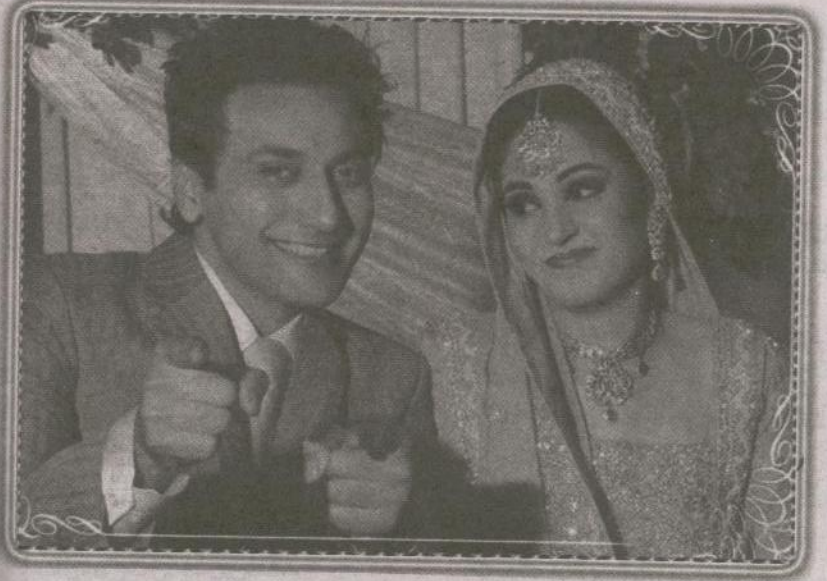
”بل بیٹھے میں تو زندگی شوخی سے بھر پور ہوتی ہے لیکن اکیلے میں دکھ سے چور چور۔ یہ کیا بھید ہے۔ سوچتے سوچتے وہ کنیا سے باہر نکل آیا۔“

کچھ کہانیوں میں مفتی کی ذاتی جھلک ہے، لیکن صرف وہی لوگ اس کو جان سکتے ہیں جو دیگر تحریروں کے ذریعے ان کو جانتے ہیں۔

”فر“ کا ذکر نہ کرنا بھی مشکل ہے اور کرنا سواتر۔ کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے کی میکینک خوبی اور مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

زندگی کیفیت، قوت، مشاہدے سے بھر پور نفسیات اور شخصیت کی پرتیں کھولتی ہوئی۔ مفتی کی تحریروں میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ دوسروں تک رمز شناسی کا اہم اور جستجو متخل کریں۔

کیا آپ جانتا چاہتے ہیں؟



بندھن

فاق خان ہمدانیہ فائق خان

شاہین رشید

جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور ان کی محکم دنیا میں ہوتی ہے اور اس ایک رشتے سے کتنے رشتے جنم لیتے ہیں۔ ”بندھن“ کا رشتہ جتنا نازک ہے اتنا ہی مضبوط بھی ہے مگر اس کی ڈور میاں بیوی کے ہاتھ میں ہی ہوتی ہے چاہیں تو مضبوطی سے تھامے رہیں اور چاہیں تو ڈھیل دے کر دلوں میں دراڑیں ڈال دیں۔ اس بار بندھن میں آپ کی ملاقات فائق خان اور ان کی سسر سے کروا رہے ہیں۔

”کیسے ہیں فائق خان اور بیٹے کی پیدائش بہت مبارک ہو۔“

”جی الحمد للہ بالکل ٹھیک ٹھاک اور شکر ہے۔“

”جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور ان کی محکم دنیا میں ہوتی ہے اور اس ایک رشتے سے کتنے رشتے جنم لیتے ہیں۔“

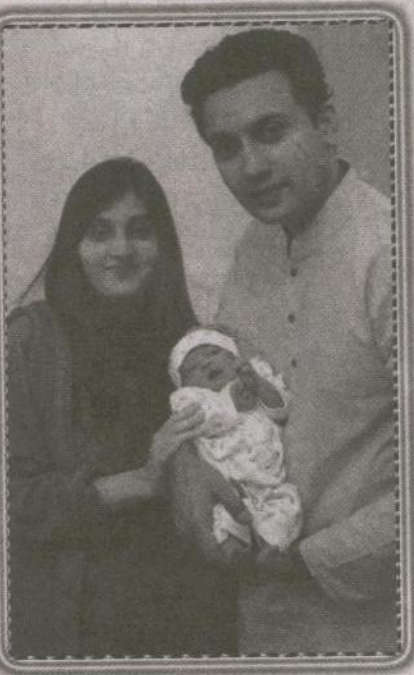
”بہت اچھی۔ بہت حسین۔ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا اپنے احساسات کو۔“

”اب جب تھکے ہارے گھر آتے ہیں تو کیسا محسوس ہوتا ہے؟“

”گھر آتے ہی پہلے اپنے بیٹے کو پیار کرتا ہوں۔ گود میں اٹھاتا ہوں اور پھر کوئی اور کام کرتا ہوں۔“

”سسر سے یہ نہیں پوچھتے کہ دن کیسا کزرا؟ بیٹے کے ساتھ اور بیٹے کا؟“

”یہ کام میں سارا دن فون کر کے کرتا رہتا ہوں۔“



”بیٹے کا نام کیا رکھا۔“

”بیٹے کا ”حمز ان“ رکھا ہے اور یہ ”حمز“ سے نکلا ہے اور یہ ایسا نام ہے کہ میرا نہیں خیال کہ اس کو کوئی بگاڑ سکتا ہے۔ جہاں تک کسی نام سے بلائے کی بات ہے تو ابھی تو ”حمز ان“ بہت چھوٹا ہے اور اس کے پیار کے بہت سے نام ہیں جس کا جودل چاہتا ہے بلا لیتا ہے مگر جب وہ بڑا ہو گا تو اس کا نام بگڑنے نہیں دوں گا۔“

”آپ ایک کمپنی کے برانڈ امبیسیڈر ہیں۔ جراثیم کا بہت دھیان دیتے ہیں آپ کو۔ اب بیٹے کے لیے بھی ایسی ہی ہدایات دیتے ہوں گے۔“

”تقہ۔ بالکل جی۔ یہ تو بہت ضروری ہے کیونکہ ہمارے ملک میں تو صفائی ستھرائی کا فقدان ہے اس لیے ڈر لگتا ہے کہ بچوں پر اس کا اثر نہ ہو جائے۔ اس لیے اگر اچھے برانڈ کے صابن استعمال کریں گے تو واقعی جراثیم سے بچ سکتے ہیں۔“

”اور کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟“

”آج کل تو ”ملکہ عالیہ“ میں ہی مصروف ہوں۔ آپ دیکھ ہی رہی ہوں گی کافی اچھا رسپانس مل رہا ہے۔“

”کافی دنوں کے بعد کسی بڑے رول میں آپ کو دیکھا۔“

”ایسا نہیں ہے میرے کافی ڈرامے انڈر پروڈکشن ہیں اور کچھ دیگر چینلز پہ آن ایر بھی ہیں اب چونکہ اتنے چینلز ہو گئے ہیں اور ڈرامے بھی تو کچھ بر نظر نہ جاتی ہے اور کچھ پر نہیں۔“

”یعنی بھی کام نظر آتا ہے تو بھی نہیں۔“

”جی بالکل۔ ورنہ کام تو بہت ہو رہا ہے۔“

”گلدستہ کچھ بندھن کی باتیں ہو جائیں۔“

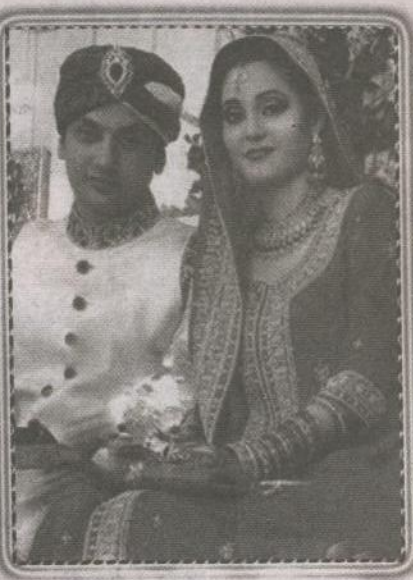
”جی جی بالکل۔“

”مجھے یاد ہے کہ جب ایک بار آپ سے بات ہو رہی تھی اور شاہی کا ذکر ہوا تو آپ نے جو کہانی سنائی وہ تو بالکل فلمی کہانی تھی۔ ذرا دہرائیں گے۔“

”تقی پرانی بات آپ کو یاد ہے۔ چلیں آپ کہتی ہیں تو میں دہرا دیتا ہوں۔ بہت پرانی بات ہے۔ میں نے ثانیہ کو عاطف اسلم کے ایک کنسرٹ میں دیکھا تھا۔ اس وقت عاطف اسلم بھی اتنے پاپولر نہیں تھے تو جب کنسرٹ ختم ہوا تو یہ جھوم سے جلدی نکلنے کے چکر میں بھاگتی ہوئی آ رہی تھیں۔ میرے قریب آتے ہی گر پڑیں۔ حیثیت ایک مرد کے کہ لڑکی گر پڑی ہے میں نے سنبھال لیا اور بس پہلی نظر میں ہی فدا ہو گیا۔“ (تقہ)

”او اچھا۔ فلم میں تو رائٹر کے ہاتھ میں سب کچھ ہوتا ہے اور ملاپ بھی ہو جاتا ہے۔ آپ کا پھر ملاپ کیسے ہوا۔؟ اسی وقت تو انھما محبت نہیں کیا ہو گا۔“

”جی جی بالکل۔ اگر ڈراموں کا رائٹر نہیں رہے تو حقیقی رائٹر تو اوپر ہے اور اس نے ہمارا ملاپ اس طرح کر لیا اور کہانی یہاں سے شروع ہوئی کہ ثانیہ نے مجھ



”جی بہت اچھی۔ زندگی مکمل ہو گئی ہے جیسے اور اب تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔“

”تو پہلے چلتا تھا؟“

”بہتے ہوئے۔“ چلتا تو پہلے بھی نہیں تھا، کیونکہ فائق کے اتنے کام ہوتے تھے کہ کچھ اور کرنے کا نام ہی نہیں ملتا تھا۔“

”ہوں۔۔۔ گھٹ۔۔۔ اب ڈبل مصروفیات ہو گئی ہیں تو فائق تمہارے ساتھ کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں؟“

”جی جی۔ بالکل۔۔۔ پہلے بھی ہاتھ بٹاتے تھے جب ”محمد ان“ اس دنیا میں نہیں آیا تھا اور اب تو بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔“

”فاق ایک مشہور شخصیت ہیں، شروع شروع میں تو بہت اچھا لگا ہوگا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ شہرت پریشانی کا باعث تو نہیں بن رہی؟“

”نہیں جی بالکل نہیں۔۔۔ اب تو لوگ مجھے بھی پہچاننے لگے ہیں اور میری بہت عزت کرتے ہیں اور شہرت ہر ایک کے حصے میں نہیں آتی یہ تو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے؟“

”کون سی خیمہ یا پہلے والی؟“

”مہنی مون کے لیے ملا بیٹھا گئے تھے اور اس میں تو کوئی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ آزادی والی زندگی تو شادی سے پہلے کی ہوتی ہے شادی کے بعد تو ذمہ داریوں والی زندگی ہو جاتی ہے تو بس زندگیاں دونوں اچھی ہیں اور انسان کو دونوں ہی زندگیاں انجوائے کرنی چاہئیں۔“

”میں نے دیکھا ہے کہ جینز اور بری میں اتنا کچھ ملنے کے باوجود لڑکیوں کو شادی کے فوراً بعد شاپنگ ضرور کرنی ہوتی ہے آپ کی بیگم نے بھی ایسا کیا؟“

”نہیں۔۔۔ اس معاملے میں میں لگی ہوں کہ میری بیگم بہت سمجھ دار ہے، اسے احساس ہے کہ منگانی بہت ہے اور انسان بڑی مشکل سے کما تا ہے تو اللہ کا شکر ہے کہ میری بیگم فضول خرچ نہیں ہے۔“

”آپ کی لومیرج ہے شادی کے بعد یہ فیصلہ صحیح لگایا غلط اور کون سی شادی زیادہ کامیاب ہوتی ہے؟“

”مجھے اپنا فیصلہ بالکل ٹھیک لگا اور کامیابی کی گارنٹی تو کسی شادی کی بھی نہیں دی جاسکتی۔ کبھی لو بہت کامیاب ہو جاتی ہیں اور کبھی ارتج بہت کامیاب ہو جاتی ہیں۔“

”سات سال دوستی رہنے کے بعد نکاح اور رخصتی کے وقت کیا کیفیت تھی؟“

”سچ بتاؤں۔۔۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ثانیہ سے میری شادی ہو گئی ہے اس سے جس کو میں بہت پسند کرتا ہوں۔ بہت شکر ادا کیا اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے میری خواہش کو پورا کیا۔“

”اور اب کچھ باتیں، ثانیہ فائق خان سے۔۔۔“

”کیسی ہیں ثانیہ اور میٹا مبارک ہو۔ دن رات کیسے گزر رہے ہیں؟“

”جی بالکل ٹھیک۔۔۔ بہت شکریہ اور دن رات تو بہت اچھے گزر رہے ہیں مصروفیات میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔“

”کیسی لگ رہی ہیں مصروفیات۔“

”جہاں تک ملاقاتوں کی بات ہے تو ایسا کچھ نہیں ہوا کیونکہ ثانیہ بھی بہت مصروف رہتی تھی اور میں بھی۔ ہاں البتہ شادی کی شاپنگ کے دوران ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی تھی کیونکہ شاپنگ ہم نے مل کر کی اور پھر چونکہ نکاح ہو چکا تھا لہذا کسی کو اعتراض بھی نہیں تھا۔“

”ظالم سلج آیا؟ اور ثانیہ کی تعلیم کیا ہے؟“

”ظالم سلج تو خیر نہیں آیا۔ لیکن چونکہ میرا تعلق شوہر سے ہے تو تھوڑا رابہم ہوا، مگر پھر مسئلہ جلدی حل ہو گیا اور ثانیہ نے مائیکرو بیالوجی میں ماسٹر ڈگری حاصل کی ہے۔“

”مستی تعلیم کے بعد لڑکیاں گھر نہیں بیٹھتیں، ثانیہ نے جاب کے لیے اصرار کیا؟ اور کچھ بتائیں کہ موڈی ہے، ہنس کھ ہے یا غصے کی تیز ہے؟“

”نہیں۔ ثانیہ نے جاب کے لیے کبھی اصرار نہیں کیا اور نہ ہی میں نے کہا البتہ اپنی فیلڈ میں اس نے پریکٹس ضرور کی ہے اور اب تو ماشاء اللہ ہمارا بیٹا ہے تو اسے گھر کی ذمہ داریوں کا احساس ہے، ہاں جب ذمہ داریاں تھوڑی کم ہو جائیں گی، بیٹا بڑا ہو جائے گا تب مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور ثانیہ مزاج کی بہت اچھی ہے بلکہ بہت معصوم ہے اور اس کی فرمائشیں بھی بہت معصومانہ ہوتی ہیں۔“

”اب تو ماشاء اللہ ثانیہ کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں، لیکن کیا آپ کا بھی دل چاہا کہ وہ آپ کے ساتھ اس فیلڈ میں کام کرے؟“

”نہیں۔ ایسا کبھی نہیں چاہا اور اگر ایسا چاہتا تو پھر شاید اس فیلڈ کی کسی لڑکی سے شادی کر لیتا۔“

”بیگم کی کوئی اچھی اور بری عادت جو آپ محسوس کرتے ہیں بتائیں؟“

”بری عادت تو یہ ہے کہ تھوڑی ضدی ہے، اتنا برست ہے اور حساس ہے اور اچھی بات یہ کہ ہمدردی کا ماہ بہت ہے، ہر انسان کے لیے بہت رحم دل ہے۔“

”مہنی مون کے لیے کہاں گئے تھے اور آزاد زندگی عمل ہوا۔“

”سے آنو کراف مانگا اور ساتھ ہی ای میل ایڈریس بھی دے دیا۔ بس پھر بات چیت شروع ہو گئی۔ تھوڑی سی انڈر اسٹینڈنگ بھی۔ بات چیت کے دوران ایک دوسرے کی فیملیز کا تعارف بھی کر لیا تو اندازہ ہوا کہ ثانیہ کی فیملی تو ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔“

”تینے سال رہی یہ دوستی اور کب رشتے داری میں بدلی؟“

”تقریباً سات سال ہماری دوستی رہی اور 13 مارچ 2011ء کو ہماری دوستی رشتے داری میں بدلی۔“

”کیوں؟ اتنا لمبا انتظار؟“

”لمبا انتظار اس لیے کیا کہ ایک تو ثانیہ بڑھ رہی تھی، پھر کم عمر بھی تھی اور میں بھی جلدی شادی کرنا نہیں چاہتا تھا تو بس اس لیے دونوں نے اپنی صحیح عموں کا انتظار کیا۔ کیونکہ میں بھی چاہتا تھا کہ کچھ بن جاؤں کچھ کمالوں، امبیٹلشن ہو جاؤں۔“

”شادی کی صحیح عمر آپ کے خیال میں کیا ہوتی ہے؟“

”بات عمر کی نہیں بات وقت مقررہ کی ہے۔ جب وقت لکھا ہوتا ہے تب ہی ہوتی ہے اس سے پہلے بہانے بنتے چلے جاتے ہیں کہ جی لڑکی چھوٹی ہے لڑکا امبیٹلشن نہیں ہے ویسے شادی اس وقت کرنی چاہیے جب لڑکی تھوڑی میچور ہو جائے اور لڑکا مکمل پختہ ہی نہیں بلکہ اچھا مکمل پختہ ہو ورنہ دو وقت کی روٹی تو سب کو ہی مل جاتی ہے۔“

”تو پھر 13 مارچ 2011ء کو شادی ہوئی۔“

”مگنی شادی سے پہلے ملاقاتیں ہوتی تھیں؟“

”13 مارچ 2011ء کو بات کی ہوئی تھی اور ساتھ ہی شادی کی ڈیٹ بھی فیکس ہو گئی تھی اور یہ سب کام گھر کی خواتین نے کیے کیونکہ میں تو شوٹ پر تھا۔ شادی ہماری 30 ستمبر 2011ء کو یعنی نکاح ہوا اور 2 جنوری 2012ء کو رخصتی کا عمل ہوا۔“



خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعل - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

چوبیس گھنٹے میں خاص ایک گھنٹہ بی بی کے سامنے بیٹھ رہی تھی۔ بہت اچھا ڈراما تھا۔ مگر اس کردار سے مجھے نفرت ہو گئی ہے۔ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ پوری سلطنت اور حکومت کا وقار تباہ کر دیا۔ اب ڈرامہ مجھ سے بالکل دیکھا نہیں جاتا۔

پیارے شیریں! آپ کا خط اور مکمل تفصیلی تبصرہ ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لگا۔ دو ماہ سے آپ شامل نہیں ہو سکیں اس کا ہمیں واقعی افسوس ہے۔ آپ کے خط ہمیں موصول ہو گئے تھے لیکن اس وقت موصول ہوئے جب شعل کا یہ سلسلہ تیار ہو چکا تھا اور پراپر پریس جانے والا تھا۔

ساتھ رضا کی کہانی میں تھر کے لوگوں کے حالات، ان کی قناعت، ساوگی، غرت اور بد حالی سامنے لانا یا معنفہ کا مقصد تھا اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب رہیں، آپ نے جس کہانی کے بارے میں لکھا وہ ہم نے بھی پڑھی ہے

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔ آپ کی عافیت مسلمانوں اور خشیوں کے لیے دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سب کو اور ہمارے پیارے وطن کو سلامت رکھے۔ آمین
اب آتے ہیں آپ کے خطوط کی طرف۔

پہلا خط ملتان سے شیریں ظفر کا ہے۔ لکھتی ہیں۔
”پیارے نبی کی پیاری باتیں“ خوابوں اور ان کی تعبیر سے متعلق موضوع بہت زبردست تھا اور جتنی بھی روایات درج تھیں اس سے نکل کم سے کم میں نے تو نہیں پڑھی تھیں۔ لہذا بہت ہی اہتمام اور توجہ سے پڑھی۔

تانبہ گوہر قریشی نے جاویداں زندگی کے عنوان کے تحت محمود ریاض صاحب کے بارے میں لکھا۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔
بس وہی بات کہ

وہ فلم کار جس کا صحیفہ ہے یہ
آج ہم میں نہیں ہے، یہی رنج ہے
مریم عزیز نے ”تعبیر“ لکھا اچھا لکھا۔ ایک روایتی کہانی ہے۔

”رقص بسل“ نیلہ عزیز جی کا ایک شخص ناول ہے۔ اب بور کرنے لگ گیا ہے۔ نیلہ جی ”ماورا“ نے رضا حیدر سے جو بدلہ لینا ہے، وہ بلی تھیلے سے باہر نکال دیں، کہیں تیور ”ماورا“ کا بھائی تو نہیں۔

اس بار پورے شعل کی جان تھا گنت بسا کا ”انہونی“ بہت ہی زبردست لکھا، کردار جان دار، کہانی شان دار، لکھنے کا اسلوب اور بیان زبردست امایہ خان کا ”بت شکن“ بھی بہت اچھا ہے۔ کہانی کا نیچو اچھا ہے۔ مجھے رائیں اور مہر خان کا ملنا بہت اچھا لگا۔ مجھے رائیں کا کردار بہت پسند آیا۔ شازیہ جمال نیر کا ”سرخ جوڑا“ اور مسرت ناز کا مکمل ناول ”وہ کون تھی“ بہت ہی سوسو تحریریں تھیں، اپنا کوئی اثر نہ چھوڑ سکیں۔ ”دستک“ میں فنکاروں سے چھوٹی سی ملاقات اور مدیر رضوی کی حسن نعمان کی بندھن میں دلچسپ ملاقات بہت پسند آئی۔

امتل جی! جب سے آپ نے ”تاریخ کے جھروکے“ میں ”رو کے لانا“ عرف ”حورم سلطان“ کے بارے میں لکھا ہے۔ یہ ایک واحد ڈرامہ تھا جو کہ میں

سال کے بعد ہماری مقفی اور نکاح ہوا تو میں بالکل بھی ڈری ہوئی نہیں تھی کیونکہ جو بندہ سات سالوں میں نہیں بدلا وہ شادی کے بعد کیوں بدلے گا تو مجھے اب ان کی شوہر سے ڈر نہیں لگتا۔
”شادی کی رسمیں کیسی تھیں اور منہ دکھائی میں کیا ملتا تھا؟“

”چونکہ پہلے نکاح ہو چکا تھا، اس لیے میں نے خود بھی ان کی رسموں میں شرکت کی اور ہم دونوں نے انجوائے کیا اور حالانکہ مجھے پتا تھا کہ شادی کی رسمیں ہیں اور اب مجھے رخصت ہو کر دوسرے گھر جانا ہے، مگر اس کے باوجود مجھے رخصتی کے وقت بہت رونا آیا تھا۔ اور منہ دکھائی میں انہوں نے مجھے بھیس لٹ دیا تھا اور ہنسی مون، ہم نے ملایشتیا میں منایا تھا۔“

”شادی کی شاپنگ فائق کے ساتھ کی تھی یا سسرال میں ساس نندوں کے ساتھ؟“

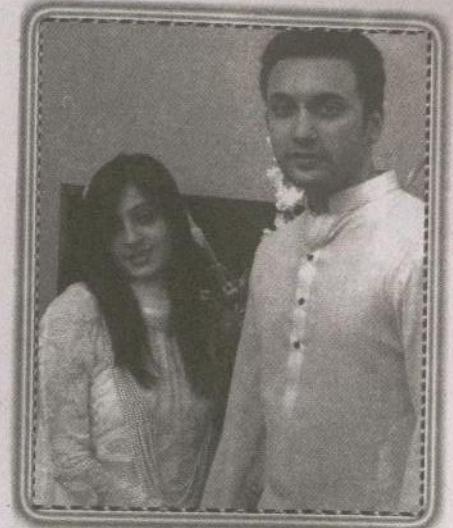
”جی فائق کے ساتھ شادی کی شاپنگ کی تھی اور بہت اچھا لگا تھا ان کے ساتھ شاپنگ کر کے۔ کچھ شاپنگ سسرال والوں کے ساتھ بھی کی تھی۔“

”ماڈرن ہیں یا مشرقی؟“
”میں نے تو جی طبیعت بھی مشرقی ہی پائی ہے۔ ماڈرن ڈریسز مجھے پسند نہیں، ساوگی پسند ہوں، فیشن کرتی ہوں، مگر لکھٹ میں رہ رہ۔“

”اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں؟“
”جی۔ ہماری فیملی بھی خاصی مختصر ہے۔ والد صاحب لاڑ ہیں جبکہ میری اہلی ہاؤس وانف ہیں۔ مجھ سے ایک بڑے بھائی اور مجھ سے چھوٹی ایک بہن ہے۔“

”اور کچھ کتنا چاہیں گی؟“
”نہیں جی، شکر ہے۔ آپ نے سب کچھ تو پوچھ لیا ہے۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اس جوڑے سے اجازت چاہی۔



”سسرال کیسا لگا؟“

”سسرال ماشاء اللہ بہت ہی اچھا ہے۔ سب ہی لوگ بہت محبت کرتے ہیں۔ چھوٹی سی تو فیملی ہے، یہ اکلوتے بیٹے ہیں اور ان کی دو بہنیں ہیں اور اگرچہ سب ہی بہت اچھے ہیں، مگر میری ساس تو بہت ہی اچھی ہیں۔ ان کی تعریف کے لیے تو میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں۔“

”غصے کے تیز ہیں؟ اور عاشق مزاج کتنے ہیں؟“

”بہتے ہوئے۔“ ”عاشق مزاج۔ یہ غلط جملہ ہے، ہاں یہ رومینٹک مزاج ہیں صرف بیوی کے لیے یا پھر ڈراموں میں کیونکہ وہ ان کا پروڈیویشن ہے۔ ہاں غصے کے تیز ہیں اور چھوٹی چھوٹی بات پر انہیں غصہ آ جاتا ہے اور میں تو ایسی ہوں کہ یہ اگر پیار سے بات بھی کر لیں تو میں خوش ہو جاتی ہوں اور غصے میں ہوں یا موڈ خراب ہو تو فوراً ٹھیک بھی ہو جاتی ہوں۔“

”شوہر سے ڈر لگتا ہے؟“

”جب ان سے دوستی ہوئی تھی اور تھوڑی بہت اندر اسٹینڈنگ بھی تھ تو ڈر لگتا تھا کہ کچھ گڑبڑ نہ ہو۔ ان کی فیملی ہی ایسی ہے، مگر جب تقریباً سات

لیکن یہ مماثلت اتفاقیہ ہے۔ سائرہ کا اپنا اسٹائل اپنا انداز ہے اور بات وہی ہے کہ انداز بیان بات بدل دیتا ہے ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں۔

فریدہ فرید نے پاک پتین شریف سے لکھا ہے

خوب صورت ٹائٹل کو نگاہ بھر کے دیکھتے پھولوں کے بہترین استعمال کو داد دیتے جب داخل رسالہ ہوئے تو ”پہلی شعل“ میں میڈیا کو ضابطہ اخلاق کی تنبیہ سے خود کو صد فیصد متفق پایا۔ ”اس ماہ کی مسکراہٹ“ میں سلیپنگ سوٹ پونیک اور مزے کا تھا۔ ”پانوں سے خوشبو آئے“ میں ”اہل بیت کا اخلاق“ دل و روح کو مرگائے بلاشبہ اہل بیت عظام سرایا خوشبو ہیں۔

”کھلتا کسی پھول“ بالکل انتخاب شاعری ”موسم کے پکوان“ میں گول گپے نہ صرف پڑھے بلکہ بنانے کی ناکام کوشش بھی کی۔

”تاریخ کے جھروکے میں“ حورم سلطان کے اصل کردار سے واقفیت ہوئی۔ ہم خواجہ ان کے حسن و ذہانت کے قائل ہوئے جارہے تھے۔ ”خط آپ کے“ میں خط تو ہماری رائے کے عکاس ہوتے ہی ہیں مگر شیریں لب و لہجے میں بدل جواب ارسال کرنے والی ہستی کو میرا سلام۔

سلطے دار ناولز ”میں ایک بھی مثال“ معذرت کے ساتھ ابتدائی اقساط کے بعد ادھر اور اچھوڑ چکی ہوں۔

رخسانہ جی میری فیورٹ رائٹرز میں مگر تکلیف دہ اسٹوری پڑھنے کے بعد ذہن و دل دیر تک بو جھل رہتے ہیں۔ ”رقص بکسل“ پڑھ تو رہے ہیں مگر یوں سمجھیے بس پڑھ ہی رہے ہیں۔ اس سال شعل کے سلسلے وار ناولز زیادہ متاثر کن نہیں رہے۔ یہ میری ناچیز رائے ہے۔ مکمل ناول میں ”تعبیر“ مریم عزیز کے مخصوص انداز کی عکاسی کرتا ناول تھا۔ ”وہ کون تھی“ اسلوب پرکشش نہیں تھا۔ اسٹوری مرکز راہٹ کے تھی۔ ”بت شکن اور انمولی“ دو لفظی تبصرہ ویل ڈن۔

افسانوں میں ”سرخ جوڑا“ غیر متوقع اینڈ تھا ”عموما“ اس عنوان اور ٹائپ کا ایسا اینڈ پہلے کبھی نہیں ہوا بہر حال سب اچھا ہے اور پھر بیان اپنا صبا حرا ٹائپ پونیک تھا تو انداز تحریر بھی شعل کے مروجہ انداز سے الگ تھا ”زرا سا جاسوسی کا اسلوب نمایاں تھا مگر بلاشبہ تحریر انٹرٹیننگ تھی۔

بہت شکر یہ فریدہ بہت خوبصورت، تفصیلی خط لکھا آپ نے۔ آپ کی تعریف و تحقید مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کر سکیں گی۔

کائنات عابد دوسرے فیصل آباد سے شریک محفل ہیں۔ لکھا ہے۔

”ٹائٹل اچھا لگا اور اس بار شعل اچھا بھی بہت اچھا ”بت شکن“ بہت اچھا ناول ہے۔ رائٹن کو مہر ز کے ساتھ دیکھ کر دل خوشی محسوس ہوئی ”ایک بھی مثال“ میں مثال تو پس کر رہ گئی ہے چاری کتے خود غرض نکلے دونوں ماں باپ۔ ”نبیلہ عزیز اپنے ناول کی اسپید ٹھوڑی پڑھا دیں۔“ ”تعبیر“ کا اینڈ بہت اچھا ہوا۔ افسانوں میں سوداگری ٹائپ پر تھا۔ ثانیہ کے بارے میں مزہ کر بہت دکھ ہوا۔ ٹکٹ سیما کا ناول زبردست تھا۔ لیکن اینڈ اچھا نہیں ہوا اس کا۔

کائنات اللہ تعالیٰ آپ کو ایف ایس سی کے پیپر میں کامیابی عطا فرمائے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں شعل کی پسندیدگی کے لیے شکر یہ۔

سعدیہ ملک اسلام آباد سے لکھتی ہیں

مئی کے شمارے میں سب سے پہلے تو ”بت شکن“ پڑھا۔ مہر ز اور رائٹن کے دوبارہ ملنے پر انتہائی خوشی ہوئی۔ اس وقت کا انتظار میں نے دوسری ”تعبیر“ قسط پڑھنے کے بعد ہی سے شروع کر دیا تھا۔ امایہ خان نے اسے بہت خوبی سے لکھا ہے۔ انداز تحریر وہاں قابل ستائش ہے۔ ”رقص بکسل“ بہت سلو جا رہا ہے کوئی قابل ذکر واقعہ ہوئے بغیر ختم ہو جاتی ہے۔ ”ایک بھی مثال“ بھی بہت سلو جا رہا ہے۔ ”تعبیر“ ایک نیپیکل کہانی تھی۔ انداز تحریر بھی کچھ خاص نہ تھا۔ ”وہ کون تھی“ میں ساری کہانی پہلے ہی سمجھ میں آگئی تھی۔ پڑھ کر یوں لگا جیسے وقت ضائع کیا ہے۔ ”انمولی“ کا اینڈ اچھا تھا۔ پڑھ کر لاکھ لاکھ شکر کیا کہ اس میں مین کرکٹر اور چند سائنڈ کرکٹر خوب صورتی کی انتہا پر نہیں پہنچے ہوئے تھے۔

افسانوں میں سائرہ رضوانے قمر کے لوگوں کی حالت اور آخر میں سوچ کو بہت اچھی تحریر کیا۔ ”سرخ جوڑا“ کا آخر پراثر تھا۔ ”سوداگری“ افسانہ کالی اچھا لگا۔

شعل کی مجھے یہ بات بہت ناپسند ہے اور میں اس بات سے بہت Irritate ہوتی ہوں کہ۔ اس میں ہیرو صاحب و جیہہ و ٹھیل ہوتے ہیں۔ ہیرو کن بھی حسن کے اعلا مرتبہ پر فائز ہوتی ہے اور اس کے پیچھے کئی کئی لوگ باگل ہو رہے ہوتے ہیں۔ حوالہ ”تعبیر“ رقص بکسل وہ ”کون تھی“ وغیرہ مصنفین کو چاہیے کہ وہ عوامی انداز اختیار کریں اور ہر کرکٹر کو حور اور غلمان نہ بنادیں۔ کچھ ایسا لکھیں جو حقیقت کے قریب لگے۔

پیاری سعدیہ! ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بہت اچھے نمبروں سے کامیاب کرے۔ آئین ماورائی حسن کے حامل ہیرو یا ہیروئن ہمیں بھی پسند نہیں اور ہم اس کا خیال بھی رکھتے ہیں لیکن بھی کمالی کا تقاضا ہوتا ہے بہر حال آئندہ مزید خیال رکھیں گے۔ آپ کی تعریف و تحقید ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچانی جاری ہے۔

حلیہ زمان، ندایا پرورد اور دہاویوں نے شرکت کی ہے لکھتی ہیں۔

اس دفعہ بھی ٹائٹل بے حد اچھا تھا ”رقص بکسل“ بہت اچھا ہے لیکن پیلر اس کی رفتار تیز کریں۔ مریم عزیز کی ہر تحریر دلوں کو چھو جاتی ہے۔ امایہ خان بلاشبہ رائٹرز میں یقیناً ”اچھا اضافہ“ ہے ”بت شکن“ پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے، دعا ہے آپ کے قلم کا زور اسی طرح جاری رہے ”افسانے تمام اپنی مثال آپ تھے۔“ ”ایک بھی مثال“ کی اسپید بہت کم ہے۔

حلیہ زمان! شعل کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکر یہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کر سکیں گی۔

سوگو کو نڈل نے جہلم سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں میں نے اسی سال ہی کام مکمل کیا ہے۔ آج مجھے شعل کو پڑھتے ہوئے تقریباً ”نو“ دس سال ہو گئے ہیں۔ میرے گھر والوں ”اساتذہ کے علاوہ شعل کا میری تربیت میں بڑا ہاتھ ہے۔

مجھے ٹائٹل وہ اچھا لگتا ہے جو سادہ سا ہو مائل نہ ہو بلکہ ایک ایک اپ کیا ہو۔ شعل کی تمام رائٹرز بہت ہی اچھا لکھتی ہیں۔ بہتی مسکرائیں رہیں۔

پیاری سونو! نو دس سال سے شعل پڑھ رہی ہیں اور کبھی خط نہیں لکھا آتے عرصہ بعد خط لکھا تو بھی اساتذہ۔ آئندہ تفصیلی بھرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

آمنہ اجالاڈ ہر کی سے شریک محفل ہیں۔

ٹائٹل اس بار بہت دلکش تھا۔ آپ نے پچھلی بار کی شکایت دور کر دی۔ سب سے پہلے مریم عزیز کا مکمل ناول ”تعبیر“ پڑھا۔ گو کہ ناول اچھا تھا اینڈ بھی صحیح تھا۔ لیکن پھر بھی مریم عزیز بیشہ کی طرح اس بار کچھ خاص رنگ نہیں جما سکیں۔ سائرہ رضا کا ”ارمی“ اچھا ہے مگر ”پڑھ کر دل سندھ دھرتی ہے“ آباد قراویوں کے دکھوں پر ڈوب ڈوب کر ابھرا اور ارجن (پاس پاس) کا کڑے انسانوں، روز بروز دم توڑتے مردوں کے دل فگار توحوں پر مجھے بے اختیار سندھی شاعر سائل پیرزادہ کی نظم یاد آئی۔

اور اب واقعی ٹھہریں مردوں کا رقص نہیں ہے۔ بس ہر سو دور دور تک سفاک موت کا رقص ہے۔ ہاں سائرہ آپ سے کہتا ہے کہ ان کے افسانے میں کہیں کہیں سندھ کی پیاری مٹھی زبان کے خوبصورت الفاظ بہت اچھے لگے۔

ٹکٹ سیما کا ناول ”انمولی“ اس ماہ کی سب سے پیسٹ تحریر تھی۔ مسرت ناز کا مکمل ناول ”وہ کون تھی“ مسرت ناز۔ نیانام نیا کام ناول اگر اچھا نہیں تھا تو برا بھی نہیں تھا۔ میرے خیال میں نئی لکھاری ہونے کے ناستے ایک اچھی کوشش تھی۔ ہمارے موسٹ فیورٹ سلسلے وار ناول ”رقص بکسل“ کی یہ قسط بس گزرا ہے لائق تھی۔ مزہ نہیں آیا پڑھ کر اشعار کے دو صفحات دیکھ کر جہاں دل خوش ہو گیا۔ وہاں اپنا شعر نہ دیکھ کر یہ سلسلہ سونا سونا لگا۔

پیاری آمنہ! ہر ایک کی طرح اس بار بھی آپ کا بہت اچھا تبصرہ۔ آپ کی رائے متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ نبیلہ عزیز کچھ مسائل کی بنا پر ناول پر پوری توجہ نہیں دے پا رہی ہیں۔ صفحات بھی کم ہیں اس لیے آپ کو کی محسوس ہوئی۔ آپ دعا کریں آپ کی پسندیدہ مصنفہ مطمئن اور پرسکون ہو کر پوری بیسویں سے لکھیں۔

عائشہ نواز نے نیالاہور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ہم دو بہنیں ”تین بھائی“ ہیں۔ ابو بہت اچھے کسان اور اہی گھریلو خاتون ہیں۔ میں سب سے بڑی ہوں۔ میں انھیں کلاس میں تھی جب پچھو اسکول چلی گئیں تو میں

نے چوری چوری شجاع پر حاکمیت مزا کیا۔ اس دن سے شجاع سے دوستی ہو گئی۔ ہمارے گھر والے تو بڑھنے نہیں دیتے کہتے ہیں ہم بگڑ جاؤ گی لیکن میں کہتی ہوں کہ شجاع نے میری لائق سنوار دی اور میں سدھ گئی۔ ”رقص بسل“ بہت زیادہ پسند ہے، ناول کا رول اچھا لگا اور شکر ہے کہ وہ جاب کے لیے مان گئی۔ ”ایک بھی مثال“ عدیل نے اچھا کیا مٹا دی گئی۔ مثال عدیل کے پاس رہے تو بہتر ہے یہ دو ناول مجھے بے حد پسند ہیں۔ ”تعبیر“ بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے اس کے ساتھ کسی نے بھی اچھا براؤ نہیں کیا۔ شاہدہ بیگم کے تو نام ہی سے نفرت ہے۔

بیاری عاشق بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے ہمیں خط لکھا آپ اپنی بڑھائی پر پوری توجہ دے کر گھر کے کام میں اسی کا ہاتھ بٹائیں پھر شجاع پڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ جہاں تک بگڑنے کی بات ہے تو ہماری قارئین تو یہی کہتی ہیں کہ شجاع اور خواتین نے ان کو زندہ رہنے کا سلیقہ سکھایا۔ ان کی شخصیت سنوار دی۔

حنا سلیم اعوان، کنزئی شاہین اعوان، گاؤں خون بانڈی تحصیل و ضلع ہری پور ہزارہ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے۔

گاؤں کا حال کیا لکھوں۔ بس اتنا ہی کہ گندم کے خوشوں اور دھرتی کے درمیان جدائی کا لمحہ بس آیا ہی جاتا ہے۔ شاید اسی غم میں مبتلا ہو کر وہ ابھی سے زور پڑنے لگی ہے۔ باغوں میں ہر سو پرندوں کی چکار مٹکات کی مخصوص مک ہر چٹھندی پر چکرانی پھرتی ہے۔ ہمارے گاؤں کا حسن اور رونق ان دنوں اپنے عروج پر ہے۔ لوگات ختم ہونے کے بعد شاید رونق بھی نہ رہے گی۔

ٹائٹل پسند آیا۔

”جادوئل زندگی“ پڑھ کر یوں لگا جیسے میں بھی محمود ریاض صاحب سے مل چکی ہوں۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین۔ ”ایک بھی مثال“ بہت ترس آتا ہے مثال پر حاصصہ کی مشکلات کو بھی تھوڑا کم ہونا چاہیے۔ بہت غم اٹھالیے اس نے ”رقص بسل“ ناول کا کردار شروع میں جتنا پسندیدہ تھا۔ اب نہیں اور عزت بی بی کب اپنی ”عزت“ کا خیال کریں گی۔ کچھ سدھار اور بھی ہونا چاہیے۔ ”بیت شکن“ آغاز ہی سے من پسند ٹھہرا۔ راین کی زندگی میں یہ

نئی تبدیلی اچھی لگی۔ ”تعبیر“ کی شادی ضرار سے ہوئی یہ تو پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ ”وہ کون تھی“ مسرت ناز نے بھی کافی اچھا لکھا۔ نگہت سیما غلام دیکھ کر خوشی میں اضافہ ہوا۔ حاجرہ منیر نے اتنی بڑی غلطی تو نہ کی تھی کہ اسے ایسی سزا ملتی۔ افسانے سب ہی زبردست تھے۔ چھوٹی کمالی میں بڑی بات کہنا یہ تو واقعی کمال ہے۔ ”ارے اوچھبھگوری“ لاجواب تھا۔

حنار اور کنزئی! اللہ تعالیٰ ہمارے محنت کش کسانوں کو سلامت رکھے وہ پورے ملک کو اناج، گندم، چاول، پھل سبزیاں میا کرتے ہیں۔ لیکن انہیں ان کی محنت کا پورا اصلہ نہیں ملتا ان کے حالات میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ صدیوں سے پس ماندگی کا شکار وہ آج بھی زندگی کی بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہیں۔

شجاع کی پسندیدگی کے لیے دل سے شکریہ۔

تنزیلہ غفور نے کوٹ راولا کشن سے لکھا ہے ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ اسپیشلی ”سرخ گلاب کے پھول“ نیبلہ عزیز کا ناول ”رقص بسل“ بہت شان دار جا رہا ہے۔ پلین اس ناول کے صفحات بڑھادیں۔ میں پہلے جب بھی گول گپے بناتی تھی وہ کم پھولتے تھے مگر اس دفعہ ترکیب کامیاب رہی۔

تنزیلہ! مبارک باد کہ آپ گول گپے بنانے میں کامیاب ہو گئیں۔ اب گھر والوں کو بنا کر کھائیں اور داد وصول کریں۔ نیبلہ عزیز کے ناول کے صفحات واقعی بہت کم ہوتے ہیں۔ ہم نے نیبلہ عزیز سے کہا ہے کہ وہ ناول کے صفحات بڑھادیں۔ ٹائٹل کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کراچی سے مسرت الطاف احمد نے شرکت کی ہے لکھتی ہیں۔

اس بار شجاع میں ناول ”افسانے بس ناول ہی رہے“ ”ایک بھی مثال“ میں اس بار کچھ نیا پڑھنے کو ملا۔ ”رقص بسل“ نیبلہ عزیز کا طرز تحریر بہت اثر انگیز ہے جو روانی اور چٹکی ان کی تحریر میں ہے وہ لاجواب ہے قارہ اس ناول میں میرا موصوفی ثورٹ کردار ہے جب کہ ولید اور عزت کی نوک جھونک بہت مزا دیتی ہے۔ ساورا کے کردار میں ذرا بھی انزیشن ٹیل نہیں ہوئی۔ ”بیت شکن“ کی یہ قسط پڑھی تو بہت خوش کواریت کا احساس ہوا

پلین لاماہ جی مرہزی کی زندگی کی روشنی کو بجھنے نہ دیں ”تعبیر“ یہ ناول حقیقت سے بہت ہی دور محسوس ہوا۔ اچھا خاصا جھول محسوس ہوا، مبالغہ آرائی کی حد ہی گزری۔ لیکن ایڈیٹر بھی پسند آیا اور ضرار کا کردار سب سے زیادہ قابل تعریف تھا۔ ”انسوئی“ حاجرہ کا خود غرض اور بے حس رویہ بہت ہی شاندار کر گیا۔ ”وہ کون تھی“ روایتی موضوع لیکن دلچسپ انداز تحریر۔ حور عین کا کردار اول کو بھا گیا۔ افسانوں میں ”اری اوچھبھگوری“ قابل تعریف تھا۔

بیاری مسرت ایہ جان کر افسوس ہوا کہ آپ کو ہمارے جواب سے دھکا لگا۔ دراصل آپ اپنے اچھے خط لکھتی ہیں کہ ہم نے سوچا ”آپ کا تعارف“ بھی بہت اچھا ہونا چاہیے۔ اس لیے آپ کو دوبارہ لکھنے کو کہا، ورنہ وہ تعارف بھی شائع ہو سکتا تھا۔ تفصیلی تبصرے کے لیے دل سے شکریہ۔

زندگی احمد نے ڈیرہ غازی خان سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں۔

ٹائٹل ہمار کی نسبت سے کافی دلکش لگ رہا تھا۔ پہلی شجاع میں آپ کی دل فریب باتیں پڑھیں۔ حمد و نعت حسب معمول دل کو چھو لینے والی تھیں۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں تو ہوتی ہی پڑا کرتی ہیں۔ آپ جو فوائد و مسائل ساتھ ساتھ بتاتے ہیں اس سے مجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً ”آپ کو اس کا اجر دے گا۔“ (ان شاء اللہ) کو لیے اپنا ایک خبر نظر سے گزری۔ جس کے مطابق ایک لڑکی نے شادی سے انکار پر لڑکے پر تعیزاب پھینک دیا۔ ایسا یہ جو کہتے ہیں نا کہ آج کی لڑکی اپنا حق لینا جانتی ہے تو ایسا صرف شہروں میں وہ بھی مخصوص طبقے میں ہوتا ہے۔ گاؤں قصبوں کا نظام شر سے ٹوٹتی ڈ فرخت ہوتا ہے۔ افسوس صد افسوس آج بھی عورت کا حق پامال کیا جاتا ہے۔ انہیں رسوا کیا جاتا ہے۔ انہیں بھیڑ بکری سمجھا جاتا ہے۔ میرا حیدر بہت مسرت اچھی رائیڈ ہیں۔ آگے جا کر یہ بہت نام و مقام کمائیں گی۔ لاماہ خان اچھا لکھ رہی ہیں۔ لاماہ خان نام بہت اچھا ہے۔ صاحت یا عین اچھے افسانے لکھتی ہیں۔ راشدہ رفعت میری فیورٹ رائیڈ کی فہرست میں شروع سے شامل رہی ہیں۔ باقی مستقل سلسلے سب اپنی جگہ فٹ ہیں۔ خاص طور پر ”تاریخ کے جھوکے“ بہت اچھا ہے۔

زندگی! سب سے پہلے تو معذرت کہ آپ کے پچھلے خط

شامل نہ ہو سکے۔ تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ افسانوں کے لیے معذرت، فی الحال صرف مطالعہ پر توجہ دیں۔

بھوں سے تمہیں روئے نے لکھا ہے۔

”رقص بسل“ کا مطلب پہلے ہمیں بتائیے۔ (حیران ہوئے نا آپ سب میری کم علمی سے بہ کلمات دراصل یہ ہے کہ اپنے خاندان کی میں وہ واحد تنہم و چراغ ہوں۔ جس نے شجاع اور خواتین کو پڑھنے کی ہمت کی ہے۔ میرے علاوہ باقی کوئی بھی نہیں پڑھتا۔ کسی سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی، سو غیر مطلب کے بہت انہیاں سے پڑھتی ہوں اس ناول کو ولید رحمن کا کردار قابل تعریف ہے۔ نمو جی لکائی عرصہ ہو گیا ہے شبلی اور جوادی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ملاقات کا کوئی راستہ ڈھونڈ لیا۔ فائزہ جی آپ کن بھول دھلیوں میں گھوٹی ہیں؟ جنہیں سسز نظر نہیں آ رہیں۔ لبنی جدون بھی بھی بھی لکھتی ہیں۔ لبنی جی کیوں۔

بیاری تمہیں! آپ خواہ مخواہ اتنا عرصہ خط لکھنے کے لیے سوچتی رہیں۔ بہت اچھا خط لکھا ہے آپ نے دیے بھی الفاظ کی خوب صورتی لاکھ متاثر کن سہی، جذبات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ آپ اپنے جذبات خواہ کتنے ہی ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ہم تک پہنچائیں۔ دل سے نکلی بات دل تک پہنچ جاتی ہے۔

کسی لفظ کے معنی نہ آنا کم علمی نہیں۔ سب کچھ جاننے کا دعوا تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ ”بسل“ کے معنی گھاسل یا تڑپنے والے کے ہیں یہ عاشق کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ”رقص“ کے معنی تو آپ جانتی ہی ہوں گی۔ آپ کی تحریر ابھی پڑھی نہیں گئی بھی کتاب منگوانے کے لیے آپ اس نمبر پر فون کر لیں۔ آپ کو کتاب کی قیمت اور منگوانے کا طریقہ بتا دیں گے نمبر یہ ہے 021-32735021

رضوانہ گلگیر رائے نے لودھراں سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں۔

ماڈل گرل مسکراتی ہوئی گلابوں سے لدی اچھی

گلی۔ سب سے پہلے ”پیارے نبی کی پیاری باتیں“ پڑھ کر قلب و جاں کو منور کیا۔ بندھن میں مدیجہ اور نعمان حسن ایچھے لگے۔ دستک میں وہی انٹرویو جو ہم بار بار پڑھ چکے ہیں ”ایک تھی مثال“ پڑھ کر دل کا ایک کونا جھلک گیا۔ ”اری اوچھ گھری“ میں سارے رضا کے قلم کی جولانی عروج پر نظر آئیں۔ ”سرخ جوڑا“ شازبے نے ایک کھلی حقیقت کو عموماً سے لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ وقت کے ساتھ آپ کے قلم میں مزید نکھار آیا ہے۔ ”وہ کون تھی“ مسرت ناز نے بار بار لکھا ہوا ٹاپک ریپیٹ کیا۔ ”محبت کا ستارہ“ معیاری تحریر تھی۔ مریم عزیز کی ”تعبیر“ میں وہی اسلوب خوب صورت لفظوں کا چٹاؤ خوب صورت طرز تحریر جو ان کی تحریر کو منفرد بناتے ہیں۔ ”رقص نکل“ ست روی کا شکار ہے۔ بات ہو جائے امیہ خان کے ”بت شکن“ کی معذرت کے ساتھ امیہ جی آپ کے ناول میں کوئی خاص موڈ نہیں۔ ”خط آپ کے“ یہ سلسلہ مجھے بے حد پسند ہے جس میں تمام باتیں اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں۔ سونیارانی کو شادی کی مبارک باد اللہ آپ کو نوال افضل گھمن کو بیٹھ کی مبارک باد۔

پیاری رضوانہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا بھجوا ہوا شعر کسی اور نام سے شائع ہو گیا۔ اس سہو کے لیے معذرت تقید اور تعریف کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

حنا صدف اور مقدس لکھنؤ وال کلال صلیح گجرات سے لکھتی ہیں

ٹائٹل گرل کا آئی میک اپ بہت اچھا لگا۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں میں خواب کی تعبیر پڑھ کر اچھا لگا مدیجہ رضوی اور حسن نعمان کا بندھن پڑھ کے بہت اچھا لگا۔ ”ایک تھی مثال“ مثال پر ترس آ رہا ہے۔ سارے رضا کی ”اری اوچھ گھری“ خود کو جب صمیر کے کہنے میں کھڑا کیا تو روح کا پتہ اٹھی۔ ہم لوگ پانی کی ٹوٹی کھول کر بند کرنا بھول جاتے ہیں اور کوئی اس کی ایک بوند کے لیے ترس رہا ہے گرمیوں میں لوڈ شیڈنگ کی بدولت اگر ٹھنڈا پانی نہ ملے تو برا حال ہوتا ہے اور تھر واسیوں کو ٹھنڈا گرم نہیں بلکہ پانی کی بوند خوشی کا سماں پیدا کرتی ہے۔ مریم عزیز ”تعبیر“ بھی تحریر تھی۔ زید جیسے

لوگوں کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ”رقص نکل“ ماور مرتضیٰ کے کراچی جانے کا انتظار ہے پچھلے ماہ کے شعاع میں کسی بہن نے لکھا تھا کہ تیمور جو کہ ناول کا ہیرو ہے اس کی پرستاشی زبردست تھی مگر اب نین امیر کی طرح بی ہو کر رہا ہے تو میں کتنا چاہوں گی کہ محبت انسان کو بے بس کر دیتی ہے وہ لطف و نقصان نہیں دیتی۔ نبیلہ عزیز صاحبہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ بس کمائی کے صفحات بڑھا دیں مسرت ناز ”وہ کون تھی“ اچھا تھا۔ ہمارے جلال پور خاں شہر میں ہائی اسٹینڈرڈ کا اسکول دارا رقم ہے جس میں سرسری کلاس کے بچے کی ماہانہ فیس پینچیس سو روپے ہے۔ والدین وہاں پر ماہانہ پینچیس سو روپے دے دیتے ہیں مگر ان ہی لوگوں کو اگر دس روپے کسی فقیر کو دینے ہوں تو ان لوگوں کو پریشانی ہوتی ہے۔ ہمارا احساس ختم ہو چکا ہے یہ اگر ایک دفعہ سوچ لیں کہ تھریٹن انجان کے دانے پانی کے قطرے کی کمی کے باعث ماؤں کی گودا بڑ رہی ہے اگر پینچیس سو روپے سے چند سو مہمان کو روے دیں تو شاید کسی ایک ماں کی گود بچ سکے۔

حناء اور مقدس! آپ کی بات درست ہے لیکن آپ کو یہ اندازہ نہیں ہے سب تو نہیں لیکن بیشتر والدین اپنی اولاد کی تعلیم کے لیے یہ فیسیں کس طرح مہیا کرتے ہیں۔ یہاں یہ سچ ہے کہ بہت سارے لوگ اس قابل ہیں کہ وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں مگر بات صرف احساس کی ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی تعریف و تقید ان کے سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ ”محبت بے بس کر دیتی ہے۔“ آپ کی اس سوچ سے ہم متفق نہیں ”انسان کو اپنے وقار کا خیال رکھنا چاہیے۔ محبت ہو یا نفرت کسی بھی جذبے میں حد سے گزرتا انسان کو انسانیت کے درجے سے کرا دیتا ہے۔

سلی پوس مروان طور سے لکھتی ہیں

سب سے پہلے تو ٹائٹل کی طرف جو انتہائی پروقار اور نفیس سی ماڈل سے جگمگا رہا تھا۔ دل خوش کر دیا۔ استوری آف دی ٹاپ ”رقص نکل“ لیکن بہت مختصر اور ست روی کا شکار ہے۔ کمال بیور حیدر جیسا شان دار آدمی کہ بندہ خواہنا امپریس ہو جائے لیکن جب بات محبت کی آئی تو بقول ولید اپنے مقام سے بہت نیچے کی طرف آتا رہتا ہے۔ نبی رائز امیہ خان بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

گلشنی نہیں کہ یہ نبی رائز ہیں۔ مریم عزیز کا مکمل ناول ”تعبیر بہت اچھا ہے لیکن آج کے دور میں اتنا صبر اور اپنی خواہشوں اور خوابوں کو دوسروں کے لیے قربان کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔“ تاریخ کے جمو کوں سے ہمیشہ سے میرا فورٹ رہا ہے۔ دوسرے سلسلے بھی ٹھیک سی تھے۔ پیاری سلی اشاع کی محفل میں خوش آمدید۔ دوسروں کے لیے نہیں اپنیوں کے لیے اپنیوں کی خوشیوں کے لیے تعبیر یہ ہے سب کچھ کہہ بے شک شاہدہ بیگم جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں دنیا میں لیکن اگر سب ان جیسے ہو جائیں اور دنیا سے ایثار قربانی اور محبت کے جذبوں کا وجود ختم ہو جائے تو تصور کریں یہ دنیا تب کیسی ہوگی محبت ہو یا نفرت انسان کو اپنے مقام اور اپنا وقار بہر صورت قائم رکھنا چاہیے۔

اقصیٰ بتول نے نیالا ہور سے لکھا ہے۔

سرخ نگاہوں کی ہمارے ٹائٹل کو خوب سجایا۔ صحیح کہتی ہیں آپ کوئی بھی کام ہی انجام بخیر کو پہنچتا ہے جب سچائی کو لفظ خاطر رکھا جائے مگر سچائی تو کیا۔ یہاں انسانیت کوئی سچ کہا جا رہا ہے آج جب انفرادی طور پر اخلاقیات ختم ہو چکی ہیں تو بڑی سچ پر ہم کیسے امید کرتے ہیں؟ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتوں کا تو کوئی مول ہی نہیں۔ ”ایک تھی مثال“ ترخانہ جی کا قلم بہت مشقانی سے مثال کی نفسیات کو ٹوٹے بکھرتے دکھا رہا ہے۔ سارے رضا لفظ نہیں لکھتیں ”گوئی محرم سچا ہو چک دی ہیں۔ سارے جی اتنا خوب صورت حساس درد بھرا اور رب تعالیٰ کی عظمت بیان کرتا افسانہ لکھنے پر بہت بہت مبارک باد اسے پڑھ کر رواں رواں اپنے رب کا شکر گزار ہو گیا۔ اللہ آپ کو بڑے خیر دے۔“ تعبیر کا انڈسٹری اچھا لگا۔ ”رقص نکل“ اب تک یہ پہلی قطع ہے جو کچھ اچھی لگی۔ ماور کا کردار اتنا خاص نہیں جتنا کہ کھانی کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایسے شو آف کرتے کر کبھی بھی بھی اچھے نہیں لگے مجھے۔ بندے کے اندر موت، خلوص، عاجزی ہوتی چاہیے۔ ”بت شکن“ کی تو کیا ہی بات ہے۔ اس میں رائیں کا کردار بہت اچھا ہے۔ ”سوداگری“ واقعی سوداگری اور محبت میں بڑا فرق ہے۔ مگر لوگ کم ہی سمجھتے ہیں۔ نکت سیمہ کا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ”سرخ

جوڑا“ بہت ہی اچھا لگا یہ ناول ”وہ کون تھی“ کچھ خاص نہیں لگا۔ حقیقت سے دور تھا لیکن خیر اتنا برا بھی نہیں تھا۔ زہرا تنویر اور حرا قریشی کا تبصرہ پسند آیا۔ تاریخ کے جمو کوں سے زبردست موضوع کے ساتھ بہت پسند آ رہا ہے۔“

پیاری اقصیٰ! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

مہوش کنول مشی نے جنڈا نوالہ بھکر سے لکھا ہے

میں تین کمائیاں بھیج چکی ہوں، لیکن کوئی بھی شائع نہیں ہوئی۔ کیا سب ناقابل اشاعت تھیں۔

قارئین متوجہ ہوں!

- 1 شعاع ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
- 2 افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔
- 3 ایک سطر جمود کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
- 4 کمائی کے شروع میں اپنا نام اور کمائی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
- 5 مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابل اشاعت صورت میں تحریر کی واپسی ممکن نہیں ہوگی۔
- 6 تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کمائی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
- 7 شعاع ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع۔ 37 اردو بازار کراچی۔

مہوش! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی کہانیاں قابل اشاعت نہیں ہیں۔ فی الحال صرف مطالعہ پر توجہ دیں۔
مسز بین اجمل روہڑی ضلع سکھر سے شریک محفل ہیں۔ لکھا ہے۔

سورق پیارا لگا مگر بنا دوپٹے کے ماڈل اچھی نہیں لگی۔ خوابوں سے متعلق احادیث اچھی لگیں۔ ایک بڑی غلطی درست کی۔ میں درود شریف پڑھتی تھی برے خوابوں کے لیے لیکن حدیث کی رو سے ”تعوذ“ پڑھنی چاہیے۔ ”بت شکن“ ایہ خان شان دار لکھ رہی ہیں جملہ مکمل ہے۔ خاص کر یہ دو جملے کہ ”میرے اعمال اتنے کم نہ تو نہ تھے“ اور ”زندہ کرو ان تصویروں کو“ بتوں میں جان ڈالو۔“

سندھ میں رہنے کے باوجود میں قمر کے بایسوں کے لیے رضا کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتی۔ بس حکومت سے کتنا چاہتی ہوں کہ اس وقت سے ڈریں جب کوئی کچھ نہ کر سکے گا۔ اور یہ بے گناہ بچے اللہ کے سامنے اپنی فریاد لے کر جائیں گے تب بھی کیا آپ کے پاس کوئی نیا بہانہ یا وعدہ ہوگا۔
بین! آپ کے خط لیٹ موصول ہونے کی وجہ سے شامل اشاعت نہ ہو سکے ہمیں احساس ہے کہ پرچہ بہت سے شہروں میں دیر سے پہنچا ہے اور ہماری قارئین اس وجہ سے جلدی خط نہیں لکھ سکتیں۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ کہانی کے لیے معذرت۔

سمیعہ سمر قریشی نے ضلع بہاول ننگر سے لکھا ہے
جب میری سسڑ کی شادی ہوئی تو میرا دل نہیں لگتا تھا اور میں روئی ایک دم میری نظر شعاع پر پڑی وہ دن آج کا دن شعاع شعاع میں شعاع کیونکہ شعاع نے رونا بند کر دیا مسکراتا شروع۔ ٹائٹل پر معصوم سی ماڈل اچھی لگی۔
”رقص مکمل“ تو ہے ہی سپر ہٹ اسٹوری۔ ”ایک تھی مثال“ ”پڑھ کر دل خون کے آنسو روپا۔ اتنی ہی بچی اور اتنے امتحان۔ خیر اب دوسری ماں اچھی آئی (قسمت سے) تو دل

ماہنامہ خاتین، واغٹ اور ادارہ خاتین واغٹ کے تحت شائع ہونے والے سب سے پہلے ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کنان میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقس بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعیت پر ڈراما، ٹیلی ویژن، فلم، کتاب اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے بلاشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی کارروائی کر سکتا ہے۔

جوفیس فریش
وہی بیوٹی فل

ابا کالونی پیک میڈ

FACE
FRESH
Beauty Cream



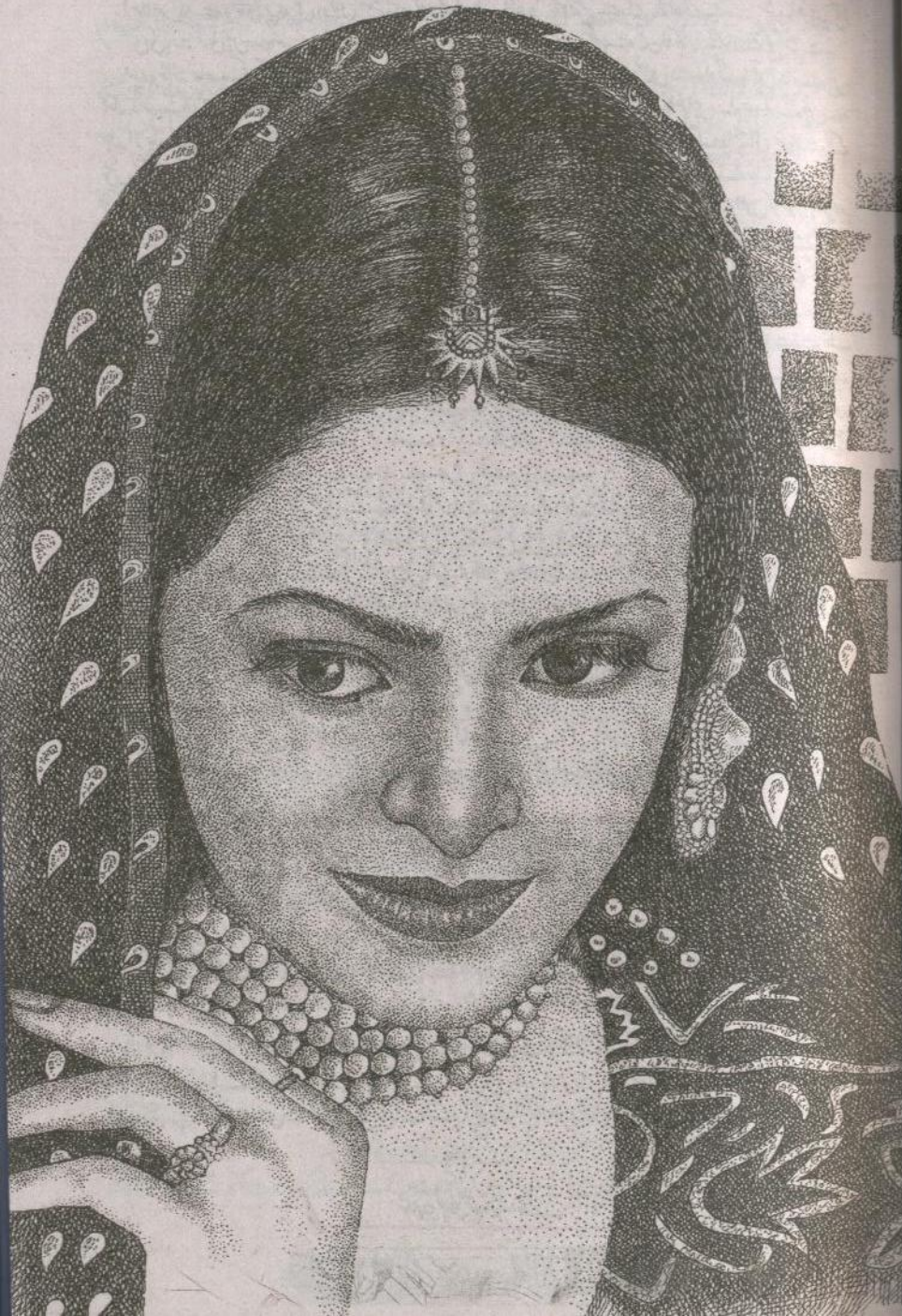
سیکھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصطفیٰ بیٹا بہو سے لگاؤ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سناچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی نند فوزیہ کا بالا خرا یک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دو ماہا نظیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل نظیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹ اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ذکیہ کی وادرات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زہیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آٹس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹ سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زہیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی بددگر رہا ہے۔



اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہد، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشری سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔ حمیدہ خالہ عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زہیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کئے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے لئے بزیمہ کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے۔ سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔ رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سو اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشری کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا لائش ہوجانا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آ جاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زہیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفروز ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم عاصمہ کو ایک مکان دلایا ہے۔ بشری اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔

عدیل مکان کا اوپر والا فرش بشری کے لیے سیٹ کر دیتا ہے اور کچھ دنوں بعد بشری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشری سے جھگڑتا ہے۔ بشری بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طش میں بشری کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چین لینا ہے۔ مثال بیمار ہو جاتی ہے۔ بشری بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پکا کر اٹھاتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کرتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چٹشیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔ اچانک ہی فوزیہ کا نسیم رشتہ طے ہو جاتا ہے۔ انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بھکا مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل مثال کو لے جائے تاکہ وہ بشری کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔ انسپکٹر طارق ذکیہ بیگم سے فوزیہ کا رشتہ مانگتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہو جاتی ہیں مگر بشری کو یہ بات پسند نہیں آتی۔ ایک پراسرار سی عورت عاصمہ کے گھر بطور کرائے دار رہنے لگتی ہے۔ وہ اپنی حرکتوں اور انداز سے جاوونے والی عورت لگتی ہے۔ عاصمہ بہت مشکل سے اسے نکال پاتی ہے۔

بشری کا سابقہ منیجر احسن کمال ایک طویل عرصے بعد امریکا سے لوٹ آتا ہے۔ وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشری سے منگنی توڑ کر نازیہ بیگم سے شادی کر لیتا ہے، پھر شادی کے ناکام ہوجانے پر ایک بیٹے سیٹی کے ساتھ دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آ جاتا ہے اور دوبارہ شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشری تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔

بالآخر وہ احسن کمال سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے اور سادگی سے دو گھنٹے کے اندر نکاح بھی ہو جاتا ہے۔ عاصمہ اس جادوگر عورت کو نکالنے کے بعد اپنا مکان دوبارہ کرائے پر نہیں دیتی بلکہ بڑوس میں رہنے والی سعیدہ کے ساتھ کوچنگ سینٹر کھول لیتی ہے۔ ساتھ ہی اس کے مشورے پر بی بی اے کے پرائیویٹ امتحان دینے کی تیاری شروع کر دیتی ہے۔

”مگر چکی ہوں آپ کے بولنے اور بتانے سے پہلے ہی یہ سب باتیں میں بھائی سے آتے ہی دیکھ لیا تھا کہ کیسے اس گھر میں صرف عفت کا راج ہے آپ کو ایک گوشے میں ڈال دیا گیا ہے۔ میں نے پہلے ہی عدیل بھائی سے بول دیا ہے اور امی آپ پریشان نہیں ہوں اس بار جاؤں گی تو آپ کو الگ سے پیسے بھیجا کروں گی۔ اس سے آپ اپنی پسند کی چیزیں منگو آلیا کریں اور جیب میں پیسہ ہو تو یہ عفت جس نے پیچھے سے کچھ نہیں دیکھا دب کر رہے گی آپ سے۔ میں پھر بات کروں گی بھائی سے۔ آئی ہوں۔ میرے خیال میں عدیل بھائی آگئے۔“ وہ ماں سے جان چڑھا کر وہاں سے بھاگ گئی۔

”آگیا ہے تو اسے پیسے لے آ میرے پاس، دو گھڑی کو تم دونوں بیٹھ جاؤ۔ ترس جاتی ہوں۔ میرے بچے بھی میرے پاس آکر بیٹھیں۔ کچھ ماں کے دکھ درد سنیں۔ کچھ اپنی کہیں اور دیکھو لو وہ میری دوا میں لے کر آیا یا پھر بھول گیا۔ بیوی بچوں کی فرمائشوں کے پھیلے بھر کر لایا ہو گا۔ بوڑھی خبطی ماں کہاں یاد رہتی ہے۔“

نیم پیچھے سے بولتی رہ جاتی ہیں اور فوزیہ عفت کے ساتھ کھڑی ہنس ہنس کر باتیں کیے جاتی۔ دونوں میں خوب گاڑھی چھتی تھی۔ بہت سے تحائف لے کر آئی تھی فوزیہ عفت اور اس کے دونوں بچوں کے لیے۔

مثال کے لیے وہ ایک سوٹ اور گریا لے کر آئی تھی جسے دیتے ہوئے وہ خود بھی کچھ الجھی رہی تھی کہ مثال کا قد تو فوزیہ سے بھی بڑا ہو چکا تھا۔

اور وہ اسے ابھی بھی جھوٹی بچی سمجھ کر گریا اٹھا لائی تھی۔ یوں بھی پچھلے سال عروسہ کی سالگرہ پر اتنی گریاں اکٹھی ہو گئی تھیں کہ فوزیہ نے اس میں آدھی تو یہاں پاکستان میں اپنی دھاک جمانے کو قریبی رشتہ داروں کے بچوں میں تقسیم کر دی تھیں۔ وہ مثال کی عمر کے سال بھولی نہیں تھیں۔

بس یونہی لا روئی سے وہ مثال کے لیے بھی ان ہی گریوں میں سے ایک اٹھا لائی۔

”پچھو اب یہ تو مجھے دے دیں۔“ بارہ سال کی پریش نے وہ گریا فوراً فوزیہ سے جھپٹ لی۔

یوں ہی مثال نے اسے لینے کے لیے ابھی ہاتھ نہیں بڑھائے تھے۔ مثال نے بے تاثر نظروں سے پریش کو گریا لیتے اور خوش ہوتے دیکھا اور خاموشی سے جانے لگی۔

”اے موز خراب کر کے کیوں جاری ہو۔ میں تمہارے لیے یہ سوٹ بھی تولائی ہوں۔ لو۔“ فوزیہ نے پیچھے سے بہت جتنے والے انداز میں آواز دی تھی۔

مثال ان ہی قدموں پر ٹھک گئی مگر مڑی نہیں۔

کیونکہ وہ جانتی تھی اول تو یہ سوٹ جو اسے بہت احسان کر کے دیا جانے والا ہے سب کا مستزکر وہ ہو گیا اچھا بھی ہوا تو اس تک نہیں پہنچے گا۔

”کم سنی ہے میرے خیال میں تو یہ مثال بی بی ماں کی طرح۔ بشری کو بھی یہی بیماری تھی۔ مطلب کی بات فوراً“

اچک لیتی مطلب کی نہ ہو تو بہری بن جاتی۔ فوزیہ کے دل میں پرانی پانپنیدگی نے چٹکی کالی تھی۔ مثال بے تاثر

چہرے کے ساتھ پھوپھی کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

بلیک کلر کا جارح کا سوٹ تھا جس پر شاگنک پنک اور سلور بہت خوبصورت چھوٹے چھوٹے پھول اور

ڈیزائن تھے۔ مثال کی توقع کے برعکس سوٹ بہت خوب صورت تھا۔

”خاص میں نے اپنی پسند سے لیا ہے اپنے لیے سرخ رنگ میں اور تمہارے لیے یہ بلیک۔“ وہ مثال کی آنکھوں

میں پسندیدگی دیکھ کر غریبہ انداز میں بولی تھی۔ مثال نے آہستگی سے سوٹ لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

”یہ تو بہت خوب صورت کلر ہے فوزیہ اور سچ میں تو مثال کو یہ منحوس کلر کبھی نہ پہننے دیں۔ ہماری اماں ہشتن

کہا کرتی تھیں۔ کنواریوں کو یہ کلر نہیں پہننا چاہیے۔ خدا نخواستہ آگے چل کر یہ رنگ ان کی زندگی کو بھی منحوس کر دیتا ہے اور یہ تو سارا ہی بلیک ہے۔ شلوار بھی دوپٹا بھی۔ رہنے دو بھی! مثال نہیں پنے کی یہ رنگ۔“ مثال کے ہاتھوں میں پہنچنے سے پہلے سوٹ ”خس وار“ کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔

فوزیہ اس خصلے کے لیے تیار نہیں تھی۔ فوری طور پر کچھ بول نہیں سکی۔

”میرے پاس ایک شوخ سا سوٹ پڑا ہے الماری میں، وہ میں اس کی جگہ مثال کو دے دوں گی۔ ٹھیک ہے نا۔“ وہ

جیسے فوزیہ کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے فوراً سے بولی۔

مثال کچھ کے بغیر خاموشی سے جانے لگی۔

”وہ ایسے اچھا لگتا مثال کے رنگ روپ پراٹھتا۔ میں نے تو اس کے خیال سے لیا تھا۔“ فوزیہ کو عفت کی حرکت

کچھ اچھی نہیں لگی تھی۔ سرسری سے انداز میں بولی۔

”تو تم دے دو اس کو۔ میں نے تو اس کے بھلے کو لیا تھا۔“ عفت فوراً ناگوار ی سے بولی۔

”اے نہیں۔ میں کوئی اور دلا دوں گی مثال کو۔ تم رکھو۔“ فوزیہ فوراً سنبھل کر بولی۔

اب اتنے سارے دن تو اسے یہیں رہنا تھا۔ عفت سے تعلقات میں معمولی بگاڑ بھی وہ نہیں چاہتی تھی۔

مثال باہر چلی گئی۔ باہر اس کے کرنے کو بے شمار کام تھے۔ اس کے کندھے ابھی سے بغیر کوئی کام کیے جیسے دیکھ

لگے تھے۔

”آج تیو تاریخ ہے۔ دو دن بعد مہما کے پاس۔ اور وہاں بھی اسی طرح نہ موجود ہونے کا احساس اور بے شمار

کام۔“

ٹھک کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

”اس گھر میں کسی کجنت کو یاد ہے کہ اس بڑھیا کو بھی کچھ کھانے کو دینا ہے۔ صبح سے چائے کے ساتھ ایک

سوکھا توں کھلا رکھا ہے۔ اس کے بعد مجال ہے جو کسی مردود کو خیال بھی آیا ہو کہ اس مریضہ کو کبھی کچھ کھانے پینے

کی ضرورت ہوگی۔ مرگئے سارے کہیں پر۔ کوئی میری بکواس سنتا ہے یا نہیں۔“

نیم ایک دم پوری طاقت لگا کر چیخنے لگی تھیں۔

انہیں ہر دو گھنٹے بعد کچھ نہ کچھ کھانے کو چاہیے ہوتا تھا اور کھانے کے بعد خود بھی بھول جایا کرتی تھیں کہ کب

کیا کھایا تھا۔

مثال تھکے تھکے قدموں سے اٹھ کر کچن میں آگئی۔

ظاہر ہے عفت اور فوزیہ میں سے تو کسی نے نیم کی یہ تقریر سنی بھی نہیں ہوگی۔ سنی بھی ہوگی ان سنی کر دی

ہوگی۔

وہ نیم کے لیے سوپ گرم کرنے لگی۔

”تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گی؟“ پیچھے سے عفت آکر بجلی کی طرح اس کے سر پہ کڑکی تھی۔

مثال حیرت زدہ سی کھڑی رہ گئی۔

”کسے شکل پر بارہ بجائے نحوست پھیلائے پھرتی ہو، ذرا سا سوٹ کیا لے لیا۔ ایسی شکل بتائی جیسے ہمیشہ ہی تم

سے اس گھر میں ایسا سلوک کیا جاتا ہے، کچھ نہیں دیا جاتا۔ یہی ظاہر کرنا چاہ رہی تھیں نا تم؟“ وہ جانتی تھی عفت

اس طرح اگر اس پر چڑھ دوڑے گی۔

لیکن اس بار اس نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ اپنے چہرے کے تاثرات نارمل رکھے مگر پھر بھی۔ یہ جرم

بھی اس کے کھاتے میں آئی گیا۔

”کیا بہتر نہیں ہوگا ممالوں کے سامنے آپ مجھ سے یوں بلاوجہ میں نہ الجھیں۔ میں کچھ کہہ دوں گی تو آپ ہسٹریائی مریضوں کی طرح چیخنے چلانے لگیں گی۔“ وہ کھولتے سوپ کو دیکھتے ہوئے سر دہجے میں بولی۔ عفت کو تو جیسے ہزار واٹ کا کرنٹ لگا۔

مثال بہت کم بولتی تھی بلکہ کبھی کبھی تو پورا دن کچھ نہیں بولتی تھی۔ عفت اس پر چیختی چلاتی۔ سارے گھر کا کام کروانے کے باوجود کسی نہ کسی بات پر یہ براہم ہوتی رہتی مگر وہ جواب میں خاموش رہتی اور آج۔۔۔

”کیا میں مریض ہوں ہسٹریائی مریضہ؟ بالکل ہوں چیختی چلاتی ہوں۔ تم نے یہ بکواس کی ابھی۔“ وہ جیسے غصے میں بالکل ہی تو ہو گئی۔

”پریشے کل اپنا ذول ہاؤس ٹوٹ جانے پر اسی طرح چیخ چلا رہی تھی جب فوزیہ پھپھو نے کہا تھا کہ اسے دورے تو نہیں پڑتے۔ آپ اس طرح چیخیں گی تو سوچ لیں۔ آپ کے بارے میں ان کے خیالات کیسے ہو سکتے ہیں آگے آپ کی مرضی۔ دادو کو کر سوپ دے کر آئی ہوں۔“ عفت تو جیسے کھڑے کھڑے پھری ہو گئی تھی۔

یہ وہ مثال تو نہیں تھی جو اتنے سالوں سے بے دام کی غلام بنی ہو گئی تھی ہر کسی کے کام کیے جاتی تھی۔ بھی پلٹ کر جواب نہیں دیتی تھی۔ یہ تو۔۔۔

”مجھنی کو ایک کالا سوٹ لے لینے کا اتنا صدمہ لگا ہے کہ مجھ سے زبان چلانے لگی ہے مگر یہ پریشے کے بارے میں کیا بکواس کر کے گئی ہے۔ اللہ نہ کرے میری بچی میں ایسا کوئی عیب ہو یا کوئی اس کے بارے میں ایسی بات کرے۔ فوزیہ تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔“

عفت پریشان سی ہو گئی۔

”ضرور اسی کمپنی نے یہ بات اسے دل سے گھڑی ہے صرف میرا جی چلانے کو۔“

وہ بے قراری سارے گھر میں گھولنے لگی۔

”جانتی ہے یہ پریشے سے میری بیٹی پر یوں جیسی ہے جو اسے دیکھتا ہے اسی کو دیکھتا رہتا ہے۔ یہ مثال کسی کو کیا نظر آئے گی۔ اسی کی جلن نکال رہی ہوگی۔ فوزیہ لٹو جو ہو گئی ہے پریشے پر۔ ابھی سے مذاق مذاق میں اپنے فیصل کے لیے مانگ رہی تھی۔ بس اسی دم جل بھن گئی ہوگی چیل ماں کی بیٹی۔“ عفت کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔

اور جو فوزیہ اور خالد کی آمد کے دن شام کی چائے میں اس کھیا لڑکی نے عفت کی شادی کا سب سے قیمتی ٹی سیٹ توڑ ڈالا تھا۔

جب عفت کچن میں آئی تو بڑے پورے سیٹ کے ساتھ زمین بوس ہو چکی تھی۔

سارے ہی برتن چکنا چور تھے اور مثال نیچے بیٹھی کرچیاں اٹھا رہی تھی۔

عفت نے پیچھے سے اسے دو ہتھوڑے مارے تو وہ انہیں کرچوں کے اوپر جاگری۔ اس کے ہاتھ زخمی ہو گئے۔

اور جیسے ہی عدیل بھی عفت کے پیچھے آیا۔ وہ فوراً ”وہیں زمین پر بیٹھ کر مثال کے ہاتھوں میں خون کے ساتھ چپکی کرچیاں دیکھنے لگی تھی۔“

”میں نے تو کہا ہماری بچی کا صدمہ کیا ہو یہ چار برتن ٹوٹ گئے۔ میں تو عدیل اور گئی تھی کہ کیس خدا نخواستہ اس کو کہیں چوٹ نہ لگ گئی ہو اور دیکھیں! ابھر بھی اس نے ہاتھ زخمی کر لیے۔ درد تو نہیں ہو رہا۔“

وہ بہت حساس لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

مثال اس کے یوں کر گٹ کی طرح رنگ بدلنے اور اس کے اتنے سارے روپ بہروپ دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی۔

”نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔“ وہ دروہستی آہستگی سے کہہ کر ٹوٹنی کے نتیجے خون رستے ہاتھوں کو رکھ کر بیٹھنے لگی۔

عدیل اسے دیکھے جا رہا تھا۔

”جھلو! میں نہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں مثال! آؤ میرے ساتھ۔“ کوئی ایسا لہجہ بھی ہوتا تھا جب عدیل اس کی فکر میں بہت سال پہلے والا باپ بن جایا کرتا تھا۔

”تو بابا! اس کی ضرورت نہیں۔ میں ٹھیک ہوں بالکل۔“ وہ اسی طرف رخ کیے حلق میں گھلتے نمکین پانیوں کو پیتی ہوئی بظاہر بڑے گھرے لہجے میں بولی۔

”عدیل! آپ جا کر ممالوں کے پاس بیٹھیں۔ کیا سوچیں گے خالد بھائی! ہم دونوں ہی اندر آگئے ہیں۔ میں چائے سرو کروں تو پھر خواستے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں۔ آپ پلیر ممالوں کے پاس جا کر بیٹھیں۔“

عفت فوراً ”عدیل کو احساس دلاتے ہوئے بولی تو وہ سر ہلا کر وہاں سے چلا گیا۔ عفت نفرت بھری نظروں سے مثال کو دیکھتے ہوئے بڑبڑاتے ہوئے چائے کا پانی پھر سے رکھنے لگی۔

پریشے اور دانی یہ دو اضافے تھے جو اس کے باپ کے گھر میں آئے۔

جن کے آتے ہی اس کی اہمیت جو عفت پہلے ہی مختلف طریقوں سے کم کرتی چلی گئی تھی ابھر بھی کم ہوتی گئی۔

پریشے یوں بھی اتنی خوب صورت اتنی دووہیا سفید صحت مند لگی تھی کہ وہ فوراً ”ہی ہر کسی کی توجہ کھینچ لیتی۔“

خود مثال کی کوشش ہوئی وہ چوندرہ دن یہاں رہے اس کو اسے آنے کے بعد سارا وقت صرف پریشے کے گرد منڈلائے۔

جب پریشے چھوٹی تھی تو عفت اسے مثال کو نہیں پکڑاتی تھی۔ ہاتھ لگانے پر بھی جھڑک کر روک دیتی کہ اس کے گندے ہاتھوں سے جراثیم بچی کو لگ جائیں گے۔

عدیل بھی اس سے آنے کے بعد سارا وقت پریشے میں ہی لگا رہتا۔ وہ وادی کی بھی لاڈلی تھی۔

بالکل ویسے جیسے کبھی مثال ہوا کرتی تھی۔

بھی بھی پریشے کو بھی سب کی محبتوں کا مرکز بنے دیکھ کر اس کے دل میں بہت جلن ہوتی۔ آنکھوں میں کچھ نہ چھینے کے باوجود می آجاتی۔ اس کا جی چاہتا وہ پریشے کو کیس چھپا دے۔

کئی بار اس نیت سے اس کے پاس جاتی مگر پھر اس کی موہنی صورت دیکھ کر بے اختیار اسے پیار کرنے لگتی۔

جیسے ہی مثال کچھ بڑی ہوئی پریشے اس کی ذمہ داری بنتی چلی گئی۔

یوں بھی دانیال اس کھر کا دوسرا خوب صورت اور بہت دیر کا خدا سے مانگا ہوا اضافہ تھا۔

دانی نے ماں اور باپ کو خود میں مصروف کر لیا۔

پریشے کی اہمیت کم تو نہیں ہوئی لیکن دانیال تو سب کی آنکھ کا تار تھا، خود پریشے کا بھی۔

مثال کو بھی وہ اچھا لگتا مگر پریشے پر اسے زیادہ پیار آتا تھا۔ پریشے کو سنبھالنے کی ذمہ داری اس کے سپرد ہوئی۔

پھر برتن دھونے کی۔ پھر ڈسٹنگ اور گھر کا پھیلاوا سمیٹنے کی۔

پھر ایک کے بعد دوسرا کام خود بخود مثال کے ذمے ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ عفت کو لنگ میں بھی اس سے خوب کام کروانے لگی، لیکن سب کے سامنے یہی کہا جاتا۔ ”میں اسے اس لیے ساتھ لگائے رکھتی ہوں کہ پرانی بچی ہے نظروں کے سامنے رہے۔ کل کوئی اونچ نیچ ہو گئی خدا نخواستہ تو اس کی ماں اگر تو مجھے پکڑے گی نا۔“

اور عدیل نے کبھی بھی عفت کو پرانی بچی کہنے پر نہیں ٹوکا۔ وہ باپ کے چہرے کی طرف دیکھتی رہتی۔

یوں لگتا جیسے وہ خود بھی دل سے اسے پرانی بچی تسلیم کر چکا ہے۔ پریشے بھی اس سے پیار تو کرتی تھی مگر جب اس کا اپنا دل ایسی خواہش کرتا۔

یوں بھی کوئی پندرہ دن کے لیے کسی سے جی لگائے اور پندرہ دن کے لیے اجنبی بن جائے۔ اس کی زندگی اس

ہزارے سے بہت عجیب تر ہو گئی تھی۔
 وہ کوئی بھی کام جم کر نہ لگا کر رہی نہیں پاتی تھی۔
 اسکول بشری کے گھر سے قریب تھا تو عدیل کے گھر سے دور!
 اکثر ہی اس بات کو بہانہ بنا کر عفت اس کی چھٹی کروالیا کرتی تھی۔ پھر اکثر نچ دکھ اور پریشانی میں اس کی کوئی
 نہ کوئی ضروری چیز بھی بشری کے گھر رہ جاتی تو بھی عدیل کے۔
 کوئی ٹیسٹ کاپی، کوئی نوٹس فائل، کبھی کوئی ضروری کتاب۔ آہستہ آہستہ اس کا پردھانی سے بھی دل اچھا ہوتا
 جا رہا تھا۔
 وہ ہر چیز ہر معاملے میں اکھڑی اکھڑی رہتی تھی۔
 کوئی بھی اس سے وہ کام نہ کہتا جو کچھ دنوں میں مکمل ہونا ہوتا کیونکہ اگلے ہفتے تو وہ چلی جاتی۔
 وہ خود بھی پر اعتماد نہ رہی تھی اور دوسرے بھی اس پر جی سے بھروسہ نہ کرتے تھے۔
 مثال تو سب کے لیے ایک مثال ہی بنتی جا رہی تھی۔
 اس کے اکھڑے اکھڑے رویے کے سبب کوئی بھی اس سے خوش نہیں تھا۔ وہ خود بھی کسی سے خوش نہیں
 تھی۔ کسی کے ساتھ کسی جگہ یہ اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی یہ جگہ یہ لوگ۔ عارضی ہیں۔ اسے
 چاہتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے ٹھیک پندرہ دن بعد یہاں سے چلے جانا ہوتا تھا۔
 وہ پردھانی میں وابھی رہ گئی تھی۔ بس نارمل نمبروں کے ساتھ بمشکل پاس ہو کر اگلی کلاس میں چلی جاتی۔
 بشری نے شروع میں اس کے یوں کر ریڈ کرنے کا غم کھایا پھر جیسے اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اپنی نئی زندگی نئی
 دنیا میں من ہو گئی۔
 وہاں اس کے لیے بھی ایک دوسری مثال آئینہ موجود تھی۔ احسن کمال بشری اور سیفی کی آنکھوں کا تارہ۔
 آئینہ۔
 جس کے آتے ہی اس گھر میں پہلے سے نظر انداز مثال کو بالکل جیسے بھلا دیا گیا تھا۔
 پتا نہیں کیوں کوشش کے باوجود بشری کے اکسانے پر بھی اس کو یہ عام سے نقوش والی کمزوری پچی پہ بالکل بھی
 پیار نہیں آیا تھا۔
 شاید اسے آئینہ سے انسیت ہو بھی جاتی مگر سیفی اسے آئینہ کے قریب نہیں پھکنے دیتا تھا۔
 وہ بہت خود پسند، ضدی، جھگڑالو اور لڑاکا تھا۔
 مثال سے اسے خاص ضد اور چڑسی تھی۔ وہ اس کو جھڑکنے، ڈیل کرنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔
 وہ لاؤنج سے گزرتی، آئینہ رو رہی ہوتی اپنی کلاں میں بڑی۔ سیفی وہیں سے شور مچا دیتا کہ مثال نے آئینہ کو مارا
 ہے۔ اگر احسن کمال گھر پر ہوتا تو وہ جن خاموش، سر دبے مہر نظروں سے اسے گھورتا۔ مثال کی وہیں جان نکل
 جاتی۔
 وہ اس درجہ گھبرا جاتی کہ اپنے دفاع کے لیے ایک لفظ بھی بول نہیں پاتی تھی۔ بس ہاتھ مسلتی ہوئی تھر تھر
 کانے جاتی۔
 بشری شروع میں اس کی حالت پر پریشان ہو کر اس کا دفاع کرنے کی کوشش کرتی مگر پھر وہ بھی جیسے مثال کی غلطی
 جان کر اسے ڈبٹے لگتی۔
 نتیجتاً مثال آئینہ سے دور ہوتی چلی گئی۔
 اس عام سی شکل صورت کی پچی سے اسے کوئی رغبت نہیں تھی۔ ہاں جب گھر میں کوئی نہیں ہوتا تھا اور ایسا

آہستگی سے اس کے پاس آکر بولی۔ عفت دانی کو سلاتے سلاتے خود بھی سوچتی تھی۔ پریشہ دادی کے ساتھ لیٹی تھی۔ مثال باپ کے پاس آگئی۔
”بولو میری جان! کچھ چاہیے؟“ عدیل شفقت بھرے لہجے میں بولا۔ اس نے بہت دنوں بعد اسے نظر بھر کر دیکھا تھا۔

”یہ آپ نے پریشہ کے کپڑے پہن رکھے ہیں؟“ وہ اس کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگا۔

مثال نے جلدی سے خود کو دیکھا۔

تیرہ سال کی عمر میں نکلنے لگے تھے اس کے تین چار سال پرانے کپڑے بہت چھوٹے ہو رہے تھے۔

”نہیں بابا! میرے ہیں۔“ وہ جلدی سے گیس کو کچھ ہینچ کر بولی۔

”ہوں! عدیل کچھ سوچنے لگا۔

”کیا کہہ رہی تھیں آپ؟“ اسے خیال آیا تو پوچھنے لگا۔

”بابا! اگر میں یہیں رہ جاؤں۔ آئی مین فل منتھ۔ سارا امینہ آپ کے پاس رہاں رہوں۔ میں ماما سے کبھی کبھی ملنے چلی جایا کروں گی۔ مجھے آپ کے پاس رہنا اچھا لگتا ہے۔“ وہ بہت ڈر ڈر کر ایک ایک کر بولی تھی۔

عدیل کو کچھ رنج سا ہوا کہ مثال واقعی وہ نہیں رہی تھی جیسی ان دونوں کے ساتھ تھی۔ صحت مند پر اعتماد شوخ اور ہر بات منہ بہ منہ دینے والی یہ وہ مثال تو نہ تھی۔

”آپ کو وہاں کوئی مسئلہ ہے جان؟“ وہ شجیدگی سے بولا۔

اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”مئی آپ کو توجہ نہیں دیتیں؟“

وہ کچھ نہیں بولی۔

عدیل خاموش اسے دیکھتے ہوئے کچھ سوچتا رہا پھر گہری سانس لے کر یونہی سر ہلانے لگا۔

”میں آپ کی ماما کو کال کروں گا کہ وہ آپ کا خیال رکھا کریں اور میں آپ کو مستقل یہیں رکھنے کی بات بھی کروں گا۔ اگر وہاں گنس تو آپ یہیں رہیں گی۔ مجھے اس بات کی خوشی ہوگی۔“ عدیل رک رک کر بولتے ہوئے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو نوٹس کر رہا تھا۔

اس کا سر جھایا ہوا چہرہ ایک دم سے کھل اٹھا تھا۔

”بابا! آپ بات کریں گے۔ میں ماما سے یہ کہیں گے کہ وہ مجھے یہیں آپ کے پاس رہنے دیں۔“ وہ بے یقین سی باپ کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر دوڑاؤں بٹھتے ہوئے بولی۔

”کیوں نہیں کروں گا بیٹا! ہماری یہی بات طے ہوئی تھی کہ جو کچھ بھی ہوگا۔ مثال کی خوشی اور مرضی سے ہوگا اگر آپ کی خواہش یہی ہے تو مجھے اس کی خوشی ہے۔ میں ایک دو دن میں آپ کی ماما کو کال کرنا ہوں۔“

”بابا! ایک چھوٹی بار بار کبھی ادھر بھی ادھر۔ میں بہت ڈسٹرب ہوتی ہوں۔ ابھی میں نے لاسٹ ویک اپنے انگلش کے ”وائے“ لکھے تھے مگر نوٹ بک ماما کی طرف رہ گئی اور نتیجے مجھے سارا دن ہنسی (سزا) میں کھڑا رکھا۔

ان کے نزدیک میں ہر وقت یہی ایکسکیوز کرتی ہوں کہ ماما کے گھر رہ گئی نوٹ بک بابا کے گھر۔ اور بابا!

بولتے ہوئے اس کی آوازیں نمی سی کھل گئی۔

”جئے میرا مذاق بھی اڑاتے ہیں کہ بابا بابا کے گھر الگ الگ کیسے ہو سکتے ہیں۔ اگر تمہارے پیرٹس میں سپریشن بھی ہو چکی ہے تو بھی تم ایک ہی کے پاس رہتی ہوگی یا آدمی آدمی دونوں طرف۔“ اس کی آنکھوں میں جع ہونے والے آنسو بہنے لگے۔

عدیل کے دل پر جیسے گھونسا سا ہوا۔
”میرا بچہ۔“ وہ بے اختیار اس کو ساتھ لگا کر اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اس کی تکلیف سے نظریں چرانے لگا، جو اس بچی کو اپنے ماں باپ کے جذباتی پن کی وجہ سے پہنچی تھی۔
”آپ بات کریں گے ماما سے؟“ وہ خود ہی سنبھل کر آنکھیں رگڑتے ہوئے سرخ چہرے کے ساتھ بولی۔
عدیل اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

”تھینک یو بابا۔“ ہر پندرہ دن بعد یہاں وہاں جاتا۔ بہت انسٹنٹ لگتا ہے۔“ وہ پھر سے نظریں جھکا کر لذتی پلکوں کے ساتھ تم لہجے میں بولی۔

عدیل تڑپ کر رہ گیا۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں وہ کتنے بڑے بڑے احساسات کی بھٹی سے صرف اپنے پیدا کرنے والوں کی وجہ سے گزر رہی تھی۔

”تم اب جا کر ریسٹ کرو۔ صبح اسکول بھی جانا ہوگا۔“

وہ مزید مثال کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ نرمی سے بولا۔

وہ خاموشی سے چلی گئی اور عدیل اس رات بہت دیر تک جاگتا رہا۔

”دماغ تو نہیں خراب ہو گیا آپ کا عدیل! اول تو اس کی ماں کبھی نہیں مانے گی، پھر میں ماں ہو کر اس کی بچی کو اس سے چھین لوں۔ یہ میں کبھی نہیں کر سکتی اور پھر دیکھیں! یہ جو آج سے ناقدین سے اہلین کے درمیان۔ مثال کو جتنا اچھا اس کی اپنی ماں سمجھ سکتی ہے، میں لاکھ چاہوں تو ایسا نہیں کر سکتی۔ اپنی ماں تو اپنی ماں ہوتی ہے۔ لاکھ سوتیلی ماںیں سگی بننے کی کوشش کریں۔“

عفت عدیل کے منہ سے سب سنتے ہی جیسے بھڑک اٹھی۔ عدیل لمحہ بھر کو کچھ بول ہی نہیں سکا۔

”آپ کا دل چاہتا ہے تو سو بار بشری سے بات کر لیں، لیکن میں سمجھتی ہوں وہ اس بات کے لیے نہیں مانے گی۔

یوں بھی عدیل اس کی ساری ذمہ داری آپ پر آجائے گی۔ اس کی ماں جان چمڑا کر چیخے ہو جائے گی۔ کل کلاں کو اس کی شادی ہوگی۔ رشتے کا معاملہ، چیز کا معاملہ اور خدا نخواستہ کوئی اونچ نیچ ہوگی تو اس وقت یہی بشری واویلا کرئی آجائے گی کہ باپ نے ظلم کیا اس کی بچی کی زندگی خراب کر دی۔ آپ سوچیں! اچھی طرح۔ ایک جذباتی غلطی کے بعد دوسری کو نہ دہرائیں۔ مثال کو ان باتوں کی کیا سمجھ۔ اسے تو یہاں سکون اور سکھ ہے میں تو اسے مل کر پانی نہیں پینے دیتی۔ اس دن مجھ سے کہہ رہی تھی کہ اس کی ماں وہاں اس سے کام کرواتی ہے سارا دن۔ ظاہر ہے۔ وہ ماں ہے اس کی بہتری کے لیے ابھی سے اسے کام میں ڈالنا چاہتی ہے۔ میں ایسا کروں گی تو ظالم کہلاؤں گی۔ لڑکی کا معاملہ ہے، کچھ گھر کے کام و ام آجائیں گے تو کل کو اس کی اگلی زندگی اچھی گزرے گی اور یہ سب صرف سگی ماں ہی کر سکتی ہے۔ میں تو بابا اس سے کام و ام نہیں کرواؤں گی۔ کہیں مجھ سے بھی بدظن ہو جائے یہ۔“

وہ بغیر رکے سب کچھ کہہ گئی بہت ہوشیاری اور بہت طریقے سے۔

مثال اسکول گئی ہوئی تھی۔ اسے عفت کی اس کارگزاری کا پتا نہ چل سکا۔

”بابا! اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔

باہر بشری کا ڈرائیور اسے لینے آیا ہوا تھا۔

”میں نے بات کی تھی تمہاری ماں سے۔ وہ بہت ناراض ہوئی اس بات پر۔ بیٹا! ہمارے قانون میں سارا تحفظ صرف ماں کو ہے۔ باپ کو ایسا کوئی حق نہیں۔ اس نے اگر مجھے پندرہ دن کے لیے تمہیں دے رکھا ہے تو یہ اس کی

مہربانی ہے۔ اس نے صاف انکار کر دیا ہے کہ وہ تمہیں مستقل میرے پاس نہیں چھوڑ سکتی۔ اب بتاؤ بھلا میں کیا کرتا۔“

عدیل سخت لاچار رہی ہو۔
مثال گم صم ہی باپ کی شکل ہی دیکھتی رہ گئی۔
وہ راستہ بھراپے آنسو ضبط کرتی رہی۔

”نہیں۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو مثال! بشری! کچن میں بری طرح مصروف تھی جب اس نے جاتے ہی اس سے عدیل کے فون کے بارے میں پوچھا۔

بشری کے انکار پر وہ لمحہ بھر کے لیے کچھ بول ہی نہ سکی۔

”آپ سے پاپائے کوئی بات نہیں کی؟“ وہ کچھ پریشان سی ہو کر بولی۔

”کیا بات کرتی تھی۔ تمہارے اسکول سے متعلق تو کوئی بات نہیں ہے کوئی گزرتو نہیں ہوئی رزلٹ میں۔“ وہ چونک کر بولی۔

رات کو احسن کمال کے بزنس پارٹنر کو ڈنر پر بلایا گیا تھا۔ بشری الگ کے ساتھ مصروف تھی۔ اوپر سے مثال کے سوال جواب وہ کچھ جھلا کر رہ گئی۔

”نہیں ماما! ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ دل گیری سے بولی۔

”چھا مثال پلین! جا کر تم نے جو کرتا ہے وہ کرو پھر اگر کچن میں میری تھوڑی ہیلپ کرانی ہے تو کراؤ ورنہ آئینہ کو جا کر دیکھ لو۔ میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔ تم سے بعد میں بات کرتی ہوں۔“ بشری نے اسے وہاں سے چلتا کیا۔

اور اگلے گیارہ دن تک بشری کو اس سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔

”مگر احسن! مثال کے اسکول میں تو ٹیسٹ سیشن چل رہا ہے چند روز بعد ان کا سمسٹر اشارٹ ہو جائے گا۔“ بشری کھانے کی میز پر احسن کمال سے بولی۔

”نوپراہم۔ دیکھو مجھے یہ ایک ہفتے کی ویکشنز یوں سمجھو ایک ہلکے سنگ کے طور پر ملی ہیں کہ ہم ملائیشیا کا ایک وزٹ کر کے آئیں۔ اس کے بعد پورا سال میرے پاس بالکل بھی ٹائم نہیں ہوگا۔ مثال کو ہم فیکسٹ ٹائم لے جائیں گے۔ یوں بھی ابھی اس کا ویزا وغیرہ نہیں ہے۔“

احسن کمال نے بہت مفاتی سے مثال کو اپنی فیملی سے الگ کر دیا تھا ورنہ ویزا تو بشری کے ویزے کے ساتھ بھی بنوایا جاسکتا تھا۔

”ٹیس پاپائے۔ میری ویکشنز بھی بہت کم ہیں ہم خوب انجوائے کریں گے۔

اور۔۔۔ آئینہ کا تو پہلا ایئر ٹریول ہو گا نا پاپا! وہ اسی جوش سے بولا۔

مثال تو خیر یوں بھی ان کے ساتھ جانے پر خوش نہیں ہوتی کیوں کہ بشری کے پاس مثال کے لیے ٹائم نہیں ہوتا تھا۔

”بشری! پینک آج ہی کر لینا ساری۔ کل رات گیا رہے تھے کی فیکسٹس کفرم ہوئی ہیں۔ اس کے بعد تین دن بعد کی فلائٹ مل رہی تھیں۔“ وہ اب آپس میں گفتگو کر رہے تھے یوں جیسے مثال وہاں موجود نہیں۔

”مگر ابھی تو مثال کو یہاں چار دن اور رکنا تھا۔“ بشری کو خیال آیا تو کچھ پریشان ہو کر بولی۔

”نوپراہم! یہ رُکے اس کا اپنا گھر ہے۔ بعد میں ڈرائیور اسے اس کے باپ کے گھر چھوڑ آئے گا۔“
”نوپراہم! میں اس کی نہیں رہوں گی۔“ وہ فوراً ہی گھبرا کر بولی۔
”چھوٹی ہے احسن! یہ ابھی۔“ بشری بھی پریشانی سے بولی۔
”جی بھی فکھی نہیں ماما! پشیمند نہ سنی اس کا منہ چڑا کر بولا۔
”تو ٹھیک ہے چار دن کی کیا بات ہے۔ یہ فیکسٹ ٹائم ہے چار دن پہلے یہاں آجائے اگر اتنا ہی سخت حساب کتاب کتاب ہے تو۔“ احسن کمال سرسری لہجے میں کندھے اچکا کر بولا۔
”بشری! کچھ پریشان اور رنجیدگی سے مثال کو دیکھنے لگی جو مسلسل نظریں جھکائے ہوئے تھی اور جس کی لرزتی کانپتی لمبی پلکیں اس کے آنسو روکنے کی کوشش کی گواہی دیتی ہوئی تھیں۔

ایک بار پھر شفٹنگ اس کی منتظر تھی۔
یہ والا گھر کوچنگ سینٹر کے لیے بہت چھوٹا پڑ گیا تھا۔

عاصمہ نے گزرتے سالوں میں ماسٹرز اور ایم ایڈ تک تعلیم حاصل کر لی تھی اس نے اپنے کوچنگ سینٹر میں بہت اچھے تعلیم یافتہ نیچرز رکھے تھے۔ اس کے سینٹر کا شمار بھر میں ایک نام ہو گیا تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد شہر کے اچھے علاقے میں یہ بنگلہ کرائے پر لیا گیا تھا۔

انہوں نے اپنا گھر کرائے پر دے دیا تھا۔ اپنی بخت سے پوش علاقے میں پلاٹ خرید رکھا اور کچھ پیسے جمع ہونے پر اس پر تعمیر شروع کرانے کا ارادہ تھا۔ واقع پر ہی انجینئرنگ سیکنڈ ایر میں تھا۔

اربیہ اور اریشہ بھی میٹرک اور آٹھویں درجے میں تھیں۔

ورہ بھی تینوں بسن بھائیوں کی طرح بڑھائی میں بہت اچھی تھی۔ عاصمہ کا گھر محبت اور سکون کا گوارہ تھا۔

ان گزرتے سالوں میں اس نے دن رات محنت کی تھی۔ اس نے بھی اور اس کے بچوں نے بھی۔

”اللہ کسی کی محنت کبھی ضائع نہیں کرتا۔“ عاصمہ کو دیکھ کر اس کی بہت کو دیکھ کر لوگ یہی کہا کرتے۔

بنگلہ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اتنا تھا کہ ان کی رہائش کوچنگ سینٹر کے طور پر آسانی سے کام لے سکے۔

اوپر کی طرف ایک گیسٹ روم تھا اور ایک ہال چھوٹا سا کمر جس میں واقع اپنے پینٹنگ اور اسکیچنگ کا سامان جمع کر رکھا تھا۔ اس کی فراغت کا مشغلہ جو اسے بہت دنوں بعد نصیب ہوئی تھی۔

اس شام بھی شفٹنگ کے تھکا دینے والے کام کے بعد اسے کچھ فراغت میسر آئی تھی۔ وہ سب سے نظر بچا کر ادھر رہتا تھا۔

اپنا کمرہ صاف کیا۔ سامان ترتیب سے لگایا اور پھر تھک کر باہر ٹیرس کی طرف آگیا۔

وہ گھرانے کے ٹیرس سے کافی اونچا تھا مگر دیواریں کافی چھوٹی تھیں۔

اور وہاں اس نے پہلی بار مثال کو بیٹھوں پر بیٹھے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے روتے دیکھا تھا۔

پہلے تو اسے لگا کوئی لڑکی وہاں بیٹھی شاید سو رہی ہے۔

پھر وہ ذرا آگے ہو کر غور کرنے لگا تو مثال نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ دونوں آنکھیں اوپر چہرے کو رگڑا اور کسی بھی طرف دیکھے بغیر وہ تیز رفتاری سے نیچے بیٹھیاں اتر گئی تھیں۔ اسے لگا اس کی سیڑھیاں چڑھ آئی تھی۔

وہ بہت دیر تک اس خالی چھت کو دیکھتا رہا تھا۔ اگرچہ ابھی نہ تو اس کی اتنی عمر تھی کہ محبت چاہت یا اس طرح

کے کسی جذبے کو ڈھنگ سے سمجھ سکتا۔ بس اس لڑکی کے آنسو جیسے اسے ترپا گئے تھے۔ پھر جانے کیسے اتفاق ہوا کہ وہ اگلے چار سال تک اس لڑکی کو وہاں نہیں دیکھ سکا تھا۔
اس کا انجینئرنگ کالج میں داخلہ ہو گیا تھا اور عاصمہ کے کہنے پر وہ کچھ عرصہ مکمل یکسوئی سے پڑھنے کے لیے ہاسٹل میں چلا گیا تھا۔
وہ اس لڑکی کو اور اس شام کو قطعاً "فراموش کر چکا تھا انجینئرنگ کے تیسرے سال کے اختتام پر وہ گھر آیا تھا۔ اس کے کالج میں چھٹیاں تھیں۔
یوں بھی اس نے فیصلہ کر لیا تھا وہ اب گھر پر ہی رہے گا۔ ہاسٹل کے اخراجات کافی بڑھ گئے تھے۔ عاصمہ کچھ بیمار رہنے لگی تھی۔ مسلسل محنت نے اسے بہت کمزور کر دیا تھا۔
پھر پے در پے شہر بھر میں کھلنے والے کوچنگ سینٹر کی بدولت اس کے سینٹر میں کچھ رش کم ہو گیا تھا۔
عاصمہ کو اریبہ اور اریشہ کی شادی کی فکر دن رات ستانے لگی تھی۔
اس نے کئی جگہ ان کے رشتوں کے لیے کہہ رکھا تھا مگر کیں بات نہیں بن رہی تھی۔ واثق اور عاصمہ کافی پریشان تھے۔

ڈرائیور اسے عدیل کے گھر کے باہر اتار کر چلا گیا تھا۔ پندرہ دن ہونے میں ابھی چار دن باقی تھے۔
وہ پایا کو فون کیے بغیر واپس آگئی تھی۔
شاید عدیل نے سیل نمبر پیچ کر لیا تھا کیونکہ اس کا سیل مسلسل آف جا رہا تھا۔
"عدیل بھائی اپنی مسز اور بچوں کو لے کر اسلام آباد گئے ہیں۔ ان کی مسز کی فیملی میں کوئی شادی تھی۔ کہہ کر گئے تھے کہ وہ چار دن بعد آئیں گے واپس۔"
ساتھ والی آئی کے ہوش رہا انکشاف نے مثال کی ٹانگوں سے جیسے جان نکال دی تھی۔
"تم نے اپنے ڈرائیور کو روکنا تھا نا؟ وہ تمہیں ساتھ واپس لے جاتا کیونکہ ہم بھی آج قاتب اور شاکی نانوی طرف جا رہے ہیں۔" وہ فوراً اسے بتانے لگیں۔
"وہ تو چلا گیا آئی! اور وہاں ماما کے گھر میں تو کوئی بھی نہیں۔ وہ لوگ ملایشیا چلے گئے ہیں۔ رات میں ان کی فلائٹ ہے اس لیے ممانے مجھے اس وقت یہاں بھیج دیا۔" وہ کانپتی آواز میں بولی۔
"تمہارے پایا کو کال کر کے بتادیا تھا تمہاری ماں نے۔" وہ اب کے کچھ برہمی سے بولیں۔
مثال نے نفی میں سر ہلادیا۔
"مجھے نہیں پتا آئی! وہ بہت ڈر گئی تھی۔"

دوسری طرف کا گھر تو کئی سالوں سے بند تھا۔ وہ لوگ کسی دوسرے ملک جا کر میٹل ہو گئے تھے اب اگر نبیلہ آئی بھی چلی جاتی ہیں تو وہ کہاں جائے گی۔
"تو اب کیا کرو گی تم؟" وہ نے لحاظ سے لمحے میں بولیں تو مثال خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔
"تمہاری نانویں نا۔ ان کے گھر چلی جاؤ۔ ماموں بھی۔" نبیلہ کو جیسے خیال آیا تو وہ کہنے لگیں۔
"ماموں اور نانو تو پچھلے ماہ حج کرنے گئے ہیں۔ وہاں ممائی کی خالہ رہتی ہیں نا۔" وہ ہولے سے بولی۔
نبیلہ یوں کھڑی ہو گئیں کہ اب کیا کیا جائے۔
"آئی! میں۔ اب کیا کروں؟" وہ ڈر کر خود ہی پوچھنے لگی۔
"میں کیا بتاؤں۔ دیکھ لو۔ اپنے پایا کو کال کر کے ان سے پوچھو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔" وہ رکھائی سے بولی۔
اور پھر کچھ سوچ کر اپنے ہاتھ میں پکڑا سیل اس کی طرف بڑھایا۔ مثال کانپتے ہاتھوں سے باپ کا نمبر ملانے لگی۔

دوسری طرف سیل آف جا رہا تھا۔

اس نے ہر کوشش کی اور مایوسی پر سیل نبیلہ کو واپس کرنے لگی۔
"پاپا کا سیل آف ہے۔ شاید ان کا نمبر پیچ ہو گیا ہے۔" وہ رندھی آواز میں بولی۔
"نانی گاؤ! ایسے لاپرواہ پرش ہیں۔ بچی کی کوئی فکر نہیں۔ اپنی اپنی دوسری فیملیوں کو لے کر سر سپائے کو نکل گئے۔ اب بتاؤں تمہارا کیا کروں۔ ہم نے آؤٹ آف مٹی جانا ہے۔ ہمیں ساتھ تو نہیں لے جاسکتے۔" وہ کوفت بھرے لہجے میں بولیں۔

دوسرے لمحے ان کے گیٹ سے گاڑی باہر نکلی۔ ان کے دونوں بچے اور شوہر تیار حلیے میں گاڑی میں بیٹھے تھے اور نبیلہ آئی کو بیٹھنے کا کہہ رہے تھے۔

"کو میں آئی ہوں۔" وہ بے زاری سے کہہ کر شوہر کے پاس گئیں کچھ دیر شوہر سے بات کرتی رہیں۔
مثال کی آنکھوں میں آنسو آتے جا رہے تھے۔ اطراف میں شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ رات ہونے کو تھی۔ وہ کہاں جائے گی اس وقت اگر یہ لوگ بھی نکل گئے تو۔
اس کے ضبط کرتے کرتے بھی آنسو نکل ہی پڑے۔

"سنو! تمہاری دادی کی کزن ہیں نا یہاں تیسری چوتھی گلی میں رہتی ہیں۔ تمہاری دادی بھی شاید وہیں رکی ہوں تم وہاں چلی جاؤ ناں۔ معلوم ہے نا تمہیں ان کا گھر؟" شوہر سے مشورے کے بعد نبیلہ آئی اس کے پاس آکر بولیں۔

"ناہم تمہیں چھوڑ دیں؟ اس کی خاموشی پر وہ کچھ بے زاری سے بولیں۔
"آپ۔ رہنے دیں۔ میں خود سے چلی جاؤں گی۔ مجھے دادی کی کزن کا گھر معلوم ہے۔" وہ رک رک کر بمشکل بولی تھی۔

"دیکھ لو اگر جا سکتی ہو تو جانا ورنہ بتادو یہ نہ ہو کہ رستہ بھول جاؤ یا پھر کہیں اور نکل جاؤ۔" وہ احتیاطاً بولیں ورنہ ان کا موبو ایسی کوئی بھی ہمہ روي جتانے کا نہیں تھا۔ ان کے شوہر اب گاڑی کا ہارن بجائے جا رہے تھے۔
"چلی جاؤ گی نا بتادو مجھے ویسے بھی تمہارے پریش کون سا مجھے کہہ کر گئے تھے تمہارا خیال رکھنے کو۔" وہ اس خواہ خواہ کی سر پرزی مصیبت سے جھنجھلا رہی تھیں۔

"آئی! میں چلی جاؤں گی دادی کی طرف پلیز۔ آپ پریشان نہیں ہوں۔ یہاں سے تین گلیاں چھوڑ کر ان کا گھر ہے۔ مجھے راستہ آتا ہے۔" وہ کچھ خود اعتمادی سے بولی۔
"گڈ۔ تو میں پھر جاؤں؟" وہ جیسے ہلکی پھلکی ہو کر بولیں۔

"جی! مثال رخ پھیر کر ہاتھ میں پکڑے بیک کو سنبھالتے ہوئے آہستگی سے بولی۔
نسرین دادو کے گھر وہ ایک باریا شاید دو بار پایا کے ساتھ گئی تھی۔ اسے بالکل بھی ان کے گھر کا راستہ نہیں آتا تھا مگر اس کی خود ار طبیعت یہ گوارا نہیں کر رہی تھی کہ ساتھ والی آئی اس کی وجہ سے خواہ خواہ پریشان ہوں جب اس کے اپنے والدین کو اس کی فکر نہیں تھی۔
وہ اندھیری گلیوں میں تیز تیز چلنے لگی۔

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے قدموں کی رفتار بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ "مجھے ان سے نانو کے یہاں نہ ہونے کا جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا۔ وہ مجھے نانوی کی طرف ڈراپ کر دیتے۔"

وہ اب تقریباً "بھاگ رہی تھی جب کوئی اندھیرے میں اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور اس کی چیخ نکلی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عالم لاہوت

”وقت تجھ؟“

نیم اندھیری۔ نیم روشن تنگ و کشادہ گلیوں میں وہ حمزہ عزیز جمالی ایسی چال میں چلتا جا رہا ہے جیسے کسی مٹی کی رنگ قتلہاں مولانا روی کے عشق حقیقی کے صفحات پر جھوم جھوم چرن چھوٹی ہوں اور پیا رنگ کالا میں رنگ رنگ جاتی ہوں۔ وہ تو من شدی۔ تو من شدی کا الاپ کرتی ہوں۔ اور اس رقص میں شامل ہوتی ہوں جسے رقص یا رکستے ہیں۔

وقت تجھ کا اندھیرا چھایا ہے جو دن کے اجالے سے دنیا داروں کے لیے کیا جاتا ہے ارفع و اعلا ہے یہ اندھیرا جو باطن کو پا جانے والے اللہ کے حضور سجود میں جھکے روشن پیشانیوں والوں کے نور سے سجا ہے۔ جاڑے کی سرد ترین رات ہے، جمالی کالی چادر کو سر سے وجود پر جھولتے چھوڑ کر کچھ ایسے قدم بڑھا رہا ہے جیسے اس نے سرگوشیاں سنی ہیں کہ اس بار نور والے بیتھے ہیں۔ باجماعت ہوئے کو ہیں۔ آؤ باجماعت۔ ہاں آؤ۔ وہ عالم وجد میں عالم سماع میں خاک سے کہیں دور شان سے قریب ہو جانے والے۔ آؤ باجماعت۔ عالم ناموس (فانی دنیا) کو پیچھے چھوڑے عالم لاہوت (سالم) کا مقام (فانی اللہ) کی طرف سفر کریں۔

عالم لاہوت کے شوق میں سفر کرتا حمزہ جمالی اپنے قدم بڑھاتا جا رہا ہے۔ آجاؤ وجود کو الف کرتے الف میں ڈھالتے الف کو پا جائیں۔ مسجد علاقے کو کہیں پیچھے چھوڑتے ذرا کنارے پر ہے، آس پاس کی کئی آبادیوں کو لگتی ہے۔ اسے جلدی نہیں ہے۔ وہ دیر بھی نہیں کر رہا۔ اسے ایسا لگتا ہے یہاں وہاں سے ایک

جماعت سی بنی کہیں جا رہی ہے۔ مکی جماعت جو گھروں سے نہیں نکلتی جو گھروں میں ملتی بھی نہیں۔ راہ پار میں پارا کھٹے ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ پار آبادیوں میں نہیں ملتے۔

”کالی چادر“ اس کے باپ کی چادر اس کے سر سے وجود پر جھول رہی ہے۔

وہی چادر جو اس کے باپ نے اس وقت اوڑھ رکھی تھی جب وہ دوپٹے سے اپنی بیوی اس کی ماں کا گلا

گھونٹ رہا تھا یہ چادر اس کے باپ کے وجود سے ایسے لپٹی تھی جیسے شر انسان کے لٹس سے لپٹ کر اس کے ہاتھوں خیر کا قتل کرواتا ہے، یہی چادر اس کے سر سے ہوتی اس کے وجود پر ایسے جھول رہی تھی جیسے برگزیدہ صوفی کے وجود سے رضائے حقیقی لپٹی ہوئی ہے۔

یہ چادر اس کے وجود کا وہ حصہ تھی جو لباس ستر پوشوں کے لیے ہوتا ہے۔ یہ ہمہ وقت اسے یاد دلایا کرتی تھی کہ اس کے باپ نے کیا کیا۔ یہ اسے سکھایا کرتی تھی کہ اسے کیا نہیں کرنا۔ یہ صرف ایک کپڑا نہیں تھا یہ وہ بنیاد تھی جس پر اس نے حمزہ عزیز جمالی بشر کی بنیاد کھڑی کی تھی۔

مسجد کا دروازہ کھول کر وہ اندر آیا اور تہجد کی نماز کا اعلان کیا، بمشکل تین چار لوگ آجایا کرتے تھے نماز تہجد کے لیے وہ بھی کبھی کبھار ہی۔

اعلان تہجد، اذان، حجر، ظہر اس کے ذمہ تھی کبھی کبھار جمعے کا خطبہ بھی دے دیا کرتا تھا، جب ماموں شہر سے باہر ہوتے ان ہی دنوں وہ پانچ وقت کی اذان اور نمازوں کی امامت کرواتا تھا۔ نوری مسجد کے امام اس



کے ماموں تھے لیکن ہمہ وقت وہ مسجد کے کاموں میں مصروف رہتا۔ مسجد جاتے ہوئے مسجد سے کھانا لینے آتے ہوئے مسجد کی صفائی کرتے ہوئے مسجد کے آس پاس کے وسیع محلے احاطے کی پچی زمین پر پانی چھڑک کر صفائی کرتے ہوئے چار اطراف بنی کیاریوں کی کلاٹ چھانٹ کرتے ہوئے، سیکے کپڑے اور اخبار سے بڑا چھانک، دروازے کھڑکیاں صاف کرتے ہوئے، لمبے پانس پر ملل کاسفید اجلا کپڑا لپیٹ

نیروی لائبریری اینڈ فرینٹنگ پوائنٹ
ساکس سٹور اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
مختار پورے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کیا جاتی ہے
دکان نمبر 13 صد بازار اہر پار

کردیادوں کی گرد صاف کرتے ہوئے اندر کے باقی سازو سامان کو دھوپ لگواتے ہوئے اس کے پاس جو سارے کام تھے وہ خانہ خدا سے متعلق ہی تھے جس لگن محبت سے وہ یہ سارے کام کرتا ناو ایسا لگتا سارے جہاں میں اللہ صرف اسی کا ہے اللہ کا گھر اسے ہی پیرا ہے اس گھر کے مالک کا ایک واحد غلام وہی ہے لوگ مسجد کے دروازے پر جوتیاں اتارتے وہ درہنگی زمین پر ہی اتار دیتا اور نکلے پھر چلتا اندر آتا راستے میں نظر آتے چھوٹے موٹے کچے ٹکڑے اٹھاتا آتا۔ بڑے دروازے کے ساتھ اپنی آنکھیں نکادیتا۔ اسے مسجد سے نکلنے کی بھی جلدی نہیں رہتی تھی۔ اپنی زندگی کی بہت ساری راتیں اس نے یہیں گزار دی تھیں۔ جب جب وہ مسجد میں اکیلا ہوتا اس محبت سے گھومتا پھرنا جیسے چپکے چپکے اللہ کو ڈھونڈتا ہو اور چپکے سے اللہ کو پالیتا چاہتا ہو۔ جب جب اس نے مسجد میں رات گزار دی وہ بھی نہ سو سکا۔ وہ مسجد کے احاطے میں جہاں نماز جمعہ کی سونمازی سجدہ کرتے تھے بیٹھ جاتا، دونوں گھٹنے جوڑ کر پکڑ کر بیٹھ جاتا چادر کندھوں پر رکھی زمین پر ایسے پھیل جاتی جیسے لمبے سجدے میں غرق ہو چکی ہو اور ماضی کی غفلت پر توبہ کرتی ہو۔

وہ کوئی ورد نہیں کرتا تھا۔ نہ وہ کلام میں مشغول ہوتا، بہت عرصے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ ایسی حالت میں کچھ یہ کہا کرتا تھا۔

”اللہ ہو۔ اللہ ہو۔ اللہ ہو۔ اللہ ہو۔“

ایک رات ماموں آئے کوئی کتاب لپٹی تھی۔ حجرے سے احاطے میں اسے ایسے بیٹھے دیکھ کر نہیں ڈرے تھے کہتے تھے کوئی بجوم سا تھا۔ سب سر جھکائے گم بیٹھے تھے۔ انہیں چکر سا آیا۔ دیکھا تو وہ اکیلا احاطے میں گھٹنے جوڑے بیٹھا تھا۔ اس کے بعد ماموں نے اسے مسجد میں رات رتنے نہ دیا۔ وہ ماموں کو انکار نہیں کرتا تھا اگر وہ کہتے کہ مسجد نہ آیا کرو تو وہ اپنے اللہ کے ساتھ مسجد سے باہر آجاتا۔

بشکل ساڑھے چار سال کا تھا جب ماموں اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

علاقے کے بچے جوان سب ہی اس پر رشک کرتے ان بچوں جوانوں کے والدین بھی کرتے تھے جتنے بھی بچے اس سے قرآن پڑھ گئے تھے اس کے اخلاق و نرم گوئی کے گویہ ہو گئے تھے اسکول آتے جاتے خاص اسے مسجد اگر سلام کر کے جاتے۔ ایک بہت بڑی جماعت تھی جس میں وہ قرآن پاک پڑھایا کرتا تھا۔ بچے اسے پسند کرتے تھے وہ ان کی ماں کی طرح مشفق تھا۔ آپس کی لڑائی میں اگر کوئی ایک آدھ روٹے لکٹا تو وہ دیر تک انہیں گود میں بٹھائے رکھتا۔ روتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر اس کا پیچھے ہٹتا۔

”جہاں۔ کا کے بھاک جا۔ ماروے گا تجھے بھی۔“

اس کے باپ نے دوپٹے کا پھندا ابھی کتنا شروع کیا ہی تھا کہ اس کی ماں نے اسے بھگانا چاہا وہ بیت بن کر موت و زندگی کا تماشا دکھاتا رہا۔ روتا رہا۔ روتا رہا۔ اس کا جی پھنسا جاتا تھا۔

حمزہ عزیز جمالی خوبصورت تھا۔ واڈھی اور عمدہ وقت کی چادر گری نے صرف اسے ایک جوان بشر نہ رہنے دیا۔ برے سے برے کروار کی لڑکی بھی اس سے احترام سے ملتی تھی۔

مسجد سے گھر کی طرف اور گھر سے مسجد کی طرف آتے کئی خواتین گھر کے دروازوں میں کھڑی اسے روک لیتی تھیں۔

”جمالی بھائی جی منے کی آنکھ میں پھنسی نکل آتی ہے۔ دم کروں۔“ وہ دم کر دیتا۔

”گلے ہفتے اس کے بورڈ کے پرچے ہیں۔ سرکارو جان نہیں چھوڑ رہا۔“ کسی نو عمر جوان لڑکی کا سر آگے کر دیا جاتا۔ وہ ماموں سے کیسے جکھی گئے بتا دیتا۔ دم بھی کر دیتا۔ کچھ جو اسے گلی میں نہ روک سکتے وہ مسجد کے حجرے میں بلا جھک نماز عصر کے بعد آجاتے اور رات گئے تک آتے رہتے۔ ماموں عصر کے بعد باقاعدہ بیٹھے تھے لیکن صرف مغرب تک باقی لوگ کچھ

دن میں چکر لگا جاتے کچھ قبل از عشاء سے بعد از عشاء تک۔

دم کرواتے، پانی پڑھواتے۔ رشتوں کے دعا کرواتے، کسی چھوٹے بڑے نقصان کی بابت پوچھے جاتے وظیفہ و صدقہ، نوافل کا طریقہ لے جاتے، کچھ خواتین صرف خواب بتانے آتیں۔ مولوی عبدالحکیم انہیں تعبیریں بتا دیتے۔ کچھ استخارہ کرواتے آتیں کچھ دعا کے لیے کہہ جاتیں، وہ کتنا کہ استخارہ خود کرنا چاہیے لیکن ان پڑھ عورتیں بعد رہتی تھیں کہ وہی ان کا استخارہ کریں۔ جمالی ماموں جتنا قابل تو نہیں تھا لیکن تموزا بہت کچھ کر لیتا تھا۔ مزید وہ نکاح خواہ بھی تھا کچھ اتفاقات ایسے ہوئے کہ مولوی عبدالحکیم صاحب نے جن جن کا نکاح پڑھوایا۔ انہیں طلاق ہو گئی یا وہ بیوہ ہو گئیں، کچھ بس کچھ بھولیں وہ بھی رہیں کہ شوہر شکی، ٹھکڑے، برے اخلاق کے ٹکڑے۔ اور جن جن کے جمالی نے نکاح پڑھوائے وہ ہستی بستی رہیں تو سب ہی نے بس آپوں آپ ہی یقین سا کر لیا کہ جس کا نکاح حمزہ جمالی پڑھوائے گا وہ لڑکی سکھی رہے گی۔

جناب مولوی عبدالحکیم صاحب بھی خوب جانتے تھے لوگوں کے اس یقین کو، لیکن ساحد کرنے والے تھے لیکن بشری تھے نا جسمی کبھی سوچا کرتے۔ ”قاتل کا بیٹا ہے۔ خون میں گناہ عظیم کا عیب دوڑتا ہے۔“ پھر توبہ کرتے۔ تبکہ صرف شیطان کو ہی بھلا۔

اکثر لڑکے والوں کا اعتراض ہوتا ”یہ اتنا سال کا نکاح پڑھائے گا کوئی برگزیدہ بزرگ مولوی نہیں ہیں آپ کی مسجد میں؟“

”برگزیدگی کے لیے بزرگ نہیں توفیق ضروری ہے بس۔“ کسی نے کہا۔

”نکاح تو جی عزیز جمالی ہی پڑھائیں گے۔“ پوچھنے والے کو جواب ملتا بعد از ان دنوں کی زبانی سب کو معلوم ہو ہی جاتا کہ نکاح حمزہ جمالی سے پڑھواتا ہی کیوں ضروری تھا۔

لڑکیاں بابا یاں جو کبھی رواجی انداز میں لڑتیں تو جل

کرید دعا دیتیں۔ ”اللہ کرے تیرا نکاح مولوی حکیم ہی پڑھائے۔ عزیز جمالی تیری بارات کے دن شہر سے باہر ہوں پیار ہو یا صاف صاف انکار کر دس آئیں۔“

نکاح سے متعلق کسی ایسی افواہ کی جھلک اس تک آتی تو وہ شرمندہ سا ہوتا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس کے ماموں کے سامنے ایسے کھڑا کیا جائے۔ دنیا کے لوگ تو اپنے فائدوں پر عزت و تکریم دیتے ہیں نا۔ لیکن اس کے ماموں نے اسے کسی بھی فائدے کے لیے عزت و تکریم نہیں دی تھی۔ اگر کچھ تھا تو بس کی محبت اور خوشنودی اللہ۔

دہنوں کے لمبے گھونگھٹ تلے اس نے کئی بار رجسٹر رکھے۔ قبول ہے قبول ہے اس نے بہت بار سنا۔ کسی ہندی لکے چوڑی بچے ہاتھ نے اس کی توجہ نہ پکڑی۔

”وہ کبھی وہ خود پیشیں گرفتار محبت نہ ہوا۔“

اس کا باپ قاتل تھا۔ نہ جانے کیا چ تھا اس کی ماں سبھی یا باپ کی شکی نظر۔ وہ اسے بھی حرامی کہا کرتا تھا۔

”عمر قید کی سزا کاٹ کر وہ کسی باہر کے ملک چلا گیا تھا۔“

اس نے اپنی آنکھوں سے اسے باپ کو قاتل بننے دیکھا تھا اس کی ماں کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔ اور موت کے پر اس کی پشت سے ہو کر آنکھوں کے سامنے پھر پھر اڑا رہے تھے وہ آنکھیں موت سے خوف زدہ نہیں تھیں وہ تو بس توجہ کنال تھیں کہ انہیں ایسے غلیظ الزام کے سائے تلے موت کے مقدس دروازے کی طرف وداع نہ کیا جائے۔

حمزہ عزیز جمالی کو اسی عمر سے چپ لگ گئی تھی۔ اسے موت سے نفرت نہ ہو سکی کیونکہ اس کا باپ قاتل تھا۔ اسے زندگی سے محبت نہ ہو سکی کیونکہ اس کی ماں مقتولہ ہو چکی تھی۔

وہ موت کی حیات سے باہر نکل آیا تھا۔ اسی وقت داوا مرحوم نے اس کی آنکھوں کو چوما تھا ”اللہ وایوں۔ اللہ وایوں۔“

موت و حیات سے پرے ان آنکھوں میں دیکھ کر لوگ نظریں جھکا لیتے تھے۔ مودب سے ہو جاتے تھے۔

”اللہ والوں۔“

وہ بشری آنکھیں تھیں۔ وہ بشر سے خالی تھیں۔ وادار موحوم نے اپنے بیٹے کو خود پولیس کے حوالے کیا اور اسے ماموں کے

ماموں اسے لے آئے، بے چارے ڈرے ہوئے تھے اس کے خون سے رات دن ایک ہی سبق دیتے تھے۔

”بچے عزیز جہلی جہاں سے آئے ہیں سب ہی کو وہیں واپس جانا ہے دنیا میں کتنے بھی ہاتھ پیر مار لو ٹھوڑے دوڑالو۔ ٹھیک اسی جگہ جانا ہے جس بنیاد سے اکھاڑ کر اس عارضی ٹھکانے بھیجا ہے۔ پر جیسے پاک صاف آئے تھے ویسے پاک صاف ہی جائیں تو بات بن جائے۔“

”چھاپ پھر بات بن جائے گی۔“ بہت سالوں بعد مسجد کے احاطے میں صادقین کی فائل بہ سجدہ آیات کی طرح سر جھکا کر اس نے خود سے پوچھا، خود کو بتایا تھا۔

ایک دن مولوی حکیم نے اسے حالت نماز میں دیکھ لیا تو رو پڑے۔

”اس کا باپ قاتل بنا، اس کی ماں مقتولہ بنی، وہ حالت نماز میں نہیں تھا۔ وہ بات بتا رہا تھا۔“

حجرے میں بیٹھا وہ صبح مسلم بخاری پڑھ رہا تھا وقفے سے خواتین آتی جاری تھیں اپنے مسائل لے کر۔

”مولوی جی، اسے دم کروں کبھی ہے سر پھینا جاتا ہے۔“ خاتون لاہروانی سے دوپٹا اوڑھے لکڑی کے بچہ پر آکر بیٹھ گئیں ساتھ ہی ایک لڑکی درو سے بے حال ہوئی آنکھیں لقمیا، بند کیے بیٹھی تھی۔

”یہ پانی لائی ہوں، اسے بھی دم کروانا ہے۔ دونوں

سے تڑپ رہی ہے۔ گو جزاوالہ گئے تھے شادی میں، وہیں نظر لگی کہ ٹھنڈ لگی، درد جانے کا نام نہیں لے رہا۔“

وہ چوتھے پر بیٹھا تھا۔ سر ہلا کر آیات پڑھنے لگا۔ ماں پیچھے کو کھسک گئی اور لڑکی چوتھے کے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ مسلسل اپنا سر مسل رہی تھی اور ہائے ہائے کر رہی تھی۔

جہلی نے ذرا سا آگے کو جھک کر لڑکی کے سر پر پھونک ماری۔

پھونک کی ہلکی سی ہوا اسے ناگوار گزری یا اسے سکون ملا۔ لڑکی نے جھٹ اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ہائے ہائے رک گئی۔ آہ میں ڈوبی آنکھیں جسم ہو گئیں۔ ان آنکھوں میں درد کہاں تھا۔

وہاں تو کچھ اور ہی تھا۔ کیا تھا۔ کیا تھا۔؟؟ وہ درو ہی نہ تھا صرف جہلی دوسری پھونک مارنا بھول گیا۔

جہلی جان نہ سکا۔ وہ دیکھ ضرور رہا تھا لیکن پائیں رہا تھا۔

”اگر جوگی کا کوئی جوگ تھا تو وہ اس کی آنکھیں تھیں۔“

اگر عشق مجسم صورت کہیں تھا تو وہ ان آنکھوں میں ہی تھا۔

لیکن وہ کسی مفوم میں ملفوف (سپردہ) تھیں وہ جان نہ سکا۔

ہائے ہائے کرتے لڑکی نے آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن وہ جہلی کے اندر وا ہو چکی تھیں وہ رنگ تھا لیکن انجان تھا کیوں ہے۔ میٹھ ملہار گونجا۔ چم چم بارش ہونے لگی۔ اسے اچھا لگا۔

خالہ بتول کی لائی پانی کی بوتل اس نے کانٹے ہاتھوں سے پکڑی اور بہت دیر لگی لیکن پانی پر اس نے دم کر ہی دیا۔

”اس کے لیے دعا کریں ذرا۔ مجھے تو شک ہے کوئی سایہ وایہ ہو گیا ہے اسے۔ روٹی رہتی ہے ہر وقت۔ کل رات اٹھ کر جو پاگلوں کی طرح دھاڑیں ماریں اس نے میں تو ڈر گئی۔“

اس نے سورہ النہاس اور سورہ الفلق پڑھنا شروع کی لیکن دوبارہ اس کی طرف نہ دیکھا۔

”کسی کوئی بات نہیں ہے خالہ جی۔ ٹھیک ہو جائے گا سر درد۔“

”مجھے ایک اور دم کروں مولوی جی!“ زمین کی آخری تہ میں دبے ہوئے انسان کی سی آواز نکلی اس کی اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور ہائے ہائے کی ٹھہرا رک کر خاموش دہائی میں بدل گئی۔

”بڑی وحشت ہوئی ہے جی مجھے۔ مولوی جی۔ مولوی جی۔“ اس نے سینہ سلا ”میرا دل پھٹا جاتا ہے۔ میرا اندر۔“

”بڑا تھوہہ جہاں ہم گئے تھے مجھے تو یقین ہے کچھ دیکھ آئی ہے وہاں ڈر گئی ہے۔“

جوگی کا جوگ آنکھوں کے رستے بننے لگا وجود کے آ پار دکھائی دینے لگا۔

”میرا جی چاہتا ہے جی میں مر جاؤں۔ میں مر جاؤں جی۔“

اس نے یہ کہتے آنکھیں پھر سے پوری کھول دیں۔ جہلی کی آنکھیں ان آنکھوں میں گر گئیں۔ نہیں ویسے نہیں جیسے مرد کی عورت کی آنکھوں میں لڑتی ہیں۔ پھر کیسے۔ جیسے بھی بس وہ ان آنکھوں سے بننے کو تیار نہ تھیں۔ وہاں عشق مجسم صورت لیے پھیل کر جاتا تھا۔

وہ سانولی سی تھی، لمبی تکی، مڑی تڑی سی نہ جانے کس رنگ میں سے ڈوب کر ابھری تھی۔ کس رنگ سے یک رنگ ہوئی تھی کہ جزوہ عزیز جہلی کی نگاہیں نہ تھکتی تھیں۔ بس تکتی تھیں۔

وجود وجود اور جمال و جمال کی وہ دہلیز پر جا کھڑا ہوا۔

یہ کیا ہوا؟

وہ تو چوتھے پر حجرے میں بیٹھا تھا۔ وہ مسجد کے احاطے میں عشق یار میں کیونکر جھوم رہا تھا۔ اس کا وجود تو حجرے میں بیٹھا تھا۔

جہلی نے ایک اور دم کر دیا۔ اور اپنا سینہ مسلنے لگا۔

”ہائے ہائے“ فراق کی دہائی میں بدلی۔

ماں بیٹی دونوں چلی گئیں۔ دم کر کے وہ بے دم ہو گیا۔ خاموش ہی رہتا تھا لیکن اس بار ایسی خاموشی تھی کہ مائی نے عجیب بات پوچھی۔ ”ماں یاد آ رہی ہے جہلی؟“

اس نے نفی میں سر ہلادیا۔ بھولے گی تو یاد آئے گی نا۔

”چھاپ تجھے دیکھ کر دل کو ہول پڑ رہے ہیں۔“ روئے کو دل چاہتا ہے۔ جی چاہتا ہے دنیا داری چھوڑ کر

کسین رو پوش ہو جاؤں۔“

وہ مائی کی صورت دیکھنے لگا۔

شادی کے اکیس سال بعد مائی ماں بننے جاری تھی۔ ایک بار اسے فطری عبادت کرتے دیکھ کر روئے لگی جب تک اس نے سلام پھیرا تب تک وہ جائے نماز کے قریب زمین پر بیٹھ کر روٹی رہی ہچکیاں لیتی رہی۔ پھر اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

”تو دعا کر جہلی! ایسے ہی جیسے عبادت کر رہا تھا۔ ایسے ہی دعا کر۔“ مجسم دعا بن جا میرے لیے۔ میرے پاس بھی کوئی تیرے جیسا ہو کہ جس کی اذان پر میں نماز کی تیاری کرنے لگوں۔ ایسے ہی جہلی میرے بچے جیسے تو عبادت کرتا ہے۔ میرے لیے فریاد کرو۔“

وہ مہموت مائی کو دکھاتا رہا، ایسی شدت اور چاہت جس پر مائی ہنسی ہنسی جاتی تھی وہ فدا ہو گیا۔ اتنی چاہ۔ ایسی چاہ۔

اسے اپنی عبادت بے کار لگی۔ اس میں ایسی چاہت تو نہ تھی۔ اسے بدگمانی ہوئی۔ اس میں یہ شدت نہ تھی۔

اس نے خود کو از سر نچاچا۔

اگلے دن خالہ بتول آئیں ہدیے کے ڈبے میں سو روپے ڈالے۔

دو کھتی ہے مولوی جی جاو گر ہیں۔ سکون سے سوئی رات بھر پانی میں نے سارا پلا دیا تھا یہ بوتل لائی ہوں۔

اسے بھی دم کر دیں۔

اس نے بول دم کر کے دے دی، عشاء کے بعد اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر عائشہ فاطمہ آئی اس کی سیاہ چادر کے ساتھ تنکے اچھتے تھے اور چادر کے پلو مٹی سے اٹے تھے شوار قمیض سے نہیں ملتی تھی اور چادر لباس کے ساتھ منہ سر اور ہاتھوں پر بھی مٹی لگی تھی وہ یقیناً ”آتے ہوئے گئی تھی“ اس کے بھائی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

”مولوی جی دل پھٹا جاتا ہے جی۔ آگ لگی ہے جی اندر۔ کچھ کر دیں۔ کچھ تو کر دیں مولوی جی۔“ کچھ کرنے کے لیے وہ کہہ رہی تھی جو عزیز جمالی پر بہت کچھ کر چکی تھی۔

”کیا ہوا ہے۔ خواب میں تو نہیں ڈر گئی؟“ ”جانتی نہیں جی کیا ہوا ہے۔ بس جی کچھ کر دیں۔ آگ لگی ہے اندر۔“

اس کے اندر واقعی آگ بھڑکی تھی۔ اس کا وجود مجسم آتش نظر آتا تھا۔ آخریہ آگ اسے کیونکر لگی۔ عزیز جمالی کو جتنے دم درود آتے تھے اس نے ہنہ کر اس پر بھوکہ دے اور لکڑی کے ٹیچر پر بیٹھے بیٹھے اس نے ایک ذرا سکون کا سانس لیا۔ وہ دہائی سے آہ میں پڑی۔ اپنے سر منہ کی مٹی چادر کے پلو سے صاف کرنے لگی۔

”آپ بڑے اچھے ہیں جی۔ میں تو کم لی ہو گئی ہوں۔ جادو گر ہیں آپ! اماں کہتی ہیں دیلوں کی روح ہے آپ میں۔ بزرگوں کے سائے میں بیٹھتے ہیں آپ جی۔“ وہ جھک کر رکی اپنے بھائی کی طرف دیکھا حجرے میں رکھی چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔

وہ بول رہی تھی ایسے لگتا تھا کلام امیر خسرو کو مناجات میں شامل کرتی ہو، جیسے سنگیت کار نے اس راگ کو جا پکڑا ہو جو اسے ابن الوقت بنانے والا ہو وہ چپ ہوئی تو ایسے لگلا کھوں کروٹوں مجاوروں نے اپنی سائیں روک لی ہو۔ حق ہو کا درد انہیں جذب کرنا ہو۔

”وہ جی کچھ کر دیں جی۔ مولوی جی۔!“ بتتے پانی پر چلنے کے سے انداز سے اس نے کہا کوئی اسے اس پار لگا دے کوئی تو۔

وہ کس پانی پر چل رہی تھی۔ اسے کس پار جانا تھا۔ پھر وہ ایک دم سے کھڑی ہو گئی اور چلی گئی۔ زمین پر کچھ جاتی اس کی چادر پر عزیز جمالی نے کئی بو سے دیکھ نظر سے۔

عزیز جمالی عبادت کے لیے کھڑا ہوا تو اسے لگتا اس کی عبادت کھوکھلی ہے وقت تجدد کئی گلیوں کو پار کر کے مسجد تک کا سفر کرتا تو اسے لگتا اس کے آگے پیچھے کا قافلہ اس سے پھڑ گیا ہے۔ جیسے ہی وہ عائشہ فاطمہ کے بارے میں سوچتا سب کچھ کھوکھلا ہو جاتا۔ آخر وہ کس مقام پر کھڑی تھی کہ اسے دیکھتے ہی اس کے کیا تال کا سفر جاری ہو جاتا وہ ”کئی جاناں میں کون“ ہو جاتا ”نہ میں مومن وچ مستل۔“ اس کا پول کھل کھل جاتا۔

اگلے دن وہ پھر آئی۔ اس بار اکیلی تھی شلوار کے پانچے مٹی سے اٹے تھے۔ یہی حال چادر کے کونوں کا تھا آنکھوں کی حالت ایسی تھی جیسے آگ اپنی منزلیں طے کرتی ساتویں آخری منزل پر جا کھڑی ہو۔

”مجھے تعویذ لکھ دیں جی!“ اس نے ایسی منت سے کہا جس منت سے مرید اپنے مرشد کو جا پکڑتا ہے۔

”میں تعویذ نہیں لکھتا۔ ماموں جی لکھتے ہیں۔“ ”بڑے مولوی جی۔“ وہ بہت ماموں ہوئی ایسے لگنے لگا جیسے دھاڑیں مار کر ایسے روئے گی کہ انت کر دے گی انت ہی ہو پھر۔

اس کے جاتے ہی عزیز جمالی پر بے سکونی موسلا دھار بارش کی طرح برسی وہ گھر کی طرف بھاگا اور رضائی لپیٹ کر سو گیا۔ مای حیران پریشان کئی بار آئی اسے کانٹے ہوئے دیکھ کر گئی۔ مولوی جی آئے اسے دم کیا بخار دیکھا لیکن بخار نہیں تھا۔

دونوں میاں بیوی نے سوچا ”لاکھ انکار کرے اب

اس کی شادی کر ہی دیں گے۔ کئی دن بعد اس کی حالت سنبھل تو ہی نے بڑے پیار سے پوچھا۔

”شادی کر دیں تیری؟“ وہ خاموش رہا۔ ”تیرے ماموں کو بہت سے لوگوں نے کہہ رکھا ہے۔ میں چاہتی ہوں۔ لڑکی سیدھی سادی ہی ہو۔ آس پاس کے گھروں میں کئی لڑکیاں ہیں بڑا پیار کرتے ہیں مجھے سب صاف صاف کہہ جاتے ہیں کہ ان کی خوش قسمتی ہوگی اگر تو انہیں عزت دے۔ کیا کہتے ہو۔ ہاں کروں اپنی پسند سے؟“

وہ خاموش رہا۔ ابھی وہ وہاں تال میں تھا شاید اس کی ماں نے بھی کہا ہو۔ اگر نہ بھی کہا تو وہاں کے جانے سے ہی۔ عائشہ فاطمہ اور عزیز جمالی اس سوچ سے وہ بے چین سا ہو گیا اور کمال کی بات کہ اسی پر وہ فدا سا ہو گیا جیسے کمال طالب کو اسباق کمال ملنے والا ہو۔

وہ رات دن اسے سوچ رہا تھا جیسے حرف بہ حرف قاعدہ عشق پڑھ رہا ہو۔ وہ لفظ لفظ پر دنگ رہ جاتا۔ ذرا ہو ہو جاتا لیکن جیسے جیسے بڑھتا جا رہا تھا۔ تشنگی سے مرنے کے قریب ہو تا جا رہا تھا۔

بول بی بی آئی۔ حجرے میں بڑی حواس پاختہ سی تھی ایک پر پی آگے کی۔ اس پر ایک مروانہ ایک زنانہ نام لکھا تھا دو سری طرف عائشہ فاطمہ والدہ بول بی بی لکھا تھا۔

”ان کا استخارہ کر دیں جی!“ اس نے ایک گہری سانس بھی لی عزیز جمالی کی آنکھوں کے آگے شب گیر تاپنے کو دے لگے۔

”میرا جیٹھ ہے صدیق سالک اور لیا زاس کا بیٹا۔ کل آئے تھے میرے پیروں میں سر رکھ دیا۔ میں نے بھی کہہ دیا مولوی صاحب سے مشورہ اور استخارہ کرواؤں گی دل مطمئن نہ ہوا تو صاف انکار ہے۔“ بول بی بی نے آہ لی۔

”میرا جوان بیٹا مارا تھا اس مردود نے گاؤں میں زمین کا بھگڑا تھا۔ بدلے میں اس کا بیٹا چھانی چڑھ گیا۔ کیسے رشتہ دے دوں۔ کیسے دے دوں مولوی جی۔ پر

اپنی پگڑی رکھ گیا ہے ہمارے پیروں میں کہتا ہے جوان بیٹا زہر کھالے گا۔ مر جائے گا۔ ایک مر گیا ہے۔ دوسرے کو کیسے مرے دیں۔ مر جائے میری بلا سے۔ پر۔“

اس نے آہ لی۔ ”بہت شادی میں کیا گئی یہ بلا میں جان کو آگئیں۔ اپنی ساری زمینیں دینے کو تیار ہیں پر اب کیا فائدہ میرا شیر جوان بیٹا مار ڈالا۔“ بول بی بی انھیں صاف کرتی رہیں ”میں کل آ جاؤں گی۔ استخارہ بھی کر دیتے گا جی۔ ٹھیک ٹھیک دیکھیے گا جی۔ مجھے برا اعتبار ہے آپ پر۔ پھر چاہے زہر کھائے کہ پھاسی چڑھے میری بلا سے۔ میرا شیر جوان بیٹا۔ کیسے دے دوں رشتہ۔ پر حالت دیکھی نہیں جانی اس کی۔“

مسجد کے خادم کی طبیعت نامساں تھی اس لیے آج مسجد میں اسے ہی رہنا تھا۔ احاطے میں بیٹھ کر وہ دیر تک اس کے حق میں دعا کرنے کی کوشش کرتا رہا پر ہاتھ نہ اٹھے گھر سے آیا اس کا کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا جس بستر پر اسے سونا تھا وہ بے نشن رہا تھا۔ کندھوں پر گری کلی چادر زمین پر پھٹی جا رہی تھی۔

استخارہ بہترین تھا۔ لڑکا لڑکی کے لیے ٹھیک تھا۔ لڑکی لڑکے کے لیے پھر حزن عزیز جمالی کا کیا ہو گا؟ عشاء کی نماز کے بعد وہ کوئی پچاس بار حساب لگا چکا تھا۔

اس کی مرضی کا حساب آگر ہی نہیں دے رہا تھا۔ چاروں اطراف محرابی برآمدوں کے پتھوں بیچ عزیز جمالی سجدہ کرتی کلی چادر لیے کسی اور کے لیے ہی قیام کیے بیٹھا تھا۔

یہاں اب کوئی خدائی سوال نہ تھا۔ آس پاس کوئی ہجوم محسوس نہ ہوتا تھا۔ وہاں کوئی چٹہ پوش۔ رو پوش کسی صورت موجود نہ تھا۔ کیونکہ وہاں کسی بشر کا سوال نکالا جا رہا تھا۔ عبادت گاہوں کو انسان نہیں ”عشق“ آباد کرتے ہیں وہاں اب کوئی عاشق نہ تھا سوال بشر کا

نکالا جا رہا تھا جواب بشر کا چاہیے تھا مسجد ایسے ہوئی
جیسے صدیوں سے ویران ہو وہاں کبھی رقص طالب
نہیں ہوا۔ مسجد میں ایسا سنانا پھیل گیا جو صحرائے عرب
میں ظہور نبی آخر الزماں سے پہلے پھیلا تھا۔ آنکھیں
عاشقہ فاطمہ اور ایاز سالک پر گزری تھیں۔

آنے کی اجازت لینے آئی تھی عزیز جمالی ایک طرف
ہو گیا وہ اندر آگئی۔

گے سودا نہیں کریں گے۔“
عزیز جمالی نے اس مجسم عشق کی طرف عقیدت سے دیکھا۔ ”تو یہ تھا وہ جو گئے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ جو گئی ہو گیا تھا، وہ دھڑلے سے دل لگا بیٹھی تھی اور کھلی ہو گئی تھی۔ رات کے ان پہلوں میں وہ عبادت کے لیے کھڑا ہوا کرتا تھا اور وہ اپنا رانچھاپانے نکلتی تھی۔ وہ رات کے دل لگا بیٹھا تھا اور سوال بدل بیٹھا تھا۔ وہ ایسے سانس لے رہی تھی جیسے کوئی اس کے اندر اس کی حیات کی جڑیں کاٹ رہا ہو۔ حیات جو وہ کسی اور کو بنا بیٹھی تھی۔“
”کچھ کریں جی۔ کچھ کریں جی۔“ وہ سینہ مسلنے لگی۔

اس کے ہاتھ میں شہادت آتی جا رہی تھی اور اس کا باپ گناہ عظیم کا مرتکب ہو رہا تھا۔
عاشق فاطمہ کو اپنے حصے میں لکھتے وہ بھی گناہ عظیم کا مرتکب ہوا تھا۔ محبوب حقیقی پر ایسا یو پار کرتے وہ۔

خودکشی

”ارے واؤ۔۔۔ کتنا خوب صورت ڈریس ہے۔“
ماہم نے شیشے کے شوکیس میں سجے سیاہ انارکلی
اشاکل کے خوب صورت فراق کو دیکھ کر بے ساختہ
کہا۔

فراق کے اوپری حصے پر گولڈن اور سلور کلر کے
بڑے بڑے ٹکینے جڑے ہوئے تھے۔ ان ٹکینوں کے
درمیان خالی جگہ کو موتیوں اور چھوٹے چھوٹے ڈائمنڈ
کٹ اسٹونز سے اس طرح بھرا گیا تھا کہ بال برابر جگہ
بھی خالی نہیں رہ گئی تھی۔ جگر جگر کرتے ہوئے فراق
سے پھونٹتی سنہری اور دودھیاروشنی کی شعاعیں آنے
جانے والوں کو ٹھک کر رکنے پر مجبور کر رہی تھیں۔
فراق کے دوپٹے اور گھیرے پر سجے جامہ دار کے
گولڈن اور سلور بھجڑے اسٹائلشن بتا رہے تھے۔
فراق کی خوب صورتی میں کھوئی ماہم حقیقتاً کسی
بت کی مانند بے حس و حرکت ہو چکی تھی۔

”جلدی کرو ماہم! دیر ہو رہی ہے۔ ابھی انجم اور صنم
کی شاپنگ کرنی ہے اور تمہارے لینے کے ساتھ
میچنگ جوتا بھی تو ڈھونڈنا ہے۔ مغرب کی اذانیں
ہونے والی ہیں۔ تمہارے ابو پریشان ہو رہے ہوں
گے۔“ فریدہ بیگم نے ماہم کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے
کہا، جو وہاں کسی جسمے کی طرح جم کر کھڑی تھی۔

”امی۔۔۔ مجھے یہ ڈریس دلوادیں! دیکھیں نا کتنا خوب
صورت ہے۔ شادی کے بعد جب میں حرا کی شادی پر
پھپھو کی طرف جاؤں گی تو یہی پہنوں گی اور اس کے
ساتھ گولڈن اسٹونز اور موتیوں کا سیٹ جو خالہ نے
گفت کیا ہے اور ساتھ میں ڈھیر ساری چوڑیاں اور

گولڈن ہیل والا جوتا پہن کر تو میں بالکل پرنسز لگوں
گی۔“ ماہم نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا۔

”کیا ہو گیا ہے ماہم! کیوں فضول باتیں کر رہی ہو؟
تمہارے جینز کے سارے کپڑے بن چکے ہیں اور سب
ہی تمہاری پسند سے بنوائے ہیں۔ اب مزید کی گنجائش
بالکل نہیں ہے اور پھر ذرا اس جوڑے کی قیمت تو دیکھو
پارہ ہزار روپے۔ اتنا مہنگا سوٹ نہیں بنوا سکتی میں
تمہارے لیے۔ چلو اب میاں سے اور جلدی سے جوتا

پسند کرو، میری توبہ جو میں تمہیں آئندہ بازار لے کر
آؤں، ہر مرتبہ تم میرے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی
کر دیتی ہو۔“ فریدہ بیگم نے شیشے کے بارے فراق
کے ساتھ منسلک ٹیک کو غور سے دیکھتے ہوئے
قطعیت سے کہا۔

”امی! اگر آپ مجھے یہ ڈریس خرید کر نہیں دیں گی تو
میں جوتا بھی نہیں لوں گی۔“ ماہم کا لہجہ ہٹ دھرمی
لیے ہوئے تھا۔

”ٹھیک ہے مت لو، لیکن تمہاری یہ ضد بالکل
نہیں مانوں گی۔“ فریدہ بیگم نے مین روڈ کی طرف
جاتے ہوئے حتی انداز سے کہا۔

”ارے اتنی جلدی آگئیں تم دونوں ماں، بیٹی۔
ہو گئی شاپنگ پوری۔“ ماجد صاحب نے جو گیٹ کے
پاس بنی چھوٹی سی کیماری میں لگے پودے سے ہری
مرچیں توڑ رہے تھے، ماہم کو تیزی سے گیٹ کھول کر
اندر آتے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ جواباً ماہم نے

انہیں آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا اور پھر اگلے ہی
لمحے تقریباً بھاتے ہوئے اپنے کمرے کے دروازے
کے پیچھے غائب ہو گئی۔

”مے کیا ہوا؟ جوتا نہیں ملا کیا۔“ ماجد صاحب نے
تھکے تھکے قدموں سے گھر میں داخل ہونے والی فریدہ
بیگم سے استفسار کیا۔

”بتاتی ہوں، ذرا سانس تو لینے دیں۔“ فریدہ بیگم
نے رنکے ہوئے دوپٹوں کا شاپر تخت پر رکھتے ہوئے

کہا۔
”تم سانس لیتی رہو، میں خود ہی ماہم سے پوچھ لیتا
ہوں۔“ ماجد صاحب تیزی سے اندر کی طرف بڑھے۔
اپنی لاڈلی کی آنکھوں میں آنسو ان سے برداشت نہیں
ہو پارہے تھے۔

”کیا ہوا بیٹا!“ ماجد صاحب نے ماہم کے سر پر ہاتھ
پھیرتے ہوئے پیار سے پوچھا جو صوفے پر بیٹھی
بچیوں سے رو رہی تھی۔ ماجد صاحب کے الفاظ پر



اس کے رونے میں تیزی آگئی۔

”وہ ابو آج مجھے بازار میں ایک بہت پاراسوٹ پسند آگیا۔ میں نے اسی سے کہا کہ مجھے وہ فراق دلوا دیں، لیکن امی نے انکار کر دیا۔ ابو! میرے کپڑوں میں ایک بھی فراق نہیں ہے اور۔“

”پڑے بونائے وقت تم نے ایسی کوئی فرمائش نہیں کی اور اب جبکہ ہمارے پاس بارہ سو کا جوڑا خریدنے کی گنجائش نہیں ہے، تم بارہ ہزار کا فراق خریدنے کی فرمائش کر رہی ہو۔“ فریدہ بیگم نے اسی وقت حاضر ہو کر ماہم کی بات کاٹنے لگے۔

”بارہ ہزار۔“ اس بار ماجد صاحب بالوجہ بھی تشویش لیے ہوئے تھا۔

”ماہم بیٹا! تمہیں تو پتا تو ہے کہ اب ہمارے پاس صرف شادی کے کھانے کے میسے ہی بچے ہیں، بارہ ہزار کا سوٹ خریدنے کی ابھی تو گنجائش نہیں ہے، لیکن فکر نہ کرو، بس تھوڑا سا انتظار کرو، میں وہ سوٹ تمہیں ضرور دلوا دوں گا۔“ ماجد صاحب نے ماہم کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”میں ابو! مجھے یہ سوٹ ابھی چاہیے۔ آپ امی کا پرس چیک کریں۔ ان کے پرس میں پندرہ ہزار روپے ابھی بھی موجود ہیں۔“ ماہم نے حنفی سے ماجد صاحب کا ہاتھ جھٹکا۔

”لیکن ماہم! وہ میسے تو انعم اور صنم کے کپڑوں اور چوڑی کے لیے رکھے ہیں، وہی تو لینے گئی تھی میں، لیکن تمہاری وجہ سے خرید ہی نہیں پائی، تمہیں پتا تو ہے، پھر ان پیسوں کی بات کیوں کر رہی ہو؟“ فریدہ بیگم کے لمحے میں پریشانی نمایاں تھی۔

”مجھے کچھ نہیں پتا، آپ کے پاس پیسے ہیں۔ آپ بس مجھے وہ فراق خرید کر دیں۔“ ماہم نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ اس کی اوچی آواز انعم اور صنم کو بھی کمرے میں کھینچ لائی۔

”لیکن ماہم! اگر تمہیں وہ سوٹ دلا تو پھر یہ دونوں تمہاری شادی میں کیا پہنیں گی۔ بہن کی شادی پر نئے کپڑے بنوانا ان کا حق نہیں ہے کیا؟“ فریدہ بیگم کا

تھکا تھکا سا لہجہ ان کی دلی تکلیف کی جھلکی کھارہا تھا۔
”تو پورے کرس ٹان ان کے ارمان میں نے کب منع کیا ہے۔ لیکن مجھے وہ ڈریس دلا دیں۔“ ماہم کی وہی ایک رٹ تھی۔

”لیکن بیٹا، تم خود حساب کرو، بالکل گنجائش نہیں ہے۔“ فریدہ بیگم کا سنا ہوا لہجہ ان کی پریشانی کا غماز تھا۔
”یہ میرا مسئلہ نہیں ہے امی! میں نے ساری دنیا کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا، مجھے بس وہ ڈریس خرید کر دیں۔“ ماہم نے خود غرضی کی آخری حد کو چھوا۔

”نہیں ماہم! میں یہ نہیں کر سکتی۔ اپنی ایک اولاد کی خواہش پوری کرنے کے لیے باقی کی حق تلفی کروں۔ انعم اور صنم کے کپڑے واقعی تمہارا مسئلہ نہیں

ہمارا مسئلہ ہیں۔ لیکن یہ مت بھولو کہ والدین کے مال و اسباب پر ان کی ساری اولادوں کا برابر کا حق ہوتا ہے اور جب اولاد آپس میں ایک دوسرے کے حق پر ڈاکہ ڈالنے لگے تو والدین یہ بات برداشت نہیں کر سکتے۔ سمجھو اس بات کو اور دماغ مت خراب کرو میرا۔“ فریدہ بیگم نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ لیکن ماہم پر کوئی اثر نہ ہوا تو کچھ کر جیسے ٹھک کر بیٹھ گئیں۔

”خود غرض۔“ تیزی سے کمرے سے باہر نکلتی ہوئی انعم اور صنم نے آہستہ سے کہا جسے ماہم نے بخوبی سنا۔ لیکن اسے پروا کب تھی۔

”ماجد صاحب! ماہم نے رات سے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے۔ صبح ناشتا بھی نہیں کیا اور اب کھانا بھی نہیں کھا رہی ہے۔ آخر میں کیا کروں اس کا۔“ فریدہ بیگم بے اتہار پریشان تھیں۔

”میں نے بہت کوشش کی لیکن پیسوں کا انتظام نہیں ہو پا رہا۔ تم ماہم سے بات کرو۔ اگر وہ مانتی ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ میں اپنی موٹر سائیکل بیچ دیتا ہوں۔“ ماجد صاحب نے دائیں ہاتھ سے اپنی پیشانی مسلی۔

”امی! آپ ماہم بلاتی کو ان کی پسند کا ڈریس خرید دیں، ہم دونوں بارات پر وہی کپڑے پہن لیں گے جو

اسکول کے سالانہ فنکشن پر بنائے تھے۔ بس آپ اور ابو پریشان نہ ہوں۔“ دعوت ناموں پر نام لکھتی انعم اور صنم نے فریدہ بیگم کے دائیں بائیں بیٹھتے ہوئے کہا۔
”جیتتی رہو بیٹا! فریدہ بیگم نے انعم اور صنم کو کھینچ کر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ دو آنسو ان کی آنکھوں سے نکل کر دونوں کے بالوں میں جذب ہو گئے۔ ماجد صاحب نے نعرے اپنی دونوں بیٹیوں کی طرف دیکھا۔

”دیکھو انعم! میں کیسی لگ رہی ہوں۔“ ماہم نے دائیں بائیں گھومتے ہوئے کہا۔
فریدہ بیگم وہ فراق لے آئی تھیں۔ لیکن وہ ماہم کو ساتھ نہیں لے گئی تھیں۔ اب اس کی کوئی فرمائش پوری کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔

”اچھی لگ رہی ہیں۔“ انعم نے رکھائی سے کہا۔
”پتا تھا یہ ڈریس مجھے بہت سوٹ کرے گا اور اس کے ساتھ یہ سیٹ بھی۔“ ماہم نے گالوں میں موجود جھمکوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ جن کا سنہرا پن اس کے گالوں سے جھلک رہا تھا۔ اپنی خوشی میں گم وہ انعم اور صنم کے چہرے پر ابھرتے اس دکھ کو دیکھ ہی نہیں پا رہی تھی، جو اس کے اترانے پر ان کے چروں سے عیاں تھا۔

”دیکھیں ماہم! میں ایک فیملی مین ہوں۔ میرے ماں، باپ، بہن، بھائی اور اب آپ میری زندگی ان تمام رشتوں کے بغیر ناممکن ہے، لیکن ایک بات یاد رکھیے گا۔ آپ میرے لیے کتنی بھی اہم ہوں میرے والدین کا مقام میری نظروں میں بہت بلند ہے تو پلیز کوشش کیجئے گا کہ اپنے آپ کو بھی ان کے مقابل نہ لائیں، کیونکہ اس صورت میں میرا بھوکا یقیناً میرے والدین کی طرف ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری بات اچھی طرح سمجھ چکی ہوں گی۔ باقی رہی میری بات تو ان شاء اللہ میں کوشش کروں گا کہ آپ کو خوش رکھ سکوں۔“ گمبیر لہجے میں دھیرے دھیرے بولتا ہوا

عارب ماہم کے بچے روپ کو اپنی آنکھوں میں سمورہا تھا۔ ماہم کے چہرے پر بکھری حیا آنسو مکان عارب کے لیے اس کی پسندیدگی کو ظاہر کر رہی تھی۔

”ارے امی آپ! آئیے۔“ ماہم نے اپنی ساس اور نند کو دیکھ کر فوراً صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اپنی ساس اور نند کو اپنے کمرے میں اس وقت موجود پارکروہ حیران تھی ان کا خیال تھا کہ یہ وقت خالصتاً آرام کے لیے ہوتا ہے اور اس وقت کسی کی دخل اندازی انہیں پسند نہیں تھی اور نہ ہی وہ کسی اور کے آرام میں خلل ہوتی تھیں۔ لیکن آج وہ ماہم کے کمرے میں یہ نفس نفیس موجود تھیں جو ماہم کے لیے یقیناً اچھے کا باعث تھا۔

”جیتتی رہو بیٹا! سدا سا گن رہو۔“ دعائیں دیتے ہوئے وہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ اس سبز انگرکھے میں۔ ماشاء اللہ چشم بدور! اپنا صدقہ یاد سے دے دینا۔“ عابدہ بیگم نے ماہم کی بلائیں لیں۔ ”ویسے تمہاری بری کے جوڑے بڑی عرق ریزی سے تیار کروائے تھے میں نے اور مریم نے۔ ایک سے ایک خوب صورت اور منگنا جوڑا تمہاری میں، تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہو گا کہ تمہاری بری کتنی شان دار ہے۔“ عابدہ بیگم کا لہجہ فخریہ تھا۔

”جی امی! بری کے سب ہی جوڑے بہت عمدہ اور نفیس ہیں۔“ ماہم نے خوش دلی سے جواب دیا۔ ”لیکن جناب والا ابھی آپ نے میرا فراق نہیں دیکھا۔ اس کے سامنے تو یہ سارے جوڑے پانی بھرتے نظیر آئیں گے۔“ اگلی بات ماہم نے فقط دل میں ہی سوچی تھی۔
”ماہم بیٹا! شادی کو کافی دن گزر گئے ہیں لیکن ابھی بھی تمہارے کمرے میں اپنی پیس اور بھنگو بکھرے ہوئے ہیں۔ میں آج اسی لیے مریم کو لے کر آئی تھی کہ وہ تمہارے سارے کپڑے الماری میں رکھوا دے۔ ویسے بھی مریم کے کانچ میں فنکشن ہے اور یہ



ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار



مرحبا گل بہار شربت
ہندوستان کی پہلی اور سب سے بڑی برانڈ
ہندوستان کی پہلی اور سب سے بڑی برانڈ



f Marhaba Laboratories

UAN: 111-152-152

www.marhaba.com

مجھ سے کہہ رہی تھی کہ اسے نئے کپڑے بنادوں۔ تب ہی مجھے خیال آیا کہ ابھی اس نے تم سے ”پینٹی کھلائی“ بھی وصول کرنی ہے۔ ارے بھی یہ تو منہ کا نیگ ہوتا ہے۔ بھابھی کے جینز کے کپڑوں میں سے منہ کو ایک جوڑا لٹ کیا جاتا ہے۔ یہ ہمارا بڑا پرانا رواج ہے۔ تمہیں شاید پتا ہوگا۔“ عابدہ بیگم نے استفسار کیا۔

”جی ای! مجھے پتا ہے۔ میری امی نے مجھے بتایا تھا۔“

”او مریم! ماہم نے سوٹ کیس کا کوڈ سیٹ کرتے ہوئے کہا۔ ٹک کی ہلکی سی آواز سے سوٹ کیس کھل گیا۔

”یہ تو مریم! تم پر بہت اچھے لگے گا۔ میں نے تمہارے لیے ہی خریدا تھا۔“ ماہم نے سب سے اوپر رکھا ہوا فیوڈی اور گرین طر کا اسٹائلش سا سوٹ مریم کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو بھابھی! یہ بہت پیارا ہے، دیکھیں بھائی اچھا ہے نا؟“ مریم خوب پر جوش تھی۔ عارب نے مسکراتے ہوئے ایک نظر سوٹ کی طرف دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے دوبارہ ٹی وی پر چلتے ہوئے بیچ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”چلو مریم! اب بھابھی کے ساتھ مل کر اس کے سارے کپڑے الماری میں سیٹ کر دو۔“ عابدہ بیگم نے مسکراتے ہوئے ہدایت جاری کی۔

”لا! میں بھابھی! آپ مجھے کپڑے پکڑاتی جائیں، میں الماری میں رکھتی جاتی ہوں۔“ مریم نے الماری کا پٹ وا کرتے ہوئے کہا۔

جیسے جیسے ماہم کپڑے نکال رہی تھی ویسے ویسے مریم کے منہ سے ادا ہونے والے ”واؤ!۔۔۔ یوٹی فل اور امیزنگ“ جیسے الفاظ ماہم کے لیے خرواہا کا باعث بن رہے تھے۔

”ماہم! بلو ٹنگ بھابھی! واٹ آما سٹر پیس۔“ ماہم کے سیاہ فراک کو دیکھ کر مریم بے ساختہ بول اٹھی۔

”بھابھی! آپ کا یہ سوٹ سب سے زیادہ پیارا ہے۔ امی مجھے بھی ایسا سوٹ چاہیے گا۔“ کیانی پری میں ایسا

ہی سوٹ پہنوں گی۔ بھابھی! آپ نے یہ کہاں سے خریدا تھا۔“ مریم کا لہجہ پُرشوق تھا۔

”وہ انارکلی میں۔۔“

”مریم! اگر تمہیں یہ والا سوٹ پسند ہے تو تم یہ لے لو۔ ویسے بھی پینٹی کھلائی کا سوٹ تو منہ کی اپنی مرضی اور پسند کا ہی ہوتا ہے۔ کیوں عارب! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ ماہم کی پوری بات سننے بغیر ہی عابدہ بیگم نے حکم جاری کرتے ہوئے عارب سے تائید چاہی جو بیچ کو چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

”جی ای! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ویسے بھی ماہم کے پاس تو دھیر سارے کپڑے ہیں۔ لڑکیوں کو شادی کا یہی فائدہ تو ہوتا ہے۔ مریم یہ لے لے۔ مجھے نہیں لگتا کہ ماہم کو کوئی اعتراض ہوگا۔“ عارب کا لہجہ انتہائی پر یقین تھا۔

”جی۔۔۔ اگر مریم کو یہ ڈریس پسند ہے تو وہ یہ لے لے۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔“ حیرت اور شدید غم کی ملی جلی کیفیت میں گھری ماہم نے بدقت خود کو سنبھالا۔ کیونکہ عارب کی نظروں میں گرنا اسے منظور نہ تھا۔

”تھینک یو سوچ بھابھی!“ خوشی کی شدت سے مریم ماہم کے گلے جا گئی۔

”چلیں امی! مجھے یہ ڈریس فضا کو دکھانا ہے۔“ فضا“ مریم کی کلاس فیلو تھی اور پڑوس میں ہی رہتی تھی۔ مریم نے عابدہ بیگم کو بالڈ سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

عارب دوبارہ سے بیچ دیکھنے میں منہمک ہو چکا تھا۔ دل پر چلتے ہوئے آ رہے اور بے بسی کے شدید احساس سے ماہم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جسے اس نے رخ موڑ کر چھپایا۔

”خود غرض۔۔“

مریم کے کمرے سے باہر جاتے ہی ماہم ہولے سے بڑبڑائی، لیکن اپنی آواز کی بازگشت اسے شرمندہ کر گئی۔

آج اسے اپنی بہنوں کا کرب بہت اچھی طرح محسوس ہوا تھا۔

کہاری کا گھر

”بہت برے ہو تم۔ بہت برے۔ بہت برے۔ کاش! تم ایسے نہ ہوتے۔ تم دیے ہو جیسے سب ہوتے ہیں۔“

وہ دہائے میں منہ چھپائے روئے جا رہی تھی۔ دکھ ہی ایسا ملا تھا۔ زخم بھی گہرا تھا اور وار بھی کاری تھا اور جب مسیحا ہی زخم دے تو شکوہ کس سے کرنا۔ اپنے درد کو دہاتے ہوئے ایک دم ہی اس نے خدا کو دل کی گہرائیوں سے پکارا۔

”یا اللہ! وہ اتنا برا کیوں نکلا؟“ مگر کسی کا اچھا برا ہونا کس کے اختیار میں ہوتا ہے بھلا۔ وہ جو آسمانوں کی بے بی کٹ میں پرے نصیب نے بھی اپنی ماں کی بد نصیبی بلند یوں پر بیٹھا ہے وہ جو چاہتا ہے جیسا چاہتا ہے بس وہ

ناؤلیٹ

کر دیتا ہے۔ اے اللہ! تو وہ کر دے جو میں چاہتی ہوں۔ جب میرا اپنا گھر توڑنا نہیں چاہتی تو وہ کیوں چاہتا ہے؟ تو اپنے کرداروں میں رد بدل کر دے۔ میرے مالک! میرا کردار ایسا کر دے جیسا میں چاہتی ہوں اور میں یہ بھی جانتی ہوں محض میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہو گا تو وہی جو تو چاہتا ہے۔“

اس کا ذہن مختلف حصوں میں بٹ گیا۔ ایک خیال آتا اور ایک جاتا۔ وہ دہائے میں منہ دیے روئی رہی۔ پرین کرنے شروع کر دیے تھے گھر کی سے جھانکنا



چاند خاموشی کی رداوڑھے کمرے کی کھڑکی سے نظر آتا رہا۔

اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں حیرت چمکتی پر تھی۔ آج تو سب کچھ میٹنگ کا تھا۔ پونی نیل اسکرٹ، ٹاپ، گورے گورے ہاتھوں میں کالج کی چوڑیاں اور گلابی پیروں میں براؤن اسٹرپ۔ اس کی حیرت کی وجہ قطاروں میں بنے کمروں میں سب سے آخری کمرے کی کھڑکی کی چوٹ کے کنارے پر بنا چکنی مٹی کا ہلکی سی چھتری نما شکل کا ایک گھر تھا جو کہ جسم میں بھی کالی کم تھا۔ نازک انگلی کے پور سے وہ جتنی بار اسے چھوئی حیرت کے سمندر میں ڈوب ڈوب جاتی۔

چھت پر کھیل تماشوں میں من ہمدان کی تیز اور شرارتی نگاہوں نے اس کے انہماک کو ہر زاویے سے جانچا تھا۔ صحن چھت سے با آسانی دکھائی دیتا تھا۔ بتایا ضرور اس کو اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ اسی اثنا میں اس گھر کی سب سے بزرگ خاتون کسی کام سے وہاں آئیں اور وہ تیزی سے وادی۔ وادی۔ "کتنی ان کی جانب بڑھی اور دامن پکڑ کر ان کو وہاں لے آئی۔

"کیا ہوا بیٹا موم ہے کہاں پہنچے لے جاوے ہے تو۔"

"واہی ہاں! وہ کیا ہے کھڑکی پر وہاں۔"

اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ وادی نے اپنے موٹے شیشوں والے چشمے کو دوپٹے کے پلو سے صاف کر کے اس پر نگاہ جمائی۔

"اے بے لونی! باہلی! باہلی! ہوتی جاوے ہے۔" وہ دوپٹے کو منہ پر رکھ کر ہنسنے لگیں وہ کچھ شرمندہ ہونے پر بولی۔

"بتائیں نا وادی! کیا ہے یہ؟"

"کسم پاری۔۔۔ یہ کون ہوتی ہے وادی اماں؟"

"اری پٹی! یہ ایک کیرا۔۔۔ ہے جو چکنی مٹی کے بھوروں (ڈروں) سے اپنے قد سے کئی گنا بڑا گھر بناتی

ہے۔ انڈے بچے دیتی ہے، گھوڑی گرہن ہوتی ہے عورتوں کی طرح۔"

اس کے کچھ پہلے نہ بڑا وادی وضو کرنے چلی گئیں اس نے ایک بار پھر گھر کو چھو اور دل میں تہہ کر لیا کہ میں بھی گھر بناؤں گی اور جیسی ہمدان نے پیچھے سے آ کر اس کی پونی کھینچی۔ پونی نیل میں بندھے ہال شانوں بکھر گئے۔ مگر ہمدان کی اس حرکت کی اسے مطلق پروا نہیں تھی۔ بلکہ وہ خوشی خوشی ہمدان کو بتانے لگی۔

"ہمدان! یہ دیکھو! کہاری کا گھر۔"

اور وہ نالے بھری شرارتیں آنکھوں میں سمو کر اس کے برابر میں آکر ہوا۔

"فنا شک!"

"ہمدی! میں بھی اپنا گھر بناؤں گی۔"

"او گڈ آئیڈیا!"

ہمدان کی آواز کے اتار چڑھاؤ سے وہ اس کی شرارت محسوس نہیں کر پائی۔

"میں ماما کو بلا کر لانی ہوں۔"

وہ ہمدی کا جواب سنے بغیر کمرے کی قطاروں کو عبور کرتی مرکزی بیٹھک میں پہنچی اور فائرہ کو کھینچتی جب کہاری کے گھر تک لانی تو حیران رہ گئی۔ وہاں اب

— کہاری کا گھر تھا نہ ہمدان کا۔

رست کے ڈروں سے بنے گھر کی دیواریں ڈھادی گئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے مٹی کے رنگ کے کیرے بین کرتے چوٹ کی افقی سطح پر چڑھے جارہے تھے۔ اور اس کی بھوری مٹی مٹی آنکھوں میں موٹے موٹے نمکین شفاف موتی تھے۔ براؤن رنگ کی پونی اس کے پیروں میں پڑی تھی۔ کہاری کا گھر ٹوٹ چکا تھا۔

"اپنا سالانہ پیک کرلو۔ جودل چاہے لے جاؤ۔ کل صبح تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔"

کتنا سرو لوجہ تھا حسین کا۔ اتنا سرو جیسے دسمبر اور

جنوری کی ساری ٹھنڈ اس کے لفظوں میں رکھ دی گئی ہو۔ اس کے ہاتھ کے بلوں میں بھی اتنی کرختگی تھی کہ وہ ایک نگاہ ڈال کر رہ گئی تھی پھر بھی ہمت کر کے اس کے رہوہ لرزنی پلکوں اور لرزتے ہونٹوں پہ التجا تھی۔

"میں۔۔۔ میں ہمیں رہنا چاہتی ہوں حسین۔۔۔"

اور وہ کڑکتے لہجے میں اس کے لفظوں کو کاٹ کر لولا تھا۔ اور میں تمہیں یہاں رکھنا نہیں چاہتا۔

"میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں حسین! میں نہیں رہ پاؤں گی آپ کے بغیر۔" وہ ذرا نزدیک ہو کر منمنائی تھی، اس پر زور بھی اثر نہ ہوا۔

"محبت کرتیں تو رات کی تاریکی میں اپنا منہ کالا کر کے نہ آتیں۔"

"بتان ہے، جھوٹ ہے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔"

"اور جو میں نے دیکھا۔ میں اب اس گندگی کی پوٹ کو مزید اپنے گھر میں اپنی زندگی میں تعفن پھیلانے کے لیے نہیں رکھ سکتا۔"

اس کا انداز دو ٹوک تھا۔ وہ حیران پریشان اسے تک رہی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں ایک دن حسین نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ "تم میری زندگی کو مرکانے کے لیے آئی ہو۔ ایسے ہی مرکانی رہنا۔"

"اور اب میں تعفن پھیلانے لگی۔" اس نے سوچا۔

"میں کورٹ کے ذریعے تمہیں طلاق بھیج دوں گا۔ نصیب کا خرچا اور حق مرگی رقم بھی تمہیں مل جائے گی۔"

حسین نے بیڈ کی سائیڈ دراز کھولی اور براؤن رنگ کے لفافے سے لگ بھگ درجن بھر فوٹو گرافس نکال کر اس کے منہ پر دے بائیں۔ اس نے ایک دم آنکھیں بند کر کے ان سے بچنے کی غیر شعوری سعی کی تھی۔ تصاویر اس کے پیروں میں بکھر گئیں۔ اس نے ایک

تصویر اٹھا کر وھندرائی نگاہوں سے دیکھی۔ کون تھا ان تصویروں میں۔ ایک وہ ایک اس کا جانی دشمن۔

ابھی تو اس نے حسین کے سامنے خود کو ناکارہ گناہوں سے نکالنے کی سعی کی تھی اور اب یہ دوسرا تماشا شروع ہو گیا تھا اور حسین سوچ رہا تھا کیا نہیں ہے ان تصویروں میں بے حیالی، بے وفائی، حسین کے اعتماد کا خون۔

وہ یا گلوں کی طرح ایک ایک تصویر کو اٹھا کر دیکھتی اور پھینکتی۔ مختلف لباسوں والے جسم پر ایک چو سجا تھا۔ اس عورت کے چہرے کو حسین نے بے تحاشا چاہا تھا۔ دنیا کی ہر نعمت دی۔ وہ سامیں بنا۔ اسے سائبان دیا۔

"حسن۔۔۔ نین۔۔۔ یہ جھوٹ۔۔۔ بکواس ہے یہ اس شاطر کا پھیلایا ہوا جال ہے۔ آپ۔۔۔ ان

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھریلو انسائیڈ کلب بنگلہ

کاپیائیڈیشن قیمت - /750 روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

گھانا خواتین

قیمت - /225 روپے بالکل مفت حاصل کریں۔

آج ہی - /800 روپے کا مفتی آؤ رار سال فرمائیں۔

منگو انے کا ہتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32216361

تصویروں پر یقین کر بیٹھے۔ یہ تو کسی بھی فوٹو شاپ

”شٹ اپ جسٹ شٹ اپ! یہ سب جھوٹ ہے تو اس رات جو میری نگاہوں نے تمہیں اس کی باتوں میں دیکھا وہ کیا تھا؟“

”حسین! بعض دفعہ ہم جو دیکھتے ہیں یا دکھائی دیتا ہے ویسا نہیں ہوتا۔ آپ مجھے صفائی کا موقع دیں۔“

اپنی کچھ دار باتیں بند کرو۔ میں نے جو اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ جھوٹ نہیں ہو سکتا اور تمہارے سیل کی ریکارڈنگ جو میں نے سنی وہ بھی جھوٹ نہیں ہو سکتی اور یہ فحش تصویریں۔ جس کی باتوں میں باتیں ڈالے کھڑی ہو شادی بھی اس سے پرچائی تھی۔ میری زندگی میں آگ لگانے کیوں آئی تھیں تم۔ کیوں۔ دل تو چاہتا ہے تین لفظ بولوں اور فارغ کروں تمہیں۔ پر یہ سارے ثبوت دکھاؤں گا اپنے والدین کو اور تمہارے چہیتے خصال کو جو تمہاری حمایت میں سب سے آگے ہیں۔“ اسے لگا بواہ کبھی اٹھ ہی نہ سکے گی۔

اس نے آخری کوشش کی اور حسین کے پیروں کو تھام کر رونے لگی۔

”آپ کو نصیب کا واسطہ! مجھے رسوا مت کیجئے گا۔ اس جھوٹ کو میرے سر کا ناجست بنائیں۔ میں کس کس کو وضاحتیں دوں گی۔“

وہ ایک جھٹکے سے پیر چھڑاتا ہا ہر نکل گیا تھا۔ کمرے کی ہر چیز سہمی ہوئی تھی۔

آج وہ پھر ہمدان کے انھیال آئی تھی۔ آئندہ کی لاڈلی تھی۔ سو جب بھی آئندہ میکے جاتیں اسے بھی اکثر ساتھ لے جاتیں۔

ساوان کا مہینہ تھا۔ گھر کے پچھواڑے کافی وسیع محن تھا۔ جہاں نئی موسمی پھولوں کے پتے پڑے تھے۔ رات کی رانی تھی۔ اور وہ فطرت کی دلدادہ تھی۔ آتے ہی محن کی طرف نکل جاتی۔ پھولوں سے باتیں کرتی

رنگ برنگ پھولوں کو توڑتی اور پونی میں اڑس لیتی۔ تکیوں کے پیچھے بھاگتی۔ چھوٹے تنے کے درختوں پر جا پڑھتی۔ بارش کے دنوں میں مڈیاں پکڑتی۔ گھر کے سب بچے اس کی آمد سے بہت خوش ہوتے۔ موسم نے سرمئی آچل۔ اوڑھا اور گڑا ہل کرچے تو پچیاں بھاگ بھاگ نیا جان کو بلا لائیں۔ جو ہمدان کے سب سے بڑے ماموں تھے اور بچوں کے کاکا جان تھے۔ بچوں نے کاکا جان کے گرد گھیر ڈال لیا۔ اور کورس میں فرمائش کرنے لگیں۔

”کاکا جانی! جھولا ڈال کے دیں آہ کے درخت پر میر

کاکا جانی فوراً“ اسٹور سے رسیوں کا تھیلا نکال لائے۔ موٹے رے سے درخت میں جھولا ڈالا اور بیٹھنے کے لیے ایک لکڑی کا تختہ پھنسا دیا۔ باری باری ساری بچیاں جھولے میں بیٹھنے لگیں۔ شرارتی لڑکوں کا ٹولہ کئی میں کرکٹ کھیلنے میں مشغول تھا۔ جلد ہی کسی خبر نے انہیں خبر دی کہ درخت میں جھولا ڈالا گیا ہے۔ سب نے محن میں دھاوا بول دیا۔

اور جب جھولے میں بیٹھنے کی اس کی باری آئی تو وہ سب اس کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ سارے لڑکوں نے جھولے کے رستے کو پوری طاقت سے پیچھے کی جانب کھینچ کر اچانک چھوڑ دیا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ پائی دھڑام سے لیاری میں جا گری۔ جہاں بارش نے کچڑی دلدل بنا رکھی تھی۔ اور جب گارے میں تر تر رونی دھوئی۔ وہ کچڑے پر آدھ ہوئی تو سب سے زیادہ ہنسنے والا ہمدان تھا۔

”بھوتی بھوتی“ وہ اسے چڑا رہا تھا۔ تب ہی کاکا جانی بچوں کا شور و غل سن کر وہاں آگئے اور سارے بچوں کو ڈانٹا۔

”اسے کسی نے بھی کچھ کہا تو میں سب کو سزا دوں گا۔“

”کیوں ماموں! اسے کچھ کتنا گناہ ہے کیا؟“ یہ آواز ہمدان کی تھی اور وہ کاکا جانی کے گویا ہونے سے پہلے ہی پھر بول پڑا تھا۔

”ہاں میری ماما کتنی ہیں یتیم ہے بے چاری!“ اور سب نے اسے ہمدان سے دیکھا تھا۔ کاکا جانی نے نیبیہ نگاہیں ہمدان پر ڈال کر اسے دیکھا تو اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔ یہ اس کی سات سالہ زندگی میں ہمدان کا دوا گیا وہ سرا دکھ تھا۔

آج اس کی آخری رات تھی اس گھر میں۔ اس نے کمرے کی ہر چیز کو چھو کر دیکھا تھا۔ کتنے ارمانوں سے اس نے ایک ایک چیز خریدی تھی۔ کھرا سکیم سے لے کر وال اینڈنگ تک۔ حسین نے اس کی پسند کو اولین ترجیح دی تھی اور اب کتنی آسانی سے اسے نکال کر پھینک رہا تھا اپنی زندگی سے۔ اپنے گھر سے۔ الماری میں ہینک ہوئے حسین کے کپڑوں سے لیٹ لیٹ کر رونی تھی وہ۔ ”حسین! میں کیسے رہوں گی آپ کے بن۔ اس خوشبو کے بغیر۔“ اس نے کپڑوں میں جی اس کے جسم کی مہک کو اپنے روح کی گہرائیوں میں اتارا تھا۔ پھر اس نے پیگمر سے اتار کر اس کی ایک شرٹ کی چھوٹی سے چھوٹی تہ بنا کر اپنے ہینڈ بیگ میں رکھی۔ وہ مزید کیا رکھتی۔ اس کا لایا ہوا توپچہ بھی نہیں تھا۔ سب کچھ حسین کی عطا میں تھیں۔ وہ خالی ہاتھ آئی تھی۔ جاتے ہوئے اس کے کانڈھے سے لگا گری نیند سوا نصیب تھا اور بیک میں حسین کی گرے شرٹ تھی۔

اس کی ماما اپنے میکے میں رک پ گئی تھیں تو اسے بھی رکنار پڑا۔ رات بھر بارش برسی تھی۔ موسم کے پکوان تیار ہوئے تھے۔ ہمدان کی مامیوں نے محن میں کڑا ہی رکھی تھی۔ اس بھوری بھوری آنکھوں والی بچی کو سب کچھ بہت پرکشش لگتا۔ ابھی ابھی ہمدان کی ٹانگیں نے اسے اپنے ہاتھوں سے نرم نرم پوری کے نوالے کھلائے تھے اور کاکا جانی نے آفس جانے سے پہلے ہمدان اور اسے پچاس پچاس روپے دیے تھے۔ ناشتے

سے فارغ ہو کر اس نے محن کی راہ لی تھی۔ رات بھر کی بارش سے ہر چیز گھری گھری تھی۔ رات کو جھولے سے گر جانے کے باوجود پھر جھولے پر چڑھی بیٹھی تھی۔ فوڈی نے ایک کیری اس کے حوالے کی۔ وہ ہلکے ہلکے جھولے لیتی کیری کھاتی اور کھٹاس سے اپنی بھوری بھوری آنکھوں کو بند کر لیتی۔ کیاریوں کے اطراف میں چھت اور دیواروں سے بہہ بہہ کر آنے والی چٹنی مٹی کا ڈھیر لگا تھا اور دھوپ کے نکلنے سے مٹی تھوڑی سخت بھی دکھائی دے رہی تھی۔ جب ہی ستارہ نے آئینڈیا دیا کہ اس مٹی سے برتن بناتے ہیں۔ روزی ایک مگ میں پانی بھر لائی۔ مٹی کو اکٹھا کر کے وہ لڑکیاں مٹی کو اس حالت میں لے آئیں کہ اس کو شکل دیکھ کر برتنوں میں ڈھالا جا سکے۔ پھر سب بچوں نے اپنی اپنی پسند کے برتن بنالے اور کیاریوں کی منڈیروں پر سوختے کے لیے رکھ دیے۔ سب سے منفرد جو چیز تھی وہ اس کا بغیر چھت کا بنایا ہوا گھر تھا اور جب ستارہ کے بھائی نے اس کا بغیر چھت کا گھر دیکھا تھا تو اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک نرم شلخ سے لکڑی توڑ کر دیواروں میں ایسے پھنسی تھی کہ گھر پر چھتری سی بن گئی۔ اب اس کا گھر مکمل ہو گیا تھا۔ پھر ستارہ کے بھائی نے جھاڑو کی تکی کے پچھلے سرے سے اس پر کندہ کیا۔

حسین نے گاڑی اس کے گھر کے گیٹ پر لے جا کر روکی اور ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول کر کہا۔ ”اتر۔“

”مجھے ایک موقع صفائی کا دیا جانا چاہیے حسین!“ وہ گاڑی سے اتر کر لیٹ کر بولی تھی۔ وہ گاڑی اڑا۔ لے گیا بغیر کوئی جواب دیے۔ اس نے دھندلائی آنکھوں سے غبار اڑائی گاڑی کو دیکھا۔ فضا میں گرد تھی اور اس کے اندر غبار تھا۔ سمندر کا غبار جو آنکھوں سے جگہ بنانا چہرے پر پھیل رہا تھا۔ اس نے مردہ ہاتھوں سے لوہے کے مضبوط گیٹ کو دھکیلا۔

Prickly Heat

English

Prickly Heat

English

Prickly Heat Powder

20% EXTRA

English

ActivNeem

کاکا جانی کی تعریف نے اسے آسانوں کی دستوں میں اڑا دیا تھا۔ اس رات وہ خوش خوشی سوئی تھی۔ صبح بہت روشن تھی۔ اس نے آنکھ کھلتے ہی اس کمرے کی راہ لی جہاں سب بچوں نے کھلونے رکھے تھے۔ سب کچھ تھا۔ نہیں تھا تو بس اس کا گھر نہیں تھا اور وہ پاگلوں کی طرح ہر بچے سے پوچھ رہی تھی۔ ستارہ نے اسے بتایا کہ وہ گھر تو ہمدان لے گیا تھا جب وہ سو گئی تھی اور۔ اس نے گلی کی راہ لی کہ وہ وہیں ہو گا شرارتوں میں مصروف۔ اور جب اس نے گلی میں پہلا قدم رکھا تو دیکھا۔ سامنے ہی اس کا گھر ٹوٹا رہا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر مٹی کے ٹھیکروں کو جمع کیا۔ گھر کی دیوار اس کے ہاتھ میں تھی۔ جس پر لکھا ”پروا کا گھر“ اس کی بھوری مولی آنکھوں میں دھیر سارے آنسو لے آیا تھا۔ اس کا گھر کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور تقسیم کرنے والا ہمدان تھا۔ یہ ہمدان کا دیا گیا تیسرا بڑا دکھ تھا۔

”ماما جانی! انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں نے ان کے پر بھی پکڑے مگر وہ نہیں مانے۔“ وہ فخرہ کے سینے میں چھپی سسکیوں سے رونے جا رہی تھی۔ فخرہ۔ ڈپٹے ہوئے بولیں۔

”پروا! پاگل مت بنو خاموش ہو جاؤ۔ بچہ بھی پریشان ہو رہا ہے۔“

”نہیں ہو سکتی میں خاموش۔ میرا گھر روٹی کے گالوں کی طرح ہوا میں بکھرے کو تیار ہے۔ آپ کتنی ہیں میں چپ ہو جاؤں۔ آپ کو اندازہ نہیں میں کتنی اذیت میں ہوں۔ اس شخص کے الزاموں نے میرے جسم کو ہر جوڑے سے توڑا ہے اور آپ کتنی ہیں میں خاموش۔“

اس کی آواز آنسو میں مدغم ہوئی تو وہ فقرہ مکمل نہ کر پائی۔ فخرہ نے دونوں کانہوں سے تھام کر اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کے آنسو پونچھے۔

”میاں بیوی میں جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ میں آج

”بڑے ماموں کچھ دیر پہلے ہی آفس کے لیے نکلے ہوں گے۔“ اس نے سوچتے ہوئے پہلا قدم گھر کی دہلیز پر رکھا۔ ”سب کے سب سوئے بڑے ہوں گے میں سیدھی ماما کے کمرے میں جاؤں گی وہ تسیبہ صحت میں مشغول ہوں گی۔“

بے خیالی میں چل رہی تھی۔ اسی لمحے گھر کا مرکزی دروازہ کھلا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کا جانی دیکھن اس کے روبرو آن رکھا۔ وہ ٹھنک ٹھنک سوٹ میں تھا۔ اس نے زمانے بھر کی نفرت لمحے میں سمو کر کچھ کہنے کو ہونٹوں پر کیے تھے کہ وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

”وار مو یلم نو کم بیک۔“

”تم بہت برے ہو۔ بہت برے۔ کاش! تم اتنے برے نہ ہوتے۔“ اس نے دکھ سے کماؤ وہ بھی دبدو بولا تھا۔

”تم بھی بہت بری ہو۔ بہت بری۔ کاش! تم اتنی بری نہ ہوتیں تو آج میری ہوتیں۔“

اس کے لہجے کی آگ سے وہ وہیں کھڑے کھڑے بھسم ہو گئی تھی اور وہ اسے اسی مقام پر چھوڑ کر چلا گیا۔ فضا میں زردیاں کھلی تھیں یا اس کے اندر خزاں کا موسم اتر تھا۔ ہر منظر و حوالہ دھواں تھا۔

رات کو کاکا جانی آئے تو ساری بچیوں نے اپنے اپنے برتن دکھا کر انعام میں پیسے پورے تھے اور وہ آنکھوں میں جھجک لیے سب سے آخر میں اپنا گھر دکھانے لائی تھی۔

”کاکا جانی! یہ میں نے بنایا تھا۔“

”بہت خوب۔“ ان کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

جب ہی ستارہ کاکا جانی کے برابر آکر بولی۔

”چھت بھیا نے بنا کر دی ہے پروا کو۔“

کاکا جانی نے مسکراتے ہوئے اس کے ماتھے پر ہوسہ دیا تھا اور سو کاٹھ نکال کر اسے تھمایا۔

”بہت سلیقے سے گھر بنایا ہے پروا نے۔“

فاروق بھائی سے بات کر دی گی۔ حسنین کے پاس جائیں گے، سمجھائیں گے اسے۔ تم تسلی رکھو کچھ نہیں ہوگا اور جب ماں ہے تمہارے ہمارے ہمارے بھی دکھ اٹھانے کے لیے تو پھر تمہیں کیا ضرورت ہے پریشان ہونے کی۔

وہ فاروخ سے علیحدہ ہو کر تکیے میں منہ دے کر لیٹ گئی۔ ”اما میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ ان الزامات کی نوعیت کیا ہے۔“ وہ اندر ہی اندر ڈھسے گئی۔ فاروخ روتے ہوئے نصیب کو کانڈھے سے لگا کر صحن کی جانب چل دیں۔

اور دیکھتے ہی دیکھتے بچپن، لڑکھن اور پھر جوانی میں ڈھل گیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہی ہمدان کی نالی کا صحن۔ کاکا جانی کی بے لوث چاہت، ستارہ کی محبت اور اس کے بھیا کے لہجے کی نرمابٹ، ہمدان کی چاروں مامیوں کا دوستانہ رویہ۔ معین اور عصہ کے نگلنے قد اور اسکرٹ اور فراک سے دوپٹے کے احاطے میں آجانے والی پروا۔

ہمدان کی اذیت ناک شرارتیں اور پروا کو ستائے جانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینے والی جنونی عادت پروا کا بے انتہا حسن۔ اس کے گلابی پاؤں مزید شفاف ہو گئے تھے۔ اس کی بھوری بھوری معصوم آنکھوں میں ویسے ہی معصوم خواب تھے۔ اس نے باپ کو نہیں دیکھا تھا مگر کئی شفیق چہرے باپ جیسے تھے۔ فاروق ماموں، عمر ماموں، کاکا جانی، بقی ماموں، شہزاد ماموں، گلزار ماموں، ڈھیر سارے ہمدان کے خنبیلی کزنز سب ہی تو اس کے دوست تھے۔ سب اچھے اور اس سے محبت کرتے تھے۔ ایک بس وہی تھا جو اسے رلاتا اور ستاتا تھا۔ ہمدان نے دو سال گپ دے کر اس کے ساتھ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ اسے اکثر ڈیپٹر جان بوجھ کر چھوڑ کر یونیورسٹی چلا جاتا اور اکثر اسے یونیورسٹی چھوڑ کر گھر آ جاتا۔ وہ پوائنٹس میں اسے گوستی گھر پہنچتی اور فاروق ماموں

سے شکایتوں کے ڈھیر لگا دیتی اور جب اس کو سخت ست سننے کو ملتی تو وہ کہیں نہ کہیں اس سے بدلہ نکال لیتا۔

پروا نے ہر ہر شے سے محبتیں سمیٹی تھیں۔ فاروخ بچوں کی چادر اوڑھے بہت جلد چھ ماہ کی بچی کو گود میں لیے بھائیوں کے در پر آ بیٹھی تھیں۔ سب کی کوششوں کے بعد بھی وہ گھر بسانے کے لیے دوبارہ رضامند نہ ہو پائیں۔ پروا کو خنبیلی میں بے تحاشا چاہتیں ملی تھیں۔ فاروق کے ہاں ہمدان کے بعد کوئی اور اولاد نہ ہو پائی تھی۔ ہمدان کی ماں نے نہ صرف خود اسے بیٹیوں جیسا پیار دیا بلکہ اپنے منہ بکسے بھی اسے محبتیں دلائیں۔ ”آمنہ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ سو پروا کو ان کی بیٹی سمجھ کر بہت پیار دیا گیا تھا اور دوسری اہم بات اس کی بھولی صورت اور خوب صورتی سعادت مندی نے سب کے دل گرویدہ کر رکھے تھے۔ اسے ہمدان کے سارے کزنز میں سب سے زیادہ انسیت ستارہ سے تھی۔ سب سے برہ کر کاکا جانی کا نرم اور پر شفیق رویہ۔

”ہمدان! اس نے میرے سے نیچے بیٹھے ہمدان کو آواز لگائی تھی۔ مگر ہمدان کو آواز آئی تو کوئی جواب دیتا وہ تو ہنڈ فری لگائے اپنی گرل فرینڈ سے باتوں میں مشغول تھا۔ پروا کی طرف اس کی پشت تھی۔

”افسوس! اتنا سہو کیوں نہ رہا ہے۔“

اس نے اضطرابی کیفیت میں اسے پھر آواز دی۔ پھر اسے غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ وہ ہنڈ فری لگائے ہوئے ہے۔ پروا نیچے آئی اور آہستگی سے اس کے پیچھے آکر ایک کان سے ہنڈ فری نکال کر اپنے کان میں لگائی دوسری جانب تر تم بھری آواز پانا جاوہر جی تھی۔ ”اوہ ہدی! تم اپنے گروپ کے سب سے ہنڈ سم لڑکے ہو۔“

اس نے بس یہی سنا تھا کہ ہمدان نے ہنڈ فری جھپٹ کر اسے گھورا اور پھر جلدی سے اس لڑکی کو خدا

حافظ کہہ کر اس پر غصا۔

”کیا بد تمیزی تھی یہ؟“

”یہ بد تمیزی ہے تو وہ کیا تھا جو میں اتنی دیر سے تمہیں آوازیں دے رہی تھی اور تم، سرے بن کر بیٹھے تھے۔“

”کوئی کام ہو گا یقیناً۔“

”تمہارے بھی بہت کیے ہیں۔“ وہ فوراً بولی۔ کوئی پرسٹل کام کو تو بندہ احسان بھی مانے۔

”کیا کام ہے ایسا؟“

”ماہ جنین کے ساتھ ڈسٹ مانی ہے۔“

”تو مارو، روکا کس نے ہے؟“ وہ برجستہ بولی تو وہ اسے گھورنے لگا۔

”تم کبھی کام مت آنا۔“

”تو اس میں میرا کیا کام؟“ وہ ابرو چڑھا کر بولی۔

”وہ اکیسے میں ڈرتی ہے۔“

”ڈرنا بھی چاہیے۔“ پھر جواب حاضر۔

”پروا۔۔۔“ وہ دھڑاڑا تھا۔

”اچھا بولو یا!۔“

”تم میرے ساتھ چلو گی تو وہ آنے پر راضی ہو جائے گی۔“

”میں فضول مکیاب میں ہڈی ہوں؟“

”اس کا مطلب ہے تم نہیں چل رہی؟“

”میں نے یہ کب کہا؟“ اس نے ڈرتے ہوئے کہا۔ اگر میں نے منع کر دیا تو ستارہ کے گھر لے کر نہیں جائے گا یہ جنگلی۔

”مطلب راضی ہو؟“ اس نے لا جواب کیا۔

”جانا کہاں ہے۔“

”آؤں کریم چارلر۔“

”تم نے بھی ایک کام کرنا ہوگا۔“

”اپنے مطلب پہلے نکل تو تم۔ خیر بولو؟“

”مجھے ستارہ کے پاس جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم جس کے لیے لینا پہلے پھر واپسی میں پارلر چلیں گے۔“

”فون پر کون تھی؟“

”سینئر گروپ کی تھی شارڈ۔“

”اف!۔“ وہ اسے وہیں چھوڑ تیار ہونے چل دی۔

فاروخ کے سارے گھر والے اس کے ارد گرد تھے۔ فاروق اور آمنہ کسی گہری سوچ میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔

”کوئی وجہ تو بتائی ہو گی اس نے، کیوں چھوڑ گیا اچانک اس طرح۔“ فاروق بھائی کے لہجے میں تنقیدی گہری پرچھائیاں تھیں۔

”کوئی خاص وجہ تو نہیں بتائی۔ بس روئے جاری ہے۔ کبھی ہے میرا گھر لوٹ گیا۔“ فاروخ نے دھیمی آواز میں کہا تو نعمان نے سیل فون پر کوئی نمبر ملایا۔ لیکن حسنین کا سیل بند جا رہا تھا۔

”اب تو رات بھی کٹنی ہو گئی ہے۔ کل میں جلدی آجاؤں گا آؤں سے تو تمہیں لے کر چلوں گا فاروخ! روز بروز زیادہ آرام سے بات ہو سکتی ہے۔ اتنا سمجھ وار پچھ ہے حسنین، سبھی ہوئی طبیعت کا۔ اسے ہوا کیا ہے جو انتہائی اقدام اٹھا رہا ہے۔“

فاروخ خاموش نشن پر نگاہ جمائے بیٹھی رہیں۔

وہ دونوں ستارہ کے گھر پہنچے تو وہ انہیں گیسٹ پر ہی مل گئی۔ ہمدان تو والی تہائی چائیاں مامیوں کے کمرے میں جھانکنے لگا تھا۔ چھٹی کان تھا۔ دن چڑھے تک آدھے لوگ سوئے پڑے تھے۔ زیادہ چل پل نہیں تھی گھر میں اور ہمدان کو بھی کچھ زیادہ ہی جلدی تھی۔ ستارہ انہیں برآمدے میں بٹھا کر چائے کا اہتمام کرنے چلی گئی۔ پروا کی عادت سے سب واقف تھے کہ وہ پھول دیکھ کر انہیں توڑے بنارہ نہیں پاتی۔ وہ پیڑز جھکی پھول توڑ کر دوپٹے کی جھولی میں بھرے میں گم تھی۔ پیچھے سے کسی نے اس کے سر پر چپٹ لگائی تھی اور وہ بے ساختہ بولی۔

”ہمدان کے بچے اب میں تمہیں چھوٹوں گی نہیں

وہ ایک دم پٹی اور گھبرا کر ایک دم دوئے کا آنچل چھوڑ دیا۔ سارے پھول سامنے کھڑے شخص کے قدموں میں بکھر گئے۔

”اے آپ... میں سمجھی ہمدان ہے۔“

”وہ اسلام کاروان نہیں رہا کیا اب؟“

وہ بھی اپنی گھبراہٹ چھپا کر بولے تھے کیونکہ چپت تو انہوں نے بھی اسے ستارہ سمجھ کر لگائی تھی۔ ان دونوں کے قد کاٹھ ایک جیسے تھے۔ دوسری وجہ پروانے ستارہ جیسا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ سوٹ آمنہ نے دونوں کو ایک جیسا دلایا تھا۔ وہ ان کی بات پر مزید گڑبڑا گئی۔ جھٹ سلام جھاڑا۔

”وعلیکم السلام!“ وہ جواب دے کر تھوڑا پیچھے ہٹے تو اس نے زمین پر پیروں کے بل بیٹھے سارے پھول دوپٹے کے پلو میں دوبارہ جمع کر لیے۔ وہ جا کر کین کی کرسی پر براجمان ہو گئے اور جب وہ آہستگی سے چلتی ان کی جانب آرہی تھی تو انہوں نے ایک نگاہ اس کے پیروں پر ڈالی اور نبھانے کیوں نگاہ اٹھ کر رہ گئی۔ آج بھی اس کے پیچھے اتنی ہی گلابی تھیں جتنے بچپن میں تھے۔ وہ سوچوں میں گم تھے۔ وہ سامنے والی کرسی پر ٹک گئی۔

”کس کے ساتھ آئی ہو اتنی صبح؟“

”ہمدان کے ساتھ۔ وہ اندر رہے مایوں کے پاس!“ اس نے دھیرے سے کہا۔ جب ہی ستارہ ٹرے اٹھائے اس کی جانب چلی آئی۔

”بھیا! آج آپ نے اتنی دیر کر دی جاگنگ سے آنے میں جس رکھائے فریج میں جا کر لی لیں۔“

”ارے فرقان لے گیا تھا مجھے اپنی طرف۔ گھنٹوں لگائے رکھا ہے پھر۔ بل اتنے لوگ انجوائے کرو۔“ وہ اٹھ کر چلے گئے۔ ہمدان بھی اٹھیا اور اس کا ہاتھ کھینچتا دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ ستارہ روکتی رہ گئی مگر وہ اسے تیزی سے بائیک پر بٹھا کر زن سے بائیک بھاگ لے گیا۔

فاروق بھائی جب آمنہ اور فاخرہ کو لے کر حسنین

کے گھر پہنچے تو وہ گھر پر نہیں ملا۔ کسی ضروری کام سے ایک ہفتے کے نور پر اسلام آیا گیا تھا۔ یہ اطلاع کھر کے ملازمین نے ان لوگوں کو دی تھی اور جب ان لوگوں نے حسنین کے آبائی گھر جا کر معاملہ پیش کیا تو سب کے سب دم بخود رہ گئے۔

حسین اور پروا کے درمیان ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ پروا کی بے لوث محبت سے گھر کا ایک ایک فرد واقف تھا اور حسنین کتنا ہی کم گو سی پر پوری کے لیے دل میں محبت کے خالص جذبات رکھتا تھا۔ ان کے کانوں میں بات پڑتے ہی سب پروا کی طرف دوڑے تھے کیونکہ حسنین کا سبیل مستقل آف جا رہا تھا۔

ہمدان اور وہ ایک ٹیبل پر آنے سامنے بیٹھے تھے۔ ہمدان ماہ جیس کو میسیج پر میسیج کر رہا تھا پر نہ تو وہ فون اٹھا رہی تھی اور نہ ہی میسیج کا جواب دے رہی تھی۔ ستارہ کے صحن سے توڑے سارے پھول اس نے میز پر رکھے تھے۔ وہ مسلسل دو گھنٹے انتظار سے اکتا گئی تھی اور اسے بار بار چلنے کا کہہ رہی تھی۔

”ہمدان جیسے تم انتہائی فضول اور احمق انسان ہو ویسے ہی تمہاری اول جلول فریڈز ہیں۔ اس لڑکی کو اتنی بھی تمیز نہیں کہ ہم اس کے پیچھے خوار ہو رہے ہیں کم از کم کل ہی انٹینڈ کر لے۔ تم واپس چلو ورنہ میں رکشے سے چلی جاتی ہوں اور تم قیامت تک اس کا یہیں انتظار کرو۔ ستارہ کے پاس تو مجھے بیٹھنے نہیں دیا اور یہاں لا کر مجھے دو گھنٹوں سے خوار کر رکھا ہے۔“

پروا نے صبر کا بیانا لبر ہو گیا۔

”یار! اتنا غصہ مت کرو۔ تم بیٹھو میں باہر دیکھ کر آتا ہوں۔ وہ گاڑی وغیرہ میں ہوگی۔ اس لیے کل ریسیو نہیں کر رہی۔“

”بس میں دس منٹ اور دیکھ رہی ہوں۔ اتنی دیر سے لوگ ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ ان پھولوں کی وجہ سے اور بھی مشکوک ہو رہی ہوں میں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میرا کوئی ایفر ہے تم سے۔“

پروا کے آخری جملے سے ذومعنی سی مسکراہٹ نے اس کے بہت خوب صورت اور مسکراتے شرارتی ہونٹوں کے کناروں پر رقص کیا تھا حواسوں میں آنے کہ بعد وہ خود اپنی بات پر استغفر اللہ کی گردان کر رہی تھی۔

ہمدان کو گئے پانچ منٹ ہو گئے تھے۔ زیادہ رش نہیں تھا۔ پھر بھی وہ لوگوں کو کن انکھوں سے دیکھ کر خود بخود دل میں چور محسوس کر رہی تھی۔ تب ہی دروازہ کھلا۔ اندر آنے والی شخصیت بھیا کی تھی۔ وہ پھولوں پر نظر جمائے ہوئے نبھانے کتے برے برے لفظوں سے ماہ جنین کو کوس رہی تھی اور بھیا کو اسے یہاں دیکھ کر جرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ دو گھنٹے پہلے ان کے گھر سے نکلی تھی۔ انہیں بہت عجیب لگا تھا۔ ان کا آنا یہاں اتفاقیہ نہیں تھا انہیں یہاں کسی برو کر سے ملنا تھا کسی پلاٹ کے سلسلے میں وہ ان کا انتظار کر رہا اور اس کی ٹیبل ایسے زاویے پر تھی کہ وہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔

دس منٹ گزر جانے کے بعد وہ غصے میں پھولوں کو وہیں چھوڑتی نکلتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ بھیا پھولوں پر نگاہ جمائے اس منظر میں کھوئے رہے جب انہوں نے اسے پھول توڑنے دیکھا تھا۔ کافی فاصلہ ہونے کے باوجود وہ ان پھولوں کی ممک اپنے اندر اتنی محسوس کر رہے تھے۔

کتی بوجھل سی صبح تھی۔ لگتا تھا ہر منظر پر اتنی دھند اتنی ہے جتنی دھندلی اس کی آنکھیں تھیں۔ اسے آئے چوتھا دن تھا اور چار دن سے وہ سب کے اصرار کے باوجود کمرے سے نہ نکلی تھی۔ سب سے زیادہ خوف تو اسے اپنے دشمن سے سامنا کرنے کا تھا۔ ابھی تو یہ راز ہی تھا کہ ان کے پیچ آیا کون؟ وہ خود اپنے منہ سے لوگوں کو بتا کر سناں ان کے ہاتھوں میں کیوں دیتی؟ فاخرہ نے بیڈ کے کنارے بیٹھ کر اس کے رشتی بالوں میں ہاتھ پھیر کر اٹھایا اس کی درد میں ڈوبی آواز کسی

پاتال سے نکلی محسوس ہوئی تھی۔

”لہما! حسنین نے سبیل آن نہیں کیا؟“

”نہیں۔ آس سے بھی پتا کیا ہے وہ کسی آفیشل کام سے نہیں گیا۔ ایک ہفتے کی لیو پر ہے اس کے گھر والے کو شش میں ہیں کہ رابطہ ہو جائے۔ تم ہی نہیں اس سے وابستہ ہر شخص عجب مجھے میں پھنسا ہے کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ وہ آن لائن بھی نہیں ہوتا۔ سب نے اس کے لیے میسیج چھوڑ دیا ہے کہ کونفیکٹ کرے۔ فاروق بھائی روزا میل کر رہے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ غصہ ہے۔ اتر جائے گا تو خود ہی آئے گا۔ تم نے بھی تو ابھی تنک کی کو بھی ان الزامات کی نوعیت نہیں بتائی۔ جو بات بھی سمجھی کھل کر اس کے گھر والوں کو بتا دیتیں۔“

وہ ضبط کے کڑے امتحان سے گزر رہی تھی۔ ان کی بات کا کیا جواب دیتی۔ کیا بتاتی کہ کیسا زخم ہے جو دکھانے پر اور بھی تکلیف دے گا۔ ابھی تو لوگ ہمدردی کر رہے ہیں سب بات کھلے گی تو کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اسے اپنے ہاتھوں سے سنگسار کر دیں گے۔

جیسے ہی دونوں گھروں کے بیچ انٹرمیڈیٹ کے ایگزامز سے فارغ ہوئے سب نے چنگ کا شور مچا دیا۔ گرمیاں ہوں اور سمندر کی شکل نہ دیکھ پائے تو لغت ہے ایسی چٹھوں پر۔ بروگرام بھیا کے سامنے رکھا گیا۔ انہوں نے اٹھا اٹھار پکا دیا۔

ستارہ نے فوراً ”پروا کو فون کیا اور یوں یہ بات ہمدان تک بھی پہنچی اور اس نے بھی چٹکیوں میں سب کے ذہن بنائے اور مشترکہ طور پر ساحل پر سورج طلوع ہونے کا منظر بھی سب نے آنکھ دیکھا۔ ناشتے کے بعد وہ بک کرائے گئے ہٹ کی میز بھیاں چڑھ رہی تھی تو ہمدان ہٹ کی بالکونی میں کھڑا سورج پر نظر س جمائے ہوئے تھا۔ اس نے پروا کو دیکھ لیا تھا کہ وہ آ رہی ہے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی جانب بلایا

تھا۔

”کیا ہوا جناب! کوئی روگ شوگ تو نہیں لگا لیا جو سورج کی پرستش میں لگے ہو تم۔“
”روگ لگتا ہے تو سورج کو دیکھا جاتا ہے؟“ اس نے سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔
”عموماً“ یہی سنا ہے میں نے کہ لوگ چاند سورج ستاروں میں اٹھ جاتے ہیں۔“ وہ بھی اس کی تقلید کرتی تارنجی تھاں کو دیکھ رہی تھی جو آسمانوں کی وسعتوں میں بغیر کسی دھماکے سے ٹنگا تھا۔

”ہمت فلسفی نیٹ کرتی ہے فطرت مجھے۔“
”اچھا۔۔۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔ اس نے سچ کھتا۔“ تم جیسا ڈرامے باز اس روئے زمین پر نہیں ہو گا۔ یہ فلسفی باتیں چھوڑو اور ساحل پر آؤ۔ ریس لگائیں گے۔ جو جیتے گا اس کو کاکا جانی جہاز میں اپنے خرچے سے سیر کرائیں گے اکیلے۔ پانی سب لوگ ساحل پر رک کر جہاز کا دور سے نظارہ کریں گے۔“
”پھر تو یہ جیت میرے نام ہوئی مس پروا!“
”لہجہ سی۔۔۔ ملاؤ ہاتھ۔“

پروا نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس نے تمام کر پیچھے جیسے قبول کیا۔ ساحل کی ریت پر بیٹھے بھیا کی نگاہ ان دونوں میں الجھی تھی۔ ہمدان نے بے ایمانی کر کے خود کو فاع قرار دیا تھا سب کے احتجاج کرنے پر کاکا جانی نے اپنی آفر واپس لے لی تھی۔ یوں ہی آوہان و محل گیا تھا۔ اچھے بھلے خوب صورت چرے ”کالے بھوتوں“ میں تبدیلی ہو گئے تھے۔ دوسرے کھانے کے بعد آدھے لوگ ہٹ میں ستارے تھے۔ وہ ستارہ کے ساتھ پانی میں کھڑی تھی۔ لہروں کا شور تھا اور پانی میں کافی تیزی تھی۔ وہ مزید آگے جانے سے ڈر رہی تھیں۔ ان سے آگے جاتے بھیا نے انہیں اشارہ کیا کہ آگے آجاؤ تو مگر ستارہ کی ہمت نہیں ہوئی۔ پروا نے ہمت پکڑی اور بھیا کی طرف بڑھی۔ بھیا سے دو گز کے فاصلے پر عمیر اور سمیر بھی تھے۔ وہ بھیا کے برابر آگئی۔ ستارہ اسے ساحل سے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ ہمت کی بالکونی سے ہمدان نے اسے اتنے گھرے پانی

میں کھڑا دیکھا تو تیز تیز قدم بڑھا تا پانی کی جانب لپکا۔
”پروا! باہر آجاؤ۔ ہمت تیز لہریں ہیں۔ تم نہیں سنبھل پاؤ گی۔“

پروا نے مڑ کر اسے دیکھا کہ وہ کچھ کھتا اور اشارے کرنا اس طرف آ رہا ہے۔ مگر اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ بھیا کی وجہ سے ہمت جو صیلے سے کھڑی تھی۔ وہ مڑ کر سیدھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ تیزی سے ایک طاقتور لہر کا چھٹکا لگا اور اس کے حواس معطل ہو گئے۔ اس نے بھیا کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ پانی میں غائب ہو چکی تھی اور جب پانی پوری طاقت سے ساحل سے ہر چیز چھینتا واپس پیچھے کی جانب جا رہا تھا تو بھیا جو کہ ابھی تک مضبوطی سے قدم جمائے کھڑے تھے انہوں نے پانی کے زور سے ہستی پروا کو دیکھ لیا تھا۔

عمیر اور سمیر بھی اس کی جانب لپکے تھے۔ بھیا نے مضبوط قدموں سے چلتے اس کی جانب جاتے ہی اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا تھا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں اور چرے پر ہوائیاں تھیں۔ بھیا نے اسے کھرا کر کے بازو کے گھیرے میں لیا تھا۔ دونوں ہی سمجھنے سے قاصر تھے۔ قیامت گزر گئی تھی یا گزر رہی تھی۔ وہ کچھ حواس میں آئی تو خوف کی بنا پر ان کے شانے سے چٹ گئی تھی۔ تب تک ہمدان بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔

”ایسے چھوٹے حادثے ساحل پر ہوتے رہتے ہیں۔“
بھیا نے اسے آہستگی سے خود سے علیحدہ کیا تھا۔ ڈھیر ساری شرم اس کی آنکھوں میں اتری تھی۔ ہمدان نے آتے ہی لتاڑا کہ وہ اتنے گھرے پانی میں آئی ہی کیوں۔“ بھیا نے پریشان ہونے والے ہمدان کو ایک نگاہ مڑ کر دیکھا تھا۔

سب نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ بچ گئی تھی۔
”اگر ستارہ کے بھیا نہ ہوتے تو میرا کیا ہوتا؟“ اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ ”اف میں کیسے بے خیالی میں ان سے جا لگی۔ کیا سوچیں گے وہ اب میں ان کا سامنا کیسے کروں گی۔“ وہ ان ہی سوچوں میں غلطان تھی کہ ساری کزنز نے ہٹ میں دھاوا بول دیا تھا۔

”پروا! یہ کیا ہو اس ہے۔ اک ذرا سی پانی میں ہی تو گری تھیں تم سوگ ایسا منار ہی ہو جیسے پتا نہیں کیا ہو گیا ہو۔“

زری کی بات پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی پھر خود کو کپڑے کرتے بولی تھی۔
”نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں میں تھک گئی تھی۔ آرام کر رہی تھی۔ چلو چلتے ہیں۔“ وہ سب ٹولے کی شکل میں ہٹ سے نکلیں۔ کچھ اونٹ پر سوار ہو گئی اور کچھ پھیپائی میں جا گھسیں۔ وہ وہیں کپلی ریت پر بیٹھ گئی اور ساحل کی کپلی ریت پر گھروندہ بنانے لگی اور بھیا جو کہ ابھی تنک پانی میں تھے۔ گاہے بگاہے اسے ”تعمیری کام“ کرتے دیکھ رہے تھے اور جب اس کا گھروندہ بن گیا تو دور جا کر اسے دیکھنے لگی۔ اسی وقت دائیں جانب سے تیزی سے گھڑ سواری کرتا ہمدان نمودار ہوا اور بے خیالی میں عین گھروندے پر لا کر گھوڑا روکا۔

”اوپر! اگر سواری سکھاؤں تمہیں۔“
وہ روٹا نہیں چاہ رہی تھی۔ نجانے کیوں ایک کھٹنے سے اس کے اندر جو کچھ بھی جمع ہوا تھا۔ تجلالت خفقت یا شرمندگی اور گھروندہ ٹوٹ جانے کا معصوم سادھ۔ سب یک دم اس کی آنکھوں سے بننے لگا تھا۔

گھوڑے کی سم سے گھروندہ پھر کپلی ریت بن گیا تھا۔ اس نے ہمدان کو نفی میں سر ہلا کر منع کیا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ اس کے رونے میں تیزی آ گئی۔ وہ تاسف سے ٹوٹے ہوئے گھر کو دیکھتی رہی۔ بھیا نے اس کے ٹوٹے ہوئے گھروندے کو دیکھا تو پانی سے نکل کر اس کی جانب آئے تھے۔

”پروا! تم رو کیوں رہی ہو۔ کچھ ریت پر بنے گھر تو ایسے ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔ چلو تم ایسا کرو دو بارہ بنا لو۔ میں تمہیں گائیڈ کرتا ہوں۔ دیوار میں موٹی رکھنا۔“

وہ بس اپنی ہی کے جا رہے تھے اس کے جذبات سے بے خبر وہ طوفانوں میں گھری تھی۔ دل تھا کہ حلق تک دھڑک دھڑک آتا تھا۔ دل کی ہستی میں شوریدہ سری تھی۔ آگئی کالہ تھا۔ پروا کو لگا۔ اس کا دل ان کی

قربت سے گھبراتا ہے۔ اور یہ محبت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

وہ تھوڑا اور قریب آئے اور اس کے آنسوؤں کو انگلی کی پوروں سے صاف کرتے بولے۔
”پاگل لڑکی! کوئی ایسے بھی روتا ہے۔ میں پانی پی کر آتا ہوں۔ تمہانا شروع کرو۔ شاہاش۔“

ان کے جاتے قدموں سے اس کی بے خود لگا ہنس جا لپٹیں اور جب وہ ہٹ کی بیڑھیاں اترتے واپس اس کی جانب آ رہے تھے تو انہوں نے دیکھا وہ بے خیالی میں سیدھے ہاتھ کی شہادت والی انگلی سے کپلی ریت یہ انگش کے حروف سے کوئی نام لکھ رہی تھی اور جب وہ اس کی پشت پر بیچنے تو ایک تیز لہر اس کے گھومار کر چلی تھی انہیں دھندلا دھندلا سے صرف H.A لکھا دکھائی دیا تھا۔ H.A یعنی HAMDAN وہ اسے بغیر کچھ کے تیز تیز قدموں سے چلتے واپس ہٹ کی جانب چل دیے تھے۔ شام ڈھلنے لگی تھی۔ پروا کی نگاہ غروب آفتاب پر پڑی تو اسے لگا اس کے پیروں میں کسی نے زنجیریں پسانا دی ہوں وہ دھیرے قدموں سے چلتی ہٹ کی بالکونی میں آ گئی۔

اور دل کی دُور جس سے جا ابھی تھی۔ وہ بہت آہستگی اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بھی ڈوبتے سورج کو دل تمام کر دیکھا تھا اور پھر اسے پکارا تھا۔ پروا کے ذہن میں روشنی کا جھماکا ہوا تھا آج صبح تو اس نے طلوع آفتاب کا منظر ہمدان کے ساتھ دیکھا تھا اور غروب آفتاب تک یہ کیا ہوا تھا اتنا بوجھل اور اداس دل اور پھر پیچھے سے ان کی آہٹ اور پکار۔

اس نے زور سے آنکھوں کو بھیچا تھا۔ جب ہی ایک تیز لہر ہٹ کی بیڑھیوں سے آ کر ٹکرائی تھی۔
”نہیں نہیں مجھے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا مجھے پتھر کا نہیں بننا۔“ انہوں نے ایک قدم بڑھا کر فاصلہ پاتا اور پھر اسے پکارا۔

”پروا! سب گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ چلنا نہیں کیا؟“

انہوں نے دیکھا کہ وہ بے حس حرکت کھڑی ہے تو

اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ کرنٹ کھا کر مڑی۔
اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔
”جی آ رہی ہوں آپ چلیں۔“
انہوں نے بغیر کچھ کہے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ رو پٹ
کی مانند ان کے ساتھ ساتھ بیڑھیاں اترنے لگی۔
اس کامیابی کی انداز میں بھی چونکا گیا تھا۔
”سمندر بہت خطرناک ہو گیا ہے۔ پانی ہٹ تک آ
رہا ہے۔ برا کر لے جانے کا نہیں کسی لیے تمہارا
ہاتھ تھام ہے۔“

”سمندر مجھے برباد کر چکا ہے۔“ اس نے سوچا اور
پھر ہر بیڑھی اترتے اس کا دل اس کے نام کی ہالا جیتا رہا
اور جس طرح اس نے ساحل پر انگلی سے لکھا تھا۔
انگلی کے اشارے سے ہر بیڑھی پر بھی ایک ہی نام
لکھے جا رہی تھی۔

HASNAIN



کافی دنوں کے بعد وہ کمرے سے باہر نکلی تھی۔ وقتاً
وقتاً اس کے سرال سے کوئی نہ کوئی ملنے آتا رہتا
تھا۔ گول گوتھنے سے نصیب میں سب کی جان تھی۔ اتنا
کچھ ہو جانے کے بعد بھی سب کو بہتری کی امید تھی۔
اس کے اندر بھی کوئی کرن پھوٹی تھی وہ دھیرے
دھیرے قدموں سے پنک کی جانب تھی۔ اسے توقع
نہیں تھی کہ وہ اسے پنک میں مل جائے گا۔ نفرت سے
منہ پھیر کر وہ واپس پلٹی۔ مگر اس نے آگے بڑھ کر۔
— پروا کی طرف قدم بڑھایا اور ایک گھونٹ جوس کا
بھر۔ اس کے — ہونٹوں پر فاختانہ مسکراہٹ
تھی۔ وہ اسے دیکھ نہیں رہی تھی۔ پھر بھی اسے معلوم تھا کہ
وہ مسکرا رہا ہے۔

اس کے جانے کی راہیں مسدود کر دیں۔ اور بڑے
پر سکون انداز میں بولا۔

”رواجان! اہل تک بھاگو گی مجھ سے۔ میں زندگی
کی ہر گلی کو تمہارے لیے ہر طرف سے بند کر دوں گا اور
بند گلی کا راستہ بس ایک گھر پر آکر کھلے گا اور وہ گھر ہو گا“

ہمدان فاروق کا گھر۔
”میں خود کو ان تنگ گلیوں کی دیواروں سے ٹکرا
کر اکرا رہا ہوں گی مگر تمہارے گھر کے دروازے پر کبھی
دستک نہیں دوں گی ہمدان فاروق!“
اس کے لمحے میں زہر نہیں بیجے تیروں کی کاٹ تھی۔
وہ اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لایا اور اس کی
بھوری آنکھوں سے اپنی بادیاری رنگ کی آنکھیں ملاتا
بولا۔

”تمہیں عرش سے فرش پر لاٹخا ہے میں نے اس
فحش کے لیے اس فحش کو ٹھکرایا تھا تم نے دیکھا اسی
فحش نے کتنی آسانی سے تمہیں ”پروا کا گھر“ سے باہر
اٹھا پھینکا تھا؟“

پروا کو لگا آپ وہ کبھی زمین سے اٹھ نہیں پائے گی۔
”یہ جال بھی تمہارا ہیچیلایا ہوا تھا۔“
وہ — جوس کا گھونٹ بھر کر مکارانہ انداز سے
ہنسا۔ کچھ لمحے اس کے حسین سگووار حسن کو دیکھتا
رہا۔ پھر بولا۔

”نہیں۔ میری جان جال نہیں کہتے اسے کہانی
تھی ایک چھوٹی سی۔ کچھ شکوک تو پہلے بھی اس شخص
کے دل میں تھے کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔ جب ہی تو
اس نے رشتے سے انکار کیا تھا یہ تو تمہاری ”بد عقلی“
تھی کہ گھر کی مرثی چھوڑ کر بڑوسی کی وال کھانے چل
دی تھیں مس پروا۔“ اس کے انداز پر وہ سلگتے ہوئے
دھاڑی۔

”مسز پروا احسن۔“
”اچھا۔ مگر کب تک؟“
”میں کا کا جانی کے پاس جا کر ساری حقیقت بتا دوں
گی۔ تم منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔“ وہ بولی
تو وہ بھی ترنت بولا۔

”اور تم؟“
وہ خاموش رہ گئی۔

”میں نے سوچ لیا ہے۔ حسین بھی تو حقیقت
آشکار کریں گے ہی نا تو میں کیوں کھٹ کھٹ کر خود کو
ماروں۔ جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ کم از کم وہاں

تمہاری شکل تو دیکھنا نہیں پڑے گی اور تم اس زعم میں
مت رہنا کہ مجھے اس چھت کے علاوہ کہیں پناہ نہیں
ملے گی۔“

”میری پلاننگ بس یہیں تک نہیں ہیں
پروا جان۔“

وہ اس پر جھکا تو وہ تیزی سے اسے دھکا دیتی باہر نکلی
اور باہر کھڑے شخص کو دیکھ کر اسے لگا تھا کہ اب کبھی وہ
ان سے آنکھ نہ ملایاے گی۔ ہمدان نے توقف نہیں کیا
تھا۔ وہ مسلسل بولتا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

”میں تمہیں نشن کی گمراہیوں اور آسمانوں کی
بلندیوں سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔ تم کہیں بھی چلی جاؤ
بس میری رو۔“ ہمدان فاروق کی۔ جو اپنی چیزیں کسی
کو نہیں دیا کرتا۔“

اور جب وہ اپنے حواس میں واپس آیا تو وہاں پروا
نہیں تھی۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے سامنے فاروق
کھڑے تھے۔ اس کے باپ جو اس کے چہرے کے
ایک ایک تاثر اور جنبش سے اس کے دل کا حال جان
لیا کرتے تھے۔

”تو کیا یہ ابھی تک اسی ”خند“ میں ہے؟“



پروا کو کا کا جانی اپنے گھر لے آئے تھے۔ کا کا جانی
نے پروا کو کہہ دیا تھا کہ نصیب اور پروا اب یہیں رہیں
گے چاہے حسین کی عقل ٹھکانے آئے یا نہ آئے۔
پروا کے دل کو کچھ ڈھارس ملی تھی۔ وہ بے آسرا نہیں
ہوئی تھی حسین نے ایک گھر کے دروازے بند کیے
تھے تو اللہ نے دوسری چھت کا انتظام بھی کر دیا تھا اور
اس دن ہونے والے واقعے کے بعد وہ خود اس گھر سے
چلے جانا چاہتی تھی۔ اسے اس بات کی بھی شرمندگی
تھی کہ فاروق ماموں نے سب کچھ سن لیا تھا جو وہ سب
سے چھپانے کی کوشش میں تھی۔ کتنے مان سے اس کی
پرورش تھی اس کی دونوں میاں بیوی نے۔ سو اب بیٹے
کے کربوت بتا کر وہ انہیں خاندان میں رسوا کرنا نہیں
چاہتی تھی۔

نصیب اس گھر کا پہلا اور لاڈلا بچہ تھا۔ سوسا راسارا
دن وہ وادی چھوڑ دیوں کے پاس رہتا۔ کا کا جانی کا بے
حد لاڈلا تھا۔ وہ اس سے آتے گھنٹوں نصیب کے
ساتھ لگا دیتے۔ اسے سینے سے لگا کر سلاتے رکھتے۔

حسین کے آفس سے پتا چلا تھا کہ اس نے مزید
چھٹیوں کی درخواست دی ہے اور یہ کہ وہ اسلام آباد کی
برانچ میں اینٹرنشپ چاہتا ہے۔ کا کا جانی کو اس پر بے حد
غصہ بھی تھا اور اس کی بے حد فکر بھی تھی۔ وہ بظاہر تو
پروا کو تسلیاں دیتے مگر اندر سے خود بھی ٹوٹ پھوٹ کا
شکار تھے۔ انہوں نے اپنے لاڈلے فرماں بردار بیٹے کے
لیے ایک بہترین لڑکی کا انتخاب کیا تھا اور شادی کے
تین سالوں میں دونوں کو بے حد خوش دیکھ کر اپنے فیصلے
پر فخر بھی محسوس کیا تھا۔ پر اب صورت حال یہ تھی کہ
جب بھی پروا کے او اس چہرے پر ان کی نگاہ پڑتی تو ان
کے دل پر ایک گھونسا پڑتا۔

پروا شادی ہو کر اس گھر میں آئی تھی اور جب کبھی
بھی یہاں آتی تو اپنے ہی بیڑوم میں قیام کرتی۔ اس
نے شادی کے بعد دو سال اس گھر میں گزارے تھے۔



حسین نے بار بار اپنے گھر میں وہ قصہ سن رکھا تھا کہ
جب اس نے کہاری کے گھر جیسے گھر کی خواہش کی
تھی اور اسے وہ بھی منظر یاد تھا جب اس نے چینی میٹی
سے گھر بنایا تھا اور اس کی چھت اس نے بنا کر دی تھی
اور ساحل کی رست سے بنا اس کا گھر وندہ بھی حسین کو



مسکرانے پر مجبور کر دیتا تھا اور وہ اکثر سوچتا تھا کہ کتنی فطری اور معصوم سی گھر بنانے کی خواہش اس لڑکی کے دل کے نہاں خانوں میں بچپن سے چھپی ہے۔ وہ اس سے عمر میں آٹھ سال بڑا تھا اور جب وہ یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ تھی وہ ایک کامیاب انجینئر بن کر عملی زندگی میں کامیابی کا سفر طے کر رہا تھا۔ وہ کئی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ساتھ کام کر چکا تھا اور آج کل وہ ایک چائینز کمپنی کے ساتھ ہاؤسنگ اسکیم پر کام کر رہا تھا۔ اس کے پاس اتنا بیک بیلنس تھا کہ شادی ہوتے ہی اپنی محبوبہ بیوی کے لیے ایک بے حد خوب صورت گھر کی تعمیر شروع کر دیتی تھی۔ اس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ پروا کے خواب کو حقیقت کے رنگوں سے رنگنا تھا۔ ایک بے حد منفوقہری ڈی ایلیوشن تیار کر کے اس نے جب پروا کو دکھایا تھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئی تھیں۔

”حسین! یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کہ ہماری گھر ہوتا ہے۔“

اس کی آنکھوں میں ستائش تھی۔ حسین کے ہونٹوں پہ جان دار مسکراہٹ تھی۔ اس نے اسے دونوں شانوں سے تھما۔

”میں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے نیچے سے قصداً پیلے اور اوپر سے نسبتاً ”موٹے“ نیم وے کر ایسے جوائنٹ کیا ہے گھر کی افقی سطح پر چھتری سے مشابہہ لگے گی۔ باہر کی ساری فنشنگ چائینز موزائیک اور کارباز ماربل سے ہوگی۔ تم دیکھنا پروا تمہارے گھر کو دھوم مچ جائے گی۔“

مجھے لگتا تھا پروا! تمہارے اور ہمدان کے بیچ کچھ ہے اور میری نظر میں ایسا کچھ ہو جانا غلط بھی نہیں۔ ساتھ رہنے سے ہندہ ایک دوسرے سے مانوس ہو جاتا ہے اور یہ مانوسیت محبت میں بھی بدل جاتی ہے۔ مگر جب قسمت نے تمہیں مجھ سے ملا دیا تو میں نے اپنی زندگی کا اولین مقصد ہی بنالیا کہ ایک گھر تمہیں ضرور بنا کر دوں گا۔ ماڈل تیار ہو گیا ہے اب ان شاء اللہ فیکسٹ منتھ سے کام شروع کر دوں گا۔ اس گھر کی

ہر ہر چیز تمہاری پسند کی ہوگی پروا! اور جب گھر تیار ہو جائے گا تو میں ناور کے وسط میں ایک اٹالین ماربل تختی پر ایک ٹائم کنڈہ کر کے لگاؤں گا۔ ”پروا کا گھر“ اور تم اس گھر کی بلا حرکت غیرے مالک ہوگی۔“

اور پروا کی آنکھیں اس کی طویل بات پر پھیل کر حیرت کا پتاریں تھیں وہ سوچ رہی تھی۔ ”خدا ایسے بھی نواز دیتا ہے“ اس نے اپنے شانوں پر رکھے حسین کے ہاتھوں پہ اپنے ہاتھ رکھے۔

”حسین! آپ کی ایسی شفاف محبت برکس میں غور نہ آجائے اور ہمیں میں ہمدی سے جتنی میں آ کروں۔ اپنا مان اعتماد اور محبت ہمیشہ قائم رکھیے گا۔“

”میری شفاف اور خالص محبت تمہارے لیے ہے اور تمہارے ہی لیے رہے گی۔ بس خدا سے ایک دعا ہے کہ ہمیں کسی کی نظر نہ لگے۔“

اس نے حسین کے ہاتھ اپنے چہرے سے لگا کر آسوگی سے آنکھیں بند کر لیں۔

ستارہ کے بڑے زور اصرار پر وہ ہمدان کے ساتھ کاکا جانی کے گھر آگئی۔ اور شام میں جب اس کا سامنا بھیا سے ہوا تو بظاہر تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ مگر دل تھا کہ سینے کی حدوں کو پھلانگتا جاتا تھا۔ اس کے ادھ کلی سے کھلے چہرے پر کون کافر تھا جو نگاہوں کو ہٹاتا۔ انہوں نے بھی دیکھا تو لفظ ہونٹوں کی سرحدوں پر آ کر واپس پلٹنے لگے تھے۔ وہ سلام سے کلام کی ابتدا کر کے بھی ساکت تھی۔ وہ چلتے ہوئے اس کے ردہو آئے تھے۔ محبت کے فصول نے اپنے پیروں کو اس کے اطراف میں بڑے دھیر سے پھیلا دیا تھا۔

”کب آئیں پروا؟“

”دوپہر کو ہمدی چھوڑ گیا تھا۔“

ہمدی کے نام پر ان کی آنکھوں کی جوت بھیجی تھی۔ چہرے پر عود کر آتی مسکراہٹ مدھم پڑی تھی۔ وہ بارے ہوئے جواری کی طرح ڈھیلے قدموں سے دروازہ بند کر گئے۔

پروا دروازوں کا کیا ہے یہ تو سائل پر منحصر ہے۔ اس کی دستک میں کتنی ترپ ہوئی ہے۔ جو بند دروازے کھلو آتی ہے۔

پروا نے اس شاندار شخص کے قدموں کو گنا تھا۔ زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ وہ شخص صرف اس کے دل و دماغ میں ہی نہیں گھر کے در و دیوار میں بھی بستا تھا۔ کتنی یادیں وابستہ تھیں اس کی پر وہ توبہ گمانی کے صحرا میں بھٹک رہا تھا۔

اس نے گھر میں پہلا قدم رکھا تھا سامنے سے آتا معین حسین کا روپ دھار بیٹھا تھا اور خیل کی وادی میں چنچے میں دیر کتنی لگتی ہے۔ بالکل اسی رنگ کے لباس میں کئی بار اس نے حسین کو بلوس دیکھا تھا۔ وہ حسین کے مشابہ ہی تھا۔ دل کی دھڑکن بے ترتیب ہی ہوتی تھی کہ معین نے آکر اسے سلام کیا اور نصیب کو تھام لیا۔ وہ ایک سانس خارج کرتی اندر کی طرف بڑھی تھی کہ اندر سے آتے عمو کی آواز نے اسے پھر دھوکا دیا۔ اس کی آواز بھی اسی کافر کی طرح تھی جو محبت کو ایمان کا کما کر تھا اور پھر منکر ہو گیا۔

”یا اللہ! ابارے دھوکے میرے ہی لیے ہیں کیا؟“

اس نے زور سے آنکھیں میچ کر سوچا۔

”سب کچھ تو دیا ہی ہے۔ میرے مالک! پھر اس کا دل کیوں بدل گیا؟“ اس نے آنکھوں کی نمی ستارہ کے دوپٹے پر چھوڑی اور اسے بھیج کر پسنے سے لگایا تھا۔

ستارہ کے گھر آئے اسے دوسرا دن تھا۔ وہ دونوں بیٹھی نیٹ پر اٹالین ڈشیز سرچ کر رہی تھیں کہ کمپیوٹر کے پلگ میں دھماکا ہوا اور سسٹم ناکارہ ہو گیا۔ وہ دونوں۔ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگیں۔ کل کا جانی کے کچھ دوستوں کو کھانے پر آنا تھا تو دونوں نے سوچا تھا کہ کچھ نئی اٹالین ڈشیز بھی فرمائی کریں گے۔ ستارہ کچھ سوچتے ہوئے گویا ہوئی۔

”چلو بھیا کے سسٹم پر سرچ کرتے ہیں ابھی۔“

دل کی شان پر جیج کر ایک کلی نے پھول کا روپ

دھارا اور اس پھول نے اسے اندر باہر سے مرکب دیا تھا۔ وہ دونوں بھیا کے کمرے کے دروازے ملت، پہنچی تھیں کہ دور تیل ہوئی۔

”تم جاؤ اندر میں دیکھ کر آتی ہوں“ کہتی ستارہ اسے وہیں چھوڑ کر باہر کی جانب چل دی تھی۔ گھر کے سارے ہی لوگ اتفاقاً کہیں نہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ آنے والے ستارہ کے نصیابی عزیز تھے۔ ستارہ سب کو لیے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھی۔

پروا نے بھیا کے کمرے کی راہ لی۔ دروازہ کھلتے ہی مختلف رنگینوزکی خوشبوؤں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ وہ ان کے کمرے میں پہلے بھی ایک دوسرے آچکی تھی مگر آج جو محبت کی آگنی نے دل کو نگاہ عطائی تو ہر نظر میں محبوب کا چہرہ جھلکا نا دکھائی دے رہا تھا۔

کمرے کے وسط میں جھازی ساز کا بیڈ تھا۔ دونوں سرہانوں کے وسط میں میوون محل کے نشن تھے۔ کھڑکیوں پر دھڑ بڑے تھے انتہائی نرم ایرانی قالین تھا۔ دروازے کے دائیں جانب سسٹم رکھا تھا۔ دل آویز وال ہینڈ گنڈز۔ انتہائی آرامتہ کر تھا۔ جو کمیں کے فوق کا پتہ دیتا تھا۔ کچھ میوون پہلے ہی اس نے سنا تھا کہ اسلام آباد سے بھیا کا دوست جو کہ ایک معروف انجیریر ڈیکورٹر ہے آیا ہے اور ان کا کراؤ ڈیکورٹ کر رہا ہے۔

پروا کو آنے کا اتفاق آج ہوا تھا۔ بھیا کا روم سب سے الگ بنا ہوا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکیوں سے پردے سمیٹ دیے۔ سرمئی شام رات کا آچل اوڑھے کھڑکیوں سے جھانکنے لگی۔ کمرے میں ملگجاسا اندھیرا تھا۔ اس نے لائٹ آن کر دی۔ کمرہ ہم روشنیوں سے منور ہو گیا۔ اس سوچ کا کنکشن فنیسی لائٹس اور نائٹ بلب سے تھا۔ فنیسی لائٹس انتہائی خوب صورت اور منفوقہ اشکال کی تھیں جو بھیا چائنا سے واپسی پر لائے تھے۔ اس نے دوسرا سوچ آن کیا۔ چھت کے انڈر گراؤنڈ درختوں بلب کمرے کو چاند سا روشن کر بیٹھے۔ اس نے انتہائی توجہ سے ہر چیز کو نگاہ جمار دیکھا۔

سب سے حسین اور توجہ کھینچ لے جانے والی چیز۔۔۔ وہ سلور اور اینٹک ایک بے حد حسین گھر تھا۔ وہ اس کے سامنے جا بیٹھی۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ بے حد حسین ریشم جیسے بال کمر بکھرے پڑے تھے۔ اس نے احتیاط سے وہ گھرائیا۔ حیرت و شوق سے اسے جانچنے لگی۔ دل نما دروازوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے ہلکے سے اندر کی جانب دیا تو دروازے کلک کے ساتھ باہر کی جانب کھل گئے۔ گھر کے اندر مدھم سی روشنی پھیل گئی اور ہلکا ہلکا چائیز میوزک بجنے لگا۔ گھر کے اندر ڈائننگ کچن تھا۔ جو کہ چائنا کے روایتی عرصی لباس میں تھا۔

گھر کا اوپری حصہ کرسٹل کا تھا۔ پروا کو وہ شوپیس بے حد پسند آیا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اٹھا کر بھاگ جائے۔ وہ اس میں اتنی مگن ہوئی کہ اسے ستارہ کا نہ آتا بھی یاد نہ رہا۔ آدھا گھنٹہ وہ اسی کھیل میں گئی رہی۔ وہ گھر چارج ایبل تھا اور اس کی چارنگ بھی فل تھی۔

گھر کیوں سے آئی تو میر کی خنک ہوا اور شام ڈھلتے ہی گھر ہوا تانہ دھیرا بھی اس مگن لڑکی کو کھلتے تھے۔ وقت گزرنے کا احساس ہوا تو وہ اس گھر کے دروازے بند کر کے کھڑی ہوئی تھی۔ اسی وقت زور سے دروازہ کھلا۔ آنے والے بھائی تھا۔ وہ بول انہیں اچانک دیکھ کر دل والے دروازوں کو پھر دیا بیٹھی گھر میں پھر لائٹس جھمک کرنے لگیں اور وہ کپکپا کر کھڑے ہوئے۔ پروا کو لگا جیسے وہ کوئی چوری کرتی پکڑی گئی ہو۔ بھیا خود اسے اپنے کمرے میں اکیلا دیکھ کر اور پورے کمرے کی لائٹس جلتی دیکھ کر حیرت میں ڈوبے کھڑے تھے۔ پروا نے جلدی سے دروازے واپس پرپس کیے اور گھر کو پھیل پر رکھ دیا۔ اس کے ایک ایک کھل سے گھر اہٹ مترج تھی۔ پھر بھیانے ہی سنبھل کر بات شروع کی۔

”خیریت؟ آج میرے غریب خانہ کو کیسے رونق بخشی آپ نے۔ میرا کراؤ شاید علاقہ غیر ہے آپ کے لیے۔“

پروا کو لگا کمرے کی ساری جھللا ہٹ اس وجہ سے شخص کی آنکھوں میں اتر آئی ہے اور ایسا بھی ہو سکتا تھا

کہ اتنی روشنی میں وہ اس کے دل کی کتاب پڑھ لیتے۔ اس نے وہاں سے بھاگ جانے میں عافیت جانی تھی۔

”نہیں۔۔۔ نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں اوپر آتا ہی نہیں ہوتا۔ ستارہ کا سٹم خراب ہو گیا۔ اس نے کہا۔ بھیا کا سٹم یوز کر لیتے ہیں۔ کچھ سرجن کرنا تھا ہمیں۔“

وہ ان کے سائڈ سے نکلتے ہوئے بولی تھی۔

”اچھا تو اب جا کہاں رہی ہو۔ میں لیپ ٹاپ دے دیتا ہوں۔ ستارہ تو ویسے کمپیوٹر کے ساتھ بڑی ہے نیچے۔“

”میں اس کی ہیلپ کرتی ہوں۔ فری ہو کر آپ کا لیپ ٹاپ لے لیں گے۔“

”اوکے ایز یوش۔ ستارہ تو بڑی ہے پلیر ایک کپ کافی بنا دو تم اور کا کا جانی کے لیے بھی بیٹا دینا۔ ہم دونوں اکٹھے ہی آئے ہیں۔“

”میں بتا دیتی ہوں۔“

وہ جھپاک سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ پروا نے کچن میں آکر دو کپ کافی کے بنائے۔ ایک کپ اٹھا کر وہ کا کا جانی کے کمرے میں گئی۔ کا کا جانی بیڈ پر دراز تھے۔

”بہت بہت شکریہ بیٹا۔ بہت طلب ہو رہی تھی چائے کا کافی کی۔“

”شکریہ کی کیا بات ہے کا کا جانی۔ میں بھی تو آپ کی بیٹی ہوں۔“

اس نے شکفتگی سے جواب دیا تو انہوں نے بھی دعا دی ”اللہ خوش رکھے۔“

کا کا جانی کے کمرے سے نکل کر اس نے جزیں ہوتے اوپر کی راہ لی۔ مجبوری یہ تھی کہ اور کوئی تھا بھی نہیں کہ وہ کافی بھجوا دیتی۔ اس نے ہلکے سے دروازے پر دستک کی۔ بھیا کی آواز آئی ”آجاؤ۔“

اس نے کمرے میں قدم رکھا کمرے کے سفید بتیاں گل ہو چکی تھیں۔ صرف فینسی لائٹس کی سنہری ڈل خوابیدہ سے روشنیاں جل رہی تھیں۔ کھڑکیوں پر پورے برابر ہو چکے تھے۔ وہ سائڈ ٹیبل کے نزدیک بیڈ پر بیٹھے تھے۔ چائنا کا خوابیدہ سا گھر ان کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ ان کے قریب آئی تو وہ اٹھ

کھڑے ہوئے۔ کپ اس کے ہاتھ سے لے کر ٹیبل پر رکھا۔ وہ جانے کے لیے برقی رہی تھی۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے رخصتے کو کہا۔ اس خوابیدہ سے ماحول میں وہ چکر بن گئی تھی۔

”پروا!“

اس کے ہونٹ خاموش تھے۔ پر اس کا رواں رواں کان بن بیٹھا تھا۔ محبت بالوں کی صورت اسے گھیر بیٹھی تھی اور محبت برسنے کو تیار بیٹھی تھی۔ کچھ ٹائٹوس سے لمحے ایسے ہی ملتے۔ وہ کچھ کہنے کو تھے اور وہ سننے کو بے چین۔ ان کا آنکھ دیتا لہجہ تھا۔ پر وہ خود کو کنٹرول کرنا جانتے تھے۔

”پروا! جب میں نے چائنا سے یہ گھر خریدا تھا تو بتا ہے کس کا قصور تھا میرے ذہن میں؟“

”کس کا؟“ اس کے بے جان ہونٹوں میں زندگی کی رمت آئی۔ ”تمہارا۔“

اس نے زور سے آنکھوں کو میچا تھا۔ یا الٹی کہیں یہ خواب نہ ہو۔ انہوں نے دھیرے سے اس کے ہاتھ کو تھام کر اسے وہ گھر تھمایا۔

”تم ہی زور کر رہی ہو۔ بس میرے دل نے کہا اور میں نے لے لیا۔ تمہیں دیا یوں نہیں تھا کہ کبھی میرے کمرے میں آؤ گی تو دوں گا۔ سو یہ آج تمہارا ہوا۔“

اسے لگا تھا کہ وہ کسی ایسی بستی میں جا چکی ہے جہاں پھول برستے ہیں۔

اس نے گھر کو بڑی جاہت سے تھاما تھا۔ بھیانے اندازہ لگایا تھا کہ وہ بے حد خوش ہے۔

”تھینک یو سوچ؟“

وہ تیزی سے نیچے کی جانب چل دی تھی۔

”ہمدان!“ فاروق نے اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے اسے آواز دی۔ نزدیک ہی آمنہ بیٹھی دوپٹے میں کروٹیں کر رہی تھیں۔ وہ ان کے سامنے آ بیٹھا۔

فاروق نے چشمہ اتار کر اس سے بات شروع کی۔

”کل رات طارق کا فون آیا تھا۔ وہ چاہتا ہے تم اس کے پاس آ کر بیٹھا چلے جاؤ۔ اس کا بہت بڑا بزنس ہے۔ کوئی بیٹا نہیں وہ چاہتا ہے تم اس کا بزنس سنبھال لو۔ ویسے بھی تم جانب لیں ہو۔ وہاں جاؤ گے تو سیٹ ہو جائے گی لائف اور تمہیں تو ویسے بھی بہت شوق تھا باہر جانے کا۔ سمجھو تمہاری لائٹری نکل آئی۔ اس کی دو بیٹیاں ہیں۔ اگر سمجھ میں آئیں تو کسی کا انتخاب کر لیتا۔ ویسے اس نے ایسا کوئی ذکر کیا نہیں، بس یہی کہا پارٹنر کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں اس کے دل میں یہی خیال ہے۔“

”شادی واوی کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا مجھے۔ ویسے میں وہاں جانے کے لیے دل و جان سے راضی ہوں۔ آپ انویسٹ کریں۔ میں طارق انگل سے پارٹنر شپ کر لیتا ہوں۔“ اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا تو فاروق کہنے لگے۔

”تم پہلے جانے کی تیاری کرو۔ وہاں جا کر بزنس کا جائزہ لو۔ تمہیں سرمایہ فراہم کروں گا۔ فٹری آف فارن افیئرز آفس میں سبھاں ہوتا ہے۔ وہاں جا کر اس سے ملو۔ ارجنٹ سارے کام کرو۔ طارق کو کال کر کے کفرم کرو کہ تم آ رہے ہو وہاں۔“

وہ برویاری سے اسے سمجھا رہے تھے۔ وہ اوکے کہتا ہوا فون کی جانب چل دیا۔ اس کا بچپن کا خواب تھا۔ باہر جانے کا اور خواب کی تعبیر پوری ہونے کو تھی۔

دوسرے دن ہی وہ پروا کو لینے جا پڑھا۔

”تم یہاں آکر بیٹھ گئی ہو۔ میری پیکنگ کون کرے گا بھئی۔“ وہ دروازے سے دیکھتے ہی اسے جوش سے پولا۔ میڈیاں اترتے بھیانے بخوبی اس کی آواز سنی تھی۔

”کہاں جا رہے ہو تم؟“

وہ اچھٹے سے پوچھنے لگی۔ ابھی دو چار روز پہلے تو وہ یہاں آئی تھی۔ اتنے دن میں ایسا کیا ہو گیا تھا۔

”آسٹریلیا میرے خوابوں کی جنت۔ جہاں

آسائشات ہیں دولت ہے۔ حسن ہے۔“ اس نے مزے لے لے کر بتایا۔ وہ اندر تک سلگ کر رہ گئی اور تنگ کے بولی۔

”یہ بولو تاکہ حسن ہی حسن ہے۔“ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ اسی اثناء میں، بھیا اس سے ہاتھ ملا کر اس کے ساتھ بیٹھ چکے تھے۔ وہ بھیا کے ہاتھ پر ہاتھ مارا آٹکھ دیا ناگوا ہوا۔

”دیکھیں بھیا! کیسے جل رہی ہے میرے جانے سے۔“ کہاں جا رہے ہو تم شہزادے؟“ بھیا نے لاڈ سے پوچھا تھا۔ دل میں لیکن ہلکی سی خلش عود کر آئی تھی۔ وہ انہیں مختصراً ”جانے کا تیار کرواے پوچھنے لگا۔“ سب کام چھوڑو۔ تم اپنا تباہی مسم رہ لو گی؟“ ”آمنہ مائی کیسے رہیں گی تمہارے بغیر؟“

”مجھے بابا اور ماما نے پریشن دی ہے تب ہی جا رہا ہوں بہتر مستقبل کے لیے۔“ ”مت جاؤ ہمدی پلیز۔“ اس نے دکھ بھرے لہجے میں منت کی۔ بھیا کے انگ انگ میں بے چینی پھیلنے لگی۔ وہ بڑی عجیب سی ہاری ہوئی نگاہوں سے اسے تنکے لگے۔ جو ہمدی کے جانے کا سننے ہی دکھوں میں گھر گئی تھی۔ ستارہ نے چائے دی اور ہمدی سے کپ شپ کرنے لگی۔ موضوع بدل گیا۔ پروا کی سوئی وہیں اٹکی رہی۔

”ہمدی! تم چلے جاؤ گے تو مجھے ستارہ کے گھر کون لے کے آئے گا؟“ ”تم چھوڑو چاند ستارہ کا گھر میرے ساتھ چلو۔ وہاں میرا کمرہ کون سمیٹا کرے گا۔“ اس نے شرارت سے ستارہ کو دیکھتے کہا۔

بھیا کو لگا تھا اس سے زیادہ تلخ چائے انہوں نے کبھی نہیں پی۔ وہ اٹھ کر بائی لوگوں سے ملنے چلا گیا اور سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ بھیا نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ان کی آواز کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہوتی تھی۔

”بلوالے گا۔“

وہ حیرت سے انہیں دیکھتے کچھ کہنے لگی کہ ہمدی شور مچاتا آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچتا دروازے کی جانب بڑھا اور گردن گھما کر تانے لگا۔ ”ماما نے بلوایا ہے اور کہا تھا جس حال میں بھی ہوا تھا کر لے آنا۔“

”ہمدی سلیپ تو پین لینے دو۔ میرا سامان بھی ہے۔“ اتنی دیر میں ستارہ بھاگتی اس کا ہینڈ بیگ اٹھا لائی تھی۔ بھیا ہونٹوں کو داغوں سے کانٹنے کی وی ٹرائلی کے سائیڈ میں سجے ”گھر“ کو دیکھتے رہے جسے بڑی شوق سے اس کے لیے خرید ا تھا۔ گھر کے بیرونی دروازے سے آتی ہمدی ستارہ اور پروا کی آوازیں ان کی سماعت میں غلط غلط ہونے لگیں۔

پروا کے جانے کو سب نے محسوس کیا تھا اور سب سے زیادہ کا کا جانی نے اپنے کمرے میں وہ اپنی بیوی سے یہی بات کر رہے تھے۔ ان کی بات چیت نے ایک نیا روپ دھالیا۔ انہوں نے بھیا کو بلوایا تھا۔

”بیٹا! تم اپنی عملی زندگی میں آجکے ہو۔ اب تم گھر بسالو تاکہ ہم بھی اپنی زندگی میں تمہارے بچوں کو دیکھ لیں۔“

ان کی گردن جھک گئی۔ ”ہم نے تمہارے لیے ایک لڑکی کا انتخاب کیا ہے جو سب کی دیکھی بھالی بہت معصوم لڑکی ہے۔“ بھیا کا دل کی آواز اس جتنی میں ڈوب کر ابھرا تھا۔ ”کون پایا؟“ کا کا جانی نے نیکیم کی جانب یقین سے دیکھتے اس کا نام لیا تھا۔

”پروا!“ ”جیس بابا! وہ تو کافی چھوٹی ہے۔ ہماری سینیٹل انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہو پائی گی اور دو سری بات یہ کہ شاید وہ میرے لیے رضامند نہ ہو۔ آپ کوئی اور لڑکی دیکھ کر میری مرضی معلوم کیے بنا بھی فائنل کر سکتے ہو۔ پروا نہیں بابا۔“

پھر کا کا جانے انہیں بہت قائل کرنے کی کوشش کی پر ان کا جواب دو ٹوک ہی رہا۔ پھر وہ کھٹے کھٹے قدموں سے اپنے کمرے کی جانب چل دیے اور جاتے ہوئے ٹرائلی سے وہ گھر بھی لے گئے تھے۔ جس کو لے جانے کا خیال بھی اس کے دل میں نہیں آیا تھا۔

ستارہ کو بتا چلا کہ ایسا سلسلہ بھی گھر میں چلا ہے، جس سے اس کی پیاری دوست اسی گھر کا حصہ بن سکتی تھی مگر بھیا کے انکار سے کہانی الٹ ہو گئی اور جب اسے وجوہات بتا چلی تو اس نے دونوں فریقین سے بات کرنے کی ٹھانی۔ پہلے تو اس نے بھیا سے بات کی اور انہیں قائل کرنے کی ہزار کوشش کی پر ان کی نہ ہاں میں نہ بدلی اس نے پوچھا جب آپ کے دل میں ایسی بات نہیں تھی تو آپ اتنی دیر سے اس کے لیے یہ تحفہ کیوں لائے۔ انہوں نے ستارہ کو یہ کہہ کر لا جواب کر دیا کہ گفت تو میں تمہارے لیے بھی لایا تھا۔ وہ تنگی ہوئی پروا کو فون ملا بیٹھی۔

”پروا! تم آج کل میں گھر آ جاؤ یا ر! تمہارا سامان پڑا ہے۔ اگر لے جاؤ۔“ ”میں کافی بڑی ہوں۔ ہمدی شاپنگ کر رہا ہے تو مجھے بھی ساتھ لے جاتا ہے۔“ ”تم ہمدی سے کہو ایک گھنٹے کے لیے تمہیں چھوڑ دے یہاں۔“

”ستارہ! میں پرسوں ہی تو آئی ہوں وہاں سے ہمدی بہت طعنے مارے گا۔“ ”بند کر دو یہ ہمدان نامہ۔ تمہارا کزن ہے تو میرا بھی کزن ہے وہ۔ اور جتنا اٹیٹنڈ ہے۔ میں جانتی ہوں۔ میں اسے کال کر کے کہوں گی تو لے آئے گا تمہیں۔“ وہ جھنجھلا کر بولی تو پروا ہنسنے لگی۔ ”ٹھیک ہے وہ لائے گا تو میں آ جاؤں گی۔“

میرے دن وہ اسے وہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ سب سے مل کر اپنا چھوٹا مٹا مٹا اکٹھا کرنے لگی۔ پروا نے جب وہاں گھر نہیں دیکھا تو جھجھکتے

ہوئے ستارہ سے استفسار کیا۔ ”ستارہ۔۔۔ وہ گھر میں نے رکھا تھا وہاں اب نہیں ہے۔“

ستارہ نے تنگ میں برتن کھنگالتے اسے مڑ کر بڑی کھوجتی نگاہوں سے دیکھتے بتایا تھا۔

”بھیا لے گئے تھے واپس۔ انہی کے کمرے میں ہے۔ جاؤ لے آؤ۔ بھیا اوپر ہی ہیں۔“ وہ کچھ جزیر ہوئی ستارہ کو دیکھتی رہی۔ ستارہ اس کی ہچکچاہٹ دیکھتے پھر گویا ہوئی۔

”ارے جاؤ نا۔ بھیا حفاظت کے پیش نظر لے گئے ہوں گے۔ تم جا کر ناگوئی تو دے دیں گے۔ منع تھوڑی کر دیں گے جو تم کنفیوژ ہو رہی ہو۔“

”جالی ہوں۔ تم جلدی کام بنالو۔ ہمدی آجائے گا تو بیٹھنے نہیں دے گا اور تمہاری ضروری بات پھر سچ میں رہ جائے گی۔“

وہ دھیرے قدموں سے مختلف سوچوں کے دھارے میں گھری ان کے دروازے پر جا پہنچی تھی۔ اس نے دستک دی تو ”کم ان“ کی آواز آئی۔ اس نے ہلکے سے دروازہ کھول کر کمرے میں قدم رکھا۔ وہ لپ ٹاپ پر جھکے کسی کام میں مصروف تھے۔

پروا نے دھیرے سے سلام کیا تو ان کا چوکنا فطری تھا۔ وہ اضطرابی کیفیت میں تھا ہونٹوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

”وہ میں۔۔۔ گھر لینے آئی تھی اس دن ہمدی نے۔“

بھیا نے بات کاٹ دی۔ ”ہاں ہاں ضرورت ہو تو لے جاؤ وہ رکھا۔“ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اس کی نشاندہی کی۔ پروا ضرورت پر انگ گئی تھی۔ ”ضرورت۔“

پروا کا لہجہ سیاٹ تھا۔ کچھ جھمن سے ٹوٹا تھا دل کی آواز ہستی میں۔ اتنی جلدی بدل گئے یہ۔ کیسا انجان سا لہجہ ہے ان کا آج۔

”مجھے لگا کچھ ضرورت کے تحت ہی دیے اور لیے

جاتے ہیں۔“
انہوں نے کہا تو وہ بغیر کچھ کے کمرے سے نکل گئی۔
انہیں لگا شکست کا دھواں اس انتہائی خوب صورت
کمرے میں اتنی تیزی سے پھیلا تھا کہ آنکھیں جن
کے احساس سے سرخ ہونے لگی تھیں۔

ستارہ جب کام ختم کر اپنے کمرے میں آئی تو وہ چپکے
چپکے آنسوؤں کو پچتی بیٹھی آنچلی سوچوں میں غلغل
تھی۔ ستارہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ اس
نے محبت سے اس کے پاس بیٹھ کر اس کے ہاتھوں کو
تھامتے پوچھا تھا۔
”کیا وہاں پر؟“
”کیا وہاں پر؟“
اس کے رونے میں تیزی آئی۔ ستارہ پریشان ہو کر
اس کے آنسو پونچھنے لگی تھی۔
”پچھ۔“

”بھائی میرے ساتھ بہت روڈی بی ہو گیا۔ ہمدی
مجھے زبردستی لے گیا تو گھر میں رہ گیا تھا۔ میں جان بوجھ
کر تو چھوڑ کر نہیں گئی تھی نا۔ بھیا سمجھ رہے ہیں مجھے
اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بھلا تجھے بھی کبھی
ضرورتوں کے تحت لیے اور دیے جاتے ہیں۔ حالانکہ
مجھ سے زیادہ گھر کی ضرورت کس کی ہوگی؟ زندگی نے
مجھے سب کچھ دیا سب کچھ پر مجھے جو چیز فہمی نیٹ
کرتی ہے وہ ایک پھت ہے اور جب انہوں نے مجھے
گھر دیا تھا تو میرے دل نے کہا تھا وہ گھر نہیں ایک
چھت دینا چاہتے ہیں مجھے۔ پر میں اپنی ضرورت کے
لیے ان کے آگے کیوں ہاتھ پھیلاؤں؟ جب انہیں ہی
میری فیملنگز کی کوئی قدر نہیں۔“
اس کے سارے فلسفے پر بس فیملنگز پہ آکر ستارہ
چونکی۔

”کیا فیملنگز ہیں تمہاری بھیا کے لیے؟“
پروا کو لگا اس کی چوری پکڑی تھی۔ یہ وہ ہونفوں کی
طرح ستارہ کو دیکھنے لگی۔ گلابی گلابی نم آنکھوں پر گھٹی
پلکوں کی جھار اسے اتنا دلکش بناتی تھی کہ ستارہ بھی

اسے ایک ٹک دیکھے ہی گئی۔ دانتوں سے ہونٹوں کو
کترنے لگی۔
”تم بھیا کو پسند کرنے لگی ہو کیا؟“ ستارہ کے
کھوتے لہجے پر وہ گردن اٹھاتے میں ہلا بیٹھی۔ پروا کے
اقرار نے بھیا کے سارے خدشات پر پانی پھیرا اور وہ
”ہرے“ کا نوا لگاتی۔ بھیا کے روم کی جانب دوڑی
تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اتنی آسانی سے مسئلہ
حل ہو جائے گا۔ وہ بھیا کے کمرے میں پہنچی تو دونوں
ہاتھوں کو سر کے پیچھے پھنسائے کسی اور دنیا میں گم تھے۔
وہ بہت پر جوش ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔
”بھیا! انقلاب آ گیا ہے اور آپ نجائے کہاں گم
ہیں۔ آپ نے پروا کو گھر کیوں نہیں دیا۔ دیے اچھا کیا۔
اس طرح سے مسئلہ خود ہی حل ہو گیا۔“ وہ بے ربط
بول رہی تھی۔ اس کی تو دلی خواہش پوری ہونے کو
تھی۔ بھیا محبت سے اٹھ بیٹھے تھے۔
”کیا ہو گیا۔ کیوں پاگل ہوئے جارہی ہو؟“
”بھیا! پروا نے اپنی فیملنگز مجھ سے شیر کی ہیں وہ
آپ کے لیے کچھ خاص فیملنگز رکھتی ہے۔“ اس
نے خاص کو بڑی معنی تیزی سے سمجھ کر بولا تھا بھیا کے
دل میں کچھ — ہونے لگا تھا۔ وہ انجان بن کر
پوچھنے لگے۔
”کیسی فیملنگز؟“
”وہ آپ کو پسند کرتی ہے۔“
بھیا نے بیٹنی سے اسے دیکھنے لگے۔ دل کی بستی
میں کالی گھٹائیں چھائیں اور ٹوٹ کر مینہ برسا۔ ستارہ
انہیں پروا کا لفظ یہ لفظ بتانے لگی۔ بھیا نے خود کو نارمل
ظاہر کر کے ستارہ کو کہا۔
”جاف۔ اس پاگل لڑکی کو یہ گھر دو اور اسے کہنا گھر
ہی نہیں گھر والا ہی اس کا ہے۔“
کھڑکی سے جھانکنا سو لمبیں رات کا چاند اپنی کرنوں
کو محبت کی صورت اوڑھے ان کے کمرے میں اتر آیا
تھا۔

بہت جلد ہی ہمدی کا سارا کام مکمل ہو گیا۔ اور وہ

ہنسا ہنسا آسٹریلیا چلا گیا۔ طارق انگل کی دونوں بیٹیاں
بے حد حسین تھیں وہ جلد ہی ان کے ہاں ایڈجسٹ
ہو گیا۔
اس کے جانے کے بعد ایک بیگلی سی شام کو ستارہ
نے اپنی پوری فیملی کے ساتھ ہلا بول دیا تھا۔ پروا کو
ڈھیروں شرم نے آن گھیرا اور اس نے خود کو کمرے میں
قید کر لیا۔

سب سے بڑا جھکا فاروق ماموں اور آمنہ مائی کو لگا
تھا۔ ان کے دل کی خواہش لبوں پر آنے سے پہلے دم
توڑ گئی۔ فاروق ماموں کی اولین خواہش تھی کہ بیٹی
جیسی بھانجی ہو کے روپ میں سدا اسی گھر میں رہ
جائی۔

ستارہ نے ڈھکے چھپے لفظوں میں سب کے سامنے
دونوں کی فیملنگز کو بیان کر دیا۔ فاروق ماموں کے پاس
کوئی جواز ہی نہیں رہا تھا کہ وہ ایک لفظ بھی منہ سے
نکالتے پھر کا کاجالی کا احترام کہ وہ اتنی شفقت سے یتیم
بچی کے سر پہ ہاتھ رکھ رہے تھے اور انہیں یہ بھی اندازہ
تھا کہ ان کا بیٹا زمانے بھری لڑکیوں میں اچھا رہتا ہے
اور باہر جانے کی خواہش کے پیچھے بھی یہی مقصد تھا
کہ وہ کسی یورپی شہریت والی لڑکی سے شادی کر کے باہر
سیٹ ہو جائے۔ اسی لیے انہوں نے طارق کی بیٹیوں کو
بھی دیکھ لینے کا کہا تھا۔ سو اسی دن یہ رشتہ لپکا ہو گیا۔
ستارہ نے اسے سمجھ کر مبارکباد دی تھی۔

”بھیا سے نہیں ملوگی؟“ اس کا لہجہ شرارتی تھا۔
اس کے چہرے پر دھنک برسنے لگی تھی۔
”نہ۔ نہیں پلینے۔“

”اور ہاں اب انہیں بھیا کہنا چھوڑ دو نام لیا کرو۔“
”ستارہ! اس نے سرزنش کی۔ وہ شرارت سے
پروا کو چھیڑنے لگی۔

”ستارہ نام نہیں ہے میرے بھیا کا حسین ہے
حسین۔ سمجھیں پروا حسین!“

پروا نے اسے تکیہ اٹھا کر اچھا۔ زندگی اتنی حسین
بھی ہو سکتی ہے اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ دو
دیوار مسکرانے لگے تھے۔

ہمدی وہاں جا کر کچھ تو بزنس میں بری ہو گیا کچھ
مصروفیت طارق کی بڑی بیٹی رجا تھی۔ رجا ایک نڈر
اور بے باک لڑکی تھی۔ اسے پروا کے منسوب ہونے
کی خبر نہ ہو سکی تھی اور پھر اچانک یوں ہوا کہ فاخرہ کو
انجانا کا۔ انیک ہو گیا۔ انہوں نے دو چارج ہوتے
ہی پروا کے نکاح کی رٹ لگا دی۔

دوسرے ہی دن کا کاجالی سے مشورہ کے بعد وہ
حسین سے نکاح کے بندھن میں بندھ گئی۔ کا کاجالی تو
رخصتی بھی چاہتے تھے۔ پر فاخرہ کے کچھ ارمان تھے سو
رخصتی موخر کر دی گئی اور وہ سرخ جوڑے میں بغیر کسی
میک اپ کے جب اپنے کمرے میں پہنچی تھی اس کے
سیل پر آنے والی کال، ہمدی کی تھی۔ اس کے آنک انیک
میں سرخوشی تھی۔ محبت کو پایا تھا، کوئی عام بات تو نہ
تھی نا! اس نے سانسوں کو برابر کرتے کال ریسپو کی
تھی۔

”ہمدی ایڈس! تم کہاں میرے ہوئے تھے اتنے
دنوں سے۔“ تجھے کال تک نہ کی تم نے اور نہ ہی تم آن
لائن ہوئے۔ بہت کچھ ہے تمہیں بتانے کو۔“

”کون سا انقلاب آ گیا وہاں میرے یہاں آتے ہی۔
جو خوشی سے مری جارہی ہو تم۔“ وہ اسے تپانے کو کہہ
رہا تھا۔ آج تو اس کی ہر بری بھلی بات پر اسے دل کھول
کر سننا تھا۔

”ہمدی! آج میرا نکاح ہو گیا اچانک۔ مجھے تو خود
یقین نہیں آ رہا کہ میں کسی کی مستزن چکی ہوں۔“

”مذاق کر رہی ہو؟“ اس کی بنیدہ آواز ابھری۔ ”اگر
تمہیں یقین نہیں آ رہا تو فاروق ماموں سے پوچھ لو۔ لینڈ
لائن پر کال ملاؤ تمہ وہ فون کے نزدیک ہیں۔“

دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ وہ لائن کٹ کر لینڈ
لائن پر کال ملا چکا تھا۔ کال فاروق ماموں نے اینڈ کی
تھی۔

”پاپا! مجھے جو کچھ پروا نے بتایا گیا وہ سچ ہے؟“
”ہاں نے تمہیں نکاح کا بتایا ہو گا ہاں آج اس کا

نکاح ہو گیا ہے۔ تم۔۔۔ ان کا جملہ بھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ وہ کال کٹ کر دوبارہ پروا کو کال ملا بیٹھا۔
”کون ہے وہ؟“ اس کا لہجہ ابھی تک ہنوز ویسا ہی تھا۔ سیات اکھڑا کھڑا۔

”ہمدی! محبت کر کے محبت کو پالیدار کتنا فسوں خیز ہوتا ہے۔ یہ بیان نہیں کیا جاسکتا ہے۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی یہ سب اتنا آسان ہو گا۔“ اس کی اکھڑی سی آواز پھر میل فون سے نکلی۔
”کس سے محبت ہو گئی ہے تمہیں؟“

”ستارہ کے بھیا۔۔۔ مجھے ستارہ نے بتایا تھا کہ وہ بھی مجھے پسند کرتے ہیں۔ پر جب کا کا جانے نے رشتے کی بات کی تو بتایا ہے انہوں نے انکار کر دیا تھا اور تم سنو گے تو بہت ہنسو گے، ان کے انکار کی وجہ سن کر۔“ دوسری جانب سانسوں کا جوار بھانا تھا۔ وہ اپنی ہی کے جاری تھی۔ اس نے ذرا توقف کے بعد دوبارہ کہا۔

”انہوں نے یعنی۔۔۔ حس۔۔۔ حسنین نے یہ کہہ کر انکار کیا تھا میں اور تم ایک دوسرے میں۔۔۔“
وہ حسنین کے نام پر ذرا سی اٹکی اور آخر میں ہنسنے لگی۔

”کیسی عجیب ریزن دی انہوں نے میں اور تم آپس میں انٹرکٹ! ہاؤ اسٹریٹجک! یہاں کبھی ہو سکتا ہے۔ تمہیں تو مشرقی لڑکیوں میں بھی کوئی چارم نظر ہی نہیں آیا۔ میں نے ستارہ کو بتایا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور یہ کہ میرا دل جسٹ اس کے بھیا کے لیے دھڑکتا ہے۔ پھر کہیں جا کر وہ راضی ہوئے اور آج اتنی اچانک یہ سب کچھ ہو گیا کہ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیا کروں۔“

پروا کو تھوڑی دیر بعد احساس ہوا تھا۔ دوسری جانب اس کی خوشی کو شیعہ کرنے کے لیے کوئی نہیں ہے۔

ہمدی کو لگا تھا ہر طرف آگ ہی آگ ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ان دیکھی آگ میں کیوں

جلس رہا ہے۔

ہمدان فاروق تو اپنی چیزیں کسی کو نہیں دیا کرتا۔ وہ میرے خدا میں نے یہاں آنے میں کتنی جلدی کی۔ کتنی سفاکی سے اس نے مجھے کہا کہ میرے اور اس کے درمیان بھلا کچھ ہو سکتا ہے۔ میرے اندر ایسی کیا کمی ہے جو اسے محبت کرنے کے لیے میں نظری نہیں آیا۔

اس کی ذہنی رو بسکتے لگی تھی۔ آج تو اس کا کہیں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ نہ حسنین و جمیل رنجما میں نہ سٹڈی کے پرفسوں ماحول میں۔ وہ رنجما کو انور کر تاسٹنی برج پر جا چکا تھا۔ ہر طرف دھند تھی اور وہی دھند اس کے اندر بھی سرایت کرنے لگی۔

”پروا۔۔۔ تم میری ہوس۔۔۔ دنیا کی کوئی طاقت۔۔۔ تمہیں مجھ سے علیحدہ نہیں کر سکتی۔“
پھر جنوں کچھ اور بڑھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”مجھے اسے لے کر آنا چاہیے تھا۔“

دوسرے دن سلکتی سوچوں میں گھرے اس نے فاروق کو فون ملا یا تھا۔
وہ باپ تھے۔ اس کے تو لہجے کی کھنک سے پہچان لیا کرتے تھے کہ وہ کس تنگ میں ہے۔
”نہیں لگ رہا میرا دل یہاں۔ یہ کیا کر دیا آپ لوگوں نے میرے ساتھ۔“

اس کی آواز کسی کھالی سے آتی محسوس ہوئی تھی۔
”آپ نے میری زندگی چھین لی۔“

”ہمدان! کھل کر بات کرو بیٹا! کیا بات ہے؟“
”آپ نے پروا کو اٹھا کر حسنین کے حوالے کر دیا۔ آپ نے ایک دھند بھی مجھ سے پوچھنا گوارا نہیں کیا۔ میرے جاتے ہی اتنے بڑے بڑے فیصلے ہونے لگے۔“

”مگر تمہاری دلچسپی ہوتی تو تم جانے سے پہلے ہمارے کانوں میں بات ڈال کر جاتے۔ ہمارے دل کی

بھی یہی خواہش تھی۔ مگر تم نے کبھی کسی کو سیریس لیا ہی نہیں۔ ہم کیسے اسے تمہارے لیے مانگ لیتے۔ تمہاری دلچسپیوں سے پورا خاندان آگاہ ہے۔ تم تو خوشی خوشی چلے گئے۔ تمہیں یہ فکر ہوتی کہ تمہارے بعد وہ کسی اور کی نہ ہو جائے تو خود کو کسی بندھن میں پابند کر جاتے اور ساری بات یہاں ختم کسے۔ یہ رشتہ پروا اور حسنین کی رضا سے ہوا ہے۔ تمہارے کا کا جان سوالی بن کر آئے تو انہیں کیسے واپس لوٹا دیتے؟“
فاروق کی کسی ایک بات نے بھی اس کے سلکتے وجود پر پانی نہیں ڈالا تھا۔

”وہ معصوم ہے بیٹا! اسے حسنین نے بکا لیا ہے۔ وہ حسنین کی باتوں میں آگئی۔ ورنہ وہ تو میرے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔“
ہمدان کی آواز بھینکنے لگی پر فاروق کے اندر ایک دراڑ بھی نہ آئی۔

”دنیا میں لڑکیوں کی کسی نہیں ہے ہمدان! اور تمہارے لیے تو بالکل بھی نہیں۔ میں طارق سے ابھی بات کر لیتا ہوں رنجما کے لیے۔ تم فصول خود کو ابھھا رہے ہو۔ پروا اور تمہاری کوئی انڈر اسٹینڈنگ ہوتی تو پروا خود اس رشتے سے انکار کر دیتی۔ اسے تم میں دلچسپی ہی نہیں تھی۔“

”آپ اس نکاح کو ختم کرادیں۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا اور اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو۔۔۔“ اس نے سب کچھ بہت چپا چپا کر کہا تھا۔ فاروق ایک دم جلال میں آگئے تھے۔

”دلغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا؟ تمہارے کہنے پر میں اپنی بھانجی کا گھر بننے سے پہلے ہی اجاڑ دوں؟ تم جیسی ناہنجار اولاد سے بہتر تھا میں بے اولاد ہی رہتا اور جب تک تمہارا دلغ درست نہ ہو یہاں فون مت کرنا۔“

وہ ان کے غصے کو کسی خاطر میں لائے بغیر گویا ہوا تھا۔

”پروا میری ضد ہے۔ اس نے مجھے چھوڑ کر کسی اور کا ہاتھ تھما ہے۔ اسے تو میں خود دیکھ لوں گا۔ اسے دنیا کی

کوئی طاقت مجھ سے جدا نہیں کر سکتی یاد رکھیے گا۔“
اس نے غصے میں فون رکھ دیا اور یہ اس کی آخری کال تھی۔

دوسری ہی نفل پر کال ریسیو کر لی گئی۔ وہ میل فون ہاتھ میں لیے ہی بیٹھی تھی۔
”کیسے ہو ہمدی؟ اب تو میری یاد تمہیں بڑی جلدی جلدی آنے لگی ہے۔ ورنہ تم تو مجھے وہاں جا کر بھول ہی گئے تھے۔“

ہمدی کو لگا کہ وہ اس سے زیادہ خوش کبھی ہوئی ہی نہیں تھی۔ اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ میں ایک سرور کی کیفیت تھی۔
”کچھ بولنے کا موقع دو گی مجھے؟“

وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔ ہمدی کو لگا جیسے بہت ساری کالج کی چوڑیاں کھنکی ہوں۔ پھر وہ اسی کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔

”کیا ہو ہمدی! ناراض ہو؟“
اس نے ایک گہری سانس لی۔

”بات یہ ہے پروا کہ یہ میرا اگلے دل پر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس کی جانب لپک جاتا تھا پر میری منزل میرے اتنے قریب تھی اور مجھ پر کبھی اور اک ہی نہ ہوا۔ مجھے جس نام سے خوشی مل سکتی تھی میں نے دل کو کھوجا ہی نہیں کبھی اور جب سب چیزوں سے دل بھر گیا تو خیال آیا اپنی سب سے قیمتی چیز تو میں پاکستان ہی چھوڑ آیا۔ مجھے لگتا تھا اگر تم میرے دل میں ہو تو ہمدان فاروق بھی تو تمہارے دل میں ہو گا۔“

میں مانتا ہوں میں نے ہر لڑکی میں دلچسپی لی۔ مگر وہ صرف میرا رونا تھا۔ میری منزل تم تھیں مگر تم نے اتنی آسانی سے حسنین کی باتوں میں آکر۔۔۔ تم نے میرا انتظار بھی نہ کیا؟“

”اس ساری بکواس کا کیا مطلب ہے ہمدان!“
”بکواس نہیں میری لہجہ کنز ہیں یہ۔ تم اس نام نہاد نکاح کو ختم کرو۔ میں آ رہا ہوں فیکسٹ ویک۔ پھر ہم

شادی کر لیں گے اور تمہیں مجھ سے کوئی طاقت چھین نہ پائے گی۔“

وہ ایک دم بچھڑ پڑی ”حسین میری زندگی میں ان کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اللہ نہ کرے کہ یہ نکاح کبھی ختم ہو، تمہیں تو پرانی عادت ہے میری خوشیوں کو آگ لگانے کی۔ میں لعنت بھیجتی ہوں تمہاری شکل پر۔ آئندہ مجھے کل مت کرنا میں حسین کی ہوں اور مرتے دم تک ان ہی کی رہوں گی۔ اپنے آگن میں چنبیلی سا لگایا ہے مجھے حسین نے اور مجھے اپنے پورے جذباتوں کے ساتھ ان ہی کے گھر میں مسکنا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے تم میرا ساتھ نہیں دو گی؟“
پروانے بغیر جواب دیے فون بند کر دیا تھا۔

وہ ماہ ایسے گزرے جیسے رات کے پیچھے دن لگا ہو۔ ان دو ماہ میں ہمدی کی کئی ساری بکواس پروانے کے اندر آہستہ آہستہ بھاگ کی مانند بیٹھ گئی اور اس کا دوبارہ کسی بھی قسم کا رابطہ نہ کرنے پر وہ بھی سمجھی کہ اس نے وہ ساری بکواس ایسے ہی کی بجوہ عادت کرنا تھا۔ ان ہی بھاگتے دوڑتے دنوں کے درمیان اس کی رخصتی طے پا گئی۔

فاروق نے آمنہ کو اس کی باتیں بتا دی تھیں۔ انہوں نے خود اسے کال کی تھی۔ وہ انہیں نارمل لگا تھا۔ پروانہ رخصتی کو بھی اس نے معمول کی خبر چننا لیا تھا۔ اس نے بتایا وہ اپنا پورا ٹائم بزنس کو دے رہا ہے اور یہ کہ وہ اپنے بزنس کو مزید پھیلا کر خود کو جلد از جلد سیٹ کرنا چاہتا ہے۔

رخصتی کی تاریخ طے ہو جانے کے بعد وہ کون سا خواب تھا جو اس نے آنکھوں میں نہ سجایا ہو۔ وہ چاند کی تمنائی تھی اور چاند آگن میں اترنے کو تھا۔ پھر ایک جھلملائی ستاروں سے بھری شب تھی اور خوشبو میں ہر سمت رقص کرتی تھیں۔ چاند بھی اس کی صبح پیشانی پر بوسہ دینے کے لیے اسی کمرے کی

کھڑکی سے اتر آیا تھا جہاں وہ محبت دوپٹے کے پلو میں باندھے مسی کے عین وسط میں بیٹھی اپنے محبوب کی راہ نکلتی تھی۔ کیسا غضب ڈھایا تھا سرخ انگارہ سے شرارے کے سوٹ میں اس نے حسین نے اس کے پاس بیٹھ کر دھڑے سے اس کا ہاتھ تھاما اور ایک ہیرے کی انگوٹھی اس کی خطوط انگلی میں پستان دی۔ حسن کے نظارے سے ایک جان لیوا فیسول سے کمرابھر گیا۔ اس کے آنچل سے سارے جگنو نکل کر حسین کی آنکھوں میں جھلملانے لگے تھے۔ اتنی مکمل جوڑی کو دیکھ کر چاند کو بھی حیا آئی اور وہ بالوں کی اوڑھن جا چھپا۔ پروانہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دل دھڑک رہا ہے یا پورا وجود دل بن کر دھڑک رہا ہے۔ حسین نے کچھ اور آگے بڑھ کر اس کے دلنشین چہرے کو چھوتے کہا تھا۔

”آج بھی چپ رہو گی کیا؟“ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا تھا۔ حسین مسکرا اٹھا اور کھڑکی پر پردے برابر کھڑے تھے۔ اسے یہ بات بھی گوارا نہیں تھی کہ اس کے اور پروانے کے بیچ یہ ضرر سا چاند بھی آجائے۔
حسین نے اس سے گھر کے بدلے وفاداری گئی۔

پورے تین سال بعد اس نے سرزمین پاکستان پر قدم رکھا تھا۔ ان گزشتہ سالوں میں وہ کہاں سے کہاں جا پہنچا تھا، سب باخبر تھے۔ طارق کی شدید خواہش کہ وہ ان کا داماد بنے، اس نے سہولت سے معذرت کرنی بھی اور جتنا چار جنگ اور نٹ کھٹ جواں دل رہا کو وہ شروع میں لگا تھا۔ اب وہ اسے گرم جوش نہیں دکھتا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ پرسکون کہیں نہیں مل پاتا تھا۔

اس کا یوں آجائے چانک نہیں تھا۔ اس کی پلاننگ کا ایک حصہ تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا وہ حسین کے بیٹے کی مال بن گئی ہے۔

اس نے گاڑی ”پروا کا گھر“ والی نیم پلیٹ کے سامنے جا روکی۔ کروفر سے چلا اندر کی جانب بڑھا تھا۔ چونکہ ار کا کاجالی کا پرائیڈم تھا۔ سو وہ ہمدان کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ اس نے بڑی عزت سے اسے ڈرائنگ روم تک پہنچا کر پروا کو اطلاع دی تھی۔ اس نے اپنے خوب صورت بالوں کو کچھو میں جکڑا اور نصیب کو کوڈ میں اٹھائی وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی اس کا دل عجیب احساس میں گھرا تھا۔

حسین کے آنے کا ٹائم بھی ہو گیا تھا۔ اس کے دروازے میں قدم رکھتے ہی وہ سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔ تین سال اس کی آنکھیں ترسی تھیں اس چہرے کو دیکھنے کے لیے۔ اس نے معجز اور عیب کی آئی ڈی پر اس کی شادی کی تصویریں دیکھ رکھی تھیں۔ ہر روز وہ اپنے دل میں سلکتے انگاروں کو اس کی تصویروں سے ہوا دیا کرتا تھا اور ہر رات تجدید عہد کیا کرتا تھا کہ وہ بس اس کی ہے۔ اب اسے رو رو دیکھ کر اسے لگا تھا کہ وہ جسم اور چہرے میں کچھ بھر گئی ہے اور اس کا بیٹا بھی ہو، ہو اس جیسا ہی تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر نصیب کو اس سے لے کر اپنے سلکتے ہونٹوں کو اس کی پیشانی پر بٹ کیا تو پروانے سر اٹھاتے خدشات ٹھنڈے پڑ گئے اور وہ بہت خوش اخلاقی سے اس کا حال احوال دریافت کرنے لگی۔ وہ بھی اسے آسٹریلیا کی چھوٹی چھوٹی باتیں بتانے لگا تھا۔ اسی اثنا میں حسین بھی آگیا اور اس سے بڑے تپاک سے ملا۔

”بھیا! یوں سی چکی کا آٹا کھلاتے ہیں اسے کتنا بھر گیا ہے اس کا جسم۔“

اس نے ہنسٹ منہ میں رکھتے ہوئے سوال دہرایا جو ٹھانہ کر کے حسین کے سینے میں لگا تھا۔ وہ سنبھل کر بولا۔

”بچے کے بعد، چھینجنگ تو۔۔۔ ہی جاتی ہیں۔ تم سناؤں کب کر رہے ہو شادی؟“

”شادی ہی تو کرنے آیا ہوں یہاں۔“
اس نے کمری نگاہ پروا پر ڈالتے کہا تھا۔ پروا نصیب

کو جیس کھلانے میں مگن تھی۔
”ویری گنڈ۔۔۔ پچھو بھی اکیلے بن سے آتا مئی ہیں۔ تمہارے بچوں کو کھلانے کی تو ان کے لیے بھی دل لگی کا سماں پیدا ہو گا۔“

وہ ان کی بات پر سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر اٹھتے ہوئے اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چمکی ڈبیا نکال کر پروا کو تھمائی۔

”تمہاری شادی کا گفٹ ہے۔ تم نے تو شادی میں جھوٹے منہ بھی نہ بلایا۔ پر میں اپنا فرض سمجھتے ہوئے وہیں سے خرید کر لایا ہوں۔“

پروانے ایک نگاہ حسین پر ڈالتے ہوئے ڈبیا کھولی ایک قیمتی لاکٹ سیٹ تھا جو کہ H کی شکل میں قیمتی گینٹوں سے مزین تھا۔ پروانے شکر کر کے وہ ڈبیا حسین کی طرف بڑھا دی۔ حسین نے ”خوب صورت ہے“ کہتے ہوئے اسے واپس تھما دی۔

”شادی میں یوں نہیں بلایا کہ تمہیں گئے ہوئے تین چار ماہ ہی تو ہوئے تھے تمہارا نیا نیا بزنس سیٹ ہوا تھا نا۔“ اس کا لہجہ سمجھا ناسا تھا۔

”بس رہتے دو، بھیا! آپ کو یاد ہے نا چب میں جا رہا تھا تو کیسے بچوں کی طرح مجھے روک رہی تھی۔ مت جاؤ ہمدی! میں تمہارے بن تھا ہو جاؤں گی اور میرے روانہ ہوتے ہی گھر سالیال۔“

حسین کا دل چاہا تھا کہ بس وہ چپ ہو جائے۔ پروا نے رات کے کھانے کے لیے روکا تھا اسے، پروا پھر کبھی آنے کا کہہ کر چل دیا۔ حسین غیر شعوری طور پر اس کے جانے کے بعد بھی اس کی باتیں سوچتا رہا۔

ہمدی سے دو تین ملاقاتوں کے بعد ہی وہ پہلے کی طرح نارمل ہو گئی تھی۔ اسی طرح مکمل کر باتیں کرنے لگی تھی۔ جیسے پہلے کرتی تھی۔ اسے لگا تھا سب کچھ واپس ہی ہے جیسے پہلے تھا اور آج بھی گھر ممانوں سے بھرا ہوا تھا۔ نصیب کو وہ ماما کے کمرے میں سلا چکی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب سنگ روم میں

بیٹھے خوش گہویوں میں مصروف تھے۔ جب وہ پروا کے برابر میں لپٹا سمیت آکر بیٹھا تھا۔ وہ اسے مختلف تصاویر دکھا رہا تھا۔ انتہائی بولڈ ڈرننگ میں کچھ تصویریں رینجاک کی بھی تھیں۔ تصویریں بھی کسی کلب کی دیکھتی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔
”ہمت مزے کیسے تم نے بہاں۔“
”نہیں وہاں نہیں کیسے یہاں کروں گا۔“

اس کا جواب برجستہ تھا اور اتنی ہی برجستہ حسنین کی نگاہیں تھیں جو ایک دم اس کی جانب اٹھی تھیں۔
”ہاں تو کرنا رو کا کس نے ہے شادی کو تاکہ ہم بھی انجوائے منٹ کریں۔“ پروا نے اس کی جانب دیکھتے کہا تھا۔ ہمدی اس کے کان میں سرگوشی کرنے لگا اور اسی لمحے حسنین نے ان دونوں پر دوبارہ نگاہ ڈالی تھی۔ ”شادی ہی تو کرنے آیا ہوں، لڑکی تو مان جائے پہلے۔“

اس کے لفظ سگتے ہوئے تھے یا اس کا قریب۔ وہ سمجھنے سے قاصر رہی تھی۔ پھر وہ تھوڑا دور ہوتے بولی تھی۔

”مجھے بتاؤ کون ہے وہ میں چٹکی بجالتے ہی راضی کرلوں گی۔“

”بہادوں گا وقت انتہائی قریب ہے۔“ اس کا لہجہ گہیر تھا۔ وہ اوکے کستی حسنین کو چلنے کا کہنے لگی۔

گزشتہ بیس دنوں میں کوئی ایک بھی دن ایسا نہیں گزرا تھا کہ وہ اسے ایک دن بھی بنا دیکھے رہ پایا ہو۔ یا تو وہ کوئی آؤٹنگ رکھ لیتا سب کو ساتھ لیے لے پھرے یا تو پروا کے لیے بھی آسانی سے جگہ نکل آتی۔ یا گھر پر ہی کوئی کھانے پینے کا پروگرام رکھ لیتا اور سب اسی لیے شامل ہو جاتے کہ وہ جتنی برس بعد وطن لوٹا ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ فارق کا اکلوتا ڈالا بیٹا تھا۔

اس مصروفیت میں پروا کو بہت جلد ہی محسوس ہو گیا کہ حسنین بہت چپ سا ہے۔ اور وہ غیر شعوری طور پر نظر انداز ہو رہا ہے تو اس نے اپنے آپ کو گھر تک

محدود کر لیا اور بڑی سہولت سے ہمدی کی تفریحی اسکیم سے معذرت کرنے لگی۔ اسے بھی دوسرے رستے آتے تھے۔ وہ اس سے بچنے لگی تو وہ اس کے گھر آنے لگا اور وہ عموماً وہ اس وقت آتا جب حسنین گھر پر نہ ہوتا۔ ویسے تو وہ بالکل نارمل بات کیا کرتا تھا۔ مگر پروا ہچکچاہٹ کا شکار رہنے لگی۔ وہ روز نہ تو گھر رہنے جاسکتی تھی اور نہ ہی کا کا جانی کی طرف۔ حسنین اسے ایک رات بھی نہیں چھوڑا تھا۔ سو وہ ہمدان کی روز آمد کو برداشت کرنے پر مجبور تھی۔

وہ آتا تو نصیب سے لگا رہتا پروا سے فرائش کر کے کچھ نا کچھ بنواتا رہتا۔ عموماً وہ ڈیجیٹل کیمرے کے ساتھ اور نصیب کی فوٹو گرافس بناتا اور عین کیچھو کرتے وقت اسے بھی کسی نہ کسی ہمارے نصیب کے ساتھ الجھائے رکھتا اور خود بھی اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا۔

اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں فاخرہ سے بھی کہا کہ ہمدی کا اس طرح روز روز اس کے گھر آنا ٹھیک نہیں، پر فاخرہ نے اسے یہی کہا کہ وہ بچپن سے ہمارے ساتھ پلا بڑھا ہے۔ اسی محبت میں آجاتا ہے اور دوسرا یہ کہ میرا اکلوتا بیٹا ہے میں کیسے روک سکتی ہوں اسے وہاں آنے سے اور حسنین بھی کوئی غیر نہیں اس کا نزن ہے۔ ہاں کی بات سن کر وہ چپ ہو گئی اور ہمدی نے بھی نظارہ لیا کچھ نہیں کہا تھا کہ وہ اس کی آمد کو خود پر سوار کرتی۔

”بھیا! پروا میرے ساتھ ہے۔ میں زمزمہ سے ہوا ہوا اسے گھر لے جاؤں گا۔ پیچھو نے بلوایا ہے۔ اسے میرے ساتھ آنے کی اتنی خوشی تھی کہ سیل گھری بھول آئی۔ اب آپ کے خوف سے پھر کلب رہی ہے گاڑی میں۔ میں نے سوچا میں ہی انفارم کر دوں آپ کو۔ پیچھو ڈاکٹر صدیقی کو چیک اپ کرا میں گی۔ نصیب کو جو اسکن پر ایلم ہو رہی ہے۔ اسی وجہ سے آپ پریشان مت ہوئیے گا۔ میں ہی شو فر ہوں آج

رات تک کے لیے ڈراپ بھی کر جاؤں گا۔ ٹھیک ہے نا۔“

ہمدی نے پروا کو ایک ہاتھ سے پرے کرتے آخری جملہ بول کر حسنین کو بولنے کا موقع دیا تھا۔ ”ہمدی فون دو“ کی گردان کرئی پروا عجیب الجھن میں پھنسی اس سے سیل لے کر خوبات کرنے کے چکر میں تھی۔

ہمدی نے جیسے ہی برف سے سرو حسنین کی آواز سے ادا ہوتے ”ٹھیک ہے“ کے الفاظ سنے اس کے اندر سلگتے انگاروں پر چھینے پڑے تھے۔ حسنین کو بتائی ہوئی کچھ باتوں میں مبالغہ آرائی بھی کی تھی۔ فاخرہ کے پلاوے سے جیسے ہی وہ تیار ہو کر اندر کسی کام سے گئی تھی ہمدان نے اس کا سیل فون بڑی سرعت سے اس کے بیگ سے نکال کر دراز میں ڈال دیا تھا۔ سائیلنٹ موبائل پر لگا کہ وہ بے خبری میں بیگ اٹھا کر اس کے ساتھ ہوئی۔

واپسی پر بھی وہ اسے لیے لیے روٹ سے گھماتا ایک جگہ نصیب کو اس کے کیم کے ہمارے رکتا جان بوجھ کر دیر سے گھر لے کر پہنچا تھا اور وہ اس لمحے کو کوس رہی تھی جب وہ دن میں اس کے ساتھ گھر گئی تھی۔ رات بھگ رہی تھی۔ اوس کے سارے قطرے اس کے اندر رات رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ حسنین کو بہت ناگوار گزرے گا۔ اس نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ آئندہ وہ غیر اجازت نہیں جائے گی۔

ہمدی گاڑی لے گیا تو وہ پڑھوہ قدموں سے سرخ چھری روش پر چل رہی تھی۔ جب اس کی نگاہ تیس پر کھڑے حسنین پر پڑی تھی۔ وہ ایک عینق گہری اندھیری سوچ میں غلط اسے نگاہ جمائے دیکھ رہا تھا۔ پروا کے قدم اتنے ذونئی سمجی نہ ہوئے تھے۔

”پہلی ضرب ہے میری جان جو آج تمہارے گھر پر میں نے لگائی۔“ اس نے کوئین کا ایک گھونٹ بھرتے خود سے کہا۔ ڈل گولڈن ٹائٹ ڈیز میں اس کی شخصیت کے اسرار پر پھیلائے کسی آئینی مندر کی

طرح دکھتے تھے۔ پھر اس نے کلک سے سسٹم پر ”سویٹ ہارٹ“ کا فولڈر اوپن کیا اور اس کی تصویروں کو سلائیڈ شو پر لگایا۔

بڑی محنت اور جانفشانی سے اس نے پروا کی تصویروں کو اپنی مرضی کا لپیٹا تھا۔ وہ ان تصویروں میں اس کے اتنے قریب تھی کہ بھی زندگی میں خود سے وہ حسنین کے بھی قریب نہ گئی ہوگی۔ حسنین کو ہمیشہ خود پیش رفت کرنا پڑتی تھی۔ آج پروا کو گھر ڈراپ کرتے ہوئے وہ حسنین کو تو ریاں ڈالے کچھ چکا۔ پھر اس نے ایک میل ٹاپ کی جس میں پروا کے کردار کو دل دار کیا اور اپنی جعلی آئی ڈی سے حسنین کے ای میل ایڈریس پر بھیج دی۔

بہت خوب صورتی سے ہمدی نے ٹیک کا بیج حسنین کے دل میں بو دیا تھا اور اس کے دل کی زنیں بڑی زرخیز ثابت ہوئی تھی۔ جلد ہی ایک پودا بھی نکل آیا۔ وہ اس سے کشا کشا رہنے لگا۔ شادی سے پہلے کے وہ تمام مناظر جن میں پروا اور ہمدی کو ساتھ دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گاہے بگاہے چلتے رہتے۔ وہ پھولوں سمیت آؤٹ کر پیمار لیں تھی۔ بھی وہ ہمدان کے ساتھ بائیک پر ہوئی اور کبھی اس کے جانے پر افسردہ دکھائی دیتی۔ وہ سسٹم پر تھا اور اس انجائے ایڈریس سے آنے والی ای میل کو بار بار پڑھ رہا تھا۔
”کون ہو تم میری بیوی پر الزامات لگانے والے؟“ انہوں نے جواب دیا۔

اس نے تنکے کا سہارا لیا۔ مگر رات کو ہی اس کی دوسری میل موجود تھی۔

”الزلمات کیسے جناب! اپنی آنکھوں سے محبت کی پٹی کو کھول پھینکیں۔ سماعتوں پر پہرے بٹھا کر دیکھیں۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ وہ کس طرح چھپ چھپ کر ملتی ہے اس سے آپ کو اطلاع دے دی جائے گی۔“

حسنین سے تنکا چھوٹ گیا اور وہ بے یقینی کے

بھروسہ میں ڈوبنے لگا۔

پانچویں تیل پر کال ریسیو ہو گئی مگر وہ پراسرار ستارے لے خاموش تھا۔ وہ کچھ دیر ہیلو ہیلو کرتی رہی پھر چھینجا کر بولی۔

”کال کی بات تو کرو ہمدی!“

”وہ میں۔ حسنین سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“
”روا کو کبھی کرنٹ نہیں لگا تھا۔ مگر ایک لمحے میں وہ کسی برقی جھٹکے کے زیر اثر آئی تھی۔“

”حسنین؟ تم نے تو کبھی ان کا نام نہیں لیا۔“

”آج۔“

”میں حسنین سے بات کرنے سے پہلے تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے اس کے استعجاب کو کوئی اہمیت ہی نہ دی۔

”کیوں ملنا ہے تمہیں؟ اور حسنین سے کیا بات کرنی ہے یہ بتاؤ۔“

”ہمدان کو لگا تھا اس کی آواز بھگ رہی ہے۔ پر اس پر متعلق اثر نہ ہوا۔“

”میں حسنین کو تمہاری اور اپنی انڈر اسٹینڈنگ کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ ویسے اگر تم کل رات مجھ سے مل کر کچھ ڈسکس کر لو تو شاید میں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لوں۔ اگر تمہارا جواب ہاں میں ہو تو کل دن میں مجھے کال کر لینا پائے ڈیر۔“

وہ سن ہوئے جو اسوں سمیت خالی خالی نگاہوں سے گھر کی دروازہ پر کھٹکتے گئے۔ اسے لگا تھا طوفان اس کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

سارے کام ہی بے ربط ہوئے چولہے کے سامنے ہوتے ہوئے بھی سارا اودھ ابل گیا۔ مائیکرو ویو میں کباب رکھے گرم کرنے کے لیے پکچن دھوئیں سے بھرے لنگہ جلد بازی میں بغیر گلف پینے ہلٹو کو ہاتھ لگا بیٹھی۔ اندر کا غبار آنسوؤں کی صورت بننے لگا۔

”یہ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے مالک؟ وہ تو سب کچھ بھول گیا تھا۔ کتنا نارمل ہو کر واپس آیا تھا۔“

اسے کچن میں زیادہ ٹائم لگ گیا تو بے خیالی میں کاؤچ پر بیٹھے حسنین نے اس کا میل اٹھالیا۔ آخری کال ہمدی کی ہی انڈینڈ کی گئی تھی۔ اس کے دماغ میں کلک ہوا اس نے چپ چاپ کال ریکارڈنگ پر لگا دی۔ جب اس نے ٹیلیفوننگ تو حسنین کو ابھی ابھی وہ خود سے بہت دور لگی تھی۔

”مگر میں اس سے ملنے نہ گئی تو وہ حسنین کو ضرور کچھ الٹا سیدھا بول دے گا۔ اور ہو سکتا ہو وہ جسٹ انجوائے منٹ کے لیے مجھے تنگ کر رہا ہو۔ ایسی کوئی بات ہی نہ ہو۔ میں تو محض اندازے ہی لگا رہی ہوں۔ میرے خیال میں اس سے مل لیتی ہوں کوئی ایسا پرا ایشو تو نہیں۔ میرا کرن ہے وہ۔ کل کر کے کہہ دیتی ہوں کہ میں آجاؤں گی۔“

اس نے اوپن ہون میں آخر فیصلہ کر لی لیا۔ نمبر لیا۔ دوسری تیل پر کال ریسیو کر گئی۔

”میں ملنے کے لیے تیار ہوں۔ کہاں آؤں؟“ پروا لگا تھا جیسے وہ مسکرا رہا ہو۔

”نکل رات نو بجے کا کاجانی کے گھر آ جانا جیسا کہ تمہیں بتایا ہے۔ وہ سب حیدر آباد جا چکے ہیں آج۔ اور گھر کی چابی بھی تمہارے ہی پاس ہوگی۔ کیونکہ جب بھی سب کس جاتے ہیں تو چابی تم کو ہی دے کر جاتے ہیں۔ ہمیں ملنے میں آسانی رہے گی۔ میں تمہیں دروازے کے سامنے ہی ملوں گا۔“

پروا کو زمین پر ہونے والے ہمتی گئی تھی۔ آج ہی پوری فیملی حیدر آباد گئی تھی۔

”ہم گاڑی میں بات کر لیتے ہیں۔“
”ٹھیک نو بجے کا کاجانی کے گھر کے سامنے میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اگر تم نہ پہنچ پائیں تو ٹھیک آوے گئے بعد میں حسنین کا نمبر ملا کر ایک انکشاف کر چکا ہوں گا۔“

پکچن میں وہ نئے تعمیر ہونے والے گھروں کے سامنے باریک چھنی ہوئی بجری میں پیر دھنسا کر بیٹھا

کرتی تھی۔ اور اسے اب لگا تھا پیر کیسے ”دھنستے جاتے ہیں۔“

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے وہ نصیب کو ایک نوکرانی کے حوالے کر کے ایک کھنڈے میں واپس آنے کا کہہ کر رکشے سے کاجانی کے گھر جا پہنچی۔ وہ اسے گاڑی میں بیٹھا نظر آ گیا تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ اس نے لائنیں آن کیں اور جا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی۔ گھبراہٹ سے اس کے چہرے پر پسینہ آنے لگا تھا۔ ہمدی بڑی معنی خیز مسکراہٹ لیے اس کے قریب جا بیٹھا تھا۔ وہ منمنانے لگی۔

”کیا چاہتے ہو؟“

”تمہیں چاہتا ہوں پکچن سے۔“

”یہ ضد جھوڑو ہمدان! میں کسی کی بیوی ہوں“

ایک بیٹے کی ہاں ہوں۔“

”مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم میری تھیں اور میری ہو۔“

اس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھما تھا۔ وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہوئی۔ ہمدی نے کھڑی ہوئی پروا کو شانوں سے تھما تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں سے خود کو چھڑاتی پیچھے ہٹی۔

”میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتی ہوں۔ پلیز میرا پیچھا چھوڑو۔ میرا گھر مت آ جاؤ۔“

وہ سسک کر رونے لگی۔ ہمدی نے اپنے مضبوط بازوؤں میں بھر کر اسے کھڑا کیا تھا۔ وہ باوقار عورت تھی اور ساری کی ساری حسنین کی تھی۔ یہاں تو وہ صرف گھر بچانے آئی تھی کہ شاید کوئی راستہ نکل آئے رستے تو نکل ہی آئے وفا کے رستے آسمان تو ہیں پر کس کس بیت ناک گھٹیاں بھی تو آ جاتی ہیں۔ اور وہ لھاٹیوں کے درمیان پھنسی تھی۔ دونوں طرف بظاہر موت دکھائی دیتی تھی مگر شعور کا رستہ بھی قریب ہی تھا۔

”اور تم نے جو چھ فٹ کے مرو کو اجاڑاؤ؟“
اس نے اپنی آنکھوں کا اس کی آنکھوں سے فاصلہ کم کرتے ہوئے کہا۔ وہ کس مسالے۔ پر اس نے گرفت ڈھیلی نہیں کی تھی۔ پروا کو لگا کسی کے قدموں کی چاپ ہے۔ ہلکی ہلکی آہٹ ایک بے حد بیت ناک روپ دھارے اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ اس نے پھر کاہن جانے کا پکچن میں سنا تھا۔ پکچن کی ساری باتیں جوانی میں سچ ہو جاتیں گی اسے خبر نہیں تھی۔

ہمدی نے اسے جس طرح کھنڈے میں جڑنا چاہا تھا وہ ہر طرح سے کامیاب رہا تھا۔ پروا کی کال آنے کے فوراً بعد ہی اس نے حسنین کو میل کر دی تھی۔ وہ فوراً آ گیا۔ گھر کے سب دروازے کھلے تھے۔ اس کے دل کے سب دروازے بند ہونے لگے تھے۔ شہرول کی گلیوں میں آگ سی دہکتی تھی اور بس اک نگاہ میں قیامت کا منظر تھا جو اس نے دیکھا تھا۔ وہ اٹنے قدموں واپس پلٹا۔

کبھی کبھی جو ہمیں دکھتا ہے ویسا نہیں ہوتا بلکہ جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں وہی دکھ رہا ہوتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے وہاں دیکھے گا۔ سو دیکھ لیا۔ اس کا آنسوؤں سے لبریز چہرہ اور اس کا دفاعی انداز نہ دیکھ پایا۔ پروا ہمدی کو دھکا دیتی باہر بھاگی تھی حسنین کے پیچھے مڑوہ جا چکا تھا۔ اس کا ہینڈ بیگ بھی اندر ہی رہ گیا تھا۔ وہ مین گیٹ سے پشت لگائے کھڑی تھی۔ دوپٹا شانے کے ایک طرف پڑا تھا۔

ہمدی کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ حسنین اسے اسی حالت میں بغیر ایک لفظ کے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ خالی گھر کے سانے اس کے اندر اترنے لگے۔

وہ مرے مرے قدموں سے اندر گئی۔
”میں انہیں بتاؤں گی وہ سب جھوٹ تھا دھوکا تھا۔“ وہ یہی گردان کرتی اندر تک گئی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا چھوڑ کر گئی تھی کچھ گھنٹوں قبل۔ مگر حسنین کہیں نہ تھا۔ اس نے نوکروں سے پوچھا تو بتا چلا وہ تو گھر ہی نہیں آیا۔ اس نے نئی بار اس کا نمبر ڈائل کیا مگر فون بند جا رہا تھا۔ تھک ہار کر وہ کابٹ پر بیٹھ کر

صوفے پر سر رکھے پوری رات اس کے لوٹ آنے کا انتظار کرتی رہی۔

دن ڈھلا اور رات آگئی۔ اور حسنین بھی اُمید انہوں نے سائیڈ دراز میں ایک براؤن لفافہ رکھا اور دراز کو لاک کر دیا۔ انہوں نے خود کو گیسٹ روم میں قید کر لیا۔ دوسرا دن بھی گزرا وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اور پھر رات آگئی۔ فیصلے کی رات۔

اس نے بہت سوچ سمجھ کر اسے طلاق دینے کا فیصلہ کیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے کہا۔

”اپنا سلمان بیک کرلو۔ جو دل چاہے لے جاؤ۔ کل صبح میں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔“

فاروق ماموں اس سے ملنے آئے تھے۔

”بیٹا! آج صلت بچے کی فلائٹ سے اسلام آباد جا رہا ہوں۔ حسنین کو ساری حقیقت سے آگاہ کرنے میں تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے میری عزت رکھی میں تم پر کوئی آج آنے نہیں دوں گا۔ اتنی آسانی سے کوئی تمہارا گھر تباہ نہیں کر سکتا چاہے وہ میرا تخت جگر ہی کیوں نہ ہو۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ تم دونوں میاں بیوی کی چپقلش کے پیچھے ہمہ کی کا ہاتھ ہے۔ مگر تم مجھے بتاؤ کہ ایسا کیا ہوا تھا جو حسنین اتنا ہرٹ ہوا اور وہاں جا بیٹھا ہے۔ ساری بات میرے علم میں ہو گئی تو میں حسنین کو سب کچھ بتا کر تمہاری پوزیشن صاف کر دوں گا۔“

وہ غیرت سے زمین میں نگاہیں گاڑھے مہرب لب تھی۔ آنسوؤں نے اس کا چہرہ بھگو دیا۔ فاروق ماموں نے پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر میٹھی کی۔

پھر اس نے نکاح کے بعد کی گئی ہمدان کی کال سے لے کر کا کا جانی کے گھر والی ملاقات اور حسنین کی آمد تک کا سب بتا دیا۔ فاروق ماموں کچھ دیر تک تو اس سے آنکھ نہیں ملا پھر اُسے تھکے پھر وہ اسے تسلی دیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”تم فکر مت کرو ان شاء اللہ جلد ہی سب کچھ پہلے

کی طرح ہو جائے گا۔“

”پہلی پائل فلائٹ سے تم آسٹریلیا جا رہے ہو۔ میرا حکم ہے اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو میں تمہیں عاق کر دوں گا۔ زندگی بھر تمہاری شکل نہیں دیکھوں گا۔ اور وصیت کر کے مروں گا کہ میری اور میری بیوی کی شکل تمہیں نہ دکھائی جائے۔“

”اتنا غصے میں کیوں ہیں پاپا! کیا ہو گیا ہے؟“

”پروا کا گھر برباد کر دیا تم نے۔ اور پوچھتے ہو کیا ہو گیا ہے۔ سب بتا دیا ہے اس نے مجھے۔ وہ تو حسنین کی عقل پر پتھر بڑگئے ہیں جو تمہاری باتوں میں آگیا۔ میں آج جا رہا ہوں اور تب ہی واپس آؤں گا جب تم یہاں سے چلے جاؤ گے۔ اگر تم نہیں گئے تو میرے قدم اس گھر میں دوبارہ کبھی نہیں پڑیں گے یا درکناس امیری عزت و ناموس کو مٹی میں ملانے والے ہو تم۔ تم جیسی اولاد سے تو میں بے اولاد ہی رہتا تو بہتر تھا۔“

وہ خاموشی سے دوپٹے سے آنسو پونچھتی ماں کو دیکھنے لگا۔

”چھوڑ دے اپنی خند۔ ہمیں زبانی کے سامنے ایسے رسوا مت کر میں کی مانند دکھاؤں گی تیرے کا کا جانی کو۔ میرے باپ جیسے بھائی ہیں وہ۔ جینا مرنا ختم ہو جائے گا ہمارا۔ اکلوتی بہن ہوں ان کی۔ کچھ رحم کھا مجھ پر۔“

وہ بغیر ایک لفظ بھی بولے کمرے سے نکل گیا۔ ماں کے رونے سے دردِ یار رونے لگتے ہیں۔ خون تو اس کی رگوں میں شریفوں کا تھا۔ چاہے وہ خود کو شیطان کے لبادوں میں کتا بھی چھپا لیتا۔

حسنین سے رستے سے کھانے کی ٹیبل تک بڑی فارمل سی باتیں ہوتی رہیں۔ چائے کے فوراً بعد وہ اصل بات پر آگئے تھے۔

”حسنین میرے بیٹے! تمہیں جب یہ لگا تھا کہ پروا اور ہمدان کے بیچ کچھ ہو رہا ہے تو کم از کم ہمدان کے باپ ہونے کی حیثیت سے مجھے تو بتایا ہوتا۔ یوں سب سے دور اگر بیٹھ جانے سے بھی کچھ مسئلے ہوتے

ہیں؟“

”نکل! میں نے مسئلہ کا حل ڈھونڈ لیا ہے۔ میں نے طلاق کے کاغذات بنوا لیے ہیں۔ ہر انسان کو اس کی مرضی سے جینے کا حق ہے۔ وہ ہمدان میں انٹر سٹڈ ہے تو اسی سے کر لے شادی۔ نصیب کو چاہے تو مجھے دے دے یا خود رکھ لے۔“

”اف میرے خدایا! اتنا آگے تک کا سوچ لیا تم نے۔ جو کچھ تم سمجھ رہے ہو ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے انتہائی شرمندگی سے کہنا پڑ رہا ہے کہ یہ سب سازش میرے بیٹے کی ہے۔“

پروا کی اس تالاق میں ذرا بھر بھی دلچسپی نہیں تھی تم یقین رکھو اس پر۔ تمہارے اور پروا کے اچانک نکاح پر اس کی اتنا پرچوٹ بڑی۔ نکاح کے دوسرے ہی دن اس نے مجھے کال کر کے نکاح ختم کرانے کا کہا جیسے وہ کسی جیتے جاگتے انسانوں کا نہ بلکہ یا گڈے کی شادی کا کھیل تھا۔ میں نے اسے سخت ست سنا میں تو وہ دو تین سال خاموشی سے بیٹھا رہا۔ مجھے پتا ہوتا کہ یہ آتے ہی ایسے تماشے کرے گا تو میں تم کو اعتماد میں لے کر سب بتا دیتا۔

دوسری غلطی پروا سے بھی یہی ہوئی کہ مجھ کو یا تمہیں اعتماد میں لینے کے بجائے وہ اس کے ہاتھوں بلیک میل ہوتی رہی۔ اور تم نے اپنے کا کا جانی والے گھر میں اسے ہمدان کے ساتھ دیکھ لیا۔ حالانکہ وہ صرف اس ڈر سے گئی تھی کہ وہ اسے بلیک میل کر رہا تھا۔ میرے بیٹے شک کو دل سے نکال پھینکو۔ پروا بہت اچھی بچی ہے۔ اس سارے واقعہ میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ شروع سے بزدل تھی۔ اس لیے ہمدان کی حرکتیں چپ چاپ برداشت کرتی رہی۔ تم یقین کرو یہ سب ہمدان کی سازش ہے۔ میری بات کا یقین کرو۔ کیا کوئی باپ اپنے بیٹے پر الزام لگا سکتا ہے؟“

وہ ہنسن کو مجھے گھر کی سے نظر آتے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اسے لگا تھا چاند رو رہا ہے۔ موسم بھیگ رہا تھا۔ ہر طرف روتے چاند نے پروا کی شکل اختیار کر لی تو وہ چاند سے نظریں چراتا فاروق کی طرف دیکھ کر بولا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔“

فاروق نے آگے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ دھیرے سے بولے۔

”میرے ساتھ چلو جو کچھ ہوا اسے بھلا دو۔ میں تمہیں سب حقیقت بتا چکا ہوں۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

حسنین کو لگا جیسے کہنے کو اب کچھ بھی نہ ہو۔ شہر دل کی بند گلیوں کے دروازے کھلنے کو تھے۔

پروا اپنی جنت کے سبز لان میں بیٹھی کسمپرسی کے گھر سے مشابہ چھتری نما ٹاور پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔ نصیب اس کی کرسی کی پشت کو تھامے کھڑا تھا۔ فاروق ماموں نے اسے بتایا تھا کہ وہ حسنین کو لے کر آرہے ہیں۔ وہ محو انتظار تھی۔ اس نے بڑے دکھ سے اپنے اور کسمپرسی کے گھر کا موازنہ کیا تھا۔

”عورت اور کسمپرسی کے گھر میں کوئی فرق نہیں۔ بڑی جان توڑ کو ششوں سے بڑی عرق ریزی سے یہ اپنا گھر بتاتی ہیں۔ ایک سائبان اور ایک چھت کے لیے مگر بعض دفعہ سرد گرم موسم ان کے گھروں پر یوں بھی اثر انداز ہوتا ہے کہ گھر بکھر جاتا ہے اور پھر اس ملے

میں عورت ”قبر بن جاتی ہے جہاں پھول تو چڑھائے جاسکتے ہیں مگر مرد عورت کو زندہ عورت میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔“

اس نے ایک گہرا سانس لے کر زندگی رہ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

وہ سوچوں کے سمندر سے نکلی تو حسنین کی گاڑی کارپورج میں آکر رک چکی تھی۔ اس نے نصیب کو گود میں اٹھا کر ہلکا قدم اس کی جانب بڑھایا اور دوسرا قدم حسنین نے۔ یوں فاصلے سینٹے غمے وہ اس کے شانے سے سر لگا کر رونے لگی۔ حسنین نے اس کے آنسو صاف کر کے اشارے سے چھتری نما ٹاور پر اس کی توجہ مرکوز کروائی۔ جہاں دو پرندے چوچے سے چوچے ملائے بیٹھے انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ ہنسی آنکھوں سے مسکراتی تھی۔

میں کیسے

گئی۔

”اٹھ گیا میرا چاند! زینبی! اسد کے لیے ناشتا بنا لاؤ۔“
محبت پاش نظروں سے بھرو جوان بیٹے کو دیکھتے
ہوئے خالہ نے زینبی کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”مجھے نہیں کرنا کوئی ناشتہ واشتہ۔“ اس کا مزاج
سوانیزہ پر تھا۔ زینبی اٹھتے اٹھتے واپس بیٹھ گئی۔

وہ واش ٹین کے سامنے کھڑا ہل سنوارنے لگا۔

”ارے کھانے سے کیا دشمنی ہے۔“ اماں کی آواز
شہد آگئیں تھی۔ انہوں نے ایک بار پھر زینبی کو اٹھنے کا
اشارہ کیا تھا وہ اٹھ کر چپن میں چلی گئی تو وہ دندنا تا ہوا
اس کے سر پہ آن کھڑا ہوا۔

”تمہیں اپنے گھر میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ سوئے
سے قبل تم ادھر تھیں اب اٹھنے سے پہلے پھر حاضر
ہو۔ ہر وقت تمہاری ہی شکل دیکھتے رہو۔ بندہ اپنے گھر
میں بھی آرام سے نہیں رہ سکتا اور مجھے نہیں پسند
تمہارے ہاتھ کا ناشتہ! اس زحمت کی بھی ضرورت
نہیں۔“

سارا غصہ ہیزاری اور کھولن اس برالت کر وہ چاچکا
تھا اور وہ ہکا بکا دروازے میں منہ کھولے کھڑی کی کھڑی
رہ گئی تھی۔

”اسے کیا ہوا۔“ خالہ نے اس سے پوچھا تھا۔ اب
کاٹنے، آنسو ضبط کرتے وہ محض شائے اپنے کا کر رہ گئی
تھی۔

وہ گھر سے نہیں نکلا تھا۔ بلکہ گاڑی میں بیٹھ کر لاہور

زینبی لٹو کا ڈیبا ہاتھ میں تھا اسے میڑھیوں پہ بیٹھی
تھی۔ اس ڈبے کا رنگ گہرا بنز تھا اور اس پر سنہری تیل
بوسے بنے ہوئے تھے۔ کوٹھی والوں کے گھر بیٹھ کی
شادی ہوئی تھی۔ یہ اس کے مکلاوے کا لٹو تھا۔
پہلے وہ کبھی مٹھائی کا ڈیبا ہے۔ ہناوٹ ہی ایسی تھی مگر
جب کھول کر دیکھا تو ایک منفرد سی پیکنگ میں گول
مٹول سوچی کا لٹو رکھا ہوا تھا۔

یہ نیا اور منفرد ڈیزائن اسے بہت پسند آیا تھا۔
اب وہ ڈیبا کھولے لٹو کا جائزہ لے رہی تھی، خشک
میووں سے بھر لٹو اس کے منہ میں پانی آنے لگا۔
”خالہ دیکھو تو! کیسا منفرد ڈیزائن کا ڈیبا ہے۔“ پالک
کاٹتی خالہ بھی کن اکھپوں سے لٹو کا ہی جائزہ لے رہی
تھیں اور دل ہی دل میں متاثر بھی ہو چکی تھیں۔
”خالہ! ہم بھی اسد کی شادی میں ایسے ہی ڈبوں میں
لٹو بانٹیں گے۔“

ڈبے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بڑی محبت سے بولی
تھی۔ اسد کی شادی کا اسے بڑا ارمان تھا۔ وہ اس کی
شادی کے ہر فیکنشن کو بڑے الگ اور منفرد انداز میں
کرانا چاہتی تھی اور اس کے لیے وہ اکثر ہی خالہ سے
ایسی الٹی سیدھی فرمائشیں کرتی رہتی تھی۔
میڑھیوں اترتے اسد کے پہلے کان کھڑے ہوئے
اور پھر حلق تک کڑوا ہو گیا۔

”اسٹینڈرڈ تو دیکھو اس لڑکی کا! ایک لٹو کے ڈبے پہ
اس قدر فریفتہ ہو رہی ہے۔“ بڑا ہنس پر زینبی نے سر
اٹھایا۔ جواباً اسے جن نظروں سے کھور گیا وہ جو اس
کا حال احوال دریافت کرنے والی تھی، لب بستہ رہ



آگیا تھا اور اب صبح سے کمر بند کیے پڑا تھا۔ نہ بھوک
نے ہی کیا۔ ”دیکھو! بیٹا تمہاری تعلیم مکمل ہونے والی ہے
لگ رہی تھی نہ نیند آ رہی تھی۔“
دو روز قبل اماں نے اسے فون کر کے گھر آنے کے
لیے کہا تھا۔ کل وہ گھر پہنچا تو رات کھانے کے بعد لبا
نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔ گفتگو کا آغاز اماں
نے ہی کیا۔
”دیکھو! بیٹا تمہاری تعلیم مکمل ہونے والی ہے
لگ رہی تھی نہ نیند آ رہی تھی۔“
دو روز قبل اماں نے اسے فون کر کے گھر آنے کے
لیے کہا تھا۔ کل وہ گھر پہنچا تو رات کھانے کے بعد لبا
نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔ گفتگو کا آغاز اماں
نے ہی کیا۔

بند تھا۔

بالآخر ابا کو لاہور روانہ کیا گیا۔

دروازے پر بڑی زور کی دستک ہوئی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ اٹھنے کی زحمت کرتا وہ بگڑے تیوروں سمیت اس کے سر پر آن کھڑی ہوتی تھی۔

”یہ کیا 1970ء کے ٹمکین ہیرو کی طرح صبح سے جگہ نشین ہوئے بیٹھے ہو اس پر فون بھی بند کر رکھا ہے صبح سے نہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔“

تیز تیز بولتے ہوئے اس نے پہلے لائٹ جلائی پھر کھڑکی کے پردے ہٹائے اور اس کے بعد ایک عدد کٹن سے اس کی ٹھکانی کی تھی اور اب اس کے سر پر کھڑی مسلسل اسے گھورے جا رہی تھی۔

”میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔“ ٹمکین لہجہ میں کہتے ہوئے اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا تھا۔

”کیا ہوا ہے طبیعت کو۔“ اب کی بار زرا فکر مندی سے اس نے آنکھوں پر رکھے بازو پر ہاتھ رکھا تھا اسد نے اس کا پردھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

”کیا نہیں تھا اس کی آنکھوں میں۔ بے چارگی، حسرت، ملال۔“

”تم تو گھر گئے تھے وہاں سب خیریت ہے نا، انکل انٹی ٹھیک ہیں۔“ وہ کس قدر فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔ اسد کو اس کا اپنے گھر والوں کے لیے یوں پریشان ہونا اچھا لگا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا اس لڑکی سے زیادہ کوئی اس کے اہل کا خیال رکھ سکتا تھا جیسا کہ اسے اپنی ماں سے بڑی محبت تھی اور آج اسے اپنے انتخاب پر پھر ہو رہا تھا کہ وہ لڑکی اتنے اچھے دل کی مالک تھی کہ اس سے وابستہ ہر چیز سے محبت کرتی تھی۔

زینی میں جانے کون سے سرخاب کے پر لگے تھے جو اہل اس کے علاوہ کسی اور کے لیے سوچنے تک کے لیے آباد نہیں تھیں۔

”ابا ہو رہا ہے یہاں۔“ ابا اچانک کمرے میں داخل ہوئے تھے اور سامنے چلتا سین ان کے لیے قطعاً غیر متوقع تھا۔

وہ اپنی جگہ حیرت کابت بن چکے تھے اور اسد اس اچانک افتاد پر اچھل کر برستے پیچھے اترتا تھا۔ فزایو نمی اپنی جگہ کھڑی رہی تھی۔

”سامان باندھو اور گھر چلو۔“ حکم صادر کرتے وہ باہر نکل گئے تھے۔

”اسد۔“ فزائے خوف زدہ نظروں سے اسد کو دیکھا تھا۔

”گھبراؤ مت، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اسے تسلی دے رہا تھا اور خود کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

اب جانے کیا ہونے والا تھا۔

تمام راستے وہ خاموش رہے تھے۔ گھر جا کر بھی انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ ساری رات بے چین رہا تھا فزائے کے ساتھ گزارا ہر بل نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ کیسے وہ پہلی بار اس سے ملا تھا، نوٹس کے بھاننے سے باتیں کرنا، یو فیسر کے سامنے ایک دوسرے کی کھچائی ٹمکین میں گول کیوں کی شرط، لائبریری میں سونا اور بیت بازی کے مقابلے۔ دونوں میں دوستی کیا کچھ نہیں تھا جو یاد آ رہا تھا۔

وہ اس کی مشام جان سے بھی قریب ہو چکی تھی وہ اسے کھونے کا تصور تو کسی صورت بھی نہیں کر سکتا تھا دوسری جانب زینی تھی۔ جس کے ساتھ سارا بچپن گزارا تھا۔ وہ اچھی شکل کی تھی سلیقہ مند، سمجھ دار، مگر وہ فزائے نہیں تھی نا۔

انکی صبح وہ خود ابا کے سامنے حاضر ہوا تھا۔ وہ حقہ گڑگڑا رہے تھے گہری سوچوں میں مستغرق۔ اسے دیکھ کر بھی ان کو دیکھا کر دیا تھا۔

”ابا جی مجھے آپ سے بات کرنا تھی۔“ اس نے گلا کھنکھار ا وہ ہنوز حقہ گڑگڑاتے رہے۔ آخر اس نے

خود ہی ہمت کی۔

”ابا جی! وہ لڑکی۔“

”وہ لڑکی جو کوئی بھی تھی، ہاسٹل میں رہ گئی۔ مجھے اس کا ذکر بھی گوارا نہیں، کل میں اور تیری ماں زینی کے ساتھ بات پکی کرنے جا رہے ہیں بس۔“ انہوں نے آخری فیصلہ سنایا تھا۔

اب کون تھا جو پتھر پر لکھی لکھنا نا۔ باہر کھڑی زینی کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ اسد ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔

زینی نے اس کالال بھجھو کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ وہ خاموشی سے لب کا قاتی دوپٹے مروٹی رہی۔

”تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے یہ سب، لیکن میں ہرگز کسی بھی صورت تم سے شادی نہیں کروں گا۔ اس سے تو اچھا ہے میں زہر کھالوں۔“ اس کے ماتھے کو انگلی سے پیچھے ہٹا نا اس پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالنے کے بعد تن فن کر آیا پتھر یاں چڑھ گیا تھا۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے سر بنا پتھر میں ڈھل گئی۔

انٹی تدبیر کا قاتی تو ہیں۔

اور پھر جانے کس طرح اس نے منایا تھا یا ابا کو۔ اہل ہنوز اس سے ناراض تھیں ساری خریداری زینی نے ہی کی۔ دو روز بعد وہ فزائے کو منگنی کی انگوٹھی پہنانے آئے تھے۔

زینی آئینے کے سامنے کھڑی اپنے چہرے کے نقوش کھون رہی تھی۔

”کیا میں اتنی بری تھی جو تم نے اتنی حقارت سے مجھے ٹھکرایا۔ تم تو میرے بچپن کے دوست تھے ایک بار کہہ دیتے، زینی! تم انکار کرو تو ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر انکار کر دیتی، تم از کم میری عزت نفس، میری انا میری خودداری تو سلامت رہتی۔ اتنا سوا تو احسان کر دیتے۔“

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

ڈبل فلورا ئیڈ ڈبل طاقت...



Cavity Protection All Day Long

English
Fluoride Toothpaste

Regularmint

FREE
Toothbrush

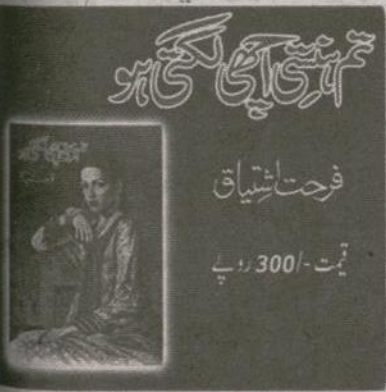
Liquid Calcium

Guaranteed
Cavity
Protection

English
FREE
Toothbrush

25 روپے کی یقینی بچت

facebook.com/snsarcare



فرحت اشتیاق

قیمت - 300 روپے

حالات تک بعد میں اسد نے اس سے اپنے رویے کی محذرت بھی کر لی تھی مگر اس کا ملال کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس کی نفرت، اس کی حقارت اور وہ توہین آمیز الفاظ نہیں بھول پاری تھی۔

اسد خوش تھا بہت خوش، آخر اس نے جو چاہا وہ پایا تھا۔ مگر ماں نے شاید اس بات کا زیادہ ہی صدمہ لے لیا تھا انہیں قانع کا حملہ ہوا تھا اور وہ لایج ہو چکی تھیں۔

مہینہ بھر اسپتال رہ کر گھر آئی تھیں۔ ان دنوں زینی نے رات دن کا فرق بھلا کر ان کا خیال رکھا تھا۔ وہ جتنا بھی اس کا مشکور ہوتا کم تھا۔

لیکن ان مشکل اور صبر آزما لمحوں میں دل فزا کا ساتھ مانگ رہا تھا اس نے سوچا وہ جلد ہی شادی کر لے گا۔

یہی سوچ کر وہ بہت دنوں بعد کلج آیا تھا۔

کلاس روم جانے سے قبل ہی فزا اسے لان میں بیٹھی دکھائی دے گئی تھی وہ راہداری سے ہوتا ہوا جو نبی اس کے قریب پہنچا لاشعوری طور پر رک گیا۔

”فزا! تم اتنا برا فیصلہ بے وقوفی میں کر رہی ہو اسد بہت محبت کرتا ہے تم سے بھل نہیں تو۔ رسول اس کی اماں ٹھیک ہو جائیں گی۔“ یہ اطمینان ہی اس کی دوست۔

”اور اگر نہ ہوئیں تو میں زندگی بھر ان کی خدمت گار بنی رہوں گی۔ اسد کی حد تک ٹھیک تھا لیکن اس کے پیرئیس کے ساتھ گاؤں جا کر نہیں رہوں گی میں۔ اسد آجائے تو اس سے دو ٹوک بات کرتی ہوں جانے کیسی اسٹوڈنٹ سی توقعات مجھ سے وابستہ کر کے بیٹھا ہے۔“

”اور اگر وہ نہ مانا تو؟“

”تو ٹھیک ہے پھر اپنی انگوٹھی واپس لے جائے۔“ لاپرواہی سے شانے اچکاتے ہوئے اس نے ہنسی بڑی بات کس آسانی سے کہہ دی تھی۔

اور ایک وہ تھا جو اس کی خاطر مرا جا رہا تھا ایک دم ہی سٹھن بڑھ گئی تھی وہ کلج کے عقبی لان میں چلا آیا تھا۔ اسے زینی کی بے لوث خدمت، محبت یا داری تھی۔

”میرا بیٹا بڑا فرمانبردار ہے وہ ضرور ہماری خواہش کا احترام کرے گا۔“ دور کہیں سے اماں کی آواز آئی تھی۔

اماں کی خواہش کا احترام نہ کرنا الگ بات تھی۔ مگر کیا وہ فزا کی خاطر اپنی ماں کو چھوڑ پائے گا۔ اسے بھلے ہی فزا جیسی لڑکی پسند ہو مگر اس کے گھر کو زینی جیسی لڑکی کی ضرورت تھی۔

وہ ایک فیصلہ کر کے اٹھا تھا۔ ”اسد تم کب آئے۔“ فزا اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھی۔

”فزا! میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے تم نہیں زینی پسند ہے اور میں زینی سے ہی شادی کروں گا۔“ فزا کا ہاتھ تھام کر اس نے اپنی پرستائی ہوئی انگوٹھی خود اتاری تھی۔

اور پھر بغیر اس کی سمٹ دیکھے واپس پلٹ آیا تھا۔ فزا کو زینی بنانا مشکل تھا مگر زینی کو وہ فزا جیسا بنا سکتا تھا۔

تھوڑا سا ماڈرن، تھوڑا سا فیشن ایبل اور بہت سارا من پسند۔

تمہاری لکھی

فرحت اشتیاق

قیمت - 300 روپے

کوئی کوئی سداق

انسانی زندگی کا کوئی ایک سیاہ دن ہوتا ہے جو اس کی پوری زندگی میں سیاہیاں بھرتا ہے۔
اس کی زندگی کا وہ سیاہ دن کون سا تھا جسے زندگی کے کیلنڈر سے خارج کر کے وہ تمام سیاہیوں کو پالش کر کے روشنی میں تبدیل کر سکتی تھی۔ اسے سوچنے کے لیے وقت درکار تھا جو اس کے پاس نہیں تھا۔
اور حل کرنے کے لیے بھی وقت چاہیے تھا جو گزر

ناؤلیٹ

چکا تھا اور اس وقت اسے ہر جگہ دھندلاہٹ محسوس رہی تھی۔ شدید ٹھکن کے باعث اس کے اندر کا اشتعال کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ صبح ساڑھے پانچ کے درمیان اسے نیند آگئی تھی آنکھ کھلی تو ساڑھے دس بج چکے تھے اور اس کی آنکھیں ایک دفعہ پھر بند ہونے کو تھیں مگر وہ پھرئی سے اٹھی، کپڑے نکالے اور نہا کر آنے کے بعد اسے لگا کہ کچھ ٹھکن ہلکی ہوئی ہے اس نے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں، بیک لیا، کیلے بال سلجھائے بغیر کچھو میں جکڑے اور تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آگئی۔ وہ عین سامنے بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے جن میں فمد بھی تھا۔

”مائے! اٹھ گئی میری بچی۔ آجاؤ تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ آؤ ناشتہ کر لو بیٹا۔“ وہ اسے فریش محسوس کر کے چمبی تھیں۔

”مجھے ناشتہ نہیں کرنا۔ کون سے ہسپتال میں بھیجا ہے اسے ابو ایڈریس چاہیے۔“

”تم بیٹھو نیچے! ناشتہ تو کر لو پہلے۔“ ابو اس کے چہرے پر چھائی بے چینی سے گھرائے تھے۔

”پلیز بتا دیں۔ کون سے پاگل خانے میں ڈالا ہے اسے کس کے حوالے کر آئے ہیں بتائیں مجھے، جانا ہے ابھی۔“

”مائے! بیٹھ کر ناشتہ کر لو پھر بات کرتے ہیں بیٹا۔“

”ابو! وہ یتیم اور لاوارث ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے جہاں چاہے پھینک دیا جائے انسان ہے وہ مجھے اگر کوئی اس طرح پاگل خانے میں ڈال دے تو آپ کو کیسا لگے گا؟“



بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL



- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے بال آگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت = 100 روپے

سوہنی ہیرائل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا بخوبی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دینی خریداجاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف = 100 روپے ہے، دوسرے شہروں والے کسی ڈسٹریبیوٹر کر جڑی بوٹیوں سے منگوائیں، روپے سے منگوانے والے کسی ڈسٹریبیوٹر سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے = 250 روپے
 - 3 بوتلوں کے لئے = 350 روپے
- نوٹ: اس میں ڈاک خرچہ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

منی آڈر بھجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فور ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں سے حاصل کریں
بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فور ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

”مناہیت آسان ہے۔ مگر بعض اوقات سب کچھ دینا نہیں ہوتا جیسا ہم سوچتے ہیں۔“
”تم مناہیت سے محبت نہیں کرتے فدا کیا اسے اپنانا نہیں چاہتے؟“
”کرنا ہوں تب ہی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آیا ہوں۔“

”تو پھر انتظار کرو اور اس مشکل گھڑی میں اس کا ساتھ دو۔ جیسے پیشہ اس کے ساتھ ہوتے تھے۔“
”میں اس کے ساتھ ہوں۔ مگر کاش وہ بھی یہ سمجھ پائے۔“

”سمجھ جائے گی فدا! سب سمجھ جائے گی بس تم عقل سے کام لو۔“
”محبت اور عقل کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ اگر عقل سے کام لیتا تو یہاں اس وقت آپ کے ساتھ نہ بیٹھا ہوتا۔ کسی کی بے رحمی کے شکوے کرتا وہ استہزاء نہ ہسکتا تھا۔“

”یہ تو بہر حال سچ ہے۔“ وہ اس کی بات پر بے ساختہ ہنسی تھیں اور پھر دونوں ذہن اپنے اپنے منصوبے اپنے طریقے سے ترتیب دے رہے تھے اور ڈانگنگ ٹیمبل کے اطراف مکمل خاموشی تھی۔ گہری سوچوں والی خاموشی۔



مینٹل اسپتال وارڈ تھری میں دو ایک بیڈ پر گھنٹوں میں سرورے بیٹھا وہ مڈر احمد تھا جسے لوگ ہمیشہ سے پاگل کہتے تھے۔ جسے وہ بھی ہمیشہ پاگل کہتی تھی جسے ڈاکٹر بھی پاگل کہتے تھے اور پھر اس کے گھر والوں نے اس پاگل کو پاگل خانے پہنچا کر ہی دم لیا تھا۔ وہ لاکھوں بیگانے چروں میں ایک اسی اپنے چہرے کو دیکھنے کے لیے لوہے کی گرل کے پاس رکھ رکھ رہی تھی۔
”اسے آپ نے اتنے لوگوں کے بیچ رکھا ہوا ہے۔ یہ سارے مل کر اسے مزید پاگل کر دیں گے ڈاکٹر صاحب!“

احسان صاحب کچھ فاصلے پر کھڑے ڈاکٹر سے بات

رہا تھا اور اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی ثانیہ ہے جسے وہ کچھ سال پہلے چھوڑ گیا تھا۔ وہ بڑھاپے کی عمر اندر سے پوری کی پوری بدل چکی تھی۔ مگر وہ کہاں جانتا تھا کہ اس بدلنے میں اسے اتنی اذیتوں سے گزرنا پڑا تھا۔ وہ اگر بدلی تھی تو کیوں بدلی تھی۔

”یہ وہ ثانیہ نہیں ہے۔ ثانیہ بدل چکی ہے۔“ اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر افسوس اور حزن والے انداز میں کہا تھا۔

”وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ شادی کے بعد بھی تمہیں یاد کرتی رہی، تمہارا انتظار کرتی رہی۔ کاش تم تب لوٹ آتے۔ مگر اب بھی سب کچھ پہلے جیسا ہو سکتا ہے۔ اگر تم کو شش کرو۔ اگر تم جاؤ تو تم اسے پھر بدل سکتے ہو فدا! تم لوگ ایک نئی زندگی شروع کر سکتے ہو۔ وہ ابھی شدید دباؤ میں ہے اسے وقت دو پلینز۔“

”وہ اپنے پاگل شوہر کے لیے روری ہے، شور مچا رہی ہے، اسے واپس لانے کی بات کر رہی ہے اور آپ کہتی ہیں وہ میرے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرے گی۔“

”تم نے دیکھا نہیں اس نے انگلی میں اب تک تمہارے نام کی انگوٹھی پہنی ہوئی ہے تم نہیں جانتے میں جانتی ہوں اس نے تمہارا کتنا انتظار کیا۔ اب وہ خفا تو ہو گی ہی۔ تم اسے وقت دو۔ پرانی باتیں یاد دلانا اسے وہ مدثر سے ملے گی تو اس کے پاگل ہونے کا یقین آجائے گا اسے۔ اس کے پاس تمہارے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔“

”بہت مشکل ہے یہ سب۔“ اس نے کپ خالی کر کے میز پر رکھا تھا۔

”مگر ناممکن نہیں ہے۔“ وہ اسے ذہنی طور پر تیار کر رہی تھیں۔
”پتا نہیں کیا ہو گا اتنی۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”وہی ہو گا جو ہم چاہتے ہیں۔ ہم اس سے طلاق کے پیچھے زسائن کروائیں بس پھر کچھ ہی مہینوں بعد تم شادی کر کے ثانیہ کو اپنے ساتھ لے جانا۔“

”ثانیہ! آرام سے بیٹھو، جوس پی لو پھر بات کرتے ہیں۔ تم اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہو۔“ امی کو اب غصہ آ رہا تھا۔ اسے بھٹاتے ہوئے پوچھیں۔

”ہوش میں نہیں ہوں تو مجھے بھی ڈال دیں اس کے ساتھ پاگل خانے میں، یہی حل ہوتا ہے تا آپ لوگوں کے پاس۔“ وہ انکا بازو چھڑاتے ہوئے چینی تھی۔

”ہم نے جو بھی کیا تمہاری بھلائی کے لیے کیا ہے بیٹا! اس کا وہاں علاج ہو گا۔ وہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ بیٹھ جاؤ شامیاش کچھ کھا لو پھر چلتے ہیں۔“ وہ اٹھ کر اس کے قریب آئے اور سمجھانے لگے۔

”مجھے کچھ نہیں کھانا ابو! آپ پلینز چلیں ابھی اسی وقت پلینز۔“ عجیب بے بسی اور لاچارگی تھی اس کے چہرے پر۔

”اچھا چلو، چلتے ہیں۔“ وہ اس کا سر تھپک کر بولے۔

”احسان! اسے بھائیں ناشتہ کروائیں آپ اسے پاگل خانے لے جا رہے ہیں۔ وہاں جا کر یہ اور پاگل ہو جائے گی۔“ وہ غصے سے اٹھی تھیں۔

”میں بھی وہیں رہوں گی۔ اب سن لیں۔“
”ثانیہ ریلیکس بیٹا، اچھا چلو چلتے ہیں۔“ وہ اسے ساتھ لگاتے ہوئے ہر نکلے تھے۔

”ہم اسے اپنے گھر لے آئیں گے ابو۔“
”اوکے دیکھتے ہیں کول ڈاکٹر۔“ وہ جابی اس سے لیتے ہوئے آگے بڑھے۔

”یہ بھی پاگل ہو گئے ہیں۔ پہلے بیٹی کی زندگی دواؤ پر لگا دی۔ اسے پاگل کر کے چھوڑیں گے۔“ وہ غصے سے بڑبڑاتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

”میرا خیال ہے میرے یہاں آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آپ نے مجھے بلا کر ایک اور غلطی کر لی ہے۔“

اس نے دیکھا تھا کہ اتنی دیر میں ثانیہ نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کی طرف دیکھا تھا نہ بات کی تھی۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا اس کا رویہ اسے تکلیف دے

کر رہے تھے۔ جب وہ لوہے کی گرل سے ہٹ کر ان تک آئی۔

”ان کو اکیلا رکھنا ان کے لیے مزید خطرے کا باعث ہے محترمہ!“

”میں اس کو یہاں سے لے جانا چاہتی ہوں۔ پلیز“ آپ اسے باہر نکالیں یہاں سے۔ ”اس کا بس نہیں چل رہا تھا لوہے کی گرل تو ذکر اسے باہر لے آئے۔

”نی الحال یہ بہت مشکل ہے محترمہ! انہیں علاج کی ضرورت ہے۔“

”یہ کب تک ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ میں اسے کب لے جا سکیں گی۔“

”دیکھیں، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ان کی ذہنی حالت بہت خراب ہے۔“

”میں جانا چاہتی ہوں۔ ابھی اور اسی وقت۔“

”محترمہ! پھر تو آپ ان کی دشمن ہوئیں کہ اس حالت میں آپ انہیں گھر لے جائیں گی۔ یہ ٹھیک تو نہیں ہوں گے البتہ آپ کا اور اپنا نقصان ضرور کر بیٹھیں گے۔“

”یہ یہاں اور پاگل ہو جائے گا ڈاکٹر صاحب! کیسے رہا ہے گا یہ یہاں۔“

”دیکھیں محترمہ! پاگل خانے لوگوں کو ٹھیک کرنے کے لیے ہوتے ہیں تاکہ مزید پاگل کرنے کے لیے۔“

”اگر ایسا ہوتا تو یہ کھپا کھپا بھرے نہ ہوتے۔ مجھے بتائیں کتنے لوگ ہیں یہاں سے جو ٹھیک ہو کر گھر گئے ہوں گے۔“

”ثانیہ بیٹا! افضل بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ لوگ علاج کریں گے اس کا ان کو اپنا کام کرنے دو پلیز۔“ وہ بہت دیر سے چپ تھے۔ مگر اب لگ رہا تھا اسے سمجھا کر چپ کرنا ضروری تھا۔

”آپ کو ٹرسٹ کرنا چاہیے محترمہ! یہاں سے بہت لوگ صحت یاب ہو کر جاتے ہیں، قصور آپ لوگوں کا ہے جو ہمیشہ تب مریض کو لاتے ہیں جب وہ سارے حواس کھو چکا ہوتا ہے۔ اب کچھ وقت تو لگے گا ہی کیا ڈاکٹر نے نہیں کہا تھا کہ انہیں میٹل اسپتال

پہنچائیں۔ مگر آپ لوگ انہیں اب لائے ہیں جبکہ علاج بہت مشکل ہو چکا ہے ان کا اور اس حالت میں کہہ رہی ہیں کہ انہیں آپ لے جائیں گی۔ اور ہم کیا دشمن ہیں جو ان کا علاج نہیں کریں گے اور یہ مزید پاگل ہو جائیں گے کمال کرتی ہیں آپ۔“

”ڈاکٹر ٹھیک کہہ رہے ہیں ثانیہ! اس کا علاج ہونے دو۔“

”مجھے اس سے ملنا ہے ابھی۔“

”ابھی نہیں مل سکتیں۔ ابھی ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔“

”مجھے اس سے ملنا ہے ابھی۔۔۔ مجھے ملوائیں میں کچھ نہیں جانتی۔“

”مجھے تو آپ بھی سائیکو لگ رہی ہیں معاف کیجئے آپ اس طرح بات کر رہی ہیں مجھ سے جیسے میں نے لاک اپ میں ڈالا ہے آپ کے شوہر کو؟“

”لاک اپ میں ہی تو ڈالا ہوا ہے آپ نے۔۔۔ دیکھیں کیسے پڑا ہے پیسوں کی طرح۔“

”یہاں بہت سارے لوگ ہیں اکیلے یہ نہیں ہیں۔۔۔“

”ڈاکٹر صاحب! آپ اسے ایک بار ملو ادیں پلیز۔“

”احسان صاحب! آپ تو اچھے خاصے سمجھ دار آدمی ہیں۔“

”جی ڈاکٹر صاحب! مگر آپ اس کی حالت دیکھیں۔ اسے ایک بار ملنے دیں۔ اسے یقین نہیں آتا ہم میں سے کسی پر بھی۔ یہ سمجھتی ہے ہم نے غلط کیا ہے اسے یہاں لاکر۔ آپ اسے دکھادیں اس کی جو حالت ہے۔“

”میں نے دیکھی ہوئی ہے ساری حالت پھر بھی میں کہوں گی کہ آپ لوگوں نے ظلم کیا ہے اسے یہاں لا کر۔“

”احسان صاحب! مجھے تو یہ بھی بہت ڈسٹرب لگ رہی ہیں۔ چلیں، بہر حال میں آپ کی ضد پر ملو ادیتا ہوں۔۔۔ مگر۔“ ڈاکٹر اس کی ضد کے آگے بے بس ہو کر اسے لے آیا۔ دروازے کے پاس تالا کھولنے لگا۔ اس سے پہلے اس نے اسٹاف میں سے ایک دو آدمیوں کو

”آواز دے کر بلایا تھا اپنے ساتھ اندر لے جانے کے لیے۔“

اندرا داخل ہوئے ہی ایک پاگل ان کی طرف جھپٹا تھا جسے ایک آدمی نے قابو کر لیا۔ ایک شخص ان کو دھکے کر۔۔۔ قہقہے لگانے لگا اور کچھ الٹی سیدھی حرکتیں کر رہے تھے۔

وہ ڈرے ڈرے انداز میں بدتر کے پاس اسے لے آئے جہاں وہ دنیا جہاں سے اجنبی بنا گھنٹوں میں سر دے بیٹھا تھا۔ اس کی قیص کا کارل اکھڑا ہوا تھا اور اسٹین کے کف پھٹے ہوئے تھے اس نے چہرہ اوپر اٹھایا تو اس کے چہرے پر کھونچوں کے کچھ نشان تھے۔

”بدتر۔۔۔ یہ کیا ہوا ہے چہرے پر۔ کس نے زخمی کیا ہے۔“ وہ بے ساختہ بڑھی تھی اس کی طرف۔

”میڈم! ذرا فاصلے پر۔“ آدمی نے اسے خبردار کیا۔

”بدتر مجھ سے بات کرو۔“ وہ ارد گرد حواس باختہ انداز میں دیکھ رہا تھا جیسے کچھ نہیں سن رہا۔

”بدتر امیری طرف دیکھو۔ مجھ سے بات کرو۔“ اس نے بازو ہلایا اس کا۔

”مت مارو مجھے چھوڑ دو۔“ وہ چیخا تھا بازو چھڑا کر۔

”بدتر! میں ثانیہ ہوں۔ میری طرف دیکھو۔“

”پھر میں تمہیں بہت ماروں گا۔ میرے کھلونے چرا لیتے ہو۔ مجھے مارتے ہو۔ کھڑکی سے گردوں کا نہیں۔“ وہ بچوں کی طرح چیخ رہا تھا۔

”اسے کیا ہوا ہے۔ یہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے ابو! وہ بے بسی سے کہنے لگی۔

”بیٹا! اس کی حالت ٹھیک نہیں۔ یہ اس وقت بھی ایسی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے گھر کی چیزیں تو ڈی دی تھیں۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”بدتر! مجھ سے بات کرو امیری بات سنو! میں ثانیہ ہوں تم سے ملنے آئی ہوں۔ گھر چلو گے تمہارا۔“

وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ اجنبی سے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

”میں ثانیہ ہوں مودی۔۔۔ تمہیں لینے آئی ہوں۔“

”مجھے درد ہوتا ہے۔۔۔ سب مارتے ہیں۔ ڈیڈی نے مارا۔ میں تو ڈاکٹر بنوں گا۔۔۔ بہت بڑا ڈاکٹر۔“ وہ بہت دنوں بعد بولا تھا۔

”اچھا۔ پھر تم گھر چلو گے۔۔۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”پہلے میں تمہیں ماروں گا۔ تم نے میری فٹ بال کھڑکی سے نیچے پھینک دی تھی نا۔“ اس نے ثانیہ کو ایک زوردار چوڑا دیا۔

”ارے رو کیے اسے ڈاکٹر صاحب! اٹھو ثانیہ۔“ انہوں نے فوراً اسے اپنی طرف کھینچا۔ جب تک آدمی اور ڈاکٹر نے اسے تھام لیا۔

”یہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟“ وہ ان سے لگ کر بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

”مس ثانیہ! اب ہر چلیں پلیز۔“

”یہ اپنے بال کیوں نوچ رہا ہے کیوں مار رہا ہے یہ خود کو؟“ وہ اپنے بال نوچتے ہوئے چیخ رہا تھا۔ اس نے خود اپنے ناخنوں سے اپنا چہرہ کھرا ہوا تھا۔

”چلو شایاش باہر چلو بیٹا۔“ وہ اسے باہر لے آئے اور دروازہ فوراً بند کر دیا گیا۔ وہ ابھی تک چیخ رہا تھا اور کچھ آدمی اس کے ساتھ چیخنے لگے تو کچھ بے ہنم قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے۔ وہ بے بسی سے لوہے کی گرل کے پاس کھڑی رو رہی تھی۔

”ریلیکس ثانیہ! بیٹا گھر چلو۔“

”انہیں رو لینے دیں احسان صاحب! اس کے بعد فینڈی گولی کھلا کر سلا دیجئے گا۔ بہتر محسوس کریں گی۔“

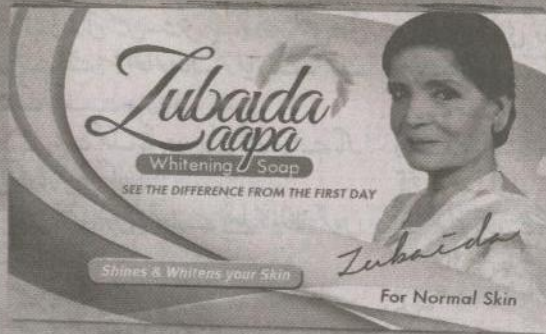
ڈاکٹر کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا اور وہ کتنی دیر تک وہاں کھڑی رو رہی تھی۔



وہ جب سے گھر آئی تھی جب چپ بیٹھی تھی۔ دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا نہ ناشتہ کیا تھا۔ ابھی بھی انہوں نے اسے زبردستی چند لقمے کھلائے تھے۔ وہ کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ اس کی اپنی کیفیت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ فینڈی گولی لینے کے باوجود وہ سونہ سکی اور

اب گورا ہوگا پاکستان

زبیدہ آپا وانکننگ سوپ،
چہرہ چمکائے اور رنگ گورا کرے



اب اس کا دل غشائیں شائیں کر رہا تھا۔
”جانیہ اب ٹھیک ہے انکل۔“ وہ پورے دن میں
اب آیا تھا اس کے پاس۔
”وہ بہت اب سیٹ ہے فم۔ بات نہیں کر رہی
ہے۔ بشکل چند لقمے لیے ہیں۔ تم جاؤ کو شش کرو اس
سے بات کرنے کی۔ اگر تم سے وہ کچھ بات کر لے گی تو
اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔“
”جی میں کو شش کرتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں
انکل۔“
”اوکے بیٹا۔ شکریہ تم ہی اسے سنبھال سکتے ہو
ابھی۔“
”جی میں سمجھ سکتا ہوں۔“ وہ ان کے جانے کے
بعد اندر آیا۔
”کیا حال ہیں میڈم! کیا ہو رہا ہے؟“ وہ کشن لے کر
اس کے سامنے بیٹھ گیا۔
”مجھے نیند آرہی ہے۔“ وہ بہت تھکے ہوئے انداز
میں بال باندھنے لگی۔
”تمہیں یاد ہے مجھ سے بات کرتے ہوئے
تمہاری نیند اڑ جاتی تھی۔“
”اتنی پرانی باتیں مجھے یاد نہیں رہتیں!“ اس کا لہجہ
خالی سا تھا۔
”جانیہ تم مجھ سے خفا ہو؟“
”میں بہت تھکی ہوئی ہوں سونا چاہتی ہوں۔“ وہ
فورا اٹھی۔
”مجھے بتا ہے تم پریشان ہو مگر دیکھو پریشان ہونے
سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہم مل کر کوئی حل نکال لیتے
ہیں۔“
”کس حل ہے تمہارے پاس میرے مسائل کا۔ بولو؟“
وہ تھکے تھکے انداز میں پھر بیٹھ گئی۔
”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں لوٹ آیا ہوں۔
ہم اس سے پیپر ز سائن کروائیں گے۔ اس کے بعد ہم
شادی کر کے یہاں سے بہت دور چلے جائیں گے۔ اپنی
نئی زندگی شروع کریں گے اور خوش رہیں گے۔ سب
بھول جاؤ تم۔“

”تم اپنی بیوی کو چھوڑ سکتے ہو؟“
”چھوڑ دوں گا تمہارے لیے۔“
”مگر میں اپنے شوہر کو نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ بھی اس
حالت میں۔“

”تم پاگل ہو کیا؟ ایک پاگل کے ساتھ کیسے زندگی
گزارو گی تم۔“
”پاگل ہوں تب ہی ایک پاگل کے ساتھ رہنے کی
خواہش ہے۔ میرے پاس کوئی احساس کوئی جذبہ باقی
نہیں بچا۔ کسی کے لیے بھی۔ میں بس ایک بے سارا
آوی کو مزید بے سارا نہیں کر سکتی۔“
”تم اپنی پوری زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتیں جانیہ۔“
”میری زندگی داؤ پر لگ چکی ہے آج سے ڈھائی
سال پہلے۔ اس وقت کمال تھے تم۔“
”جانیہ! میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا میری کیا
مجبوری تھی۔ سب ٹھیک ہو سکتا ہے۔ دیکھو ہم دونوں
کو قدرت نے ایک موقع دیا ہے پھر سے ملنے کا۔ ہم
ایک نئی لائف شروع کریں گے۔ بھول جاؤ سب۔
ہمارے سارے خواب پورے ہوں گے۔“
”اس ڈھائی سال کے مشکل ترین سفر نے میری
آنکھوں سے سارے خواب نوچ لیے ہیں فم۔ اب
میرے پاس کسی خواب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔
ایک نپٹے ہوئے صحرائیں تنہا کھڑی ہوں جسے اکیلے پار
کرنا میرا مقدر ہے۔“
”زندگی بہت مشکل ہے جانیہ اور بہت لمبی
بھی۔ اسے اکیلے گزارنا آسان نہیں۔ ہم مل کر سب
کچھ ٹھیک کر لیں گے۔“
”میں نے کہا نا کہ خواب دیکھنے کی عمر گزر گئی۔ تم
چلے جاؤ واپس۔“
”جانیہ۔ اچھا بتاؤ کیا کرو گی اگر میں واپس چلا جاؤں
تو؟“
”وہی جو میرا نصیب ہے۔ انتظار۔“
”اور اگر وہ پاگل ٹھیک نہیں ہوا تو؟“
”اسے پاگل مت کہو۔“ اسے بہت برا لگا۔
”پوری دنیا جانتی ہے۔ کس کس کو روکو گی۔ وہ پاگل

خانے میں پڑا ہے اور تم کہتی ہو اسے پاگل مت کرو۔
 ”ٹھیک ہے وہ پاگل ہے مان لیا تو ہے تو میری زندگی کا حصہ میری ذمہ داری۔“
 ”کچھ نہیں لے گا تمہیں یہ سب کر کے۔ وہ وہاں سے کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس کی میموری ختم ہو چکی ہے اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے۔ وہ اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہونے والا ٹانیہ۔“
 ”تب بھی یہ میرا نصیب ہے۔“
 ”ٹانی! بے وقوفی مت کرو۔ تمہاری زندگی ضائع ہونے کے لیے نہیں ہے۔“
 ”میری زندگی ضائع ہو چکی ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ آسان ہوتا ہے یہ سب میرے لیے اس سے شادی کرنا جتنا مشکل تھا اتنا ہی مشکل اسے چھوڑنا ہے۔ ایک انسان جو میرے آسرے پر پڑا ہے۔ اسے میں بے یار و مددگار چھوڑ کر دوسری شادی کر لوں گی۔ یہ کہنے میں آسان لگتا ہے مگر کرنے میں بہت مشکل ہے۔“
 ”مگر ناممکن نہیں ہے ٹانی!“
 ”مرچکی ہوں میں۔ بار بار مت مارو مجھے۔ چلے جاؤ فمد۔ اپنا وقت برباد مت کرو۔ میں جس حال میں بھی ہوں یہ میرا نصیب ہے۔“
 ”میں تمہیں ایک پاگل کے حوالے کر دوں جس کے ساتھ رہ کر تم بھی پاگل ہو جاؤ۔ میں نے تمہیں کھویا ضرور تھا ایک بار مگر اب نہیں۔“
 ”زندگی مذاق نہیں۔ نہ ہی بلیک بورڈ پر لکھی ہوئی تاریخ ہے جسے ڈسٹر اٹھا کر صاف کر لیا جائے۔ ایک لمحے کے توقف سے دوبارہ بولی۔
 ”میں بہت تھک چکی ہوں۔ مجھے سونا ہے تاکہ میں کچھ نارمل ہو سکوں۔“
 ”میں یہیں ہوں۔ تمہارے فیصلے کا انتظار کروں گا۔“
 ”میرا فیصلہ کل بھی یہی ہو گا۔“
 ”میں پھر بھی انتظار کروں گا۔“
 ”تم اپنا وقت برباد کرو گے۔“

”ٹانی!“ وہ دکھ سے اسے دیکھتا رہا۔
 ”لائٹ بند کر دینا پلیز جاتے ہوئے۔“ وہ ٹیکہ لگا کر بیٹھ گئی۔
 ”کیا سب اتنی آسانی سے ختم ہو سکتا ہے۔“
 ”آسانی سے ختم ہو چکا ہے۔ آج نہیں تین سال پہلے۔“
 ”میں تلافی کرنے آیا ہوں ٹانی۔“
 ”تم وقت ضائع کرنے آئے ہو۔“ اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔
 ”تم میرے جانے کے بعد پچھتاؤ گی۔ ایسا نہ ہو کہ پھر مجھے آواز دو۔“
 ”آواز دے کر دیکھ چکی ہوں دوبارہ قطعی ایسا نہیں کر لوں گی۔“
 ”تم اپنی زندگی مشکل کر رہی ہو ٹانیہ!“ وہ اب بھی دروازے کے پاس رکھا تھا۔
 ”میں پچھلے ڈھائی سال سے اس مشکل سے گزر رہی ہوں۔ اب عادت ہو چکی ہے۔“
 ”تمہیں نہیں لگتا کہ تم بھی پاگل ہو گئی ہو اس نفسیاتی کے ساتھ رہ کر۔“
 ”شکر ہے تم نے اب کی بار اسے پاگل نہیں کہا۔“
 ”ایک ہی بات ہے۔ مگر تمہارا دل ٹھیک نہیں ہے۔ پھر بات ہوگی۔“
 ”میرے پاس اتنا اسیغنا نہیں ہے کہ ایک محبت کو بار بار دہراؤں۔“
 ”ٹانی! میری کوئی حیثیت نہیں ہے تمہارے نزدیک جو تمہارے لیے وہاں سے چل کر آیا ہے اتنی دور سے سب کچھ چھوڑ چھا ڈر۔ کیوں اس کر رہا ہوں اتنی دیر سے میں کیا۔ پتھروں سے سر پھوڑ رہا ہوں۔ اسے آخر کار غصہ آ گیا۔
 ”کیوں اس کر رہے ہو اور پتھر سے سر پھوڑ رہے ہو۔“
 ”بھائی میں جاؤں۔ مرنے کے ساتھ پاگل خانے میں۔“
 ”شکریہ، جی بند کر کے جایا پلیز۔“ اس کے چہرے پر تھکی ہوئی عجیب مسکراہٹ تھی۔

”معاف نہیں کروں گا تمہیں میں۔ سن لو۔ خوش نہیں رہاؤ گی کبھی۔“
 ”میں نے بھی تمہیں معاف نہیں کیا تھا۔ تم اگر خوش نہیں رہجائے تو۔“
 ”ٹھیک ہے۔ خوشی سے برباد کرو اپنی زندگی تم اسی ضد میں رہو۔“
 ”بہت بار کہہ چکی ہوں جی بند کر دینا اور دروازہ بند اس نے کہتے ہوئے ناٹکس سیدھی کر لیں اس نے زور سے دروازہ بند کیا تھا۔
 ”ادھر گپ اندھیرے میں دو آنسو ٹوٹ کر گرے اور چہرہ بھگو گئے۔
 ☆ ☆ ☆
 ”تم جا رہے ہو فمد!“ وہ پیکنگ کر رہا تھا جب وہ اندر آئیں اس کے کمرے میں۔
 ”جی ہاں! میں نے سوچا مزید وقت برباد کرنے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے۔“
 ”تم اسے اس حال میں چھوڑ کر جاؤ گے فمد! جب اسے تمہاری شدید ضرورت ہے۔“
 ”اسے کوئی میری ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب بھلاوے ہیں۔ میں مزید یہاں رک کر تمہارا شائیں بن سکتا۔“
 ”اور وہ جو تمہا بن گئی ہے۔ اس کا خیال نہیں ہے تمہیں۔“
 ”وہ خود ہی ہے اس میں کس کا قصور ہے بھلا۔“
 ”تمہارا فمد! تمہارا قصور ہے اس میں۔ تم اگر اسے چھوڑ کر نہ جاتے تو وہ یہ فیصلہ کبھی نہ کرتی۔“
 ”تو اسے پورا جہاں چھوڑ کر اس پاگل سے ہی شادی کرنی تھی؟“
 ”یہ شادی اس کے باپ کی پسند سے ہوئی تھی۔ تمہیں پتا تو ہے اس نے بس مجھوٹا کر لیا تھا کیوں کہ اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔“
 ”جو کچھ ہے اب میں اس کے لیے سب کچھ چھوڑ آیا تھا اور وہ نہیں مان رہی تو میں کیا کر سکتا ہوں

بھلا۔“ وہ بیگ کی زپ بند کر کے سوٹ کیس نیچے اتار کر ان کی طرف مڑا۔
 ”وہ تم سے محبت کرتی تھی فمد! اسے مت چھوڑو۔“
 ”کرتی تھی مگر کرتی نہیں ہے۔ اس کا گھر بس چکا ہے وہ بدل گئی ہے آئی۔“
 ”فمد! اسے وقت دو پلیز۔“
 ”آئی! اچھلے تین ماہ سے پاگلوں کی طرح یہاں اس کے پیچھے خوار ہو رہا ہوں۔ کچھ نہیں ملا مجھے۔ سب کچھ واؤ پر لگا ہے میرا گھر میرا کاروبار سب کچھ۔ پوری زندگی داؤ پر لگا آیا ہوں اس کے لیے جس کے پاس مجھ سے بات کرنے کے لیے وقت نہیں میں برواشت نہیں کر سکتا زیادہ۔ بس بہت ہو چکا ہے۔“
 ”تم اس کی زندگی کی آخری امید ہو۔“
 ”کیسے سمجھاؤں میں آپ کو کہ جو کچھ آپ سوچتی ہیں ویسا نہیں ہوتا ہے۔ وہ اسے چھوڑنے کو تیار نہیں ہے۔“
 ”وہ چھوڑ دے گی بے زار آجائے گی اس سے۔ کتنا بھاگے گی اس کے پیچھے۔“
 ”ٹکٹ بک کرائی ہے ہوٹل جا رہا ہوں۔ وہاں سے چلا جاؤں گا۔“
 ”فمد! کچھ دن اور رک جاؤ۔“
 ”اب نہیں پلیز۔۔۔ اب میں خود بہت اپ سیٹ ہوں۔ مگر مجھے لگتا ہے میرا یہاں رکنا میرے اور اس کے لیے کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔“
 ”اگر وہ خود تمہیں روکے۔“
 ”ناممکن ہے۔ وہ بیگ لے کر کمرے سے باہر نکلا۔
 ”اگر ایسا ہو جائے تو کیا تم رک جاؤ گے فمد؟“ وہ پھر کسی امید کو لے کر اس کے پیچھے آئی تھیں۔
 ”تو میں رک جاؤں گا۔ مگر مجھے پتا ہے ایسا نہیں ہو گا۔“ وہ میڈیاں اتر کر نیچے جا رہا تھا۔
 ”وہ تیزی سے ٹانیہ کے کمرے کی طرف بڑھیں۔
 ”ٹانی! وہ جا رہا ہے اسے روک لو۔ پلیز اسے روک

لو۔ تم اس سے محبت کرتی ہونا۔ لڑائی تمیں تم اس کے لیے کئی دن کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ وہ تمہارے لیے لونا ہے۔ اسے روک لو اپنے لیے۔

”وہ سب ختم۔ ختم ہو چکا ہے؟“ وہ پتھر کے بت کی طرح کھڑی تھی۔

”کچھ ختم نہیں ہوا۔ جاؤ اسے روک لو۔ اس کے پیچھے جاؤ خدا کے لیے۔ وہ چلا جائے گا ثانی! وہ تمہاری آخری امید ہے۔ اسے روک لو! دیکھو تم نے ابھی تک اس کی دی ہوئی انگوٹھی پہن رکھی ہے۔ تم نے اس کی چیزیں سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔ ثانیہ بیٹا تمہیں پھر سے موقع ملا ہے اپنی زندگی بنانے کا۔ جاؤ ثانیہ جاؤ۔ وہ اسے پاگلوں کی طرح جھوڑ رہی تھیں۔

”امی! چھوڑیں مجھے۔ سن چکی ہوں یہ سب۔“

”ثانیہ تمہیں میری قسم جاؤ۔ پلیز جاؤ۔ اسے روک لو۔“

”امی۔“ وہ صدمے سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

”انھو ثانیہ جاؤ۔“ وہ اسے تقریباً ”کھینچتے ہوئے دروازے تک لے آئیں۔“

”امی! ایسا مت کریں۔“ وہ تکلیف سے انہیں دیکھ گئی۔

”ثانیہ! جاؤ میں نہیں چاہتی اب وہ جائے۔ اسے روک لو۔“ وہ بے بسی سے دو منٹ تک دیکھتی رہی پھر تیز قدم پیڑھوں سے اترنے لگی۔

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر آہستہ آہستہ نیچے اتریں اور گلاس وال کے نزدیک رک گئیں۔ وہ اپنی گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا جب ثانیہ اس کے پاس پہنچی۔

چہرے پر بکھرتی ہے جب اس کی کوئی بڑی خواہش پوری ہوتی ہے۔

سب کچھ جیسے ٹھک ہو گیا تھا۔

مگر سب کچھ صحیح کے درمیان کبھی کبھی کچھ گڑبگڑ بھی ہو جاتی ہے۔ کبھی کوئی ایک کھوٹ رہ جاتا ہے جو انسان کے ذہن ترین دل سے بھی چوک جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

میں تجھے دل سے پیار کرتا ہوں تو مجھے زندگی سے پیار ہے۔

گاڑی نے رفتار پھڑی تھی اور اس کا ہاتھ پلیسر پر رک گیا تھا

”یہ کیا لگا دیا ہے ثانی! میں تو سو رہا ہوں۔ اسٹیرنگ سنبھالو۔“ اس نے برا سانس بنا کر کہا۔

”چپ کر کے سونو۔ یہ سب تم میرے لیے کہہ رہے ہو یہ سمجھو۔“

”میں کبھی بھی اتنا بے سراسیمگی کا سکتا۔ بھول کر بھی نہیں۔“

”جیو مت۔ تم کبھی بھی اتنا سربلا نہیں کا سکتے۔ مگر مجھے سنئے دو۔“

جھوڑوں میں پکڑ کر ہاتھ تیرا بھول کر بھی نہ ایسی بھول کر دے اسد امانت علی کی گائیکس تھی جو دل کے اندر اترتی جاتی تھی

”ثانی! ہم گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بوڑھے ہو چکے ہیں ستر سال کے۔“

تو مجھے زندگی سے پیار ہے

”میں تمہیں بیس سال بعد یہ گانا ضرور گا کر سناؤں گا ثانی! اگر ابھی یہ جبر نہیں کرو۔“

”بیس سال بعد بھی تم اتنے باذوق ہو گے نہ ہی سربیلے اس لیے رہنے دو۔ یہ گانا میں اکیلے میں ہی سن سن کر خوش ہوتی رہوں گی۔“ اس نے بے دلی سے پلیسر بند کیا۔

”چلو میں تمہیں اک اور گانا سنا تا ہوں۔“

”میں نے کان بند کر لیے ہیں۔“ اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

”دیوانہ تھامیں۔۔۔ دیوانہ یہ نہ جانا۔ میں نے یہ نہ جانا۔

بن جائے گا پھر افسانہ۔

یہ نہ جانا میں نے یہ نہ جانا۔ وہ کلا بھاڑ پھاڑ کر گا رہا تھا۔

”خدا کے لیے بس کرو فہم۔۔۔ علی عقلت بے چارہ رو رہا ہو گا۔“ اس نے ہاتھ ہٹا کر فرس کر کہا تھا۔

”وہ پہلے کون سا خوشی خوشی گاتا ہے رورو کر اور چیخ چیخ کر تو رہتا ہے گاتا ہے۔“

”وہ تو گاتے وقت پختا ہے۔ تم تو بلا وجہ چیختے ہو۔“

”تمہیں میرے چیخنے پر بھی اعتراض ہے۔ میرے گانے پر بھی میرے اٹھنے بیٹھنے پر بھی۔ ہر اک بات پر۔۔۔ میں کہتا ہوں لڑکی اک بار سوچ لو اپنے فیصلے پر۔“

”سوچنے کا وقت اب کہاں؟ انگوٹھی پہن لی! اگر پھنٹ گریا۔ بس اب دستخط باقی رہتے ہیں۔“

”تم جب پوری طرح مل جاؤ گی دستخط کر کے تو سو پڑھ لوں گا۔“

”ہاں وحید مراوی طرح جھوٹ موٹ کے دکھاوے کے۔“

”پرانی فلمیں ذرا کم ہی دیکھا کرو اچھا! بہت اثر ہو جاتا ہے تم پر پرانے گانوں فلموں کا۔“

”میں نے سوچا ہے ہم شادی کے بعد روز ایک زیبا محمد علی کی فلم دیکھیں گے مل کر۔“ وہ پھر اسے چڑانے کے لیے کہنے لگی۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لاگ ڈرائیو پر جائیں گے۔ روز سیر سائے لے کریں گے۔ رات دیر تک سڑوں پر پھرتے رہیں گے۔“

”دلغ خراب ہے تمہارا۔ آوارہ گردی کی زندگی گزارو گے شادی کے بعد بھی۔“

”پرانی سڑی ہوئی فلمیں دیکھنے سے تو یہی بہتر ہے۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں اپنی سی ڈیز کا ڈھیر اپنی کتابیں، کہانیاں، غزلیں، دلیں سب وہیں پھینک کر آتا۔ میں نہیں پروا اشت کروں گا۔ جان نکال دینے والے سر اور موتی موتی کتابیں، جن کی وجہ سے ابھی سے چشمہ لگ گیا ہے تمہیں۔“

”کتنے سخت قسم کے آدمی ہو تم کسی کی ذاتی دلچسپیوں پر حملہ آور ہوتے ہو۔ تم تو جینا حرام کر دو گے میرا یہ نہ کرو یہ کرو۔ وہ نہ کرو وہ کرواؤ۔ کتنی مشکل زندگی ہے شادی کی۔“

”اور میں یہ سوچ سوچ کر ختم ہو رہا ہوں کہ اتنی سڑوں، بد مزاج، بد خاتون کے ساتھ مجھے پوری زندگی گزارنی ہے۔ ختم ہو گیا میں تو۔“ اس نے مصنوعی افسوس سے کہا۔

”تو پھر ابھی سے سوچ لو۔ بلکہ کوئی فیصلہ کر کے ہی جاؤ۔“

”بلکہ ابھی کیوں نہیں۔ یہ لو اپنی پیتل کی انگوٹھی۔“ اس نے انگوٹھی اتارتے ہوئے کہا۔

”خبردار! جو اسے اتارنے کا کبھی سوچا بھی۔ سمجھ لینا اس دن فہم مریگا۔“

”اللہ نہ کرے ایسا کیوں کہ رہے ہو۔“
 ”تم جو مجھے یہ اتار کر دے رہی ہو۔“
 ”پہن لیتی ہوں۔ ماؤں کی طرح بلیک میل مت کیا کرو۔“

”اور ہاں بار بار ہسپتال کی مت کما کرو۔ سونے کی ہے یہ۔“ اس کا اشارہ انگوٹھی کی طرف تھا۔
 ”اچھا چھوڑو نا کوئی اور بات کرو۔ بہت بولتے ہو۔“
 ”وگے! آپ کہئے۔“
 ”اُس کریم کھلا دو۔“
 ”ریکارڈ خراب مت کرو اپنا۔“
 ”فمد! اُس نے ایک ماکا جڑوا سے۔“



اس کے ہاتھ سے شیشہ گر کر ٹوٹا تھا اور سب سے پہلا پتھر اسے تب بڑا تھا۔ پھر بارود کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ وہ اس کا سوتلا نہیں سگا پاپ تھا۔ پہلے پہل وہ اسے ڈانٹتا تھا۔ نہ بڑھنے پر اچھا ہوم ورک نہ کرنے پر پھر وہ اسے مارنے لگا۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات پر۔

اور اس کی سوتیلی ماں نے کبھی بڑھ کر اسے چھڑایا نہیں۔ کبھی اس کی حمایت نہیں کی۔ کبھی اس پر رحم نہیں کھایا۔ حالانکہ وہ خود اسے نہ مارتی تھی نہ بھڑکتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ اجنبیوں کا سالوک کرتی تھی۔ نہ محبت نہ نفرت اس نے کبھی شکایت لگاتے ہوئے بھی نہیں سنا اسے نہ بھڑکاتے ہوئے۔ وہ بس اپنے بچوں کی تعریفیں کرتی تھی۔ ان کے گن گاتی رہتی تھی۔
 - ذیشان اور یٹنا واقعی خوب صورت تھے اور خوب صورتی میں اپنی ماں پر گئے تھے۔ وہ ذہین بھی تھے۔ اچھا پڑھتے تھے اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے لیے اچھے اچھے کھلونے لاتا تھا۔ اک آدھ اس کے لیے بھی لے آتا۔ دو منٹ آرام سے بات کر لیتا۔ مگر وہ بڑھ کر اس سے اس کے مسائل نہیں پوچھتا تھا۔ ضروریات پوری کر دیتا۔ کھانا پیٹنا دے کر اپنا فرض پورا کر لیتا اپنے تئیں۔ اس کا ہوم ورک چیک کرنے کے

لیے آتا تھا اور ہر بار خراب کارکردگی دیکھ کر اسے ڈانٹ کر کتابیں اس کے منہ پر مار کر چلا جاتا۔ اسے یہ احساس نہیں تھا کہ کچھ کام مار سے نہیں پیار سے ہوتے ہیں۔

اس نے بہت دفعہ کوشش کی اچھا پڑھنے کی۔ مگر اس کا حافظہ کمزور تھا اسے چیزیں یاد رکھنے سے ہوتی تھیں۔ وہ مکمل طور پر نکما اور نالائق نہیں تھا۔ بس اسے سبق یاد کرنے میں مشکل ہوتی تھی۔ وہ اس لیے شاید کہ سبق کے علاوہ اس کے ذہن میں کئی سوچیں ہوتی تھیں۔ دن میں ہر جگہ اپنی ماں کو ڈھونڈتے رہتا اور رات میں نیند سے اٹھ کر ڈر جاتا۔ کئی بار وہ چیخیں مار کر اٹھتا تھا۔ اس کی پینچوں پر صرف ایک بار اس کا باپ آیا تھا۔ اسے خوب ڈانٹا اور چلا گیا۔ پھر اس کی پینچوں پر کوئی نہیں آتا تھا۔ وہ حج کر کے مکمل سے منہ چھپا کر روٹا رہتا۔ ہر رات خواب آتا۔ کوئی اس کی ماں کو اس سے چھین رہا ہے۔ وہ دس سال کا تھا جب اس کی ماں مر گئی تھی اچانک ہی بٹتے بولتے بات چیت کر کے وہ اس کے ساتھ آکر لیٹی تھی اور رات میں اچانک اسے درد اٹھا اور وہ چیختے چیختے مر گئی۔ اس وقت گھر پر کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ اکیلا رہتا تھا۔ اس کی ماں اس کے باپ کی ناپسندیدہ بیوی تھی۔

اور تب ہی اس کے باپ نے ایک شادی اپنی پسند سے کی تھی۔ دونوں بیویوں کو ایک الگ الگ گھر میں رکھا۔

جب اس کی پیدائش ہوتی تب بھی اس کا باپ نہیں آیا تھا۔ اس وقت اس کی چیتی بیوی کی بھی طبیعت خراب تھی اور ٹھیک ایک ماہ بعد اس کا بھائی ذیشان پیدا ہوا۔ جس کے پیدا ہونے پر مٹھائیاں باقی گئیں۔ خوشیاں منائی گئیں۔

اس کا باپ کبھی بھار جب خرچے کے پیسے دینے آتا تو اسے ایک نظر دیکھ لیتا تھا۔ اس سے کوئی ذاتی دلچسپی وابستہ نہیں تھی۔ بس وہ ضروریات پوری کر دیتا تھا۔
 پھر اس کی ماں نے جب شروع کر دی۔ وہ چار سال

کا تھا۔ وہ اسے اسکول چھوڑ کر باپ پر جاتی واپسی میں اسے لیتی ہوئی آتی۔ اس کی ماں نے اس کے باپ سے خرچہ لینا چھوڑ دیا تھا۔ ملنا جلنا ویسے ہی کم تھا اور بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی۔

اسی طرح چھ سال گزر گئے۔ اس نے دو ڈھائی سال سے اپنے باپ کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ وہ غریب اس برائے نام باپ کو بھول ہی جاتا اگر اچانک اس کی ماں اس دنیا سے نہ چلی جاتی۔

وہ کچھ عرصہ اپنے خفیال میں رہا پھر ان لوگوں نے اس کے باپ کو بلوایا اور اسے اس کے حوالے کر دیا۔ اس کا باپ اسے بے دلی سے گھر لے آیا۔ ایک بار سینے سے لگا کر پیار بھی کیا۔ اس کے لیے کھلونے بھی لایا۔ مگر اس کے دوسرے بچے اس کی توجہ کھینچ لیتے تھے۔ آہستہ آہستہ پھر سے اس کا باپ اسے ایک کمرے میں چھوڑ کر ریگنہ ہو گیا تھا۔ وہ اسے چیزیں پکڑے کتابیں لا دیتا تھا مگر اس کے ساتھ وقت نہیں گزارتا تھا۔

ماں کی وفات باپ کی لاپرواہی کے بعد ہی وہ ذہین پیارا سا بچہ۔ احساس کمتری کا شکار ہو گیا اور اس کا اثر اس کی ذہنی جسمانی صحت پر پڑ گیا۔ وہ کمزور ہوتا گیا۔ سبق نہ یاد کر سکتا۔ رات میں اٹھ کر چٹخا۔ جب رونا اور ہاتھ سے چیزیں گر کر ٹوٹا اس کا معمول بن گیا، بدتر اچھ بارہ سال کی عمر سے ان کیفیات میں مبتلا ہوتا گیا۔ اور تب اس کا علانہ نہ ہوا اسے ہوانہ محبت سے۔



اس کے لوٹنے لوٹنے رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ مگر اس کے آنے ہی پہنچتی سے آنکھیں کھول کر آرام کرسی روک کر اسے دیکھنے لگے۔

”السلام علیکم ابو۔ کیا بات ہے طبیعت ٹھیک ہے آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔“ وہ فکر مند سی ان کی طرف بڑھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ تمہارا انتظار کر رہا تھا میں۔ اتنی دیر کیوں ہو گئی تمہیں گیارہ بج رہے ہیں۔“ ان کے

لہجے میں خفگی تھی۔
 ”وہ ابو! دراصل ہم باتیں کرتے کرتے کافی دور نکل گئے تھے۔ واپسی میں دیر ہو گئی۔“
 ”کس وقت گئی تھیں تم۔“
 ”اٹھ بجے شاید۔“

”اس وقت جانے کی کیا ضرورت تھی۔“
 ”آپ کو میرا جاننا برا لگایا فمد کے ساتھ جانا۔“
 ”نہ جاننا نہ فمد کے ساتھ جانا بے وقت جانا اور بے وقت لوٹنا برا لگا صرف برا کیا بلکہ افسوس ہوا۔ دکھ بھی کہہ سکتے ہیں۔“ ان کا لہجہ ہلکا تھا مگر وہی اور بے بس سا۔

”فمد میرا مگیت رہے ابو! بہت شریف انسان ہے مجھے بھروسہ ہے اس پر۔ آپ کو بھی ہونا چاہیے مجھ سمیت اس پر۔“

”گھومنے پھرنے کے مواقع شادی کے بعد بھی مل سکتے ہیں۔ مجھے اعتماد ہے مگر یہ سب زب نہیں دیتا اس وقت۔“

”وہ دو چار دن میں باہر جا رہا ہے۔ بتایا تو تھا کہ اس کے ساتھ جاری ہوں، آپ کو برا لگا تھا تو منع کر دیتے میں نہیں جاتی۔“

”اُس کریم کھانے کی بات کی تھی بیٹا! میں نے سوچا گھٹنے بھر میں واپسی ہو جائے گی پھر فمد کے سامنے انکار کرنا مناسب نہیں لگا۔ اچھا ہوتا تم خود منع کر دیتیں۔“

”مجھے کیا معلوم کہ آپ مجھ سے کیا توقع کر رہے ہیں۔ آپ نے نہیں روکا تو میں چلی گئی۔ مجھے خود احساس نہیں تھا کہ دیر ہو جائے گی اپنی۔“
 ”باتیں گھر پر بیٹھ کر بھی ہو سکتی ہیں۔“ ان کا لہجہ ملامت کرنے والا ہو گیا تھا۔

”مجھ سے غلطی ہو گئی۔“ اس نے بیزار سی کہا تھا۔

”آئندہ نہیں ہونی چاہیے۔“ ان کا رخ اب دوسری جانب تھا۔ وہ سگریٹ سٹگار رہے تھے۔
 ”نہیں ہو گئی۔ کیونکہ وہ دو دن بعد جاتی رہا ہے۔“

”کوشش کروں گی کہ اسے سی آف کرنے نہ جاؤں۔“
 ”ابو! پوش۔“ وہ سگریٹ کے کش لینے لگے۔
 ”مجھے پتا ہے وہ آپ کو اچھا نہیں لگتا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اسے اتنا برا اور غلط سمجھیں۔“
 ”میں نے اسے کچھ نہیں سمجھا نہ کہا اور وہ مجھے اچھا لگے یا نہ لگے، تمہیں لگتا ہے تمہاری ماں کو لگتا ہے۔“
 ”کافی ہے۔“
 ”مجھے آپ کی ان باتوں سے تکلیف ہوتی ہے ابو!“

”مجھے بھی تمہارے رویے اور لا پرواہی سے تکلیف ہوتی ہے۔“

”آپ مجھ پر بھروسہ نہیں کرتے۔“ اس کی آنکھیں ٹپکی ہو گئیں۔
 ”تم میری کوئی بات نہیں مانتیں۔ نہ سنی ہو نہ سمجھتی ہو۔“

”آپ کو مجھ سے ہمیشہ یہ شکایتیں رہیں گی؟“
 ”تم اگر میری کوئی بات سمجھو تو شکایتیں مٹ بھی سکتی ہیں۔“

”مجھے لگتا ہے میں آپ کو کبھی خوش نہیں کر پاؤں گی۔“ وہ میز پر جھپٹتی ہوئی اوپر چلی گئی۔
 ”مجھے بھی یہی لگتا ہے۔“ وہ سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے پیردائے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کوئی کیفیت نہیں تھی مگر دل بے حد ڈرا ہوا ہے چین تھا۔

اس کے ساتھ سوتیلوں جیسا سلوک ہوتا تھا مگر بہتر تھا کہ اس کے چند حقوق پورے ہو رہے تھے۔ کچھ ضرورتیں پوری ہو جاتی تھیں۔ اچھے نمبر نہ لانے پر بھی اسے اچھے اسکول میں ہی رکھا گیا۔ اسے کھانا پینا مل رہا تھا۔ پنشن اور ڈھنسا۔ بس چونہ تھا وہ احساس نہ تھا محبت اور شفقت کا۔ وہ کسی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ نہیں سکتا تھا۔ وہ کسی سے اپنی سوچیں نہیں شیئر کر سکتا تھا۔ وہ جب راتوں کو چٹا تھا تو کوئی اسے چپ کرانے کے لیے نہیں آتا تھا۔ وہ روتا تو کوئی اس کے

آنسو نہیں صاف کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے رونا بند کر دیا اور سارا سمندر اس کے اندر جمع ہو گیا آنسوؤں کا۔

اسے یاد تھا ایک بار اس نے بھی زیشان کی دیکھا دیکھی کہا تھا کہ میں بھی ڈاکٹر بنوں گا۔ اصل میں اس کے پاس زندگی کا کوئی واضح مقصد نہیں تھا۔ اس کی ماں نہیں بھی جو رات کو سلاتے وقت اسے خواب دکھاتی بڑا آدمی یا ڈاکٹر انجینئر بننے کا اس نے بھی سوچ لیا۔ کئی دنوں تک سوچتا رہا پھر جب میٹرک کلین کر لیا تو اس کے باپ نے پوچھا اور اس نے کہا ڈاکٹر بنوں گا۔

پہلی بار اس کی سوتیلی ماں نے رد عمل کیا تھا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

”احمد! اس کا اتنا دلغ ہے کہ ڈاکٹر بن سکے۔ نمبر دیکھے ہیں آپ نے۔ پریسٹ ایج دیکھی ہے۔ اس کے لیے بہت دلغ اور بہت پیسہ چاہیے۔ بچک آپ کے لپا کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے۔ زیشان ڈاکٹر بنے گا۔ آپ انجینئر بن گئے۔ اس کا بھی تو بہت اسکوپ ہے۔ اب اگر ڈاکٹر بن سکتے تو سارا پیسہ پانی میں گیا۔“
 ”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ تم ہی ای کر لویا آئی بی پڑھ لو۔ کوئی مناسب ملازمت مل جائے گی۔ ویسے بھی یہ فلیٹ تو میں نے تمہارے نام کر دیا ہے۔“ اس کے باپ کا رویہ ٹھنڈا تھا۔

”احمد! آپ نے کب ایسا کیا۔ مجھے بتائے بغیر۔“ وہ اچانک بھڑکی تھی۔

”زیشان اور دیشنا کے نام وہ دونوں پلاٹ ہیں اور تم بھی تو رکھی ہوئی ہے۔ سونا بھی تم نے جمع کیا ہے۔ یہ بھی میرا بیٹا ہے اس کے لیے بھی مجھے کرنا ہے کچھ نہ کچھ۔“

”اتنا کچھ تو ہو رہا ہے اس کے لیے۔ کسی چیز کی کمی ہے اسے۔ پوچھ لیں سب کچھ تو میں دیتی ہوں اسے۔ میں نے سمجھا آپ نے یہ فلیٹ میرے نام کیا ہو گا۔ میرا سب کچھ بھی تو آپ کے بچوں کا ہے۔“

”دیکھو تو یہ سب کچھ تو تم لوگوں کا ہے۔ اب ایک فلیٹ ہی کیا ہے اس کے نام۔ شرعی حق ہے اس کا

میرے اور پھر میرے اور بچے زیشان ہیں وہ اپنی محنت سے کچھ نہ کچھ حاصل کر لیں گے۔ یہ اگر اچھا نہ پڑھ سکا اور اسے اچھی ملازمت نہ مل سکی تو کم از کم اس کے پاس ٹھکانہ تو اپنا ہونا چاہیے۔“

پہلی بار اس نے باپ کے چہرے پر اپنے لیے فکر مند دیکھی تھی۔ پہلی بار اسے لگا وہ اسی کا باپ ہے۔ وہ جیسا بھی ہے اسے پیار نہیں کرنا مگر سوچتا ضرور ہے اس کے لیے۔ پہلی بار وہ خوش اور مطمئن تھا۔

اس نے اپنے باپ سے کچھ نہ کہا۔ وہ بڑھ کر ان سے لپٹ جانا چاہتا تھا مگر وہ یہ نہ کر سکا۔ البتہ اس کا دل کچھ صاف ضرور ہو گیا تھا باپ کی طرف سے۔ اس نے سوچا آہستہ آہستہ وہ باپ سے قریب ہو جائے گا۔ وہ بلاوجہ ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھتا تھا تاکہ کسی بہانے سے اس سے بات کر لیں۔ مگر ان کے دوسرے بچے کہاں یہ موقع دیتے تھے۔ وہ انہیں گھیر لیتے تھے۔ وہ چپ چاپ اٹھ آنا اپنے کمرے میں۔ غیر محسوس انداز میں ایک کونے میں ڈال دیتا۔

مگر اسے چھوٹی سی تسلی تھی ضرور کہ اس کا کوئی تو ہے جو اس کے لیے اچھا سوچتا ہے۔ اس خوشی اور سکون میں وہ انہیں خوش کرنے کے لیے پڑھتا رہا مگر یہاں اسے ذہن میں رکھنے میں پرائیم ہوتی تھی۔ وہ پڑھتے پڑھتے کہیں کھو جاتا تھا۔ وہ ٹھیک طرح سے کام نہیں کر پاتا تھا۔ مگر اب اس کی کار کوئی کچھ بہتر ہو رہی تھی۔ وہ یونیورسٹی میں آگیا تھا۔

پھر اس کیفیت کو اس حادثے نے اور بڑھا دیا۔ اس کے سر سے نام نہاد باپ کا سایہ بھی چھن گیا۔ اس کا باپ حادثاتی موت کی نذر ہو گیا اور وہ پھر سے بھرے جہاں میں اکیلا، بالکل اکیلا رہ گیا۔ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ ان کی ماں تھی۔ اس کی سوتیلی ماں کے پاس ان کے بچے تھے۔ مگر ایک وہ تھا جس کے پاس نہ اپنے سگے بہن بھائی تھے نہ ماں تھی اور نہ اب باپ تھا۔

”کیا بات ہے۔ فند کے فون آر ہے ہیں تم اس سے

بات کیوں نہیں کر رہیں؟“ وہ کمپیوٹر پر بے دلی سے کوئی ویڈیو دیکھ رہی تھی جب وہ اندر آئی تھیں۔
 ”دل نہیں چاہ رہا۔“
 ”ہائیمہ۔۔۔ کیا مسئلہ ہے کوئی لڑائی ہوئی ہے اس کے ساتھ کیا؟“

”ای! کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ اس نے میزاری سے کہا۔

”ہائیمہ! سیدھی طرح بتاؤ۔ ادھر مغلّی ہوئی ہے ادھر مسائل شروع۔“

”ای! وہ ملنے کے لیے ضد کرتا ہے اور میں نہیں مل سکتی۔“

”اس دن تو گئے تھے تم لوگ ڈرائیو پر۔“
 ”ابو کو اچھا نہیں لگتا میرا اس سے ملنا۔“
 ”کیوں اچھا نہیں لگتا۔ وہ مغلّی ہے تمہارا۔ کل کو شادی ہوگی۔“

”وہ ہماری اس شادی سے خوش نہیں ہیں۔“
 ”میں نہیں چھوڑو۔ تم تو خوش ہونا پس کٹی ہے۔“

”ای! ابو کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔ وہ مجھے اتنا ام میچور اور لا پرواہ کیوں سمجھتے ہیں۔ کیوں وہ میرے بارے میں اتنے تنگ نظر ہو جاتے ہیں کبھی بھار۔“

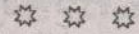
”ان کا کوئی قصور نہیں بیٹا۔ وہ جس کلاس سے اٹھ کر آیا ہے وہاں یہی سب ہوتا ہے۔ شادی کے شروع شروع میں اس کا میرے ساتھ بھی یہی رویہ تھا۔ بڑی مشکل سے اس کا دلغ درست کیا۔ اب تمہیں کیوں پریشان کرتا ہے۔ میں بات کروں گی اس سے۔“

”نہیں ای پلیز! وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔“

”تمہیں یہ فکر نہیں ہونی چاہیے، نہیں ناراض ہو گا۔“

”ای! وہ میرے باپ ہیں۔ مجھے پروا ہے۔ میں نے مغلّی کرتے ہوئے بھی دس بار ان سے پوچھا۔ ان کو منایا، مگر وہ کب اچھا سوچیں گے۔ ان کے اندر جیسے کوئی ڈر سا بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بچپن سے ایسا کرتے ہیں۔ یہاں نہیں جانا۔ یہ نہیں کرنا۔ اس سے بات نہیں

کرتی۔ لڑکوں سے دوستی نہیں کرتی وغیرہ۔“
 ”وہ بوڑھا ہو گیا ہے پر سدھرا نہیں۔ خوف کا اثر ہے۔“
 ”آپ پلیر انہیں کچھ نہ کہنے گا۔ وہ آپ سیٹ ہو جاتے ہیں۔“
 ”تم رہنے دو۔ بات کرو فند کے ساتھ۔ کل تو جا رہا ہے وہ۔ مل لو شام کے وقت یا پھر سی آف کرنے چلی جانا۔“
 ”ہم سب مل کر جائیں گے۔ ابو کو بھی لے جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں وہ یہ نہ سوچیں کہ میں ان کی کوئی بات نہیں مانتی۔“
 ”اوکے۔“ وہ لمبی سانس لے کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔



”احسان! تم نے ثانیہ سے کیا کہا ہے؟“ وہ بڑے غصے میں کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔
 ”میں نے کوئی شکایت لگائی تم سے۔“ وہ کتابوں کے ریک میں اپنا چشمہ ڈھونڈ رہے تھے۔
 ”احسان! میں سمجھتی تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ تم بدل جاؤ گے پر ایسا نہیں ہوا۔ تم ہمیشہ وہی رہو گے کنوئیں کے مینڈک۔“
 ”میں بھی تمہارے بارے میں یہی سوچتا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ تم میں تبدیلی، بنجیدگی اور فہم آجائے گا مگر شاید ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ غلط توقعات رکھتے آئے ہیں ابھی تک۔“
 ”مجھے ان بے کاری باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“
 ”اسی کا تو جواب دے رہا ہوں۔“ انہیں ایک کتاب کے نزدیک اپنا چشمہ مل گیا تھا۔ وہ کتاب ریک سے نکال کر چشمہ پہن کر کرسی پر آ بیٹھے۔
 ”کہیں اپنی اولاد پر بے چارہ بندیاں لگا رہے ہو اور ان کی زندگی خراب کر رہے ہو تم۔“
 ”رخسانہ! زندگی بنا رہا ہوں اپنی بچی کی۔ خراب

نہیں کر رہا۔ دیکھو وہ بچی ہے۔ بیس یا تیس سال کوئی بڑی عمر نہیں ہوتی ہے۔ میں اتنی میں بچے بہت خراب دیکھتے ہیں۔ سب کچھ حسین اور آسان لگتا ہے۔ تقریباً کہ میں اس کی یہ حسین دنیا فہم و فکر اور پریشانی کی نظر نہیں کرنا چاہتا۔ جب ہی جہاں اس نے کہا میں نے منگنی کروادی۔ اب تک سب کچھ اس کی مرضی سے ہوا ہے اور وہ گلوگٹر کچھ دائرے، کچھ لمبائی کچھ روزے ہوتے ہیں زندگی کے اور رشتوں کے۔“
 ”احسان! یہ ہمارا دور نہیں ہے۔ اکیسویں صدی ہے۔ چیزیں بدل گئی ہیں۔ ہمارے بچے ایسا نہیں سوچتے۔ ان پر بے جا پابندیاں مت لگایا کرو۔ کب سمجھو گے تم۔ اب یہ مت کہنا کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کو سمجھتے رہیں گے۔“
 ”وہ تمہارے لگا کر نہیں پڑے۔“
 ”کچھ نہیں کہتا۔ دیکھو میں نے جو کہا اسے ٹھیک کہا، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کوئی اس پر پابندیاں لگا رہا ہوں یا پھر میں اس پر مجبور ہوا نہیں کرتا۔ ایسا کچھ نہیں ہے رخسانہ! یکم اگر پھر بھی اسے شکایت ہے تو میں بات کر لوں گا۔“
 ”کیا بات کرو گے تم اس سے؟ وہ تو اس فکر میں دبی ہو رہی ہے کہ میرا باپ مجھ سے خفا ہے۔ اسے یہ رشتہ پسند نہیں۔ اسے میرے ملنے پر اعتراض ہے۔ میں فند کو سی آف کرنے نہیں جاؤں گی وغیرہ۔ تم نے اتنا کینیوڈ اور پریشان کر دیا ہے بچی کو۔“
 ”وہ یہ کہہ رہی ہے؟“ چپکے سے پار ان کی آنکھیں بھی مسکرائی تھیں۔
 ”ہاں اور اب تم اس خوشی میں رہو کہ تم کامیاب ہو گئے اسے ہر سال کرنے میں۔“
 ”میں مطمئن ہوں کہ اسے پروا ہے وہ لا پرواہ نہیں ہے۔ بس تھوڑی سی کم عقل ہے۔ مگر ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کچھ۔ میں مل لیتا ہوں اسے۔ کہاں ہے کمرے میں؟“ وہ کتاب بند کر کے اٹھے۔
 ”کوئی ضرورت نہیں ابھی جائے گی۔ فند سے بات کر رہی ہو گی کل سے فون نہیں اٹھا رہی تھی اس کا

میں کہہ کر آئی ہوں۔“
 ”تم جو ہوتا رخسانہ! یکم! تم میری ساری محنت اور تربیت پر پانی پھیر دینا اچھا۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے پھر بیٹھ گئے۔
 ”وہ اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ اٹھے کتاب رکھی۔ دروازے کے پار جھانکا۔ وہ نہیں نظر نہ آئیں تو چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے اس کے کمرے تک چلے آئے جہاں وہ سیل فون ہاتھ میں لیے افسردہ سے انداز میں بیٹھی تھی۔“
 ”کیا میں نے اپنے بچے کو ڈسٹرب کیا۔“ وہ دروازے کے پاس ہی کھڑے تھے۔
 ”بالکل نہیں! آپ آجائیں اندر۔“
 ”فند کیسا ہے؟ کیا بات ہوئی۔ اس نے سی آف کرنے کے لیے کہا ہو گا۔“
 ”جی مگر کہا سب آجائیں۔“
 ”یہ تم نے کہا ہو گا۔ میں جانتا ہوں۔ بیٹا! میں سو ری کروں تو کیا خیال ہے۔“
 ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ سو ری کریں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“
 ”تم مجھے خوش کر سکتی ہو۔ اس رات تم نے غلط کہا تھا کہ میں آپ کو خوش نہیں کر سکتی۔“
 ”میں آپ کو خوش کر سکتی ہوں۔“
 ”ہاں بالکل میں کوئی دنیا کا مشکل ترین بندہ نہیں جسے خوش کرنا اتنا مشکل ہو۔ بہر حال یہ بتاؤ کل چلنا ہے اسے چھوڑنے؟“
 ”ہم سب جارہے ہیں، آپ کو کوئی اعتراض؟“
 ”نہیں کوئی اعتراض نہیں ہے، چلیں گے وہ پورے چار سال کے لیے جا رہا ہے۔ تب تک تم پر بھائی مکمل کر لوں گی۔ باقی کے دو سال کیا کروں گی۔“
 ”کوئی جاب کر لوں گی، گھر کے کام کاج سیکھ لوں گی۔“
 ”اچھا خیال ہے۔ سارے کام آنے چاہئیں۔

میری بچی بہت سمجھ دار ہے نا۔“

وہ ہنسی تھی ان کی بات پر۔
 ”کل ہم فند کے لیے تحفہ خریدیں گے۔ پھر ایر پورٹ پر جائیں گے اس سے ملنے کے لیے۔“
 ”پھول آپ لے لیجئے تحفہ میں دے دوں گی۔“
 ”میں کوئی اس عمر میں پھول دیتا اچھا لگوں گا۔“ وہ شرارت سے مسکرائے پھر دونوں ہنس دیے اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔
 پھر شام میں وہ اسے بازار لے کر گئے۔ تحفہ لیا اور صبح اس کی طرف جاتے ہوئے پھول لیے۔ اسے بہت اچھی طرح سی آف کیا تھا اور شام کو کھوتے پھرتے گھر آ گئے۔



رات سوئے وقت اسے احساس ہوا۔ وہ فند کو بہت مس کرے گی۔ پورے چار سال اس انتظار میں گزارنے تھے۔ حالانکہ اس روز کے بعد وہ روز اس سے بات کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی رویں سیٹ ہوتی تھی۔
 اور پھر دو سال کچھ مشکل سے مگر گزری گئے تھے وہ اب گھر کے کام سیکھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ جاب ڈھونڈ رہی تھی۔ اسے کسی طور یہ دو سال گزارنے تھے۔ بہت مصروف رہ کر تاکہ وہ اسے کم کم یاد آئے اور اسے دو سال گزارنے کا احساس نہ ہو۔
 مگر ایسا نہیں ہوا تھا یہ دو سال پچھلے دو سال کی طرح نہیں گزرنے تھے۔
 اس دن اس کی سالگرہ تھی جب فند اسے پہلی بار وش کرنا بھول گیا۔ وہ پورا دن انتظار کرتی رہی۔ وہ اس سے بات چیت بھی کم کرنے لگا تھا۔ وہ اس کی مصروفیت جانتی تھی۔ وہ وہاں اپنے چچا کے بزنس میں حصہ لے رہا تھا۔ پڑھ رہا تھا اور بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔ اسے اس کی مصروفیتوں کا اندازہ تھا۔ وہ اس سے بار بار شکایت کر کے پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بہت میوڑ اور کم گو ہوتی جاری تھی۔ اس میں تھوڑا بہت صبر آ گیا تھا۔
 مگر اتنا نہیں کہ وہ اتنی بڑی بات سہ جاتی۔ اتنی

آسانی سے وہ بھی۔ اس نے فون کیا تھا اور اتفاق سے کسی خانوں نے اٹھایا تھا جو خود کو فند کی بیوی بتا رہی تھی۔ اس کے کتنی دیر تک وہ کچھ بھی کہنے سننے کے قابل نہ رہی تھی۔

باپ کے جانے کے بعد اس کی زندگی اور بھی مشکل ہو گئی تھی۔ جیسے تیسے پڑھائی مکمل کی اور جاب کی تلاش میں لگ گیا۔ پیشان مزید پڑھنے کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ بیٹا کی شادی ہو گئی تھی اور اس کی سوتیلی ماں بھی اپنی بہن کے پاس باہر چلی گئی۔ اب اکیلا رہ گیا وہ جو پہلے سے ہی اکیلا تھا۔ مگر آج سے پہلے روزگار اور کھانے پینے کی اتنی نیشن نہ ہوئی تھی جتنی اب ہو رہی تھی۔ اس کا تینس زیرو تک پہنچ گیا تھا۔ جو پہلے باپ نے اس کے لیے جمع کیا تھا وہ سارا اس کی پڑھائی، کھانے پینے کے اخراجات کی نذر ہو گیا تھا۔ اب مزدوری بھی مل جاتی تو اسے کرنا بھی۔

اس نے گھر کی اور اپنی چھوٹی چھوٹی چیزیں بیچنا شروع کر دیں۔ خوراک کی مقدار گھٹا دی تھی۔ کھانا تو کبھی بغیر کھائے سو جاتا۔ ماہانہ بل کی الگ نیشن تھی۔ اس نے اس دوران ایک بار بھی اسے سی نہیں چلایا۔ نہ کیس زیادہ استعمال کی۔ اچھے درجے سے وہ زندگی کے تحفے درجے تک پہنچ گیا تھا۔ بس ایک آسرا تھا کہ گھر اپنا تھا، جہاں سے کوئی اسے نکال نہیں سکتا تھا۔ ڈگری لے کر دفتروں کے دھکے کھانا معمول سامان گیا تھا۔ مگر کتے ہیں خدا ابھی کسی کو اس کی برداشت سے زیادہ نہیں آتا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا اس دن اگر احسان صاحب اسے اس دفتر میں انٹرویو کے دوران نہ ملتے۔

وہ احمد کے یونیورسٹی فیلو رہ چکے تھے اور اچھے دوست بھی۔ اس کے پورے تعارف کے بعد وہ بہت دیر تک اسے ساتھ لگے باتیں کرتے رہے، پھر اس کے ساتھ اس کے فلیٹ پر بھی آئے۔ آخری مرتبہ وہ احمد کی وفات پر آئے تھے احمد کے آبائی گھر۔ تب ہی وہ

بھی آج احسان صاحب کو پہچان گیا۔ انہیں اس کی یہ حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوا تھا اور ٹھیک دو دن کے بعد وہ اس کے لیے نوکری کا بندوبست کر چکے تھے اپنے دفتر میں۔

پھر جاب کے دوران اس کی محنت اور ایمان داری سے وہ بہت متاثر ہو گئے تھے۔ البتہ اس کا کام کرتے ہوئے کم ہوجانا ذہنی پریشانی اور اضطراب کو وہ محسوس کر گئے تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ اس ساری کیفیت کا سبب اس کی تمنائی ہی ہے۔ وہ کئی بار اسے شادی کا مشورہ دے چکے تھے اور وہ ہر بار آسانی سے ٹال دیتا۔ اس حوالے سے نہ کبھی اس نے سوچا تھا نہ سوچنا چاہا۔ نہ اسے کوئی لڑکی پسند تھی نہ ہی کسی لڑکی نے اسے پسند کیا تھا۔ البتہ انہوں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے لیے کوئی لڑکی ضرور ڈھونڈیں گے اور ایک دن تو انہوں نے اسے یہ کہہ کر حیران ہی کر دیا کہ۔

”مدر احمہ میری بیٹی ثانیہ سے شادی کرو گے؟“

اور وہ حیرانی سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔

فند نے کئی بار کال کی شاید اپنی صفائی دینے کے لیے یا پھر مجبوریاں بتانے کے لیے۔ مگر اس نے ایک کال بھی ریسپونڈ نہیں کی تھی۔ اس کے پاس کہنے سننے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ پورے چار ماہ اس نے جیسے سکتی حالت میں گزارے اسے اس دھوکے کو یقین کرنے میں بہت وقت چاہیے تھا۔ آہستہ آہستہ وہ نارمل ہو گئی۔ مگر دل جیسے جھج گیا۔ ہر طرف سے اعتبار اٹھ گیا۔ ایسے میں اس کے باپ نے ایک بار اسے پاس بٹھا کر ایک عجیب فرمائش کر دی۔ شادی کرنے کی۔ وہ بھی ان کی جواس پر۔ اس نے انکار کر دیا، مگر ان کا اترا ہوا چہرہ اور فکر مندی محبت دیکھ کر اسے سوچنا پڑا۔ پہلے اس کے باپ نے اس کی مالی تھی۔ اب باری اس کی تھی، حالانکہ اس کا ارادہ اب شادی کرنے کا نہیں تھا۔ مگر باپ کی خواہش پر تیار ہو گئی۔

وہ جو کوئی بھی تھا، جیسا بھی تھا، اسے اس سے کوئی

غرض نہیں تھی۔ وہ بس اپنے باپ کی خواہش پر مان گئی۔ حالانکہ انہوں نے اس پر دیا تو نہیں ڈالا تھا۔ صرف درخواست کی تھی۔ خواہش کا اظہار کیا تھا اور بس۔ وہ چاہتی تو سہولت سے منع کر دیتی۔ اس کی ماں اس کے ساتھ تھی۔ جو اس رشتے کے سخت خلاف تھی اور اس کے پاس انکار کے مناسب دلائل بھی تھے۔ نہ لڑکے کی جاب اتنی اچھی تھی نہ کوئی کاروبار تھا۔ وہ ایک درمیانے درجے کا درمیانی ملکانی والا عام سی شکل صورت کا لڑکا تھا۔ اس کی ماں نے بہت شور مچایا۔ اسے سمجھایا کہ وہ خوش نہیں رہائے گی وہاں دو کمروں کے ایک معمولی سے فلیٹ میں ایک معمولی آدمی کے ساتھ جس کی آمدنی بھی معمولی ہے۔ مگر اس کا باپ کتنا تھا خوشی کا لعل پیوں سے نہیں انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ سکون شرافت میں ہے، خودداری میں ہے۔

اور وہ ابھی تک صرف یہ جان پاتی تھی کہ خوشی کا تعلق صرف اور صرف دل کے ساتھ ہوتا ہے، جو ابھی خاموش تھا۔

اور پھر ثانیہ احسان اور مدر احمد ایک دوسرے کی زندگی میں آ گئے۔

ثانیہ سے زیادہ تو وہ شرابا تھا۔ ثانیہ کے دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی، مگر اس کا گھبراہٹ ہوا انداز دیکھ کر وہ خود حیران رہ گئی تھی۔

”یہ۔۔۔ میری امی کی تھی۔ ان کی کچھ چیزیں مجھے دادی نے دی تھیں، ان میں سے یہ انگوٹھی خالص گولڈ کی ہے۔“ وہ انگوٹھی ہاتھ میں لیے بجائے اس کی تعریف کرنے کے انگوٹھی کی خصوصیات بتا رہا تھا۔

”میں آپ کو پتا دوں؟“ پتا نہیں کیسے بھجک کر اس نے کہہ ہی دیا۔

”میں خود پہن لوں گی۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔

”بہت اچھا۔“ اس نے خوشی خوشی انگوٹھی کی ڈبیا اس کے حوالے کر دی، جو اس نے لے کر سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ دی۔

”میں اس سے کم تو نہیں ہوگی؟“ وہ اچانک بولا۔

”میں اس سے کم تو نہیں ہوتا ہے؟“

”کوئی نہیں صرف میں اکیلا۔“

”آپ اسے کم کریں گے؟“

”نہیں تو۔“

”پھر کیسے کم ہوگی؟“ اس پر بے زاری سوار تھی۔

”پھر واقعی نہیں ہوگی۔“ وہ اس کے اکھڑے اکھڑے رویہ کی وجہ سے سم سا گیا تھا۔

”میں چنچ کر لوں۔“ وہ پوچھ نہیں رہی تھی، بتا رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ بلاوجہ مسکرایا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کہے۔ وہ بھاری شرارہ سنھالتے ہوئے اٹھی اور کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو وہ جوں کا توں بیٹھا ہوا تھا۔ اس پوزیشن میں۔

اس نے چہرہ صاف کیا۔ گرم لگائی بال باندھے، شرارہ ہینگ کر کے رکھا۔ وہ بغیر کوئی حرکت کیے وہیں بیٹھا یہ سارا تماشا دیکھتا رہا۔

اسے عجیب الجھن ہونے لگی۔ ”کیسا آدمی ہے؟“ وہ بد پرانی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”پہنچ نہیں کرنا کیا؟“ شادی کی پہلی رات وہ ایسے پر اعتماد تھی جیسے عموماً آدمی ہوتے ہیں۔

”کرتے ہیں۔“ وہ جیسے خواب سے جاگتا تھا۔

”تو پھر جاییے۔“

”کہاں؟“

”کپڑے لے کر واش روم میں۔“

”وہ ہاں۔“ وہ کتنی دیر تک واش مین کے سامنے کھڑا اپنی شکل دیکھتے ہوئے عجیب غریب سوچوں میں گم رہا۔

وہ کتنی دیر تک بیٹھی رہی، پھر خیال آیا کہ اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس نے اٹھ کر کمرے میں ادھر ادھر دیکھا، پھر باہر نکل آئی، کچن میں رکھے فریج سے دودھ کا ڈبا نکالا۔ دودھ گرم کیا اور بریڈ لیے وہ کمرے میں چلی آئی۔ پورا اٹھنٹہ ہونے کو آیا تھا اور وہ بندہ ابھی تک واش روم میں تھا۔ اسے کچھ فکر سی ہونے لگی۔ وہ کھانے سے پہلے اٹھی، دروازہ ہلکا سا بجایا۔

”جی۔۔۔“ دو چار مرتبہ کھٹکھٹانے پر اندر سے ہلکی سی آواز آئی۔

”سب خیریت ہے؟“ اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے پوچھا۔

”جی۔۔۔ جی۔۔۔“ وہی سہا ہوا الجھ۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ مطمئن ہو کر صوفے پر آ بیٹھی اور لادھ کے ساتھ بریڈ لینے لگی۔ وہ دو چار منٹ بعد باہر گیا۔

”چہرہ تھکتا کر ہلکی ٹنگھٹی کی اور اس کی طرف دیکھا۔“

”کیا گھبراہٹ ہے۔“ اسے کچھ اور تو نہیں سوچا یہ پوچھ لیا۔

”جی رہی ہوں۔۔۔ وہ بھی نظر آ رہا ہو گا کلاس سے۔“

”جی۔۔۔ بھوک لگی ہے؟“

”ظاہر ہے۔“ وہ لاپرواہی سے پورا گلاس خالی کر کے اٹھی۔

”اور لادھ؟“ عجیب معصومیت تھی۔

”نہیں بس ٹھیک ہے، میں رات کو اتنا نہیں کھاتی۔“

”اچھی بات ہے۔“ وہ مسکرایا۔ بلکہ مسکرانے کی کوشش کی۔

”نیز آرہی ہے۔۔۔ بقی بند ہو سکتی ہے؟“

”جی بالکل۔“ وہ اٹھا اور لائٹ بجھا دی۔

اس نے لیٹ کر چارو تن لی اور وہ بیٹھا رہا۔

”مسٹر مدثر!“ اسے عجیب غصہ آ رہا تھا اس آوی پر بات نہ کرنا مگر ایسے غائب الدماغی سے کیوں بیٹھا تھا۔

”جی ثانیہ جی۔۔۔“ وہی الجھ۔

”آپ کو سونا ہے یا ساری رات بیٹھے رہیں گے۔“

”میں سو جاؤں نہیں۔“ عجیب الجھن۔

”مرضی ہے آپ کی، مگر بہر حال سو جائیے۔“ وہ ہنس پڑی تھی بے ساختہ۔

”کیا ہوا۔“ وہ اور پریشان ہو گیا اس کے ہنسنے پر۔

”کچھ نہیں۔۔۔ روز آپ اسی طرح سوئے ہیں کسی کے کہنے پر۔“

”نہیں تو خود بخود سو جاتا ہوں۔“

”تو آج بھی خود بخود ہی سو جائیں۔“ وہ بے وجہ ہنس دی۔

”جی۔۔۔ میں آپ سے ڈر رہا تھا۔“

”کیوں۔۔۔ میں چڑل لگ رہی ہوں کیا۔“

”نہیں تو آپ چڑل نہیں لگ رہی ہیں۔“

”پھر اچھی لگ رہی ہوں کیا۔“ اسے خواہ مخواہ میں مذاق سوچا۔

”جی یہ تو ہے۔۔۔ آپ اچھی لگ رہی ہیں۔“

”تعریف کا شکریہ۔“ وہ کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ بھٹکتے ہوئے بڑکے کنارے پر لیٹ گیا۔

شادی اتنی بھی بھیا تک نہیں، جتنا لوگ کہتے ہیں۔

کچھ مرد تو بالکل بے چارے ہوتے ہیں۔ ویسے اچھا ہی ہے وہ کروٹ بدلے لیٹے لیٹے سوچ رہی تھی۔

اور وہ تو عجیب سوچوں میں غرق تھا، جب اس نے تھوڑی دیر بعد ثانیہ کو بے خبر سوتے دیکھا۔

یہ بھی مدثر احمد کی شادی کی پہلی رات۔

پہلی عجیب رات۔

* * *

وہ دیر کا دن تھا، جب وہ تیار ہو کر بیٹھی تھی امی کے انتظار میں۔ وہ آتیں تو آٹھ بجے جاتے ہال میں۔ وہ پہنچ کر کے کرسی پر آ بیٹھا تھا۔ اسی طرح چپ چپ سا کتتی دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”کیا ہوا؟“ وہ سیل فون پر نمبر لیج کرتے ہوئے رک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کچھ نہیں۔“ وہ پلاؤج ہی گھبرا گیا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”اچھی لگ رہی ہوں کیا؟“ وہ کل سے اس کا امتحان لے رہی تھی۔

”ہمم۔“ وہ ہونٹ چباتے ہوئے اسی انداز میں بیٹھا رہا۔

”شکریہ۔“ وہ ہنستے ہوئے نمبر ملانے لگی۔

”جی امی۔۔۔ آج میں میں تیار ہوں۔ اچھا پہنچنے والے ہیں ٹھیک ہے۔“

”وہ لوگ پانچ منٹ میں پہنچنے والے ہیں گیٹ کھول دیجئے جاگڑ۔“

”جی۔۔۔“ وہ رولوٹ کی طرح اشارے پر اٹھ کر باہر چلا گیا اور وہ حیرت سے اسے دیکھ کر سوچتی رہی کہ یہ ہمیشہ سے ایسا ہے یا اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ شاید یہ بھی میری طرح شادی سے خوش نہیں ہو گا، کسی اور کو پسند کرنا ہو گا۔ اس کے ساتھ زبردستی ہوئی ہے۔ مگر کس نے کی یہ زبردستی اس کے والدین تو نہیں ہیں۔ شاید لڑکی نے ہی انکار کر دیا۔ وہ ذہنی صدمہ لگتا ہے۔ وہ مزید کچھ سوچتی اس سے پہلے وہ لوگ آ گئے تھے۔

”کیا حال ہیں بچے؟“ سب سے پہلے ابو کمرے میں آئے تھے۔

”ابو جی۔۔۔“ وہ اٹھ کر ان سے لیٹ گئی۔ ”بہت برے ہیں آپ بیٹی کو رخصت کر کے بھول گئے، فون بھی نہ کیا مجھے۔“

”اے بھئی یاد ہی نہیں رہا۔“

”کیسے یاد نہیں رہا، پوری رات جاگتے رہے ہیں تمہیں یاد کر کے بچوں کی طرح روئے تھے رخصتی کے بعد۔“ امی مدثر کے ساتھ اندر آئی تھیں۔

”رخسانہ بیگم۔“ وہ انہیں ٹوکنے لگی۔ ”اچھا چھوڑو چلو اب دیر ہو رہی ہے سہال میں مہمان تو پہنچ گئے۔“

”میزبان مہمانوں کی طرح لیٹ ہیں۔“

”تم پارلر نہیں گئیں مثالی۔“ امی اس کی تیاری کا جائزہ لیتے ہوئے بولیں۔

”نہیں تو۔۔۔ کیوں ٹھیک سے تیار نہیں ہوئی؟“

”کتنا بکا میک اپ کیا ہے، مجھے بتا دیتیں میں صبح آکر لے جاتی۔“

”ف امی۔۔۔ اتنے بھاری زیور اور کپڑوں کے ساتھ ٹھیک ہے میک اپ کیوں ابو سمجھ ہے نا۔“

”ہاں بھی بالکل ٹھیک ہے ہماری گڑیا تو بہت پیاری لگ رہی ہے۔“

”تم آج بھی لا پرواہی کر گئیں۔“

”امی اب ٹینشن نہ دیں پلیز۔۔۔ ورنہ مجھے فکر

ہونے لگے گی۔“

”کیوں بچی کو پریشان کر رہی ہو۔ پیاری تو لگ رہی ہے۔ چلو بیٹا کچھ نہیں، کوئی کمی بیشی نہیں ہے۔ شایاں جلدی چلو دیر ہو گی ہے۔“

”ہاں اب کیا ہو سکتا ہے چلو۔۔۔ تمہارے روم کچھ چھوٹا نہیں۔۔۔ فریج ڈولانے کے بعد جیسے سکر گیا ہو۔“

وہ اب اس سے جٹ کر کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”فلیٹ کے روم اور کتنے بڑے ہوتے ہیں امی۔“

وہ بے زاری سے اٹھی، نیا قصاب وہ ہر ایک چیز پر نظر ڈال کر تنقید کرنے لگیں گی۔

”کھٹن نہیں ہوتی نہیں۔ ویسے تو بڑا داؤدیلہ محاتی تھیں۔ تنگ کرا نہیں چاہیے۔ گھڑکی بڑی ہو، زیادہ سالانہ نہیں ڈولائیں میرے روم میں، کھلا کھلا پسند ہے۔ کھٹن ہوتی ہے۔“ وہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھیں۔

”امی! ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“ وہ دیکھ رہی تھی ان کے ایسا کہنے سے مدثر بڑی طرح شرمندہ ہو رہا ہے۔

”چلو بھی ان باتوں کے لیے زندگی بڑی ہے۔ چلو بیٹا ہم تو چلیں۔“ وہ مدثر کی طرف آئے۔ اس کی گھبراہٹ انہوں نے بھی محسوس کی تھی۔

”بھئی تمہاری ساس بہت مشکل خاتون ہیں۔ ان سے کوئی اچھی امید مت رکھنا۔ البتہ جو کشتی رہیں چپ چاپ سنتے رہنا۔ ہم سے پوچھو کتنا مشکل وقت گزارا ہے۔“ وہ آہستگی سے اس کے ساتھ باہر آتے ہوئے بولے تو وہ مسکرایا۔

”کوئی براہم ہو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہہ دینا۔ باپ کی طرح ہوں، بلکہ باپ ہی ہوں اب تو۔“

”کیوں؟“

”جی بہتر۔“

”مدثر۔۔۔ خوش ہونا تم بیٹا؟“ وہ اسے جانچتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”جی۔۔۔ بہت۔“ اس کی مسکراہٹ مصنوعی تھی۔

”ثانیہ اچھی ہے۔ بس کبھی کبھار ضدی ہو جاتی ہے۔ مگر کیرنگ بہت ہے۔ دیکھو وہ بڑے گھر سے آئی

ہے۔ اسے یہاں کوئی مسئلہ ہو تو آرام سے سمجھا دینا۔
برامت ماننا اس کی کسی بات کا۔

”جی۔“

”مذربٹا، ایک بات یاد رکھو۔ سچائی اور محبت سے زیادہ اس دنیا میں کوئی چیز اتنی طاقت نہیں رکھتی پیسہ بھی آئی جانی چیز ہے۔ کل کو تم محنت کرو گے تو پیسہ بھی آجائے گا۔ تمہارا باپ بہت سختی اور ذہین آدمی تھا۔ اس نے تین تین گھر چلائے ایک وقت میں۔ ماں باپ کے گھر خرچا بھیجتا تھا۔ دو گھر اپنے مین مین رکھتا تھا۔ بہت ڈپلن تھا اس میں۔“ وہ بڑی خاموشی سے باپ کی تعریفیں سن رہا تھا۔

کیا کتنا کہ ڈپلن کے چکر میں وہ پیسہ تو دیتا رہا سب کو، مگر اپنا آپ نہ دے سکا۔ اس کے ماں باپ اس کی شکل دیکھنے کے لیے ترستے تھے۔ اس کا گناہ ایک گھر میں رہتے ہوئے باپ کی محبت سے محروم رہا۔ اگر یہ خلا پر ہوتا رہتا تو آج مذرا احمد کی شخصیت میں اتنا بڑا خلا نہ پیدا ہوتا۔

”مائی! میں تمہاری اس شادی سے بہت ناخوش ہوں۔“ وہ واپسی پر گھر لے آئے تھے اسے مدثر نیچے احسان صاحب کے ساتھ تھا اور وہ امی کے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔

”میں نے بھی یہ شادی خوش رہنے کے لیے نہیں کی ہے۔“

”تم کیسے رہو گی اس فلیٹ میں۔ مجھے تو سوچ سوچ کر ٹھن ہو رہی ہے۔“

”امی! پلیر! اب آپ مجھے مزید ڈسٹرب نہ کریں ایسی باتیں کر کے۔“

”تمہارے باپ نے بہت جلد بازی سے کام لیا ہے۔ وہ تو موقع کی تلاش میں تھا۔ میں تو چاہ رہی تھی ایک دفعہ پھر فم سے بات کر لی جائے۔“

”کیا بات کر لی جائے۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، تعجب سے انہیں دیکھتے ہوئے۔

”دیکھو اس نے مجبوری میں ایسا کیا۔“

”میں کسی مجبوری کو نہیں مانتی۔“ اس نے بیچ میں ہی انہیں ٹوک دیا۔

”وہ معافی مانگ رہا تھا، واپس آنے کی بات کر رہا تھا۔“

”امی! وہ آپ کا بھانجا ہے، مگر میں آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ میری حالت نہیں دیکھ رہیں اس کی طرف داری کر رہی ہیں۔ اس کی وجہ سے میں یہاں تک پہنچی ہوں۔ اسے نہیں کہنی تھی شادی۔ اگر اتنا ہی مرعوب تھا وہ اپنے چچا کی فیملی سے تو اس نے منگنی کیوں کی میرے ساتھ۔ مجبور تھا تو مجھے اتنے خواب دکھانے نہیں چاہیے تھے۔ میں اسے دھوکے کے علاوہ اور کیا کہوں گی۔“

”یہ سب ٹھیک ہے۔ مگر دیکھو اس شخص سے تو بہتر وہی تھا۔ بھلے سینڈ مین کر لیتا۔ ہو سکتا ہے وہ اسے چھوڑتا تھا۔ تمہارے لیے۔“

”مذرت کے ساتھ امی۔ اسے اگر چھوڑنا ہوتا تو شادی ہی نہ کرتا۔“

”بیٹا! وہ بہت مجبور تھا۔ اس نے یہ سب اپنے فیوچر کو بہتر کرنے اور چچا سے باپ کا حصہ لینے کے لیے کیا ہے۔ اس کے سر پر باپ نہیں اسے اپنے اور اپنی ماں کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔ پھر وہ تمہارے لیے بہت پیسہ بنانا چاہ رہا تھا۔“

”مجھے پیسہ نہیں چاہیے تھا۔ اسے یہ پتا تھا۔ میں نے ابو کی خواہش پر ایک ٹنگلے آدمی سے شادی کر لی تو کیا اپنی پسند پر میں سمجھوتہ نہ کر لی۔“

”بہر حال جو ہوا بہت غلط ہوا۔ میں تو تمہارے لیے سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں۔ ثانی۔ تم اگر وہاں سیٹ نہ ہو سکو تو کھر آجانا۔“ کچھ سوچ کر انہوں نے اتنی بڑی بات کہہ دی۔

”امی۔ آپ اپنی بیٹی کے ولیمہ کے دن اس سے کہہ رہی ہیں کہ سیٹ نہ ہو تو گھر واپس آجانا؟“ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا تھا۔

”آپ کو تو چاہیے کہ مجھے حوصلہ دیں“

”سمجھائیں۔“
”میں تم پر جبر نہیں کرنا چاہتی۔ اس سب کے لیے تمہارا باپ کافی ہے۔“

”مذرا واپس آنے کا مطلب تو سمجھتی ہیں نا آپ۔“

”اسے بہر حال بہت برا لگتا تھا۔“
”مجھے صرف تمہاری خوشی عزیز ہے۔“

”بہر حال آپ کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ واقعی ڈسٹرب ہو گئی تھی۔

”اچھا چلو موز ٹھیک کر لو اپنا سا پر چلیں۔“

”نہیں امی۔ مجھے جانا ہے ابھی گھر۔“

”گھر۔ اب سے پہلے تو تمہارا یہی گھر تھا۔ کیا گھر گھر کی رٹ لگا رہی ہے۔“

”وہ نیچے اتر کر سالن پیک کرنے لگی ہے۔“

”اچھا ایک بات سنو۔ فم سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ فم مند ہے تمہارے لیے۔ اس سے ایک دفعہ بات کر لو بیٹا۔“

”امی! آئندہ آپ اس کا نام بھی نہیں لیں گی میرے سامنے۔ میں یہ چہشہ بند کر چکی ہوں۔“

وہ ساری چیزیں وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔

”جی! وہ اس کے نزدیک بیٹھا اس سے کچھ باتیں کرنا چاہ رہا تھا۔ احسان صاحب سے بہت بات چیت کر کے اس کے اندر کچھ اعتماد سا آ گیا تھا اور وہ ذہنی طور پر مطمئن بھی ہو گیا تھا۔ جب ہی صوفے پر اس سے کچھ فاصلے پر آکر بیٹھ گیا تھا۔“

”مائی۔“ اس نے آہستگی سے اسے پکارا۔

وہ گم تھی اپنی سوچوں میں، جب اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور وہ چونک گئی۔ وہ اس کے اس طرح چونکنے پر عجیب متحیر بن سے مسکرایا تھا۔

”انگو تھی کیسی لگی۔“

”کون سی۔“ وہ ناخنوں والے انداز میں اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ خاصا فریض لگ رہا تھا۔

”جو میں نے دی تھی۔ پسند نہیں آئی کیا پہنی

نہیں؟“ وہ پہلی بار اعتماد سے بات کر رہا تھا۔
”اچھی تھی۔ یاد نہیں رہا۔ پن لوں گی۔“ اس نے لاشعوری طور پر اپنا ہاتھ کھسک لیا۔
”یہ انگو تھی زیادہ اچھی ہے۔“ وہ اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے بولا جو شادیت کی انگلی میں پھنی ہوئی تھی۔

یہ فم والی انگو تھی تھی، اس نے سوچا اس نے اتاری کیوں نہیں۔

”آپ ہر وقت اسے دیکھتی رہتی ہیں۔“

”اچھا۔“ اسے حیرت سی ہوئی، یہ تو خود اس نے بھی نہیں نوٹ کیا تھا۔

”ماں کی دوست نے دی تھی گفت میں۔“ وہ اب بھی دیکھ رہی تھی۔ اسے یاد آیا یہ اس نے اپنی پسند سے لی تھی فم کے ساتھ۔

”وہ آئی تھی شادی میں۔“

”کون؟“

”دوست آپ کی۔“

”نہیں۔ اس لیے کہ مجھ سے پہلے اس کی شادی ہو چکی ہے۔ باہر ہے وہ؟“ انہیں کتنی تھی۔

”اوہ اچھا۔ پھر بات چیت ہوتی ہے اس کے ساتھ۔“ اسے بس بات کرنے کا بہانہ چاہیے تھا۔

”نہیں ہوتی۔“

”کیوں ناراضی ہے۔“

”ہاں۔“

”مذرت کرنی چاہیے دوستوں سے۔“

”ضرورت نہیں۔“ اس کا لہجہ رکھائی لیے ہوئے تھا۔

”دوستوں کی ضرورت نہیں؟“ وہ خاصا حیران تھا۔

”ہاں۔ کسی کی بھی ضرورت نہیں۔“

اور وہ وہیں بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔ کتنا چاہتا تھا۔ میری بھی نہیں؟ مگر کہہ نہ سکا۔ اس کے بعد وہ جب بھی اس سے بات کرنا چاہتا وہ بیزار ہو کر اٹھ جاتی۔ اسے بات کرنے کا ڈھنگ جو نہیں تھا۔ وہ اس کی باتوں سے بے زار آ جاتی تھی۔ بہت ٹائم لگان لوگوں کو سیٹ ہونے

میں وہ اب اس کی بے زاری اور لاپرواہی کا عادی ہو چکا تھا اور وہ اس کی حرکتوں اور باتوں کی بہت مشکل سے ان کے درمیان یکسوئی پیدا ہوئی، حلق بن پایا مگر سب کچھ بے دلی سے۔ کوئی مطمئن نہیں تھا مگر اس اچھی تبدیلی سے وہ زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اسے ثانیہ سے محبت ہونے لگی تھی۔ وہ اس کا خیال بھی رکھنے لگا تھا۔ بس اسے دل ہی دل میں شکایت تھی کہ وہ اسے وہ اہمیت نہیں دیتی۔ وہ محبت میں دیتی کچھ مانگتی نہیں، کوئی فرمائش نہیں کرتی، حق نہیں بتاتی، احساس نہیں دلاتی، جیسے اسے اس کی ضرورت نہ ہو، جیسے وہ بس گزارا کر رہی ہو۔ یہ سب سچ تھا۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ اسے ثانیہ کی بہت ضرورت تھی۔ وہ اس کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ جب مکے جاتی تو وہ لمحہ لمحہ گن گن کر گزارتا۔ مگر اسے اظہار کا سلیقہ نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا وہ سب کچھ خود سمجھ جائے اور اس سے اسی طرح محبت کرنے لگے۔ جیسے وہ کرتا ہے۔ کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ اگر محبت کرے گی تو پروا بھی کرے گی۔ وہ اظہار بھی کرے گی، اسے خوش بھی رکھے گی۔ اسے انتظار تھا کسی دن وہ اس کے ساتھ ایسا براؤ کرے جیسے بیویاں شوہروں کے ساتھ کرتی ہیں، وہی ناز، غرے، فرمائشیں، انتظار، کھانے پینے کا خیال رکھنا، وہ دفتر جائے تو فون کر کے پوچھنا، وہ ایسا کچھ نہیں کرتی تھی۔

وہ ہر دفعہ سوچ سوچ کر مجھ جاتا اور پریشان ہو جاتا۔ وہ تھک جاتا تھا۔ اس سے کہنا چاہتا پریشان نہیں تھا۔ وہ اسی بات پر خوش ہو جاتا کہ وہ کبھی کبھار ناظم دیتی ہے۔ مختصر سی آمدنی میں گزارا کر رہی ہے۔

وہ اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا، پھر بھی وہ مطمئن نہیں تھی۔ کبھی پوچھنا چاہتا تھا کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔ تم کیوں ناخوش ہو۔ مجھ میں کیا کمی ہے۔ ناکہ میں دور کرنے کی کوشش کروں۔ مگر نجانے کیوں وہ ہمارے بچتے ہتے رک جاتا۔ بات بدل جاتی۔ وہ ہر بار گھر کے لیے چند ضروریات لکھ کر لسٹ پکڑا دیتی تھی اور اپنے لیے کچھ نہ منگوائی، یا کبھی بے زاری سے

اسے جھڑک دیتی۔

وہ چپ ہو جاتا۔ سارا اعتماد فوج پر ہو جاتا۔ احساس کمتری اور بڑھ جاتا۔ مگر ایسے میں بھی ایک محبت کا احساس تھا جو اسے کسی قدر خوش رکھے ہوئے تھا۔ اور وہ یہ کہ وہ کسی سے محبت کرنے لگا تھا اور اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

وہ بہت دنوں سے بیمار تھی۔ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا چاہ رہا تھا۔ مگر وہ میکے چلی گئی اور وہیں سے اسے کچھ دنوں بعد خبر ملی کہ وہ امید سے ہے اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ فوراً گیا اور اصرار کر کے اسے گھر لے آیا تھا۔ پہلی بار اس نے پیار سے اصرار کیا تھا۔ اس لیے وہ چلی آئی۔ وہ اس کا خیال رکھنے لگا تھا۔ پھر بھی کہاں لاپرواہی ہوئی تھی کہ کچھ غلط ہو گیا۔ اس کا مس کیرج ہو گیا تھا۔ وہ بہت دن بیمار رہی، پھر مال آکر لے گئی تھی۔ وہ روز فون کرتا۔ کوئی دسویں تیل پر جا کر وہ اس کا فون اٹھاتی تو بے زاری اس کے سچے سے جھٹک رہی ہوتی۔ وہ گھر گیا اس سے ملنے کے لیے اور اس کے بجائے اس کی ماں سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اوپر اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ احسان صاحب گھر پر نہیں تھے۔ ورنہ وہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ مگر آج اس کی سانس نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور پوری کمر نکال دی تھی۔

وہ مجرم بنا سر جھکائے کھڑا رہا تھا اور اس کے کھاتے میں کروہ ناکرہ گناہ درج کر دیے گئے تھے۔ اس کی ماں نے صاف صاف کہا کہ وہ اب گھر نہیں لوٹے گی۔ وہ بھول جائے کہ ثانیہ سے اس کا کوئی رشتہ بھی ہے، بلکہ انہوں نے تو علیحدگی تک کی بات کر دی اور وہ سن ہو گیا۔ اس نے بہت چاہا کہ اس سے مل لے۔ یہ ساری باتیں خود اس سے سن لے، ناکہ یقین آجائے مگر اس کی ماں کے سامنے وہ کچھ نہ بول سکا۔ نہ اسے بولنے اور صفائی دینے کا موقع دیا گیا۔ وہ مجرم بن کر لوٹ آیا۔ احسان صاحب سے بات کی۔ وہ خود حیران ہو گئے

اسے تسلی دی کہ گھر جا کر ثانیہ سے بات کریں گے اور پھر ثانیہ کو خود گھر چھوڑ آئیں گے۔ یہ کیا تمنا لگا رکھا ہے تم ماں، بیٹی نے کوئی طریقہ ہونا ہے بات چیت کا۔ مڈر آیا تھا کس طرح بات کی ہے تم لوگوں نے۔

”وہ آیا تھا؟“ ثانیہ کچھ حیرت سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ ”آپ نے بتایا نہیں امی؟“

”تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہا تھا۔ بچے میں نے بات کر لی تھی اس سے۔“

”اور بات کیا کی یہ بھی بتادیں۔“ وہ تھک کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

”یہی کہ ثانیہ اب اس کے ساتھ نہیں جائے گی۔“

”مگر کیوں۔۔۔ ثانیہ یہ تم نے کہا تھا۔“ وہ اس سے سنا چاہ رہے تھے۔

”وہ۔۔۔ مجھے کچھ ناظم چاہیے۔ میں نے یہ کہا تھا“

میں فی الحال نہیں جا رہی۔“

”اور تمہاری ماں نے تو علیحدگی تک کی بات کر لی۔“

”کیوں امی۔۔۔ آپ نے ایسا کیوں کہا۔“ وہ قدرے حیران تھی۔

”تم نے جو کہا تھا کہ اس کٹہرے کے ساتھ رہ رہ کر بے زار آئی ہو۔ مجھے نہیں جانا اس گھر میں۔“

”کہا تھا پر ہمیشہ کے لیے نہیں۔ اب شادی کی ہے تو جانا پڑے گا۔ مگر فی الحال نہیں جانا چاہتی میں۔“

”بہتر تھا کہ تم مڈر کو ثانیہ سے ملنے دیتیں رخسانہ! خود اپنی جانب سے کیا کچھ کہہ دیا۔ بچہ ساری رات پریشانی میں سو نہ سکا۔“

”دوسروں کے بچوں کی بہت فکر ہیں آپ کو، اپنی بیٹی کی کوئی فکر نہیں ہے جس کی اتھاڑ زندگی برباد کر دی آپ نے۔“

”تم خوش نہیں ہو ثانی! وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

”جھوٹ بول رہی ہے یہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ زندگی گزارنے کی کوشش کر رہی ہوں اس کے ساتھ۔“

”ثانیہ کوئی شکایت ہے تو بیٹا شیئر کرو ابو سے۔ مجھ سے کیوں نہیں کہتیں۔“

”ابو۔۔۔ بس وہ ذرا مشکل آدمی ہے۔ اس کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہے۔ وہ عجیب سا آدمی ہے۔“

”بیٹا وہ اکیلا رہا ہے کال باپ کے بغیر۔ چھوٹی عمر میں اس نے بڑے صدمے سے ہیں۔ وہ سہا ہوا ہے اسے محبت دو، اپنائیت کا احساس دلاؤ۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ابو۔۔۔ میں نے بہت کوشش کی ہے۔ مگر۔۔۔ بس میں اتنا چاہتی ہوں کہ میں کچھ وقت اکیلے رہوں سکون کے ساتھ۔ آپ پلیز مجھے ذرا موقع دے دیں۔ میں علیحدگی کی بات نہیں کر رہی، مگر دیکھیں میں کچھ عرصہ غور کرنا چاہتی ہوں۔“

”اس دوران اگر کچھ بڑگیا تو۔۔۔“ وہ ڈرے ہوئے تھے۔

”ابو! میں بگڑی ہوئی ہوں۔ بکھری ہوئی ہوں۔ فی الحال مجھ میں حوصلہ نہیں ہے۔ تھوڑا ریلیف دے دیں۔“

”بیٹا تم اس سے بات تو کرو۔ کہہ دو بعد میں آجاؤ گی۔ ابھی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہارا شوہر ہے۔“

”اوکے۔۔۔ میں دیکھتی ہوں، مگر پلیز آپ فی الحال مجھے فوراً نہ کریں۔“

”اوکے بچے۔ مگر دھیان سے۔ دیکھو گھر روز روز نہیں بنتے بچے پھر بے چارہ ڈرا ہوا ہے۔ تمہاری بہت پروا ہے اسے۔ بغیر ماں باپ کے بچہ ہے۔ اس کے ساتھ اتنی سختی نہ برنا کرو۔“

”احسان صاحب! ہم نے کوئی محبت اور قربانی کا خیراتی ہاؤس نہیں کھول رکھا ہوا کہ ہر کسی کو خیرات میں قربانیاں دیتے پھریں۔ آپ کو اپنی بیٹی کی کوئی پروا نہیں ہے۔“

”وہ کوئی اور نہیں تمہارا داماد اور اس کا شوہر ہے
رخسانہ بیگم!“
”ہاں شوہر بھی آپ نے سر پر سوار کیا ہے اس
کے میں تو شروع سے خلاف تھی اس شادی کے“
”امی پلیز بس کر دیں۔“
”مائی کیا واقعی میں نے زیادتی کر دی ہے۔“
”پتا نہیں ابو۔ مگر آپ ٹینشن نہ لیں۔ میں بس
انتہا سمجھتی ہوں اگر میں ابھی وہاں گئی تو مزید باغی ہو کر
آجاؤں گی۔ اس لیے فی الحال میں ٹھنڈے دل سے
کچھ سوچنا چاہتی ہوں اور بات کروں گی ایک دو دن
میں آپ فکر نہ کریں۔ ابھی اگر بات ہوئی تو بات بگڑ
بھی سکتی ہے۔“
”چھال۔ ٹھیک ہے جیسے تم ٹھیک سمجھو۔ میں فی
الحال اسے منع کر دیتا ہوں کہ وہ تمہیں تنگ نہ
کرے۔“ وہ ہتھ مارا ہوا ہو کر اٹھتے تھے وہاں سے۔
”ٹانیہ خود سر پکڑ کر بیٹھ گئی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں
ہو رہا ہے، بس دل بوجھل سا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ
نہیں رہ جائے گی اس کے ساتھ اور فائدہ بھلا نہیں پائے
گی شاید۔ دو چیزیں آپس میں گٹھ جوڑ رہی تھیں۔ وہ
ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ تھی اس لیے اس سے کوئی
ایسی بات نہ کرے اسے بھی مزید پریشان کرنا نہیں
چاہ رہی تھی۔

احسان صاحب نے اسے سہولت سے سمجھا دیا کہ
کال مت کرے اور وہ۔ لمحہ لمحہ انتظار کرتا رہا کہ وہ
کال کرے گی، مگر اس نے ایک دن بھی بھولے سے خبر نہ
لی اس کی، اس نے خود ہی ایک دن فون کھڑا کیا۔ ایک
”دو تین“ چار“ چھ تیل ہو میں۔ وہ پھر فون ملائے لگا تو
دوسری تیل پر ریسیو کر لیا گیا۔ اس نے فون بھی کسی اور
نمبر سے کیا تھا، تاکہ وہ اس کا نمبر دیکھ کر پتہ نہ کرے۔
”ہیلو جی، فرمائیں۔“ یہ وہی آواز تھی۔ اس کی ثانی
کی۔

”ہیلو۔“ وہ مشکل سے بول سکا۔

”جی بولیں، کون؟ کس سے بات کرنی ہے؟“
”ٹانیہ۔۔۔“ وہ ہلکا سا کہہ پایا۔
”جی بول رہی ہوں، مگر آپ کون ہیں۔“ مکمل ہے
وہ اس کی آواز نہیں پہچان رہی تھی۔ اس کی بیوی
پورے نو ماہ اس کے ساتھ رہی۔ اس کی آواز نہ۔
اس سے بات کی۔
”مڈ ٹریول رہا ہوں ٹانیہ!“ اس کے گلے سے آواز
تھکی ہوئی نکلی۔
”اوہ۔۔۔ مڈ۔۔۔ کیا حال ہیں آپ کے۔“ اس کا انداز
اجنبی لہجہ کیوں تھا۔
”تم کیسی ہو؟“ اپنا ہیٹ کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔
”ٹھیک ہوں۔“
”طبیعت ٹھیک ہے۔“ فکر مند سی تھی۔
”ہاں ٹھیک ہوں۔“
”میں نے آجاؤں؟“ بے تابی جھلکی۔
”فی الحال نہیں پلین۔“
”کب آؤ گی۔“
”پتا نہیں۔“ رکھائی سے کہا گیا۔
”ٹانیہ۔۔۔“ آخری تھروٹ گیا۔ ”میں کال نہیں
کروں گا اب۔“ آنسو لفظوں میں آگئے تھے۔
اُدھر سے لائن ساکت تھی۔ الوداعی کلمات بھی
نہیں۔ نہ کوئی معذرت۔ نہ کوئی دعا۔ نہ کوئی
درخواست۔ نہ بات۔ بس سلسلہ ختم۔ اس دن
ٹانیہ خود اپنے سفاک طرز عمل پر افسوسہ تھی۔
مگر وہ صرف افسوسہ تھی، جبکہ مڈ ٹریول بچوں کی طرح
بلک بلک کر رو رہا تھا اور اس دن کے بعد واقعی اس نے
کبھی فون نہیں کیا۔ ان کی بات نہیں ہوئی پورے چھ
ماہ بیت گئے۔ ان کی شادی کی سالگرہ گزر گئی۔ جیسے
سب کچھ راکھ کا ڈھیر بننا چاہتا تھا۔ خود مڈ ٹریول بھی اور
اندر سے ٹانیہ بھی۔ مگر وہ پچھلے سات ماہ سے خود کو بھی
سزا دے رہی تھی اور اسے بھی۔ یہ سزا بہت لمبی
ہو گئی تھی، مگر یہ سب جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔

یہ ساڑھے آٹھ ماہ ٹانیہ کے تو ہوا بن کر اڑے تھے

مڈ ٹریول پر بجلی بن کر برس اور پھاڑ بن کر ٹوٹے
تھے۔
”ٹانیہ کو وہ ماہ بعد ہی جاب مل گئی تھی۔ وہ پورے چھ
ماہ اپنی جاب اپنے کام میں مگن رہی، پوری طرح سے
جیسے بھول گئی یا بھولنے کی کوشش کر رہی کہ اس کا
کوئی گھر تھا، کوئی شوہر بھی تھا، کوئی نکاح کے کاغذات پر
معاہدہ کیا تھا۔ اس کا مقصد تو یہی تھا کہ جاب کر کے اپنا
کچھ بنائے تو پھر چلی جائے گی۔ اس پر بار نہیں ہوگی،
اپنا خرچا خود اٹھائے گی۔ اس نے یہ نو ماہ جس تنگی سے
گزارے تھے اسے ہی پتا تھا۔ وہ اس پر اضافی خرچہ
ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کی ہمدرد بھی تھی۔ بس
ایک غلطی اس سے ہو گئی کہ جو معاہدہ کیا اس پر پوری
نہ اتار سکی۔ اس سے تعلق ہی ختم کر دیا۔ رابطہ ہی توڑ
دیا۔ اتنی سفاکی، اتنی بے رحمی پر اسے کبھی گھبار دکھ
ہو تا تھا مگر عجیب مرحلہ تھا کہ ہر معاملے میں خود کو بے
بس لیا تھا۔
ابھی بھی تو وہ بے بس ہو گئی تھی جب احسان
صاحب نے ناشتے پر افسوس کے ساتھ اس کا حال سنایا
تھا۔
”مڈ ٹریول چار ماہ پہلے نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔“
”مگر کیوں۔“ وہ چونک گئی تھی۔
”وہ ٹھیک کام نہیں کر پاتا تھا۔“
”یہ شخص کسی قابل نہیں ہے۔“ اس کی ماں کا
فرمان تھا۔
”وہ ذہنی دباؤ کے سبب کام سنبھال نہیں پایا تھا۔
پچھلے چار ماہ سے اس کی عجیب حالت ہے۔ کل گیا تھا
اس کی خیریت پوچھنے۔“
”آپ کو کیا ضرورت تھی جانے کی وہاں۔“ رخسانہ
بیگم پر ہم ہنس۔
”ابو۔۔۔ وہ کیسا ہے۔“ اس نے ناشتا چھوڑ دیا تھا۔
”اسے اس حالت میں کیا ہونا چاہیے۔ جب اس
کا کوئی نہیں۔ کاش میں اس کی شادی کسی مل ٹکاس
میلی کی لڑکی سے ہی کر دیتا۔ وہ اسے چھوڑ کر تو نہ
جالے۔ وہ بھی خوش رہتا۔ تمہارے ساتھ بھی زیادتی

نہ ہوتی۔“ انہوں نے چائے کا ادھورا کپ چھوڑ دیا
تھا۔
”زیادتی تو آپ نے خوب کی۔ مگر اپنی بیٹی کا نہیں،
پھر بھی اسی کا افسوس کھائے جا رہا ہے آپ کو۔“ وہ
کیوں خاموش رہیں بھلا۔
”ابو ٹھہرس۔ میں چلتی ہوں۔ مجھے وہاں ڈراپ
کر دیتے گا۔“
”کمال۔ تمہارا گل ہو کیا ثانی! کہاں جا رہی ہو۔“ وہ
تیز ہوئیں۔
”وہ بہت برا سہی۔ مگر وہ شوہر ہے میرا۔ اس حال
میں تو مجھے جانا چاہیے، اس کی خیریت معلوم کرنا
چاہیے۔“
”ٹانی! اتم اپنا فیصلہ آٹھ ماہ بعد بدل رہی ہو۔ پھر
پچھتاوگی، مت جاؤ، پچھس جاؤ، وہاں جا کر۔“
”مجھے جانا چاہیے امی۔ ابو آپ ٹھہرس، میں ذرا
بیک اور سیل فون وغیرہ لے آؤں۔“
میں اپنی گاڑی میں جاتی ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھے
وہاں رکنار پڑ جائے کچھ دیر۔“ وہ نیچے آکر ان سے پوچھنے
لگی۔
”ہاں۔۔۔ یہ ٹھیک ہے، مجھے ویسے بھی دفتر سے دیر
ہو جائے گی، تم اپنی گاڑی میں چلی جاؤ۔ میں فون کر کے
تم سے پوچھ لوں گا پھر۔“
”اوکے بہتر ہے۔“ وہ ان کے ساتھ باہر نکلی۔
”ٹانی! شام سے پہلے لوٹ آنا۔“
وہ فکر مند سی کتے ہوئے بیٹھ گئیں سر پکڑ کر۔ وہ
تیزی سے گاڑی سے راج سے نکلنے لگی اور وہ گاڑی میں
بیٹھتے ہوئے اسے دیکھتے رہے۔
”اللہ کرے اب تم اپنے فیصلے پر قائم رہو۔“
انہوں نے دل میں دعا کی تھی اور ڈراؤں کو چلنے کا اشارہ
کیا۔ ان کی گاڑی کے پیچھے پیچھے ٹانیہ کی گاڑی تھی۔
انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر مر مر میں سے اسے
مسکرا کر دیکھا تھا۔

وہ اندر آئی تو گھر کی عجیب حالت تھی۔ ہر جگہ چیزیں

بکھری ہوئی تھیں۔ اور کمرے تک آکر وہ ٹھٹک گئی
بند کے پاس وہ اوندھے منہ بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ اس
کے سر سے خون بھی نکلا ہوا تھا۔
وہ دہل گئی۔ اسے جھنجھوڑا آواز میں دین۔ مگر وہ
شاید بے ہوش تھا۔ سر سے کافی خون بہہ چکا تھا۔ خون
فرش پر سوکھ چکا تھا۔ گویا وہ رات سے یا کافی دیر پہلے
سے گر رہا ہوا تھا۔

اس نے غلت میں باہر نکلتے ہوئے پڑوسیوں کو آواز
دی۔ ایک دو آدمی باہر آئے ان کی مدد سے اسے گاڑی
میں ڈالا۔ وہ دونوں آدمی اس کے ساتھ تھے۔ ایک نے
ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ وہ پیچھے بڈر کا سر کوڈ میں
لیے بیٹھی تھی اور اسی ٹائم ابو کو کال ملائی۔
”ابو۔ ابو بڈر بے ہوش تھا، میں اسے اپنے
پڑوسیوں کے ساتھ ہسپتال لے جا رہی ہوں، آپ پلیز
دہل آجائیں۔“

وہ بس اتنا کہہ سکی تھی اس کا سر تھا اس کی
عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ آنسو بے اختیار ہو کر اٹھ
آئے تھے۔ اسے یقین نہیں آیا خود پر بھی کہ وہ وہی
تھی جو آٹھ ماہ اس سے دور رہی تھی۔ اس کی خبر بھی نہ
لی اور اب اتنے عرصے بعد وہ اس کی حالت پر یوں سب
کے سامنے رو رہی تھی۔ ان کے ہسپتال پہنچتے ہی
احسان صاحب بھی پہنچ گئے تھے۔ اسے فوراً
ٹریٹمنٹ دی جانے لگی۔ وہ وینٹ لائونج میں پریشان
بیٹھی تھی۔ شام تک اسے ہوش آگیا تھا۔ وہ احسان
صاحب کے ساتھ اس کے سر ہائے کھڑی تھی۔ ڈاکٹر
نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے
دماغ پر اثر تو ہوا تھا کچھ مگر وہ جسمانی طور پر ٹھیک تھا
۔ زخم پر پٹی کر کے دو اسے دی گئی۔ ڈاکٹر نے انہیں کسی
دامنی ہسپتال لے جانے کو کہا تھا۔ مگر وہ ضد کر کے اسے
گھر لے آئی تھی۔ احسان صاحب کو اس کے پاس
بٹھا کر وہ گھر گئی اور اپنی ساری چیزیں پکڑے سیٹ کر
گھر لے آئی۔ جب تک وہ بڈر کے پاس بیٹھی رہے
۔ اس نے اپنی نگرانی میں گھر سے جو ملازم لائی تھی اس
سے ساری صفائی کروائی اور میلے کپڑے لائڈری

بجھوائے۔ اس کے لیے کھانا بنا کر وہ اندر آئی تو وہ کچھ
حواسوں میں تھا۔ احسان صاحب نے زبردستی اسے
کھانا کھلایا۔ خود ٹائیپ کے ساتھ کھایا تھا اور رات کے
وہ گھر لوٹے اسے پوری طرح سے سیٹ کر کے گھر
آتے ہی رخسانہ بیگم ان پر برس پڑی تھیں مگر وہ کہتے
دفنوں بعد آج جین کی فینڈ سوتے تھے۔ ٹھکن بھی تھی
اور طمانیت بھی۔

اس کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی اس نے اسے
اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ کچھ دن چھٹی لے لی تھی۔ پھر وہ
جسمانی طور پر بالکل ٹھیک ہو گیا اور کچھ ذہنی طور پر تو وہ
وہیں سے جا بڑ جانے لگی۔
وہ پوری کی پوری بدل چکی تھی۔ وہ ہانگوں کی طرح
اس کا خیال رہتی تھی۔ وہ کچھ نارمل تھا۔ مگر بیٹھے بیٹھے
کھو جاتا تھا۔ کبھی کبھار عجیب حرکتیں کرنے لگ جاتا۔
بیٹھے بیٹھے گلاس اٹھا کر پیو۔ فرس پر ڈرے ڈرے
سے انداز میں بیٹھ جاتا۔

کبھی سخت گرمی میں جیکٹ پہن لیتا اور کہتا مجھے
سردی لگ رہی ہے۔
اور کبھی سردی آتی تو بغیانہ میں پھرتا تھا۔ وہ لاکھ
کرتی مگر کچھ نہیں پہنتا۔ پہلے کی نسبت گزارا اب
مشکل تھا، بلکہ ناممکن تھا، مگر وہ چاہ رہی تھی تو کر رہی
تھی۔

شام کا وقت تھا جب وہ گھر آئی راشن لے کر تو
دروازہ اندر سے بند تھا، اس نے بہت بیکل دیں
کھٹکھٹایا، مگر نہیں کھلا۔ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی
پوری اس نے ایک باپ کا سہارا لے کر پہلے سارا
سلمان اندر بھینکا، پھر کونچ کر کے خود کھڑکی سے کود کر
اندر آئی۔ وہ کمرے میں نہیں تھا۔ سلمان سمجھنے کے
سبب بری طرح بکھر گیا تھا۔ سب تھیلے سے نکل کر
فٹ بال کی طرح کوئی بیڈ کے نیچے کوئی کرسی کے نیچے
کوئی دروازے کے کونے سے الگا۔ یہی حال دیگر
چیزوں کا تھا۔ مگر سب کچھ سمیٹنے سے پہلے وہ۔ اسے
دیکھ کر اطمینان کر لیتا چاہ رہی تھی کہ وہ ٹھیک ہے۔
کچن کے قریب ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ کرسی پر سگم

بیٹھا تھا۔
”بڈر۔ ٹھیک ہوتا۔ سب ٹھیک ہے۔ سردی
نہیں لگ رہی؟“ وہ بغیانہ اور ٹراؤڈر میں سگم سم بیٹھا
تھا۔ اسے دیکھنے لگا مگر بولا کچھ نہیں۔
”ممدی! طبیعت ٹھیک ہے نا۔“ اس نے اپنے
دوپٹے سے اس کے چہرے کا پینٹ صاف کیا۔ اپنی
سردی میں بھی اسے پینٹ آ رہا تھا۔

وہ بچوں کی طرح غائب دماغی سے اسے دیکھنے لگا۔
”بڈر! کیا ہوا۔ ایسے کیوں دیکھ رہے ہو۔“ آج
تیسرا دن تھا، مگر اس کی ذہنی حالت ویسی کی ویسی تھی۔
کبھی کبھار وہ یوں ہی غائب دماغ ہو جاتا جیسے اسے
پہچان نہیں پڑا ہو یا کچھ کہنے کی کوشش تو کر رہا ہو، مگر
کہہ نہیں پڑا ہو۔
”بڈر بولو نا۔ کچھ تو بولو۔ اچھا کچھ کھلایا ہے۔“ وہ

اس کا چہرہ انھوں میں لے کر بولی۔
پچھلے تین ماہ سے وہ اسے بچوں کی طرح ٹریٹ
کر رہی تھی، یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ وہ ایک بچے کے ساتھ
پوری ذمہ داری کے ساتھ رہ رہی تھی۔ نیند میں اٹھ
اٹھ کر اسے دیکھتا کہ کہیں وہ کمرے سے باہر تو نہیں
نکل گیا۔ کہیں وہ باہر جاتے ہوئے نہ گرتو نہیں گیا۔ اسے
چوٹ تو نہیں لگی۔ خون تو نہیں بہہ رہا، درد تو نہیں
ہو رہا۔

کبھی کبھار وہ نیند میں چپخنے لگتا اور وہ اسے بچوں کی
طرح بھلاتی۔ بے بسی اتنی کہ وہ خود اس کے ساتھ رو
پڑتی۔ اسے سنبھالتے سنبھالتے وہ خود آدھی پاگل تو
ہوئی تھی۔ کتنے ڈاکٹروں کے چکر لگا آئی۔ آج بھی وہ
اسے اپنے ساتھ نفسیات کے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔
اس کا مشورہ تھا کہ اسے مینٹل ہسپتال داخل کرایا
جائے، مگر اس نے کوئی اور حل چاہا تو یہی کہا کہ جگہ
تبدیل کریں۔ اسے بہت سارے لوگوں کے ساتھ
بٹھائیں۔ تاکہ وہ لوگوں کو دیکھ کر بات کر کے مل کر کچھ
بہتر ہو۔ وہ اس کا اور اپنا سلمان بیک کر کے اسے اپنے
گھر لے آئی کہ اسے احسان صاحب وقت دیں گے۔
جگہ بدلے گی۔ ملازم ہوں گے، ہو سکتا ہے اس کے

اندر بہتری آئی جائے مگر اسے کیا پتا کہ یہ سودا اور بھی
مہنگا پڑے گا۔ وہ اسے لے تو آئی مگر پھر بہت بچھڑائی۔
اس کی غیر موجودگی میں اس کی ماں اس آدھے پاگل
کے ساتھ عجیب عجیب باتیں کر کے اور اسے برا بھلا
کہہ کر اسے اور ذہنی مسائل میں الجھانے لگی۔ اس پر
سونے پر سہاگہ یہ ہو کہ فمدا پاکستان آگیا ان کے گھر۔
اس نے تو ایک منٹ رک کر اس سے بات تک نہ کی
تھی۔ مگر رات بہت جلد سامنے آیا۔ ایک دن بڈر
نے کوئی چیز تو ڈی گھر کی، چپخنے لگا اور اس کی ماں اور فمدا
اسے پکڑ کر مینٹل ہسپتال لے آئے۔ وہ جب گھر پہنچی
رات کو تو اسے نہ پا کر پاگل سی ہو گئی تھی۔ پھر یہ بتا چلا
کہ وہ اسے پاگل خانے چھوڑ کر آئے ہیں تو دماغ ٹھوم
گیا۔ وہ ساری رات ان سے لڑتی رہی، روتی رہی اور
صبح سویرے پاگل خانے پہنچی تو وہ اپنے آپے میں ہی
نہیں تھا۔ گویا کہ اس کے علاوہ اب کوئی اور حل نہ تھا۔
وہ تھک کر گھر آئی تو ایک اور جنگ چھڑ گئی، اس کی ماں
اور فمدا کا نیا پلان۔ وہ چکر کر رہ گئی۔

دو دن تک اسے ذہنی طور پر تیار کیا گیا تھا۔ اسے پتا
تھا کہ بڈر کا بہتر ہونا بہت مشکل ہے۔ بلکہ ناممکن کے
قریب ہے اور کوئی امید بھی نہیں ہے۔ مگر وہ اسے
اکیلے چھوڑ کر اپنی زندگی کیسے شروع کر سکتی تھی۔ پہلے یہ
سب آسان تھا۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ اب وہ محتاج
تھا، اکیلا تھا، ایک پاگل آدمی کو اس حالت میں چھوڑ کر
اس سے طلاق کے کر اپنا الگ گھر بسانا بہت مشکل،
بلکہ ناممکن تھا۔

وہ اس کے پیچھے ضرور گئی تھی، مگر اسے روکنے
نہیں۔ انگوٹھی واپس کرنے اس کے بعد وہ رک ضرور
تھا۔ ان کے درمیان بات ضرور ہوئی تھی، مگر وہ اپنی
طرف سے صفائیاں دے رہا تھا اور معافی مانگ رہا تھا۔
ٹائیپ کی آنکھیں غم ضرور ہوئی تھیں۔ ایک بار سوچا
اسے روک لے، مگر دل نے ساتھ نہیں دیا، اب باری
ٹائیپ کی تھی اسے نباہنا تھا۔ کسی کی زندگی پوری کی

دانتوں کے درد، مسوڑھوں سے
نحون آنا، ٹھنڈا گرم لگنا اور
دیگر تکالیف کے لیے

10 پرا بلم 1 حل



Dr. Atta-ur- Rehman
Dental Surgeon

مریض کا بہروسہ ڈاکٹر پیر

ڈاکٹر کا بہروسہ 25 سال سے میڈی کیم ڈینٹل کیم

”تمہیں یاد ہے میری ڈینٹ آف پر تھہرے تم رات
بارہ بجے کی گھنٹے اور میں سو رہی تھی۔ تمہیں یاد
ہے ناڈر۔“ وہ نوالہ اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے
کہنے لگی۔ وہ برسامنہ بنا کر نوالہ چبانے لگا۔
”تم چلی گئی تھیں نا۔“ اس نے بہت دیر بعد سوچنے
کے بعد کہا تھا۔

”تم نے مجھے یاد کیا تھا؟“ اس کی آنکھوں میں پانی
تیرنے لگا جس میں اس کا چہرہ دھندلانے لگا تھا۔
اس نے غائب دماغی سے لٹی میں سر ہلایا تھا۔
”تم نے مجھے کل کی تھی۔“
وہ پھر نفی میں سر ہلانے لگا۔
”اچھا میں نے نا۔“ فرنیچر کی سیٹنگ چننے کی
ہے۔“ وہ اس کے منہ میں دوسرا نوالہ ڈالتے لگی جب
اس نے ہاتھ روک دیا۔

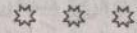
”کیا ہوا پیٹ بھر گیا؟“
”یہ تم کھاؤ۔“ وہ بچوں کی طرح بولا۔
وہ خود کھا کر مسکرانے لگی۔ ”تم بہت اچھے ہو، کیا
میں بھی اچھی ہوں۔“ اس نے بچوں کی طرح اثبات
میں سر ہلایا تھا۔
”پھر تم مجھے میرے گھر لے جاؤ گی۔“
”ہاں تم ٹھیک ہو جاؤں تو میں تمہیں گھر لے جاؤں
گی۔“

”وہاں نہیں لے جانا۔“
”وہاں کہاں؟“
”وہاں سب ڈانٹتے ہیں۔ وہ تمہارا گھر ہے نا۔“
”ہم اب وہاں نہیں جائیں گے ناڈر۔ ہم اب
اپنے گھر جائیں گے۔“
”تم بھی چلو گی کیا؟“
”ہاں۔ ہم دونوں چلیں گے۔“ وہ نفی بند کرنے
لگی۔

”دوب چلیں گے۔“
”جلدی چلیں گے۔“ وہ اسے دوا دینے لگی۔
”مجھے نہیں کھانی یہ گولی۔ کڑوی ہوتی ہے۔ یہ زہر
ہے نا۔“

پوری اس پر انحصار کر رہی تھی اور اسے اپنی تمام
خوشیاں اس پر قربان کر دیتی تھیں۔ منہ جب گاڑی میں
بیٹھا اور جب وہ اسے اللہ حافظ کہہ کر واپس آ رہی تھی
اس کی چال میں عجیب مضبوطی تھی اور رخسانہ بیگم
جنہوں نے کچھ دیر پہلے سکون کا سانس لیا تھا وہ حیرانی
سے اسے دیکھنے لگیں۔

اور ثانیہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف
سیڑھیاں چڑھ گئی اس نے بال سمیٹنے تھے، کپڑے
تبدیل کرنے تھے، ناشتا کرنا تھا اور پھر خود کو مضبوط
کر کے اس سے ملنے جانا تھا اور اب کی بار رونا بھی
نہیں تھا۔ آنسوؤں کو چھپا لینا تھا۔ یہ سوچ کر اس کے
اندر صبر سا آ رہا تھا۔ اصل مقصد تو اس کا اب شروع
ہوا تھا اور آج سے اس کی ڈیوٹی کا پہلا دن تھا۔



یہ زندگی کا ایک صبر آزما مرحلہ تھا۔ وہ دل پر جبر
کر کے اس سے ملنے جاتی۔ اس کی حالت دیکھ کر ہریار
دل ڈوب جاتا تھا، وہ پہلے پہل اسی طرح اسے دیکھ کر
پہنچنے لگتا تھا۔ پھر کچھ دن بعد اس نے چپ سا دھڑکی
تجھی کھار اشتعال میں آ کر اسے کچھ دے مارا۔ ایک
بار اسے دیکھ کر منہ چھپا لیا۔ وہ ڈاکٹر سے ملنے
مشورے کرنے لگی، اس دوران اس نے کئی نفسیات
کی کتابیں پڑھ ڈالیں، کئی نفسیاتی معالجوں سے ملی
تھی۔ اسے ہینڈل کرنے کے طریقے سیکھے، پھر اسے
اپنے طور پر ہینڈل کرنے لگی۔

وہ اسے اب کلینک میں ملتی تھی۔ ڈاکٹر روم میں
اسے لے آتے۔ وہ باتیں کرتی رہتی۔ وہ غائب دماغی
سے ستارتا۔ کچھ نہیں کہتا اور بھی الٹی سیدھی باتیں
کرنے لگتا۔ ہریار اپنی شکست پر دل ٹوٹ جاتا، ڈوب
جاتا۔ مگر ہر دوسرے دن وہ اک نیا حوصلہ جمع کرتی۔
خود کو جوڑتی اور اس سے ملنے جاتی۔ وہ اب اسے اپنے
ہاتھ سے کھانا کھلاتی تھی۔ اس سے باتیں کرتی۔
”ناڈر! تمہیں یاد ہے تم ایک دفعہ میرے لیے
گجہ لائے تھے۔“

”نہیں مدثر! یہ زہر نہیں ہے یہ دوائی ہے اسے کھا کر تم ٹھیک ہو جاؤ گے پھر میں تمہیں گھر لے جاؤں گی۔“

”تم ثانیہ ہونا۔“ وہ گولی نگتے ہوئے بولا۔

”ہاں میں ثانیہ ہوں۔ کیوں تم مجھے نہیں پہچانتے؟“

”مس ثانیہ۔“

”اور یہ امید میری زندگی کی آخری امید ہے ڈاکٹر صاحب! وہ کو ریڈور سے گزرتے ہوئے جاری تھی گیٹ کے پاس۔ جب مدثر بستر گہری نیند سو رہا تھا اور اس نے تب تک گہری نیند نہیں سونا تھا جب تک مدثر کو مکمل طور پر بے داری نہیں مل جاتی تھی۔“

”پہچانتا ہوں۔“

”پھر تاؤ ثانیہ کون ہے؟“

”میرے گھر میں رہتی تھی پھر چلی گئی۔“

”پھر لوٹ بھی تو آئی تھی نا مدثر!“

”نہیں آئی، فون نہیں اٹھاتی تھی۔ بہت بری تھی۔“ وہ تھوڑی کھجکتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھیں دوائی کے زیر اثر اب بند ہو رہی تھیں۔

”مجھے نیند آرہی ہے۔“ وہ وہیں بید پر لیٹ گیا۔

اس کے سوتے ہی وہ ڈاکٹر کے پاس آگئی۔

”اس کے ذہن پر آپ گئے چلے جانے والا صدمہ ابھی تک ہے۔“

ساڑھے پانچ سال بعد۔

مشکل وقت بہت مشکل سے گزرتا ہے مگر اس کی ایک اچھی بات ہے گزر جاتا ہے۔ ساڑھے پانچ سال بہت مشکل تھے مگر گزرتے تھے۔

صبح نے ہرج ہرج کو روشن کر رکھا تھا۔ جب وہ آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھی اور مدثر کی پکار پر اٹھی تھی۔ وہ جب منہ دھو کر باہر آئی تو وہ نیبل پر ناٹا سا لگا چکا تھا۔ سیب پھل، جوس، چائے، بریڈ اور خن کے لیے ولیہ تیار تھا۔

”مدثر۔۔۔ مجھے کیوں نہیں اٹھایا، یہی بات ہے۔“

”تم رات بہت دیر سے سوئی تھیں ثانی۔ اچھا اب جلدی آؤ نا شتا کرلو۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور ہاں اپنے بیٹے کو خود آکر کھلاؤ یہ میرے ہاتھ سے نہیں کھانا۔“ وہ محسن کو اس کی گود میں تھماتے ہوئے بولا۔

”ہاں میں جانتی ہوں۔“

”مگر یہ اب بہتر ہونے لگے ہیں۔ انہیں سب یاد آرہا ہے۔ یہ کبھی نیند میں آپ کو آواز دیتے ہیں۔“

”مجھے اس دن کا انتظار ہے ڈاکٹر صاحب! جب میں اسے اپنے گھر لے جاؤں گی اور وہ بالکل نارمل ہو جائے گا۔“

”ان شاء اللہ مس ثانیہ! وہ دن ضرور آئے گا۔ آپ بہت محنت کر رہی ہیں۔ آپ کے صبر کا پھل میٹھا ہی ہوگا۔ آپ کو بتا ہے یہاں بہت سمریض مکمل طور پر صحت یاب ہو کر اس لیے گھر نہیں جاتے کہ ان کے گھر والے ان سے تعاون نہیں کرتے۔ وہ لوگ ہمیشہ کے لیے انہیں یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ مسٹر مدثر کی صحت یابی میں اسی فیصد آپ کا ہاتھ ہے باقی علاج کا۔“

”اس کے پاگل ہونے میں بھی اسی فیصد میرا ہی ہاتھ تھا، میں فیصد تو وہ پہلے تھا باقی کی کسر میں نے پوری کردی تھی۔“

”مگر آپ ان کی زندگی کی پہلی اور آخری امید ہیں

”توبہ مدثر! اپنی تھوڑی ہوں میں کھالوں گی۔“ وہ ہنس دیتی۔

وہ دونوں ایک دفتر میں جاب کرتے تھے جہاں احسان صاحب ہوا کرتے تھے۔ شام کو واپسی پر تقریباً ایک چکر وہاں کا لگتا تھا اور گھر آتے آتے مغرب ہو جاتی۔

وہ اسے گود میں لے کر بیٹھ گئی اور اسے بھی کھلانے لگی خود بھی کھانے لگی۔ مدثر ہرج ہرج نکل کر اسے دے رہا تھا اور کھانے کا اصرار کر رہا تھا۔ بھی وہ اسے کھلانے میں مگن ہوتی، تو وہ خود نالہ توڑ کر اس کے منہ میں ڈالتا۔

”توبہ مدثر! اپنی تھوڑی ہوں میں کھالوں گی۔“ وہ ہنس دیتی۔

وہ دونوں ایک دفتر میں جاب کرتے تھے جہاں احسان صاحب ہوا کرتے تھے۔ شام کو واپسی پر تقریباً ایک چکر وہاں کا لگتا تھا اور گھر آتے آتے مغرب ہو جاتی۔

آج اتوار کا دن تھا اور دن بھی بڑا نکھر ہوا تھا، بلکہ نکھری ہوئی شام تھی، جب احسان صاحب اپنے نواسے کے ساتھ لائن میں فٹ بال کھیل رہے تھے۔ اور وہ گلاس وال کے پاس کھڑا مسکراتے ہوئے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔

”یہاں کیوں کھڑے ہو مدثر!“ وہ اس کے پاس آئی اور اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

”محسن کو دیکھ رہا ہوں۔ دیکھو وہ بالکل ٹھیک بال پکڑ رہا ہے وہ کھیل کو سمجھ رہا ہے، وہ نقلی تیزی سے دوڑ بھی رہا ہے۔“

”ہاں تو ماشاء اللہ دھاتی سال کا ہو گیا ہے۔“ وہ مسکرائی اس کی بات پر۔

”ہاں۔۔۔ مگر دیکھو اس میں کوئی کمی نہیں ہے نا۔ قوت مدافعت ٹھیک ہے، ذہن بھی ٹھیک ہے نا۔ میں رات کو اٹھ کر اسے بار بار دیکھتا ہوں، انہیں وہ چھین تو نہیں مار رہا ہے، ڈاکٹر نے اس کی پیدائش سے پہلے کہا تھا کہ ان کی ذہنی حالت کا اثر بچے پر پڑ سکتا ہے۔ صرف ماں نہیں باپ کی فطرت اور ذہنی حالت کا اثر بھی پڑتا ہے مگر خوش نصیبی سے ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ محسن بالکل ٹھیک اور نارمل پیدا ہوا تھا اور اس کی ہر ایک کھوپٹی نارمل بچے جیسی تھی، بلکہ وہ خاصا صحت مند تھا۔ ان کے زیادہ خیال رکھنے کی وجہ سے آج اس کا شمار آج کے ذہین بچوں میں ہوتا تھا۔

”ہم اسے چار سال سے پہلے اسکول میں داخل کر دیاں گے۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

”مجھے ڈو لادیں۔“ وہ بھی گلاس وال سے باہر کی دیکھ رہی تھی۔ جہاں نانا سے نواسا بال چھین کر کھاک رہا تھا۔

”نہیں اب اتنی بھی جلدی نہیں۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

وہ ہنسا تھا اور اس کی ہنسی میں ثانیہ شامل تھی۔ نانا سے نواسا جیت گیا تھا۔

اور گلاس وال کے اس طرف کھڑے بیچ کے ہاں، باپ نے تالیاں بجائی تھیں۔ جواب ان کی طرف دیکھ

رہا تھا۔ جسے دیکھ دیکھ کر مدثر احمد اور ثانیہ مدثر جیتے تھے۔ یہ ان کا محسن تھا، ان کی امید تھا، اور اسی امید پر زندگی کا احساس خوب صورت تھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
بسا بادل	آمنہ ریاض	500/-
ذردوم	راحہ جبین	750/-
زندگی ایک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
حیرے نام کی شہرت	شازیہ چوہدری	250/-
دل ایک شہر چٹوں	آسیہ مرزا	450/-
آنکھوں کا شہر	قائزہ افتخار	500/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	قائزہ افتخار	600/-
پھلاں دے رنگ کالے	قائزہ افتخار	250/-
یہ گلیاں یہ چہ پارے	قائزہ افتخار	300/-
عین سے عورت	غزالہ عزیز	200/-
دل اُسے دھوٹ لایا	آسیہ رزاقی	350/-
بکھرنا چائیں خواب	آسیہ رزاقی	200/-
دھم کو دھمکی سہانی سے	فوزیہ یاسین	250/-
اماؤں کا چاند	ہشامی سعید	200/-
رنگ خوشبو ہوا بادل	افسان آفریدی	500/-
درد کے قافلے	رضیہ جمیل	500/-
آج مگن پرچا نہ نہیں	رضیہ جمیل	200/-
درد کی منزل	رضیہ جمیل	200/-

ناول منکوانے کے لیے نئی کتاب ڈاک خرچ 30/- روپے منکوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32216361

چھٹی اور آخری قسط

چاہتے آئے
برا کیا ہے اگر اس کوہ کے دامن میں چھپ جائیں
جہاں پر جا کے پھر کوئی کبھی۔۔۔ واپس نہیں آتا
چلو اس کوہ پر۔۔۔

بند آنکھوں کے کناروں پر نمکین سیال کے قطرے
اسی انتظار میں تھے کہ وہ پلکیں اٹھائے تو انہیں رہائی
نصیب ہو۔ وہ اس نظم کو گانہیں رہی تھی، محسوس بھی
کر رہی تھی۔ نظم ختم ہوئی اور اس نے آہستگی سے ایر
فون ہاتھ سے پکڑ کر نیچے پہنچ دیے۔ اب وہ تھوڑی
شرمندہ ہو رہی تھی۔ اپنے سامنے میز پر فرائڈش اور
چپس کی پلیٹ سے آگے مہرزی کلائی یہ بندھی گھڑی کا
ڈائل چمکتا نظر آ رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کب سے بیٹھا
تھا۔ راین نظر اٹھانہ سکی۔ وہ خود اپنے لیے گلیا کرتی
تھی اور ابھی یہ سوچ کر اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ
مہرزی نے اسے گاتے ہوئے سن لیا ہے۔ اس نے بنا اس
کی طرف دیکھے خاموشی سے کولڈ ڈرنک کا گلاس اٹھا کر
لبوں سے لگا لیا۔

مہرزی بغور اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا
تھا۔ اس نے پڑھا تھا کہیں۔۔۔ کہ جو لوگ چھوٹی چھوٹی
بے وقوفانہ باتوں پر دل کھول کر ہنستے چلے جاتے ہیں وہ
اندر سے بہت دھبی ہوتے ہیں اور آج راین کو دیکھ
کہ۔۔۔ اس طرح دھبی دیکھ کر وہ بے چین تھا اور۔
مضطرب بھی۔

کیوں بھراتی ہیں اس کی آنکھیں یوں بار بار؟ کیا دکھ
ہے اسے۔۔۔ جو اپنے آنسوؤں کو ہر دم قدموں کے
پچھے چھانے کی کوشش کرتی رہتی ہے؟ وہ مہرزی کے
سامنے اپنی دیر تک ہنستی رہی۔ خوش ہوئی رہی اور
اب۔۔۔ اس کی پلکوں پر گھبرے آنسوؤں کے
قطرے چمک کر اپنی موجودگی کا احساس دلا گئے۔



امایہ خان

پیشہ شہساز

ناولٹ

جوج پوچھو تو ہم تم زندگی بھراتے آئے
ہمیشہ بے یقینی کے خطرے کا پتے آئے
ہمیشہ خوف کے پیراہنوں سے اپنے پیکر ڈھانپتے
آئے
ہمیشہ دوسروں کے سائے میں اک دوسرے کو

وگرنہ اس نے تو بظاہر چھپانے کی بہت کوشش کی تھی۔ کچھ دیر یوں ہی دونوں خاموش بیٹھے رہے اپنی اپنی سوچوں میں غرق۔

”مگر اداس کیوں ہو؟ مجھے بتاؤ پلیز۔“ رائین نے ایک نظر مہرز کے فکر مند چہرے کو دیکھا اور فوراً ہی نظریں ہٹائیں۔ وہ کافی حد تک خود کو سنبھال چکی تھی۔ اس کے رائے زخم پر جو کھڑ جمنے لگا تھا، وہ انہیں کھرچتا نہیں چاہتی تھی۔ اب اسے اپنی زندگی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ خوش رہنا چاہتی تھی۔

مگر اس کے باوجود۔ اسے اپنی حساس طبیعت پر اختیار نہیں تھا۔ کوئی بھی خوشی یا درد کا پہلو ہوتا، وہ اسے دل کی گہرائیوں سے محسوس کرنے میں بالکل بے بس ہو جاتی۔ اسے رونا کیوں آیا تھا؟ معلوم نہیں اور اسے کوئی بہانہ نہیں سوچ رہا تھا کہ اپنی حالت کی کیا توجیہ پیش کرے کہ مہرز کو مطمئن کر سکے۔ اس نے زبردستی مسکرائے کی کوشش کرتے ہوئے سامنے سے ایک فریج فرائز اٹھایا۔ اس کا کنارہ کترتے ہوئے پہلے خواجواہ اوھر اوھر دھکتی رہی اور پھر اچانک ہی۔ اس نے مہرز کی شرت کی طرف انگلی اٹھائی اور کہا۔

”تم اس نیوی بیو شرت میں بہت اچھے لگ رہے ہو۔“ مہرز کو اپنے سوال کے جواب میں اپنی تعریف سننے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اس نے جن نظروں سے رائین کو دیکھا اس سے رائین کو اندازہ ہو گیا کہ دھیان بٹانے کی یہ کوشش رائیگاں ہی گئی ہے۔ وہ پھر بھی اڑی رہی۔

”تمہاری تصویر کھینچوں؟“ وہ ہاتھ میں کیرا اٹھا کر بولی تھی۔ مہرز نے ہلکے سے مسکرا کر شعر بڑھا۔

اس کی عادت وہی ہر بات ادھوری کرنا اور پھر بات کا مفہوم بدلتے رہنا

اور پھر رائین کے ہاتھ سے کیرا لے کر میز پر رکھ دیا۔ ایک تو ایسا حسب حال شعر اور سے فرار کی کوئی راہ نہ پا کر رائین کا موڈ یکدم آف ہو گیا تھا۔ وہ نموشے انداز میں مہرز کو گھورتی ہوئی کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

جانے کس عمر میں جانے گی یہ عادت اس کی روٹھنا غود سے تو اوروں سے اچھے رہتا مہرز کے شعر پڑھنے سے رائین حیران ہوتی دوبارہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی کچھ دیر اسے یوں ہی تکتی رہی اور پھر بس پڑی۔ مہرز بھی کھل کے مسکرا رہا تھا۔

”کمال سے یاد کیے یہ اشعار؟“ اس کا موڈ بہت اچھا ہو گیا تھا۔

”سوچا کبھی تم ملیں تو سناؤں گا تمہیں۔“

”نہیں شاعری سے دلچسپی ہے؟“ اب وہ فنگر نش اٹھا کر اسے ساس میں ڈبو رہی تھی۔ ”میں حیران ہوں تم Giki میں مکینکل انجینئرنگ کر رہے تھے یا اردو ادب میں ایم اے۔“

مہرز نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ چونک کر وہیں خاموش ہو گیا۔ جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا ابھی تک اس نے رائین سے ایسا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ اسکول کے بعد وہ کمال رہا؟ کیا کیا؟ اس نے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ پھر وہ کیسے جانتی تھی کہ مہرز نے Giki سے گریجویشن کیا ہے۔

حیرانی سے رائین کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اتنی حیرت دیکھ کر وہ بھی پوچھ بیٹھی۔

”کیا ہوا۔ تم Giki کے ففٹھ بیچ میں ہی تھے نا۔“

”ہاں۔ لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ اس کا سوال سن کر رائین اطمینان سے مسکرائی اور نشوونما سے اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولی۔

”اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ تم ہی اتنے پاپور ہو کہ جب گوگل سرچ پر میں نے تمہارا نام ٹائپ کیا تو Giki کا بیچ کھل گیا اور ففٹھ بیچ میں مل گئے تھے۔“

وہ ہاتھ جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی اور مہرز کے لیے یہ وضاحت ایک اور دھچکا ثابت ہوئی کہ رائین نے اسے تلاشتا چاہا تھا کیوں؟ اس کے ساتھ چلتے وہ مسلسل یہی سوچتا رہا۔



بس لاٹ میں شٹل کے انتظار میں دونوں بیچ پر بیٹھ گئے۔

”دس نہیں۔ حتیٰ کہ تیس سینڈز بعد مہرز نے سر اٹھایا تو وہ اسی کو دیکھے جا رہی تھی۔ ٹانگہ پر ٹانگہ رکھ کر گھٹنے پر اپنی لمبی ٹکائے ہاتھ کی اوک میں چہرے کو تھامے ہوئے نہایت محویت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم ہمیشہ اسی طرح مسکراتے ہو۔ بالکل بھی نہیں بدلے۔ ابھی تک سوئے ہی ہو۔“

”اچھا؟ یعنی کیا ہوں میں؟“ مہرز نے دلچسپی سے پوچھا۔

”تم بہت اچھے ہو مہرز۔ بہت اچھے۔“ اس کے شجرہ کجے میں ملنے والے جواب پر وہ مسکراتا بھول کر حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔ ”مگر وہ کتنی رہی۔“

”تمہارے لیے دوسروں کو معاف کر دینا کتنا آسان ہے۔ ہر ایک کا گناہ بھول جاتے ہو اور اپنی ذرا سی کوتاہی بھی یاد رکھتے ہو۔“ وہ اسے دیانت داری سے سراہ رہی تھی۔

”ذرا نہ جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میری شکل دیکھنا بھی پسند نہ کرتا۔ اور ایک تم ہو کہ سب کچھ بھلا کر اپنی دوستی نبھانے بیچ جاتے ہو تمہیں غصہ نہیں آتا مجھ پر۔“

”نہیں۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ یہ اس کی بے بسی کا اعتراف تھا۔ جس سے محبت کرتے ہیں اس کی ہر بری بات بھی اچھی لگنے لگتی ہے تو پھر بتا رہی کیسی؟

لیکن رائین اسے مہرز کی فرسٹ لی سمجھ رہی تھی۔

”اسکول ختم ہونے کے بعد۔ میں نے کئی بار تمہیں خواب میں دیکھا مہرز۔ لیکن۔ تم نے بھی مجھ سے بات نہیں کی۔ کبھی بھی نہیں۔ تم ہمیشہ مجھے دور دوری نظر آئے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ضرور تم مجھ سے خفا ہو۔ میں نے تمہارا دل دکھایا تھا نا؟“

”تم نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا جس کے لیے تمہیں

شرمندہ ہونا پڑے۔ غلطی میری تھی مجھے تمہاری بک سنبھال کر رکھنی چاہیے تھی۔“ وہ ہمیشہ کی طرح اسے ہر خلص سے آزاد کرنے کے لیے ایسی باتیں کر رہا تھا اور کسی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔ رائین کے سر سے کچھ بوجھ تو نہامت کا سرگرمی تھا۔

اسی وقت بس آگئی اور دونوں اس میں سوار ہو گئے۔

واؤنا ہوٹل کے پاس شٹل نے انہیں اتار دیا۔ آہستہ آہستہ چلتے وہ دونوں لاجز کی طرف جا رہے تھے۔

رائین کا پاؤں پہلے سے بہتر ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ چلتی رہی تھی۔ اب اس نے مہرز کا ہاتھ نہیں پکڑا تھا۔ لیکن مہرز کو اس کی وجہ سے اپنی رفتار کم رکھنی پڑ رہی تھی۔

پھر آدھے گھنٹے بعد وہ لیبن تک پہنچ گئے۔ لاج کی سیڑھیاں ریڈنگ کے سارے چڑھتی جب وہ ڈیک پر پہنچی تو مہرز اس کے ساتھ چلتا ہو گا لاس ڈور تک آیا۔

اس کی توجہ رائین کے پیر کی جانب تھی جو بظاہر ٹھیک نظر آ رہا تھا۔ تب ہی رائین کی آواز پر مہرز نے چونک کر سامنے دیکھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اس کی آواز میں حیرت تھی اور حیرانی تو مہرز کو بھی ہوئی جب اس نے لاؤنج میں تمام لوگوں کے بیچ رضا کو لیٹ کے سامنے گھٹنے ٹیکے فرش پر بیٹھا دیکھا۔



احسان تیرا ہوگا مجھ پر دل چاہتا ہے وہ کہنے دو مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے مجھے پلوں کی چھاؤں میں رہنے دو

گلی کو تعجب ہوا تھا۔ تیز میوزک کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں رضا کے سب دوست کھڑے ہوئے تھے سب لوگوں کے چروں پر تعجب بڑا سرسرای مسکراہٹ تھی۔ اس نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔ پھر شیشے کے پار ڈیک پر موجود کرسیوں اور میز کو خالی دیکھ کر کرسی کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے اوپن چکن میں اپنا پلاقمند رکھا ہی تھا

لبہ لہراتے حسین بال ہمیشہ کے لئے۔

MEDICAM

SHAMPOO

مہینے بھر کا شیمپو



3 Plus SHAMPOO

SHIKAKAI

ANTI DANDRUFF

AMLA

HERBAL

ANTI-LICE

EGG

KALONJI

لڑتا رہتا تھا۔ اس وقت خوشی سے چلا نکلیں لگا رہا تھا۔
یہاں آنے سے پہلے کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ چار
دن کا ٹرپ ایک سیلیبوشن پر اختتام پذیر ہوگا۔

اس نے لاؤنج میں رکھے بڑے صوفے پر ٹیک لگا کر
اپنے پاؤں بھی اوپر اٹھالے تھے۔ اپنی شال کو نٹنوں
تک ڈال کر رامین نے سکون بھری سانس لی اور مہرزی
طرف دیکھا جوں وی کا ریموٹ ہاتھ میں لیے نہایت
اشہاک سے خبر سن رہا تھا۔

”وہیے میں نے فیس بک پر بھی ڈھونڈنے کی
کوشش کی تھی تمہیں۔ لیکن تم طے ہی نہیں کیا۔ کیا
تم نے فیس بک جو آن نہیں کیا ہے؟“
”جو آن تو کیا ہے۔ لیکن مجھے صرف فرینڈز ہی
ڈھونڈ سکتے ہیں۔ میری سیٹنگ ہی ایسی ہے۔“ اس کی
نظریں لی وی سے ہٹی نہیں تھیں۔

”اپنی سیٹنگ کرو۔ پھر ایڈ کرنا مجھے۔ ویسے تم میرا
نام ٹائپ کر کے دیکھنا۔ میں مل جاؤں گی تمہیں۔“ وہ
تھوڑی دیر سیدھا لٹ کر پھر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”آئی
ایم شیور تم نے مجھے کبھی ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی
ہوگی۔ تمہیں تو سب سے یاد ہی نہیں ہو گا کہ اس دنیا
میں رامین نام کی کوئی مخلوق بھی ہوا کرتی تھی۔ ہے
نا۔“ وہ خود سے تمام نتائج اخذ کر لینے کے بعد رسماً اپنی
تائید چاہ رہی تھی۔

وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس لمحے مہرزی نے
کہنا چاہا کہ وہ اسے کبھی بھول ہی نہیں پایا تو یاد کرنے یا
رکھنے کا کیا سوال؟ جو لڑکی اس کے خوابوں میں رہتی
تھی۔ جس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو اس نے بہت
سنجیدگی سے سنبھال کر رکھا تھا۔ اس سے اپنی عقیدت کا
اظہار وہ ایک جملے میں تو نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ
کہنا پاتا تو بس یہی۔

”تم اتنا نیکیوں کیوں سوچتی ہو؟“
”کیونکہ میں حقیقت پسند ہوں۔“ جھٹ سے
جواب آیا۔ ”مجھے اپنے حوالے سے کوئی خوش فہمی

کہ میوزک بند ہو گیا۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا تو
سامنے رضا ہاتھوں میں ایک خوب صورت نازک سی
کلی تھا۔ کھڑا تھا اور وہیں پس منظر میں اس کی اور
رضا کی فیملی بھی کھڑی تھی۔ لیلیٰ نے اٹھ کر کھوڑا
گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ میوزک بند ہوتے ہی یکدم
چھا جانے والی خاموشی بے حد معنی خیز محسوس ہو رہی
تھی۔ ہر کوئی چپ چاپ کھڑا ہی کی طرف متوجہ تھا
اور پھر۔۔۔ رضا اس کے سامنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔

”Will you marry me“

لیلیٰ کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔
کیسی فکری صورت حال تھی۔ رامین اور مہرزی بھی
حیران تھے۔ وہاں تمام لوگ لیلیٰ کے جواب کے منتظر تھے
اور لیلیٰ گوگل کی طرح کھڑی تھی۔ رضا نے دوبارہ
پوچھا۔ ”لیلیٰ مجھ سے شادی کرو گی؟“
لیلیٰ نے اپنے سامنے زمین پر گھٹنے ٹیکے رضا کو نظر بھر
کر دیکھا۔

”لیلیٰ! جلدی جواب دو پلیز۔ میرے گھٹنے دکھنے
لگے ہیں۔“ رضا نے بڑی تکلیف دہ شکل بنا کر اسے
کچھ بولنے پر اکسانا چاہا۔

لیلیٰ نے تابندہ کواجازت طلب نظروں سے دیکھا تھا۔
۔۔۔ تابندہ اور حیدر دونوں نے مسکراتے ہوئے اثبات
میں سر ہلایا۔ ان کے چہرے خوشی سے تہمتارے تھے
اور یہی حال رضا کے والدین کا بھی تھا۔ لیلیٰ نے ادھر
سے سکتل ملتے ہی رضا کے ہاتھ سے پھول لے کر
”Yes“ کہہ دیا سب لوگ تالیاں بجا کر انہیں
مبارکباد دینے لگے۔

رضا اٹھ کر کھڑا ہوا اور اپنے دوستوں کی ہونٹنگ سن
کر عجیب سی شکل بناتے ہوئے کالوں میں انگلیاں
ٹھونس لیں۔ رامین نے آگے بڑھ کر لیلیٰ کو گلے لگالیا
اور مہرزی نے رضا سے ہاتھ ملا کر مبارکباد دی۔ پھر
دونوں اپنے والدین کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔
انہوں نے باری باری دونوں کو لپٹا کر خوب پیار کیا۔
سب لوگ بہت خوش تھے اور اپنی خوشی کا کھل کر
اظہار بھی کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ فرقان جو ہمیشہ بہن سے

”میں ہے۔“
آخری فقرہ کہتے ہوئے جانے کیوں اس کا لہجہ سخت اور کھردرا سا ہو گیا۔ مہرز نے اس کا تلخ لہجہ محسوس کرنے کے باوجود جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا۔ ”فرقان کہاں چلا گیا؟“

”زندگی ہمیشہ ہمیں سربراہ کرتی رہتی ہے۔ ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ جیسا میرے ساتھ ہوا۔“

لیلیٰ اور راین کیبن کے پچھلے حصے میں بیٹھ کر باتیں کر رہی تھیں۔ نامندہ حیدر اور انکل آنٹی سونے جا چکے تھے۔ اپنے جذبات راین پر عیاں کرنے کے بعد وہ دلی طور پر اس سے اور قریب ہو گئی تھی۔ وہ پھر میں کیا ہوا تھا وہ پوری تفصیل اسے سناتے لگی۔

”اس لمحہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے اپنا وجود مٹی میں رول دیا ہے۔ نادانستگی میں خود کو کافی ڈی گریڈ کر لیا ہے میں نے۔ اب وہ کبھی میری عزت نہیں کرے گا۔ میں کبھی اس سے نظریں ملا نہیں سکوں گی اور دیکھیں کیا ہوا۔“ لیلیٰ کے چہرے پر تسکین بھری مسکراہٹ ابھری۔ پل بھر میں اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔

”اس نے ساری دنیا کے سامنے میری محبت کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ مجھ سے مجھ ہی کو مانگ کر کیسے میری ذات پر میرا یقین پھر سے قائم کر دیا، مجھے کیسے معتبر کر دیا۔ میں نے بھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا کہ رضا مجھ سے یوں اظہار محبت کرے گا۔“

”تم بہت خوش قسمت ہو۔“ راین کو اس پر رشک آنے لگا۔ ”رضا تمہیں بہت چاہتا ہے۔“
”ہاں۔“ لیلیٰ کی آنکھوں میں قدیمیں جھجک رہی تھیں۔ اس نے ایک نظر راین کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”ویسے خوش قسمت تو تم بھی بہت ہو۔“
”کس لحاظ سے؟“

”جس لحاظ سے میں خوش قسمت ہوں۔“
ان دونوں کے سامنے درختوں کے تاریک جھنڈ سے اوپر بارہویں کا مکمل چاند بہت صاف اور روشن

نظر آ رہا تھا۔ لیکن راین کو جانے کیوں وہ زرد سا دکھائی دیا۔ ”شاید میری بینائی کا قصور ہے۔“ اس نے سوچا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر لیلیٰ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”تم میرا موازنہ اپنے ساتھ مت کیا کرو۔ نہ تو میں خوش قسمت ہوں اور نہ ہی اپنی قسمت سے خوش ہوں۔ مجھے تمہاری طرح نوکرے بھر کے محبت نہیں ملی ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی نہیں ہے جو مجھ سے محبت کرنا ہو۔“ اس کی آواز میں نہ دکھ تھا نہ پاپوسی۔

بے تاثر لہجہ میں سپاٹ انداز سے کہا گیا جملہ فوری طور پر لیلیٰ کا خیال تبدیل نہیں کر سکا تھا۔ وہ اپنے موقف پر قائم رہی۔

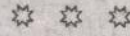
”ہر انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کم از کم ایک ایسا شخص ضرور پیدا کیا ہے جو اس سے بے حد محبت کرتا ہے۔ اس کی تمام برائیوں، بد صورتیوں اور خامیوں کے باوجود۔ وہ اس سے پیار کرتا ہے، اس کی چاہت رکھتا ہے اور اپنی بے لوث محبت سے وہ کبھی دستبردار نہیں ہوتا۔“

راین نے دھیرے سے گردن موڑ کر لیلیٰ کو دیکھا جو انتہائی غصے میں اس کی تردید کر رہی تھی۔
”اللہ نے تمہارے حصے کی محبت انھیں دینے کا پلان بنایا ہو گا۔ اس لیے تمہیں فی الحال اپنی زندگی محبت سے خالی لگ رہی ہے۔ جب وہ ایک شخص تمہیں مل جائے گا۔ جسے اللہ نے صرف تمہیں چاہنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ پھر تمہارے تمام شکوہ شکایت دم توڑ دیں گے۔“

”اللہ نے ایک ایسا شخص بھیجا تھا۔ مگر پھر وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔“ راین کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھلنے لگی۔

لیلیٰ نے مڑ کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے دیا۔ ”میں راین۔ جو تمہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ تمہارا تھا ہی نہیں۔ اسے تم سے کبھی بھی محبت نہیں تھی۔ جو ہم سے محبت کرتا ہے نا اسے ہم لاکھ دھکائیں۔ تب بھی وہ ہمیں تمنا نہیں چھوڑتا۔“ راین بے اختیار رو پڑی تھی۔ لیلیٰ نے اسے گلے

لگایا۔ روتے روتے راین نے کہا تھا۔ ”میں دعا کرتی ہوں تم رضا کے ساتھ ہمیشہ خوش رہو۔“
”اور میری دعا ہے، اللہ محبت پر تمہارا یقین قائم کر دے، ایسا کہ متزلزل نہ ہو۔“



آج صبح دس بجے اس کی نہایت اہم میٹنگ تھی۔ ایک کورین کمپنی ان کے اسٹور میں اپنی الیکٹرونکس پروڈکٹس رکھوانا چاہتی تھی۔ یہ میٹنگ مہرز نے کل رات فون پر کنفرم کی تھی یو سیٹ میں۔ اور پھر وہ رات میں ہی وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے فلائٹ بھی مل گئی تھی۔ جس کی وجہ سے پوری رات خراب ہونے سے بچ گئی اور اسے آرام کرنے کا وقت بھی مل گیا تھا۔ سار کنگ لٹ میں اپنی کار پارک کرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر گھڑی کو دیکھ کر اطمینان کیا۔ وہ بالکل ٹھیک وقت پر یہاں پہنچا تھا۔ لیکن کورین کمپنی کا ڈیپارٹمنٹ اس سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا۔ اسی لمحے جب وہ کار کا دروازہ بند کر رہا تھا اسے اپنے منیجر کا موبائل موصول ہوا اور اس کے قدموں کی رفتار خود بخود تیز ہو گئی۔ اپنے آفس کی طرف جانے ہوئے اس کا فون دوبارہ رنگ دینے لگا۔ اس نے نمبر دیکھے بغیر کال ریسیو کی اور لفٹ میں سوار ہو گیا۔

”راین؟“ مہرز بے یقینی۔ حیرت اور خوشی۔
بیک وقت ان تینوں کیفیات کا شکار ہوا تھا۔
”ہاں میں راین بات کر رہی ہوں۔ کہاں ہو تم؟“
اس نے کہاں غو لبا کھینچ کر ادا کیا تھا جس سے صاف ظاہر ہوا کہ وہ بے چینی سے اس کی منتظر ہے اور اس سے پہلے کہ مہرز جواب دیتا وہ پھر سے بول اٹھی۔
”خیر جہاں بھی ہو فوراً لاج میں آ جاؤ میں نے اتنا زبردست ناشتہ بنایا ہے تمہارے لیے۔“ لفٹ تیسری منزل پر پہنچ کر رک گئی اور مہرز نے اس کی بات ختم

ہوتے ہی کہا۔
”میں نہیں آ سکتا راین! میں یہاں اپنے کام پر واپس آ گیا ہوں اور۔“
”تم واپس چلے گئے ہو؟“ راین کی آواز یک دم دھیمی ہو گئی۔ سارا جوش و خروش جھاک کی طرح بیٹھ گیا۔

”کچھ کئے بغیر؟ مجھ سے ملے بغیر۔ بتائے بغیر۔ تم واپس چلے گئے؟“ راین کو یقین نہیں آ رہا تھا۔
”مجھے بہت ضروری کام تھا راین۔ میں رک نہیں سکتا تھا۔“ مہرز اپنے آفس کی طرف بڑھنے لگا۔
”تو نہ رکتے۔“ وہ غصے میں آئی۔ ”کم از کم بتا سکتے تھے، کچھ کہہ کر تو جا سکتے تھے۔ میں یہاں بے وقوفوں کی طرح انتظار کر رہی ہوں۔ ڈھونڈ رہی ہوں تمہیں۔“
وہ سخت ناراض ہو گئی تھی۔ مہرز کے پاس وضاحت دینے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ اپنے آفس کا دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے راین سے کہا۔
”راین! میں اس وقت تم سے بات نہیں کر سکتا۔“

”تو مت کرو بات۔ مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تم سے بات کرنے کا۔“ راین نے اس کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا اور غصے میں فون بند کر دیا تھا۔ مہرز نے ایک گہری سانس لے کر اپنے فون کی جانب دیکھا اور اسے آف کر کے جیب میں واپس رکھتے ہوئے اپنے آفس میں داخل ہو گیا۔ جہاں کورین ڈیپارٹمنٹ اس کی آمد کا منتظر تھا۔

میٹنگ ڈیوٹ گھنٹہ جاری رہی، اس کے بعد مہماؤں نے اس کے اسٹور کا جائزہ لیا اور اس کا مزید ایک گھنٹہ ان ہی کے ساتھ گزارا تھا۔ وہ پھر کے ڈیوٹ بجے واپس اپنے آفس میں آکر بیٹھے ہوئے اس کے ذہن سے ہر چیز محو ہو گئی تھی۔ اپنا کام، آرڈرز، سلیز، پریزنٹنگ حتیٰ کہ چند گھنٹوں پہلے میٹنگ میں کن شرائط برڈل کی گئی تھی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ راین کی آواز اس کے ذہن و دل کو جکڑے ہوئے۔ بار بار وہ شکوے دہرا رہی تھی۔ اسے کام کر کے تھکن محسوس

نہیں ہوتی تھی۔ کبھی بھی نہیں۔ لیکن آج وہ محض آدھے دن کے بعد ہی خود کو مدھال محسوس کرنے لگا تھا۔

رائین کی ناراضی بالکل بجاتی تھی۔ مہرز کچھ کے بغیر اسے ملے بغیر ہی واپس آگیا تھا۔ اس اچانک واپسی کی وجہ بظاہر وہ مینٹنگ تھی، لیکن یہ جھوٹ وہ دنیا کے سامنے تو پیش کر سکتا تھا۔ خود اپنے رو بہ وہ ایک تلخ حقیقت کے ساتھ پیش ہوا تھا۔ آج بھی رائین کو کسی اور کے ساتھ دیکھنا اسے کسی اور کی ملکیت تصور کرنا۔ اس کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ہے۔

اگلا تمام دن۔۔۔ روشنی ہوئی، خشکی سے منہ پھیرے ایک لڑکی سے نظر ہٹا نہیں پایا تھا، جو اس کے دل میں رہ رہی تھی۔ یوں ہی اپنے میخ کی بات سنتے ہوئے وہ رائین کو منانے کے لیے ذہن میں جملے ترتیب دینے لگ جاتا اور سامنے کھڑا میخ دیواروں کو ساری تفصیلات سے آگاہ کرتا رہتا، جو مہرز سے زیادہ غور سے اس کی بات سن رہی تھیں۔ وہ پورا دن اسی آنکھ پھولی میں گزارا تھا۔ جب مہرز کے دل نے دماغ کو کام نہیں کرنے دیا تھا۔

رات کو اسے ڈنر پر جانا تھا۔ اپنے اسٹور سے نکل کر باہر پارکنگ میں اپنی کار تک جاتے ہوئے اس نے رائین کو فون ملایا اور پھر کنٹیکٹ ہونے سے پہلے ہی کاٹ دیا۔ اس نے سوچا رات کو واپس آکر وہ اس سے اطمینان سے بات کرے گا۔ وہ تین گھنٹوں کی تو بات تھی۔ کار کو ریٹورنٹ کے رستے پر ڈال دیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ واپسی پر بھی وہ رائین کو کال نہیں کیا ہے گا۔

ڈنر کرنے کے بعد جب وہ ریٹورنٹ سے باہر آیا تو اسے ایک کال موصول ہوئی تھی جس نے یک دم اس کا موڈ خوشگوار کر دیا تھا۔ نیو یارک سے آنے والی کال نے اس کے آئندہ چار دنوں کا شیڈول مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جبری کو آنے والے ویک اینڈ کے لیے ہدایات دیتے ہوئے وہ بے حد پر جوش تھا۔

مہرز بہت خوش تھا اور خوش کیوں نہ ہوتا، ایک بہت اہم شخص اس ویک اینڈ اس کے پاس آنے والا تھا۔

مہرز نہایت سنجیدگی سے نظریں سڑک پر جمائے خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ ایر پورٹ پر اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے تو بے اختیار حسن کی آنکھیں جھپک گئی تھیں۔ کچی خوشی آنکھیں نم کر دیا کرتی ہے۔

”کیسا ہے یار؟“ اپنے بچپن کے دوست سے برسوں بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ حال چال پوچھتے مہرز نے اس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلا کر ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ حسن ٹرائی دھکیلے ہوئے ایر پورٹ سے باہر نکل آیا۔ مہرز اسے وہیں رک کر انتظار کرنے کا کہہ کر اپنی کار لائے پارکنگ کی طرف روانہ ہوا۔

”واقت“ اپنے سامنے بلیک اسپورٹس کار کو رکتے اور اس میں سے مہرز کو برآمد ہوتا دیکھ کر حسن بے اختیار کہہ اٹھا۔ ”زبردست گاڑی ہے یار۔“ مہرز نے اس کا چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھا کر پچھلی سیٹ پر رکھ دیا اور حسن سٹائیٹ انداز میں گاڑی پر ہاتھ پھیر کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتا رہا۔

”چلو بیٹھو بھی۔“ مہرز نے حسن سے کہا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ پھر کار اشارت کر کے سڑک پر لے آیا۔

اب تک پیش آنے والے اہم واقعات میں حسن کی شادی اور ایک بیٹے کی پیدائش کی تفصیل سنتے ہوئے وہ خوش دلی سے مسکراتا رہا تھا۔ موڈ تو اس وقت خراب ہوا، جب حسن نے یہ بتایا کہ وہ مہرز کے گھر قیام نہیں کر سکتا۔

حسن جس ملٹی نیشنل کمپنی سے منسلک تھا۔ اس نے یہاں سے کچھ مشینری خریدی تھی۔ جسے آریٹ کرنے کی ٹریننگ لینے کی غرض سے اپنے انجینئرز اور کچھ ورکرز کو کسلی فورنیا بھیجا تھا۔ اس لیے رہائش کا انتظام بھی کمپنی کی طرف سے تھا۔ جس پر مہرز سخت

باپوسی کا شکار ہوا، لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ حسن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا اس کی خواہش تھی۔ بنا کچھ کے ناراضی کا اظہار۔ مہرز کی یہ علوت اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ اس کی بات سن کر جس طرح وہ چپ سا ہو گیا تھا۔ حسن کو وجہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

”یار اب ناراض مت ہو۔ بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا ایسی شکل بنا کر۔“

مہرز نے گردن موڑ کر ایک جتنا ہی نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور دوبارہ سامنے دیکھنے لگا۔ حسن ہنس رہا۔ ”ایمان سے یا۔۔۔ جب ہنہہ تھا ہوتی ہے نا۔۔۔ تو بالکل ایسے ہی دیکھتی ہے مجھے۔ یوں خفا ہو کر تو بالکل پیوی لگ رہا ہے میری۔“

حسن نے انتہائی لاڈ سے مہرز کا گل لہو چاٹو مہرز نے کندھا جھٹک کر اپنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ پرے کیا۔

”میں تمہارا دوست ہوں۔ مجھ سے یوں محبت کے اظہار نہ کرو۔“ مہرز اسٹیرنگ پر ہاتھ جمائے نہایت احتیاط سے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ پھر بھی ہر تھوڑی دیر میں وہ ایک اچھٹی سی نگاہ اس پر ڈال کر اپنے خیالات کا اظہار بھی کر دیتا۔ باتوں میں وقت اور راستہ طے ہونے کا اندازہ نہیں ہوا اور گھر آگیا۔ مہرز نے سر بزلان کے بیچوں بیچ ڈرائیو پر گاڑی کھڑی کی۔ حسن نے باہر نکلے ہوئے ایک اور احسان جتنا ضروری سمجھا۔

”ایک تو میں اپنے گروپ سے ایک دن پہلے تمہارے پاس یہاں آگیا ہوں، کیونکہ مجھے تمہاری یاد نے اس قدر بے چین کر دیا تھا کہ میں انتظار نہیں کر سکا اور دوسرا۔۔۔ میں آج کی رات تمہارے گھر ہی گھروں کا کل سے اپنے گروپ ممبرز کو جوآن کرنا ہے میں نے۔“

”بڑی مہربانی ہے آپ کی۔“ مہرز نے طنزیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور اس کا سوٹ کیس ہاتھ میں لے کر کار لاگ کر دی۔ ”اب یہ بھی بتاؤ کہ اس ڈیڑھ دن میں تمہیں کس طرح وہ ساری جگہیں دکھاؤں۔۔۔ جو میں دکھانا چاہتا ہوں؟ کیا کیا پلانز سوچ رہے تھے میں

نے۔ سب متناہس ہو گیا۔“

”ویسے یہ سن گلاسز بہت سوٹ کر رہے ہیں تم پر۔“ حسن نے بھی حسب عادت بات کو نہیں اور موڑ دیا۔ مہرز نے گہری سانس کھینچ کر اندر لی اور اپنے سن گلاسز اتار کر اسے پکڑا کر بولا۔

”لو۔ تم لے لو۔“ اور سوٹ کیس اٹھا کر داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ حسن اس کے پیچھے چل پڑا۔

”کیا لڑکا عورتوں والے انداز اپنالے ہیں۔ اچھا بات تو سن!“ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر مہرز کا رستہ روکا۔

”دیکھو۔ یہ دو ہفتے شیڈول ذرا ٹائٹ ہے۔ اس کے بعد تمہارے پاس آجاؤں گا۔ پر اس۔“

مہرز کچھ کے بنائے گھورتا رہا۔ حسن اس کے جواب کا منتظر پوری آنکھیں کھولے، عجیب و غریب ایکسپریشن دے رہا تھا۔ مہرز زیادہ دیر سنجیدہ نہیں رہا یا اور مسکراتے لگا تو حسن کی جان میں جان آئی۔

چھ سال پہلے آج ہی کے دن وہ صبح ہی صبح اٹھ بیٹھی تھی۔ اپنے نکل جہنم کے لیے خریدے گئے جوڑے کو اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کتنی بار خود سے لگا کر ہر زاویے سے گھوم کر دیکھا تھا۔ وہ زیور، چوڑیاں، بھوتے۔ ان تمام چیزوں کو اس نے ہاتھوں میں لے کر بے ساختہ چوا تھا۔ وہ اس قدر خوش تھی۔ لیکن چھ سال بعد طلوع ہونے والا سورج اسے عجیب سے دکھ میں مبتلا کر رہا تھا۔ حسب عادت فجر کی نماز کے بعد چپل قدمی کے لیے وہ لان میں آگئی۔ طبیعت بھاری تھی۔ دل پر یادوں کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ زیادہ دیر تک چپل پھر نہیں سکی تھی اور تھک کر گھاس پر بیٹھ گئی تھی۔

حرائیو فر کی فیڈر بنانے کچن میں آئی تو باہر لان میں گھاس پر بیٹھی رائین کو دکھا۔ وہ سر جھکائے سرسبز

گھاس کے باریک ٹکڑوں کو ہاتھ میں نرمی سے۔ پکڑ کر کھینچ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اسی پرانی والی رامین کا چہرہ لگ رہا تھا۔ جس کے لب خاموش اور آنکھیں ماتم کرتی نظر آتی تھیں۔ وہ پریشان ہے۔ حرایہ سوچ کر اپنے آپ کو روک نہ سکی اور فوراً اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔ عین اس کے سامنے ہی وہ بھی گھاس پر اتنی پاتی مار کر بیٹھ گئی لیکن رامین نے اتنی پتلی کے باوجود اس کی آمد کو محسوس نہیں کیا تھا۔

حرائے اس کی انگلیوں کی جانب دیکھا جو مسلسل حرکت میں تھیں۔ وہ سبز گھاس کے سروں پر چند زرد سوکھے ٹکڑوں کو چن چن کر اکٹھا کر رہی تھی۔

”کیا کر رہی ہو؟“ حرائے نے پوچھا تو رامین نے یوں چونک کر اسے دیکھا کہ اسے یقین ہو گیا۔ وہ اب تک واقعی اس کی آمد سے بے خبر ہی تھی۔ وہ خاموش مگر فکر حرا کو دیکھنے لگی۔ حرائے دوبارہ سوال کیا اور زیادہ نرم لہجے میں کہا۔

”میں نے پوچھا۔ کیا کر رہی ہو رامین؟“
”ہوں؟“ وہ تنکے کو چٹا چھوڑ کر سوچنے لگی کہ کیا جواب دے۔ وہ تو اپنے نکاح میں شامل مہمانوں کی صورتیں یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کیا سوچ رہی تھی کیا یاد کر رہی تھی حرا کی دلچسپی کا اس میں کوئی سامان نہ تھا۔ ہونا بھی تو وہ یہ سب باتیں اس سے کہنا نہیں چاہتی تھی۔ کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔
”یہ آپ دیکھیں۔ سبز گھاس کے تنکے سوکھ کر زرد ہو رہے ہیں۔ میں انہیں اکٹھا کر رہی ہوں۔ بد نما لگتے ہیں نا۔“

حرائے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ مبہم سا مسکرائی، پھر کہا۔ ”کچھ دن گھاس کو ٹھیک طرح سے پانی نہیں دیا نا۔ اس لیے سوکھ گئی ہے کچھ جگہوں سے۔ تمہیں انہیں اکٹھا کرنے کے بجائے وقت گزرنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ دیکھنا اچھا ہے۔ چند ماہ میں مناسب دیکھ بھال سے یہ ٹکڑے بڑھ جائیں گے تو زرد سوکھے تنکے اپنے آپ جھڑ جائیں گے۔“

”لیکن۔۔۔ پورا لان ان کی وجہ سے بد صورت لگ رہا ہے۔“ اس نے گھاس میں انگلیاں ڈبو دیں۔
”تمہیں رامین۔۔۔ دور سے دیکھنے پر تو یہ بالکل نظر نہیں آرہے۔ تمہیں اس لیے دکھائی دے رہے ہیں۔ کیونکہ تم سرسبز گھاس کو چھوڑ کر صرف اور صرف ان زرد سوکھے ٹکڑوں پر غور کر رہی ہو۔ ان پر توجہ مت دے۔ گھاس کو پانی دو اور بس وقت گزرنے کا انتظار کر۔ چند ہفتوں بعد تم دیکھو گی تو یہ بد نما جیسے تمہیں کہیں دھونڈے سے بھی نہیں ملیں گے۔“

جائے حرا کی بات کا رامین پر کیا اثر ہوا تھا، وہ گھاس سے نظر ہٹا کر اسے دیکھنے لگی۔ حرائے اپنی بات جاری رکھی۔
”دیکھو رامین۔۔۔ زندگی کی مثال بھی اسی طرح ہے۔ ہم گزر جانے والے برے وقت کی تکلیف وہ یادوں پر بار بار توجہ دے کر زندگی کو بد صورت سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہ ہماری زندگی کا فقط ایک حصہ ہوتے ہیں۔ پوری زندگی نہیں اپنے زخموں کو بھرنے کا وقت دے۔ انہیں بار بار کھرچو مت۔ جو بھی ہوا، تم اسے بدل سکتی ہو، نہ ہی اپنی زندگی سے نکال سکتی ہو۔“
”مگر میں بھولنا چاہتی ہوں۔ میں اتنی کوشش کرتی ہوں آج میں جینے کی۔ پر وہ یادیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں، میں کیا کروں۔“ وہ اب حرا کے سامنے کھل کر بولنا شروع ہوئی تو حرائے اسے کہنے لگا۔

”میں خوش ہونا چاہتی ہوں۔ پر یادیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ مجھے خوش نہیں ہونے دے رہیں۔ میں کیا کروں؟ میں چاہتی ہوں میرے ساتھ کچھ ایسا ہو جائے کہ میں سب کچھ بھول جاؤں۔ میں نے سوچا تھا ملا کے مرنے کے بعد۔“ اس کے گلے میں اگلے آنسوؤں کے گولے نے اس کی آواز بھاری کر دی، ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنے آنسو اندر اتار لیے۔ ”سوچا تھا ملا کے مرنے کے بعد میری زندگی بدل جائے گی۔ بھائی سے مل کر۔ یہاں آکر میں سب کچھ بھول جاؤں گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔“

میرا زہن ہر گزری بات کو دن میں سو سو بار دہراتا ہے۔ کیوں؟ اس نے سوچا کہ ہر اپنے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ ”ہمارے دماغ میں کوئی ڈیلیٹ بٹن کیوں نہیں ہوتا بھائی۔“

”ہوتا ہے رامین۔“
”میرے پاس تو نہیں ہے۔“ اس نے بے بسی سے کہتے ہوئے سر جھکا لیا۔

”ہے۔ بس تم اسے دیکھ نہیں پا رہے۔“
حرائے محبت سے دلا سے سمجھائی رہی۔ دلا سے دیتی رہی، اس کے بر غلوص رویے کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا اس پر اور اس نے تسہ کر لیا۔ وہ آج کا پورا دن ٹس کر خوش رہ کر گزارے گی۔ آج کے اہم دن کو ایک نیا حوالہ دے گی۔ ایک نیا کام کرے گی جو اس نے پہلے نہ کیا ہو اور پھر۔ ہر آنے والے سال میں اس دن کو اسی حوالے سے یاد کرے گی۔

اپنی اسی حکمت عملی پر عمل کرتی وہ آج بالکل اکیلی ڈنڈی لینڈ کاؤنٹ کرنے آئی تھی۔ وہاں مہربن کو دیکھ کر اسے پہلے حیرت ہوئی، پھر شدید غصہ آیا تھا۔ اگر وہ تھا، ہوتی تھی۔ کم از کم مہربن کو منانے کی کوشش تو کرنی چاہیے تھی۔ لیکن اس نے فون کیا نہ ہی کسی قسم کی وضاحت دی تھی۔ یوں اتفاقاً سامنا ہو جانے پر بھی مہربن کا رویہ سرد مہمی لیے ہوئے تھا۔ مگر اس کے ساتھ جو شخص موجود تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس کے پاس آیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ شخص دوبارہ دوڑتے ہوئے اس کے سامنے آکر اہوا۔

”رامین عید۔“ ایک اجنبی مرد کے منہ سے اپنا نام سن کر حیرت زدہ کھڑی تھی۔
”السلام علیکم رامین عید! کچھ خیریت سے ہیں آپ؟“ حسن نے تکلفی کی انتہا پہنچا ہوا تھا۔
”آہم سوری، مگر میں آپ کو پہچان نہیں پا رہی ہوں۔ کیا آپ اپنا تعارف کروائیں گے۔“ اس کا لہجہ محتاط تھا۔

”اتنی آسانی سے نہیں۔ جناب آپ کچھ محنت وغیرہ کریں، دماغ پر زور ڈالیں۔ اچھا ایسا کرتے ہیں

آپ کو مہلت دیتے ہیں۔ اگر اس آخری شوکیس کے پاس پہنچنے تک آپ کو یاد آ گیا کہ میں کون ہوں؟ تو آپ جیت گئیں۔ ورنہ دوسری صورت میں آپ کو آکس کریم کھلانی پڑے گی۔“

”ہکسکیوڑی۔“ رامین نے آنکھیں کھینچ کر حسن کو بے زاری سے دیکھا۔ ”مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس قسم کی شرطوں میں۔ آپ اپنے دوست کے ساتھ اپنی سیر مکمل کریں اور گھر جائیں۔“ اتنا کہہ کر وہ تیز قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگی اور پھر پھرتا سے باہر نکل گئی۔

”لو جی۔ یہ تو ناراض ہو گئیں۔“ حسن کا منہ لٹک گیا۔ اس کی شکل دیکھ کر مہربن کو ہنسی آگئی تھی۔

”منہ سے۔ یہ میرا پاسپورٹ ہے۔ آپ چاہیں تو چیک کر سکتی ہیں۔ میرا نام حسن چوہدری ہے۔ میں آپ کے ساتھ اسکول میں تھا۔ مجھے معاف کر دیں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں نے دائرہ رکھ لی۔ یونیفارم بھی نہیں پہنا اور آپ سے پہچاننے کا مطالبہ کر دیا۔ آکس کریم بھی مانگ لی۔ آئندہ ایسے نہیں کروں گا۔ آپ۔“

”حسن تم۔“ وہ جو اسے جھاڑنے کا پکا ارادہ کر چکی تھی۔ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اسے لوگ دیا۔ ”پہلے نہیں بتا سکتے تھے اسٹوپ!“
”کیسی ہو؟“ حسن اس کا خوشگوار موڈ دیکھ کر دوبارہ حال چال پوچھنے لگا۔

”میں ٹھیک ہوں اور تم۔ یہاں۔۔۔ کب آئے؟“ مہربن نے تو ذکر ہی نہیں کیا تھا کہ تم سے کوئی رابطہ بھی ہے اس کا۔ حسن اور رامین نے بیک وقت مہربن کی جانب دیکھا جو چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ان کی گفتگو سننے پر ہاتھ باندھے سن رہا تھا۔ توجہ پا کر چلتا ہوا نزدیک آ گیا۔

”ویسے اب تو میں تمہیں ضرور آکس کریم کھلاؤں گی۔“ رامین اپنے پرس سے پیسے نکالتے ہوئے بولی تھی۔ ”لیکن لے کر تم آؤ گے۔ بے میں کروں گی۔“ منظور۔ ”رامین نے چند ڈالر حسن کی طرف

پڑھائے تو وہ بدک کر پیچھے ہٹا۔ ”مجھے تو معاف ہی رکھو۔“

”ارے لاوٹا۔ بھائی نہیں ہو؟“ راین کی ریکونسٹ بے اثر رہی۔ حسن نے مہرز کو پکڑ کر آگے کر دیا۔

”بالکل نہیں۔ میں نہیں جاؤں گا۔ تم ایسا کرو مہرز کو بھائی بنالو۔“ اس سے پہلے کہ راین کچھ کہتی مہرز نے حسن کو آٹھ دیا۔ ”شٹ اپ۔“

اس کاموڈ بڑا دیکھ کر حسن نے بات سنبھالنے کی غرض سے فوراً ہی راین کے ہاتھ سے پیسے لے لیے۔ ”اچھا لاؤ۔۔۔ میں لے کر آتا ہوں۔ مہرز! تم کون سا فلیور لوگے؟“

”کافی لے آتا مہرز کے لیے۔“ اس کے بجائے راین نے جواب دیا تھا۔ حسن نے راین کی پسند پوچھی تو مہرز نے کہا۔

”چاکلیٹ فلیور اور الگ سے کپ میں روٹلڈ آلمنڈز لے کر آنا۔“ راین چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ اچھے بچوں کی طرح سر ہلاتا حسن آرڈر لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

یوں اچانک ملاقات سے راین کاموڈ ہشاش بشاش ہو گیا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے پلٹ کر مہرز کو دیکھا جو نہایت سنجیدہ صورت بنائے دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال کر کھڑا اپنے جوتے دیکھ رہا تھا جس کی نوک زمین پر آڑی سیدھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ راین کے مسکراتے لب سکڑنے لگے۔ آہستہ آہستہ چلتی وہ اس کے نزدیک آنکھی ہوئی۔

”میری شکل کیا اتنی بری ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھنا بھی نہیں چاہتے؟“

مہرز سنبھل کر سیدھا کھڑا ہوا۔ ایک مہر سانس لے کر راین کے ناراض چہرے پر بھرپور نگاہ ڈالی اور کہا۔ ”السلام علیکم“

”وعلیکم السلام۔ ویسے خدا حافظ کتنا بھی اتنا ہی آسان ہوتا ہے۔“ راین نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی اور نہ ہی جتانے میں تاخیر سے کام لیا۔ مہرز

اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی خاموشی نے راین کو مزید پتا دیا۔

”مجھے تم سے یہ توقع ہرگز نہیں تھی۔ بہت ہرٹ کیا ہے تمہاری اس حرکت نے مجھے۔“ اس کی آواز میں گمراہک جاگزیں تھا۔

”آہم سوری۔“ مہرز وہ کہہ گیا جو اس نے نہ کہنے کا ارادہ کیا تھا گھر اس میں کون سی نئی بات تھی۔ راین یوں ہی اسے بے اختیار کھڑا کر رہی تھی۔ ”مجھے تم سے مل کر واپس آنا چاہیے تھا۔ میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔“

”یہ تو تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ آج اتفاق سے میں تمہارے سامنے آئی ہوں۔ ورنہ اتنے دن گزرنے کے باوجود تمہیں خیال نہیں آیا تھا کہ تمہیں اپنے اس عمل کی وضاحت کرنی چاہیے۔ جبکہ تم جان چکے تھے کہ میں ناراض ہوں۔ تم نے مجھے کل بیک تک نہیں کی۔ اس کا صاف صاف مطلب تو یہی نکلتا ہے کہ تم یہ سب کچھ جان بوجھ کر کر رہے تھے۔ نہایت نپے تلے انداز میں وہ اس کے گریز پر شکوہ کنال تھی۔

”میری میننگ تھی راین۔ بہت مصروف تھا میں۔“ مصاحبت کی کمزوری کو شش راین کے طوفانی غصے نے ناکام بنا دیا۔

”میننگ ختم بھی ہوئی تھی مہرز! اب تک چل رہی ہے؟ تم صاف صاف کیوں نہیں کہتے تم یہ دوستی توڑنا چاہتے ہو۔“

”تھک ہے۔ یہی سمجھ لو۔“ مہرز نے قطعی انداز میں اس کے شک کی تصدیق کر دی۔

”میں کیوں سمجھوں؟ تم اپنے منہ سے ایک بار کہہ دو۔ دوبارہ شکل نہیں دکھاؤں گی تمہیں۔“ وہ جھاگ کی طرح بیٹھی تھی۔

”میں ایکسکسکوز کرتا ہوں تم ایکسپیٹ نہیں کرتیں۔ وضاحت کروں تمہیں یقین نہیں آتا۔ میں کیا کروں تم بتاؤ؟ میں تم سے دور جانا نہیں چاہتا۔ تمہیں انور نہیں کر سکتا۔ میں یہ دوستی ختم نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟ یہ واحد رشتہ ہے

جو میں زندگی بھر قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ ہرگز اس سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ چاہوں بھی تو بھی نہیں۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے بلویو۔“

خود سے کیے تمام وعدے بھلا کر وہ راین کے سامنے اپنی بے بسی کا اعتراف کر بیٹھا اور اس کے لہجے کی چٹائی راین کے ذہن و دل سے ہرید گمانی یکشت ختم کر گئی تھی۔ پر اس کا وہ اس مدھم لہجہ شکست خوردہ انداز دیکھ کر وہ اس کے لیے پریشان ہوئی۔

”آئی بلویو۔“ اس نے فوراً کہا جو یقین دہانی اس نے مانگی تھی۔ مہرز دے چکا تھا۔

وہ زبردستی مسکرایا تھا۔ راین اس کے اچھے موڈ کا اطمینان پاکر حسن کی طرف چل پڑی جو تین آکس کریم کونز کیوں بشکل اٹھا کر چل رہا تھا۔ جسے ابھی گراوے گا۔ مہرز وہیں کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ اپنے آپ سے بری طرح ہار اٹھا۔

”تاہمہ آئی نے تو راین کو زبردستی یہاں بٹھایا ہے۔ مگر یہاں کس خوشی میں فارغ ہو چکی ہو۔ جاؤ اہلپ کر آؤ آئی کی۔“

تاہمہ بچن میں کباہوں کا مسالا تیار کر رہی تھیں۔ رضا کے چہرے پر شرارت تھی۔ راین اپنی مسکراہٹ دبا کر پھر سے مصروف ہو گئی تھی۔ مگر کیلی چڑھ گئی تھی۔

”ماما نے خود مجھے بھیجا ہے یہاں۔“ مہرزوں سے میرے ہاتھ جلتے ہیں۔ مسالا نہیں لگا سکتی میں۔“

”ارے ہاں۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ بہت نازک ہیں تمہارے ہاتھ۔ لاؤ دکھاؤ ذرا۔“

اس نے فوراً ”کیلی“ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس بے تکلفی کا خزانہ بھی فوراً ہی جھلکتا پڑ گیا۔ ”کیلی“ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر زور سے مارا۔ ”زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

مہرز اسی دم روانہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

مسالا اچھی طرح مکس ہو گیا تھا۔ تاہمہ۔ ہاتھ دھونے کے لیے سنک کی طرف بڑھی تھیں کہ بچن

کاؤنٹر پر رکھان کا پنڈیک لنگٹا لگا۔

”کوئی بچہ میرے پنڈیک سے موبائل نکال دے گا بلویو۔“

انہوں نے لاؤنج کی طرف منہ کر کے مدد کی درخواست کی۔ مہرز فوراً آگے بڑھا اور ان کا پنڈیک اٹھا کر ان کے پاس لے آیا۔

”بیٹا! موبائل نکال دو۔ میرے ہاتھ مسالے والے ہو رہے ہیں۔“ مہرز نے جی کہہ کر ان کے بیک سے فون نکال کر ان کے سامنے کیا تو وہ ہاتھوں پر صابن ملتے ملتے راین سے مخاطب ہوئیں۔

”ارے راین۔ تمہارے پاؤں گاڑ کا فون ہے۔ دوپہر سے پچاس کالیں کر چکا ہے۔ خدا کے لیے اس سے بات کر لو، ناکہ تسلی ہو جائے کہ تم خیر خیریت سے ہو۔“ پلینر بیٹا۔ راین کو دے دو۔“

انہوں نے آخری جملہ مہرز سے کہا تھا۔ اس نے خاموشی سے موبائل راین کو پکڑا دیا۔ جو پہلے ہی خالہ کی بات سن کر صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اس کے ہاتھ سے فون پکڑتے ہی اس نے سیل فون کان سے لگایا۔ جانے کیوں مہرز کا دل ڈوب سا گیا۔ راین کے خوشی سے تھمتاتے چہرے کو بغور دیکھتا وہ اس کی گفتگو بھی بے حد دھیان سے سن رہا تھا۔ جو یقیناً ”کسی دل عزیز ہستی کے ساتھ جاری تھی۔ جسے وہ بار بار اپنی خیریت کا یقین دلا رہی تھی۔“

”جی ہاں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ بے اختیار ہنستے ہوئے اس نے کہا۔ ”اب مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اس لیے پریشان ہو جاتے ہیں۔ اب تسلی ہو گئی آپ کو؟ ہاں وہ میرے ہاتھ میں کبیرا تھا۔ اس لیے پنڈیک خالہ کے پاس چھوڑ دیا تھا۔

”آہم سوری۔ اب ایسا نہیں ہو گا۔ میں دھیان رکھوں گی۔“ پلینر تھوڑا سا سانس دیں۔“ وہ بڑے لاؤ سے منارہی تھی۔

”اب میری پرس سے تو بات کروادیں۔“ راین فون پر اپنی منہ بولی تھی کہ اسے کسی کے ہونے یا نہ ہونے کا بالکل احساس نہیں ہوا۔ دوسری طرف سے

سنائی دیتی چکار اسے اندر تک سرشار کر گئی۔
”میری گڑیا۔ میرا بے بند۔ میری پرس کیسی ہو؟ آئی مس یو سوچ۔“ اس نے شدت جذبات میں آکرفن پر ہی پیار بھیجا تھا۔

محبت کے اس والمانہ اظہار نے مرز کو واپس حقیقت کی دنیا میں لاٹھا تھا۔ وہ کیسے بھول گیا کہ راین شادی شدہ ہے۔ اس کی ایک بیٹی ہے۔ وہ تو اسے دیکھ چکا تھا راین کی گود میں۔ اس دن رضا کے گھر۔ پھر وہ کیسے بھول گیا؟

اپنے آپ پر افسوس کرتا وہ کہیں سے باہر آیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے ایک نظر راین کو دیکھا جو ابھی تک فون پر مصروف تھی۔ وہ اس وقت بھی اس کی زندگی میں نہیں تھا۔ جب ہو سکتا تھا تو پھر آج کس طرح وہ اپنی جگہ بنا سکتا ہے۔ راین کو تو شاید کبھی بھی اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ یہ خود اس کی چاہ تھی جو ہمیشہ اسے راین کے قریب لے جاتی رہی۔

سیل فون پر آنے والے مسیج نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ کہیں سے بہت دور درختوں کے زرد پتوں کو چلتا بے خیالی میں چلتا ہوں وہ ٹھنک کر رکا اور جیب سے فون نکال کر مسیج پڑھنے لگا۔ پیغام بھیجنے والے کو یقیناً ”احساس نہیں تھا کہ اس نے مرز پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ جواب بھیجتے ہی وہ تیز قدموں سے واپس ہو کر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ماضی کے گرداب سے نکلنے کی واحد صورت یہی تھی کہ وہ ہستی ناؤ میں سوار ہو جائے۔ فی الوقت اسے فرار چاہیے تھا۔ بہانہ کوئی بھی ہوتا اسے دور جانا ہی تھا۔ سزا بھی دینا بھی خود کو۔ بے اختیار وہ راین کے اس قدر نزدیک آ گیا تھا۔ اسے خود سے شرمندگی تھی۔ ملال تھا، پچھتاوا تھا۔ غلطی اس کی تھی۔ سزا بھی اسے ہی ملنی چاہیے۔ یوں کسی سے کچھ کے بغیر اس نے واپسی کا سفر اختیار کر لیا۔ حال میں واپسی کا۔



سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں

لیکن اس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں بھول جاتے ہیں کسی کو مگر ایسا بھی نہیں یاد کرتے ہیں کسی کو، مگر اتنا بھی نہیں ایک مدت سے تیری یاد بھی آئی نہ ہمیں اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں لیکن اس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں محض سات دن بعد راین کو اپنے سامنے دیکھ کر خود سے کیے تمام عذر ریت کی دیوار ثابت ہوئے تھے۔ وہ اپنے آپ سے ہار گیا تھا۔ اپنی محبت سے ہار گیا تھا اور یہ شکست اسے ہمیشہ کی طرح سرخو کر گئی۔ اسے اپنی محبت کی پائیداری پر فخر محسوس ہوا تھا۔

آج وہ جان گیا تھا راین سے متعلق اس کے جذبے بھی ماند نہیں پڑنے والے۔ چاہے کچھ حاصل ہو یا نہ ہو۔

وہ عمر بھر اسے اول روز کی طرح چاہے گا۔ وہ کبھی اس کا دل نہیں توڑ سکتا۔ اسے دیکھی نہیں دیکھ سکتا۔ چاہے اس کے لیے وہ خود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے، ٹوٹ جائے، ختم ہو جائے، حسن سے ہنس کر ہنس کر باتیں کرتی راین کو محبت سے تکتے ہوئے وہ ادراک کی کئی منزلیں طے کرنا چاہا گیا۔

چھوٹی اینٹوں سے بنے فرش کے کنارے پتھر لے فٹ پاتھ پر سازندے جاز کی دھن بجا رہے تھے۔ آؤٹ ڈور ریستورنس سے آئی فریج کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو لوگوں کی بھوک میں اضافہ کرتی انہیں اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ شام ڈھل رہی تھی اور ماحول کی روانیت نہایت اثر انگیز تھی۔

مرز نے لیمن ایڈ کے تین گلاس خریدے، تینوں اس سڑک کے آخری سرے پر موجود ایک قدیم طرز کی عمارت کے سامنے پہنچ گئے جس کے گیٹ کی ستون پر ”ہاؤسٹل مینشن“ کے الفاظ درج تھے۔

”یہ رائیڈ بہت خوف ناک ہے۔ ایسا کرو تم دونوں چلے جاؤ میں باہر ہی وینٹ کرتی ہوں۔“

”دونوں۔ اب ساتھ یہاں تک آگئی ہو تو اندر

بھی چلو۔ اتنے سارے لوگ ہیں ڈرنے کی کیا بات ہے؟“
”اتنے سارے لوگوں کے ساتھ بھی ڈرتی ہو۔“
”اتنے سارے لوگ؟“

”جہاڑی فیملی۔“ مرز کے حلق میں لیمن ایڈ اٹکنے لگا۔ ”جہاڑی کے پاس اتنی فرصت تھوڑی ہوتی ہے کہ ہر جگہ ساتھ لے کر جاؤں۔ ویسے میں اپنی بھابی اور بیٹی کے ساتھ ہی آتی ہوں ہمیشہ۔ بس آج ایک چلی آئی۔“

”میں تمہارے ہنر مند کی بات کر رہا تھا۔“
”تم زین کو کیسے جانتے ہو۔“ اس نے دیکھا۔ وہ حیران بھی تھی اور تجسس بھی، لیکن لہجہ کچھ پیشان سا تھا۔

”میں نہیں جانتا۔“ اس نے فوراً کہا۔ ”یو سیمٹی میں تمہارے لیے فون آیا تھا۔ میں نے دیا تھا تمہیں۔“

”زین کا فون؟“ اور پھر وہ ساری کمائی سمجھ گئی، مرز کو غلط فہمی ہوئی تھی۔
”جہاڑی کا فون تھا۔ انہی کی بیٹی سے بلت ہوئی تھی میری۔“

”جہاڑی ویسے کیا کرتے ہیں تمہارے شوہر؟“ مرز نے پتا نہیں کہاں سے اتنی جرات اکٹھی کر لی یہ سوال کرنے کی۔

”میری شادی نہیں ہوئی۔“ راین سر جھکائے کیونکہ طرف واپس آتے ہوئے بولی۔ اس کا سر مزید جھک گیا ”صرف نکل جوا تھا۔ وہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ ہفتے بعد۔“

اس نے سنا اور وہیں ٹھہر گیا راین نے ٹھنک کر اس کا رونا بھی محسوس کر لیا تھا۔ اسے انتظار رہا کہ مرز کچھ کہے مگر وہ خاموش کھڑا اسے بس دیکھ جارا تھا۔

وہ کیا کہتا۔ اس کے اندر تو ہماری خاموشی چھا گئی تھی۔ کتنا رونا تھا وہ اس رات۔ اپنے رب کے آگے سر بسجود ہو کر کیسے گزر کر اس نے راین کو اپنے لیے مانگا تھا۔ کتنی شدت سے اس نے چاہا تھا وہ شخص اسے

چھوڑ کر چلا جائے۔ اور ایسا ہو گیا تھا۔ اس کی دعا قبول ہو گئی تھی۔ اور یہ اسے آج معلوم ہو رہا تھا۔ اتنے سالوں بعد۔

اتنے سارے دن گزر جانے کے بعد اسے پتا چل رہا تھا وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ کیا محسوس کرے۔ راین کے لیے افسوس کرے، جسے یہ دکھ اٹھانا پڑا۔ یا اپنے لیے خوشی محسوس کرے کہ اب وہ اسے پاس لے سکتا ہے۔

”زین نے رخصتی سے پہلے ہی ڈاکو رس دے دی تھی مجھے۔“ راین نے جیسے پہاڑ کو دھلیلا تھا۔ بہت تکلیف ہو رہی تھی اسے یہ سب کہنے میں۔
”کیوں۔ کیوں کیا اس نے ایسا؟“

وہ جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ جواب دینے کے لیے اسے یاد کرنا پڑتا۔ ذہن میں ہر اذیت ناک لمحہ۔ جس سے وہ گزر گئی تھی، پر شاید وہ تکلیف نہیں گزری تھی۔

آج کا دن وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ سوز و غم مسکرا کر اس نے مرز کے مقابل آتے ہوئے لاہرو انداز میں کہا۔ ”میرا خیال ہے میں اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔“ اتنا کہہ کر وہ بلاوجہ ہنسے لگی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ مرز اس کی روح میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ اس سے کچھ نہیں چھپا سکتی۔
”تم اسے اچھی نہیں لگتی تھیں؟“ اس نے تم پر خاصا زور دیتے ہوئے پھر کیا ”اندھا تھا کیا؟“

”نہیں۔“ ایک بار پھر بلاوجہ کی کھلکھلا ہٹ۔ ”اندھی تو میں ہوں۔ ایک آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا مجھے یہ دیکھو!“ اس نے بچوں کے بل ایک کر مرز کو اپنی باتیں آنکھ پوری طرح کھول کر دکھانے کی کوشش کی۔

”مذاق مت کرو۔“ مرز خود ہی تھوڑا سا ہنسنے لگا۔
”میں مذاق نہیں کر رہی۔ دیکھو! غور سے میری آنکھوں میں۔“

”میں فرق پتا چلے گا۔“ اسی وقت حسن نے مرز کو ہاتھ ہلا کر اندر جانی کیوں واپس

آنے کے لیے آواز دی۔
 ”چلو۔“ میرز نے پہلے اسے آگے بڑھنے کے لیے کہا تو رامین نے بری سی شکل بنالی۔
 ”مجھے نہیں جانا تا۔ بس میں اس ہاتھ سے گزر کر دوسری طرف سے نکل جاؤں گی۔“ مینشن کے اندر نہیں جاؤں گی۔“ وہ کسی بچے کی طرح ضد پر اڑ گئی تھی۔ میرز نے بڑے اطمینان سے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر زمین پر قدم جماتے ہوئے اسے وارننگ دی۔
 ”اگر تم ساتھ نہیں چلو گی تو میں بھی یہاں سے نہیں ہلوں گا سمجھیں!“ وہ کچھ دیر تو اسے کھورتی رہی جسے اس کی ثابت قدمی کا اندازہ کر رہی ہو۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ واقعی اکیلے نہیں جانے والا تو تھوڑا جھلاتے مگر مسکراتے ہوئے وہ پیر پختی آگے جاتی کیو میں شامل ہو گئی۔

کیولین سے باہر آکر حسن، رامین اور میرز کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے سامنے ہی چند ستونوں پر ان افراد کے Statue busts تھے جو مینشن میں براسر اسر طور پر ہلاک ہو گئے تھے۔ ان ستونوں پر کندہ تحریر ان افراد کی موت کی وجہ عجیب پہلی کی صورت میں ظاہر کر رہی تھیں۔ وہ باری باری ہر ستون کو بغور دیکھتا زیر لب دہرا رہا تھا، انکل جیکب کے ستون پر لکھی آخر سطر۔

”Now try to discover Who killed who“
 (یہ بتانے کی کوشش کریں، کس نے کس کو مارا؟) پڑھ کر وہ ٹھنک گیا۔
 ”میں۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی؟“ حسن، رامین کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اب ہمیں کیسے پتا چلے گا، کس نے کس کو مارا؟“

”اندر ان تمام افراد کی رو میں گھوم رہی ہیں، ان سے پوچھ لینا۔ چلو چلو۔“ رامین مزے سے کہتی آگے بڑھ گئی۔
 گزرگاہ کے بچ کھڑی چھوٹی سی دیوار کے چاروں اطراف میوزیکل۔ انسٹرومنٹس ریلیف نظر آرہے

تھے۔
 رامین اور حسن جس انسٹرومنٹ پر ہاتھ سے دیوار ڈالتے وہ دھن بکھیرنے لگا۔ چند منٹ تک وہ دونوں لطف اندوز ہوتے رہے۔
 مینشن کے داخلی دروازے کو پار کر کے ایک بہشت پہلو کمرے میں داخل ہو گئے۔ جس کی دیواروں پر بڑی بڑی پورٹریٹس آویزاں تھیں۔ پورٹریٹس کے نیچے جلتی بجھتی لو سے مدھم مدھم روشنی پیدا کرتی موم بقیان جھلکا رہی تھیں۔ ان کے اندر پختہ ہی دروازہ بند ہو گیا اور ایک خوفناک آواز سنائی دی۔

”اس مینشن سے باہر جانے کے تمام راستے بند کیے جا چکے ہیں۔ نہ کوئی کھڑکی، نہ ہی دروازہ ہے۔“
 اس کے بعد ایک زوردار قہقہہ کے ساتھ ہی کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ تمام روشنیوں یکدم بجھ گئیں۔ چھت غائب ہوئی اور بادلوں کی زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ جیسے بجلی کو بند گئی۔ اس بل بھر کی چمک میں اپنے سروں پر تمام لوگوں کو چھت سے ٹکڑا ڈھانچہ نظر آیا اور کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی چیخ سنائی دی۔
 ”ہائے امی۔“ حسن اچھل کر پاس کھڑے میرز سے لپٹ گیا۔

میرز بری طرح جھنجھلایا اور اسے برے ہٹاکر رامین کی طرف دیکھا۔ اسی وقت لائٹ واپس آ گئی۔ میرز نے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے کھڑی رامین کو مسکرا کر دیکھا۔ یقیناً ”اس نے بہت پہلے ہی یہ حفاظتی اقدامات کر لیے تھے۔ وہ آنکھیں سختی سے بند کیے ہوئے تھی۔ تیز روشنی کے احساس ہونے پر اس نے پہلے ایک آنکھ کھول کر دیکھا، پھر دونوں آنکھیں کھول دیں۔ میرز نے اس کے کان میں ٹھنسی انگلی کو پکڑ کر مایا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کمرے کا دروازہ خود بخود کھل گیا اور سب لوگ ایک ایک کر کے مینشن میں داخل ہونے لگے۔

میرز کے ہاتھ میں رامین کا لڑتا ہاتھ اس کے ڈر کو ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے ہلکا سا دباؤ بڑھاتے ہوئے اپنی گرفت مضبوط کی۔ گیلری کے باہر رائیڈ کے لیے ڈوم

بگڑ ٹریک پر ایک لائن میں آگے آتی جاری تھیں۔ جس میں بیک وقت وہی لوگ بیٹھ سکتے تھے۔ میرز اور رامین ایک ساتھ بیٹھنے لگے تو حسن، چکر میرز کو اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بدلے لینے کا ڈر اور تانے ایک انگریز عورت کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔
 ڈوم بگھی میں بیٹھے ہوئے رامین نے آہستگی سے اپنا ہاتھ میرز کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ اس بھوت کی آواز یہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ڈوم بگھی گراؤنڈ فلور پر پہنچی جہاں بھوتوں کی برتھ ڈے پارٹی منائی جا رہی تھی۔ ایک طویل ڈانکنگ ٹیبل کے گرد چمکتی رو میں ناچتی گانی، جن کے آپار دیکھا جاسکتا تھا، خوشیاں منا رہی تھیں۔

”شکر ہے انہوں نے ہمیں انوائٹ نہیں کیا۔“
 رامین نے جھڑپ جھڑپ کر کے میرز سے کہا۔
 ”اگر کر لیتیں تو میں ضرور جاتا ہوں۔“ میرز نے میز کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور وہ جو سب سے حسین روح بیٹھی ہے ایک کے سامنے۔ اس کے ساتھ ڈانس کرتا۔“

”تو اب چلے جاؤ۔ نوٹیشن کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔“ رامین نے جل کر جواب دیا اور وہ مسکرا کر سامنے دیکھنے لگا۔

ایک جھٹکا کھاکر ڈوم بگھی قبرستان میں داخل ہو گئی۔ جہاں بے شمار قبروں کے گرد بھاڑ جھنکار بکھرا پڑا تھا۔ کمرہ صورت آسیب کتوں کے پیچھے سے اچانک برآمد ہوتے پھر ہوا میں تحلیل ہو جاتے۔ صدیوں پہلے مرنے والوں کو آج ہی قبر بھاڑنے کا خیال آیا تھا۔ ایک کے بعد ایک مردہ قہقہے لگا لگا۔ گیت گاتا برآمد ہونے لگا۔ وہ ایک خاص تر اسراریت جو شروع سے اس بھوت بنگلہ کا ماحول اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ پوری طرح بے نقاب ہو کر سب کو پیچھے رہ مجبور کر دیا تھا۔ بھوتوں کے ساتھ زندوں کی چیخیں لگڑ لگڑ ہو رہی تھی۔ میرز تھوڑی تھوڑی دیر میں رامین کی خیریت کا اطمینان کر لیا پھر اسے باتوں میں الجھا لیتا۔ مگر اچانک ہی اس نے کہا۔

”وہ دیکھو۔“ میرز نے رامین کی توجہ آئینوں کی طرف دلائی تو وہ جو ارادہ کیے بیٹھی تھی کہ ہرگز اس جانب نہیں دیکھے گی۔ میرز کے کہنے پر بے دھیانی میں سامنے نظر ڈالی۔ آئینے میں ان دونوں کے عکس کے درمیان ایک Poltergeist بیٹھان کی حیرت کا مزلے رہا تھا۔ رامین نے دانت پیٹتے ہوئے زور سے ایک دھمو کار سید کیا جو بھوت کو نہیں یقیناً ”میرز کے کندھے پر لگا تھا۔“

رائیڈ کا اختتام ہو چکا تھا۔ میرز نے اترنے میں رامین کی مدد کی۔ پھر اپنے پیچھے آنے والی بگھی سے حسن کو نکلے دیکھا۔ وہ بھی اترنے کے بعد ان کے ساتھ آکر کھڑا ہو گیا۔

”آپ لوگ بڑے خوش لگ رہے ہیں، رشتہ داروں سے ملاقات ہو گئی۔“ اس نے دونوں کے مسکراتے چہروں کو دیکھ کر قہقہہ کیا۔
 ”تمہاری خوف ناک شکل کے رشتہ دار تمہارے ہی ہو سکتے ہیں۔“ رامین نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی۔

میرز نے اس کے برحتہ جملے سے خوب لطف لیا تھا۔

”تم اتنے تھوڑے سے دنوں کے لیے آئے ہو۔ اب اگلی بار چکر لگاؤ تو پوری فیملی کے ساتھ آنا۔“ رامین حسن سے باتیں کرتی آگے بڑھتی رہی۔ ”اب دوبارہ کب آنا ہوگا۔“

میرز نے تو آئی پوڈسٹنا شروع کیا۔ اس کے کانوں میں ایرفون لگے تھے۔ حسن نے ایک نظرا سے دیکھا۔ ”ان موصوف سے کہو شادی کر لیں۔ اس کی شادی پر میں ضرور آؤں گا۔“ رامین نے مسکرا کر میرز کی طرف دیکھا جو ان دونوں کی گفتگو سے بے نیاز گانا سننے میں مصروف تھا۔ اس نے چکر اس کا ایرفون کھینچا۔

”چھوڑو اسے۔ باتیں کرو ہم سے۔ کون سے گانے سن رہے ہو؟“ میرز کے جواب دینے سے قبل وہ ایرفون اپنے کانوں میں لگا چکی تھی۔

”جلیلی بابائی؟“ راین کو پہلے حیرت کا شندیدہ جھٹکا لگا۔
 ”مہرین۔۔۔ تم ایسے گالے بھی سنتے ہو؟“ پھر وہ ہنس پڑی۔
 اس کے سوال پر مہرین نے بوٹھا کر حسن کی طرف دیکھا،
 کیونکہ آئی پوڈ اس کا تھا، بجائے وضاحت کرنے کے
 حسن بھی اسے لٹاڑنے لگا۔
 ”شرم آئی چاہیے مہرین تمہیں۔۔۔ بھلا یہ گانا ہے
 شریفوں کے سننے والا۔۔۔“ اس کی بات راین کی بے
 ساختہ ہنسی میں دب کر رہ گئی۔ اس طرح کھل کر ہنسی
 ہوئی وہ مہرین کو بہت اچھی لگی۔ اتنی اچھی کہ مہرین نے
 خود بھی کسی قسم کی وضاحت دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔
 غلط فہمی ہی سی۔۔۔ پر اس کی ہنسی رکنے کا نام ہی نہیں
 لے رہی تھی۔



”آج مجھے اتنا مزا آیا ہے میں بتا نہیں سکتی۔ کاش
 آنے والا ہر دن اسی طرح گزرے۔“ وہ حسرت آمیز
 لہجے میں اپنی خوشیوں کے دائمی ہونے کی خواہش مند
 تھی۔
 ”یہ تو تم پر منحصر ہے۔“ مہرین مسکرایا۔ ”اگر تم چاہو
 تو ہر دن اسی طرح بھرپور طریقے سے گزار سکتی ہو۔“
 ”یہ اتنا آسان ٹھوڑی ہے۔“ اس نے سر جھٹک کر
 جیسے افسوس کا اظہار کیا۔ ”ہم تینوں ہر روز تو یہاں
 اکٹھے نہیں ہو سکتے نا۔“
 حسن کی بات یاد آتے ہی اس کے لب مسکرانے
 لگے۔

”حسن کہہ رہا تھا مہرین سے کو شادی کر لے۔ اس
 کی شادی پر ضرور آؤں گا میں۔ پوری فیملی کے
 ساتھ۔۔۔“
 مہرین نے ایک لمحے کے لیے بھی راین پر سے
 نظریں ہٹائی نہیں تھیں اور پھر اس نے کچھ ایسا کہا کہ وہ
 چونک کر اس کی جانب دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔
 ”سوری کیا کہا تم نے۔ میں نے سنا نہیں۔“ وہ
 پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئی۔
 ”میں کہہ رہا ہوں کہ میں اسے واپس نہیں جانے

”دل لگ۔“
 ”کیوں؟“
 ”کیونکہ میں شادی کر رہا ہوں۔ بہت جلد۔“
 ”وہ رینٹی!“ راین کی ایک دم سمجھ میں نہیں آیا وہ
 کیا کہے۔ مہرین نے اچانک ہی اس کے سر پر جیسے بم
 پھوڑا تھا۔

”ہاں۔۔۔“ مہرین کا طینان قابل دید تھا۔ جیسے ساری
 تیاریاں مکمل ہو چکی ہوں۔
 ”اور تم نے ہمیں بتایا بھی نہیں۔ حسن کو بھی
 معلوم نہیں۔ ورنہ وہ مجھ سے نہ کہتا کہ تمہیں شادی
 کے لیے رضامند کروں۔“ مہرین نے ایک بھر پور بدن کو
 بھر لینے والی سانس بھری اور ہاتھوں کو سینے پر باندھ کر
 کھڑا ہو گیا۔ اسے راین کا رد عمل دیکھ کر مڑا آیا تھا۔
 ”چلو اچھا ہے۔ میں نے یہاں کوئی شادی اینڈ
 نہیں کی اب تک۔ پتا نہیں یہاں رسمیں وغیرہ کیسی
 ہوتی ہیں۔ ویسے تم نے کیا سوچا ہے۔ پاکستانی اسٹائل
 میں شادی کرو گے یا امریکن؟“

”بھئی لڑکی پاکستانی ہے تو شادی بھی اسی طرح کروں
 گا۔“ راین کو یہ بات سن کر ہنسی آگئی۔
 ”یعنی تم۔“ اس نے مذاق اڑانے والے انداز
 میں انگلی سے مہرین کی طرف اشارہ کیا۔ ”گولڈن شیروانی
 اور سہرے کے ساتھ۔ ڈالر کے نوٹوں کا بڑا سا ہار پن
 کہ سفید گھوڑی پہ سوار ہو کر دلہن بیاہنے
 جاؤ گے؟“

مہرین اسی طرح آگے بڑھ کر راین کے قریب آیا۔
 ”تم بتاؤ تمہیں کیا پسند ہے۔ سفید گھوڑی یا بلیک
 سپورٹس کار؟“
 ”یہ تو اپنی ہونے والی دلہن سے پوچھو۔ میں کیا
 بتاؤں؟“ انتہائی غیر محسوس انداز میں وہ اگلے قدموں
 تھوڑا سا پیچھے ہٹی تھی۔ مہرین دو قدم اور آگے بڑھ کر
 دوبارہ اس کے بالکل نزدیک آ گیا۔
 ”اسی سے تو پوچھا ہے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا
 ہوں راین!“

راین نے سنے تھے بالکل صاف اور واضح طور پر۔

وہ ایک ایک لفظ جو مہرین کی زبان سے ادا ہوئے مشکل
 بننے میں نہیں یقین کرنے میں ہو رہی تھی۔ اس کی
 منکر اہٹ سمٹ کر معدوم ہوتی چلی گئی۔
 ”کیا کہہ رہے ہو مہرین؟“ اس نے آنکھیں
 کھینچتے ہوئے مہرین کی جانب یوں دیکھا جیسے اسے
 اپنے الفاظ واپس لینے کی تنبیہ کر رہی ہو۔
 ”تمہیں برا لگا؟“

”تمہارے منہ سے یہ بات سن کر واقعی بہت برا
 لگا۔“ مہرین کے لیے اس کا یہ رد عمل قطعی غیر متوقع
 تھا۔
 ”تم ابھی شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ یا مجھ سے
 شادی نہیں کرنا چاہتیں؟“
 ”میں کبھی نہیں۔ کسی سے بھی شادی نہیں کرنا
 چاہتی۔“ مضبوط لہجے میں دو ٹوک جواب دیتے ہوئے
 اسے بس ایک لمحہ لگا تھا۔

”بہت سال پہلے میں اس تجربے سے گزر چکی ہوں
 اور وہ ہرگز ایسا خوشگوار نہیں تھا کہ میں اسے بار بار
 دہرائی رہوں۔ میں آج جہاں ہوں، جیسی ہوں جس
 حال میں ہوں، مطمئن ہوں۔“
 ”تم میرے ساتھ خوش رہو گی راین!“
 ”مگر تم میرے ساتھ خوش نہیں رہو گے مہرین۔
 میں تمہاری توقعات پر پوری نہیں اتر سکیں گی۔“
 ”کیسی توقعات؟ مجھے صرف تمہارا ساتھ چاہیے،
 تم جیسی ہو، مجھے اچھی لگتی ہو، میں تمہیں بدلنا نہیں
 چاہتا۔“

”یہ تو تم ابھی کہہ رہے ہو نا۔ جب میں تمہاری
 بیوی بن جاؤں گی۔ تب تمہیں میری خامیاں نظر
 آئیں گی۔ میں نارمل لڑکی نہیں ہوں۔ زن نے اسی
 لیے ڈائیوئرس دی تھی مجھے۔“ پہلے جو اس کی بات پر
 خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔ اب اس کے ارادے سے باز
 رکھنے کی کوشش میں تھی۔ وہ بیک وقت رحم کی بھیک
 مانگ رہی تھی اور دھتکار بھی رہی تھی۔ مہرین نے آگے
 بڑھ کر اسے بازوؤں سے تھام لیا۔
 ”تم بھول کیوں نہیں جانتیں اسے۔ ایک تلخ

تجربے کی بنیاد پر اپنی آئندہ زندگی خوشیوں سے خالی
 کر لینا کہاں کی عقل مندی ہے راین! بھول جاؤ اپنا
 ماضی۔“

وہ اسے بہت پیار سے سمجھا رہا تھا۔ جبکہ راین اس
 کی مضبوط گرفت کے باوجود خود کو ٹوٹا پھوٹا محسوس
 کر رہی تھی۔ اس نے مہرین کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔
 اپنے آنسوؤں کو آنکھوں سے بننے سے روک لیا تھا
 اس نے۔ گمراہی آواز میں اتر آئی۔

”مہرین۔ مجھے مجبور مت کرو۔ اس اندھے کنویں
 میں دوبارہ کودنے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔ میرے
 لیے سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔“

”کچھ ختم نہیں ہوا ہے۔ تمہارے سامنے پوری
 زندگی پڑی ہے ابھی۔ میرا بھروسہ کہو راین! میں
 تمہیں باپوس نہیں کروں گا۔“

”میں نے تمہیں زین کے بارے میں اس لیے بتایا
 تھا کہ تم ترس کھا کر مجھے رو پوز کرو؟“
 ”میں تم پر ترس کیوں کھاؤں گا؟“

”کیونکہ تم نے ہمیشہ ایسا ہی کیا ہے۔ میری ہر
 اچھی بری بات کو سپورٹ کیا ہے۔ میری خوشی کے
 لیے خود کو لیٹ ڈاؤن کیا ہے۔ اور آج بھی تم یہی
 کر رہے ہو۔ مجھ سے ہمدردی رکھتے ہو۔ مگر اس کے
 لیے اپنی لائف برباد مت کرو۔“

”یہ۔۔۔ محبت بھی تو ہو سکتی ہے۔“
 ”پلیز۔۔۔“ راین نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش
 کیا۔ ”میں اسے محبت نہیں مان سکتی۔“ اسے غصہ
 آنے لگا تھا۔

”مت مانو۔ وقت خود ثابت کر دے گا۔ مگر یہ بات
 اپنے ذہن سے نکال دو کہ زین کا تمہاری زندگی سے
 چلے جانا کوئی سانحہ تھا۔ جو بھی ہوا۔ اچھے کے لیے
 ہوا ہے۔ تمہیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ اس کے بغیر
 تم زیادہ خوش ہو۔ میں بہت خوش ہوں کہ اس نے
 تمہیں چھوڑ دیا۔ میں نے چاہا تھا ایسا ہو جائے۔“

”تم چاہتے تھے کہ زین مجھے چھوڑ دے؟“ راین
 نے آہستگی سے اس کے ہاتھ اپنے بازوؤں پر سے

ہٹائے اور پیچھے ہٹ گئی۔

”میں تمہارے گھر آیا تھا راتیں۔ میں نے زین کو دکھا تھا مارکیٹ میں تمہارے ساتھ۔ تب میں نے۔۔۔ میں نے اللہ سے تمہیں مانگا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم میرے سوا کسی اور کی ہو کر رہو۔ میں نے دعا کی تھی وہ تمہیں چھوڑ کر چلا جائے اور تم میری ہو جاؤ۔“

گنتے برسوں کی چاہت۔ اور کتنا کم وقت ملا تھا انظار کے لیے۔ پھر بھی اس نے پوری کوشش کی تھی۔ کہ وہ راتیں کو اپنی محبت کا یقین دلا سکے۔ مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔

”میں ہمیشہ تمہیں اپنا خیر خواہ سمجھتی آئی تھی۔ مگر مجھے نہیں معلوم تھا تم اس طرح مجھے تباہ کر دو گے۔ تمہاری بددعا نے میری زندگی برباد کر دی۔ میرے پایا ختم ہو گئے۔ انہیں آخری بار دیکھ بھی نہیں پائی میں۔ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ تم نہیں جانتے میری ماما نے میرے ساتھ کیا کیا۔ تم ان خود غرض انسانوں میں سے ایک ہو۔ جو اپنی خوشی حاصل کرنے کی دعا میں مانگ کر دوسروں کو زندہ درگور کر دیتے ہیں۔ تم میرا درد بھی نہیں سمجھ سکتے۔ وہ تکلیف کبھی محسوس نہیں کر سکتے جو میں نے سہی۔“ ہر درد ہر دکھ دوبارہ زندہ ہو چکا تھا وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

”میں سمجھ سکتا ہوں۔“ یقین دلانے کے لیے بدگمانی کے جانے اور کتنے کڑے امتحانوں سے گزرنا تھا اسے۔

”تم نہیں سمجھ سکتے۔“ وہ سڑائی ہو رہی تھی۔ ”تمہیں نہیں معلوم جب سر سے خون بہتا ہے تو کتنا درد ہوتا ہے۔ اور۔۔۔ زخم دینے والے ہاتھ اپنے ہوں تو آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔“ اپنے آنسوؤں کے پار اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”میری بات سنو راتیں!“ مہرز نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر اس نے بے رحمی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ تم یہاں سے چلے

جاؤ۔ آئندہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔“

راتیں نے بار بار دلاس دیتے مہرز کو زور سے پیچھے دھکیلا۔ آنکھوں سے آنسو جھٹک کر ہتھیل سے صاف کیے اور فوراً تیز قدموں سے چلتی دور جا گئے۔ وہ اسے روک نہیں سکتا تھا۔ جب وہ ناراض ہوئی تھی تو کوئی بھی عذریہ وضاحت قبول نہیں کرتی تھی اور آج تو وہ ہر رشتہ ہر تعلق توڑ کر جاری تھی کہ کس حیثیت سے اسے روکتا۔ کیا کتنا؟

ڈنڈی لینڈ کے گیٹ سے باہر پارکنگ میں کھڑی اپنی کار کا دروازہ کھولنے، اسے اشارت کر کے میں بڑک پر لاتے ہوئے وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پا چکی تھی۔ گھر نزدیک ہی تھا۔ پھر بھی اسے بے حد احتیاط سے ڈرائیو کرتا تھا زندہ سلامت اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے۔ شام پھیل چکی تھی۔ اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ۔

نیند تو جیسے کمرے سے باہر ہی رہ گئی تھی۔ بستر پر پندرہ منٹ سختی سے آنکھیں بند کر رکھنے کے باوجود وہ سو نہیں پائی تو پھینکا کر اٹھ بیٹھی۔ لیپ آن کیا کتاب اٹھائی اور صفحے پلٹنے لگی۔ پڑھنے کی کوشش کی تو ایک لفظ سمجھ نہیں آیا۔ ہر تحریر اپنا مفہوم کھو چکی تھی۔ غصے میں اس نے کتاب اچھال دی جو ہلکی سی دھب کے ساتھ بستر پر جا گری۔ بستر سے اتر کر پیروں میں سیلپر گھسیٹتی وہ اپنے ڈیک کے پاس آئی اور اسے آن کر دیا۔ آواز نہایت کم رکھتے ہوئے وہ فلور کشن پر وہیں بیٹھ گئی۔ گانا سنانے میں ہی کہیں شروع ہوا۔

No summers high
No warm july
No harvest moon to
Light one tender
august night
No autumn breeze
No falling leaves

بستر پر اس کا موبائل گنگنا گیا تھا۔ اس نے کشن سے اٹھ کر اپنا فون اٹھایا اور کال ریسیو کر لی۔ ابھی ہیلو کہا تھا کہ دوسری طرف سے التجا سنائی دی۔

”پلیز راتیں! فون بند مت کرنا۔ تم سن رہی ہو نا۔“ مہرز تھا۔

”بولو۔“ حتی الامکان اپنی آواز اور لہجہ بے تاثر رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

”میں جانتا ہوں، تم نے منع کیا تھا۔ لیکن یہ بات کے بغیر۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔“ وہ سانس روکے سننے لگی۔ ”میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں راتیں آئی لو۔“

اور کال منقطع ہو گئی۔ راتیں بے چین ہو کر ہلو ہلو کرتی رہی۔ مگر دوسری طرف التجا گون کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔ اس نے فون اپنی نگاہوں کے سامنے لا کر مبروہ کیا اور پس کر دیا۔ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا وہ اسے فون کیوں ملا رہی ہے۔ وہ تو کبھی اس کی شکل نہ دیکھنے کا تہیہ کر چکی تھی، کبھی بات نہ کرنے کی قسم کھائے بیٹھی تھی تو پھر اب؟ کال مل نہیں سکی تھی۔ التجا گون کی آواز تھی اور بس۔ ہاں۔ کمرے میں Stieve Wonders کی آواز ضرور تھی۔

Not even time for bird
to fly to southern skies
I just called to say
I love you
and i mean it
from the bottom
of my heart

دل پکھل رہا تھا۔ عجیب انداز سے۔ وہ بے اختیار ہو رہی تھی۔ جبکہ وہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے خود اپنے آپ سے ہی لڑے چلے جا رہی تھی مگر اس کا دل ہر دھکیل کو مسترد کرتا تھا۔

”مہرز اتنے برے سلوک کا مستحق ہرگز نہیں تھا۔“

ٹھیک ہے۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتی۔ لیکن۔۔۔ کم از کم وہ آرام سے اس کی بات تو سن سکتی تھی۔ تھوڑے سے تحمل کا مظاہرہ کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ جو بھی ہوا تھا۔ زین سے علیحدگی پلای کی ڈھتھہ، ماما کا تشدد اور بھائی سے جدائی۔ ان سب میں مہرز کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ مانتی نہ مانتی، صبح کے ڈپریشن نے نکاس کا غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ اس کی بھڑاس غلط انسان پر نکلی تھی۔

پھر کسی پیاس کے صحرا میں مجھے نیند آئی اور میں خواب میں ڈھونڈوں مجھے پانی کی طرح وہ ”سراب“ تھا۔ چمکتا رہتا ہے جسے پیاسا دور سے دیکھتے تو پانی سمجھتے۔ اس نے بھی یہی غلطی کی تھی۔ انتہائی باپوسی کے عالم میں وہ ٹھک ہار کر وہیں بیٹھ گئی۔ کھولتی ریت اس کا بدن جھلسائے دے رہی تھی۔ پر اب اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ آگے جانا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ اور نہیں چل سکتی تھی۔

تب ہی کسی نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو کچھ اجنبی چہرے اس کے گرد گھیر ڈالے کھڑے تھے۔ جن کے سایوں کی وجہ سے سر پر پڑتی تیز دھوپ کا رستہ رک گیا تھا۔ وہ ٹکر ٹکر سب کے چہرے دیکھنے لگی۔ ان میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ سب آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔

پھر۔ ایک ایک کر کے وہ سب ہٹتے چلے گئے۔ وہ پریشان سی ادھر ادھر دیکھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب وہ پھر اگلی تھی۔ اس نے دوبارہ آسمان کی طرف دیکھا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

”میرے مالک مجھے سیراب کر دے۔“

گزرا کر دعا مانگنے کے بعد جیسے ہی اپنے ہاتھ نیچے کے سامنے ایک شخص دکھائی دیا۔ جس نے دونوں ہاتھوں سے خوشنما رنگوں سے مزین پیالا تھا ہوا تھا۔ اس شخص نے خود آگے بڑھ کر پیالا اس کے سامنے

پیش کر دیا۔
اس کے ہونٹ تر ہو چکے تھے۔ زبان پر ٹھنڈے
ٹھٹھے پانی کا ذائقہ تھا اور جیسے جیسے سوکھا حلق سیراب
ہو رہا تھا اس کے ہاتھ پاؤں میں جان آتی جا رہی تھی۔
اس نے احسان مندی سے اس شخص کی جانب دیکھا جو
پہلے ہی اسے نہایت محبت سے تنگ رہا تھا۔ اس کی
پاس بجھ گئی تو پیالا ہونٹوں سے جدا کر دیا۔ جانے لقی
دیر سے وہ پیالی پی رہی تھی مگر وہ پیالا ہونٹوں سے لبالب
بھرا ہوا تھا۔ وہ حیران ہوئی۔ اسی دم آسمان سے بارش
برسنے لگی۔ بلکی بلکی بارش۔ اس کی رگ و پے میں
سکون اترنے لگا۔

”راہین۔“ کسی نے اس کا نام پکارا تھا۔ سرعت
سے پلٹتے ہوئے اس شخص کو دیکھا تو خوف سے راہین
کی جان نکل گئی۔ وہ مہمان۔ چہرہ سرخ خون سے تتر
تھا۔

بارش کا قطرہ اچھل کر اس کی آنکھ میں گرایا۔ اور
اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اپنا
لب پ جلا کر اس نے ٹائم دیکھا، صبح کے پانچ بج رہے
تھے۔ تو یہ خواب تھا۔ گھڑی دیکھ کر اس نے ایک طویل
گہری سانس لی۔ عجیب سی خوشبو اور خنکی محسوس
میں۔

اس طویل خواب کو ذہن میں دہراتے ہوئے وہ
دوبارہ دیکھنے پر سر رکھ کے لیٹ گئی۔ یہ خواب اسے پہلے
بھی ایک بار دکھائی دیا تھا؟ لہذا کی وفات سے پہلے اور اب
دوبارہ نظر آیا ہے۔ وہ شخص۔ کون تھا؟ ایک گہری
سانس لے کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور گوش
کر کے اس کا چہرہ یاد کرنے لگی اور پھر چشم تصور میں
اس شخص کا چہرہ نظر آتے ہی وہ لرز کر رہ گئی۔ وہ اسے
اچھی طرح جانتی تھی۔

خون میں ترتر چہرہ۔ مہرز کا تھا۔

فری دے پر سب ہی گاڑیاں بہت تیز رفتار تھیں۔
اس کی اسپورٹس کار بھی تیزی سے ہر گاڑی کو پیچھے

چھوڑتی آگے بڑھ رہی تھی لیکن اس کا ذہن پیچھے
طرف دوڑ رہا تھا۔ وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے
جھٹک کر کار کی رفتار تھوڑی اور بڑھادی۔ وہ آواز
کے ارد گرد ہر طرف گون رہی تھی۔

”تمہاری بددعا نے میری زندگی برباد کر دی۔“ وہاں
دیتی، شکوہ کرتی آواز۔ مہرز نے ایک گاڑی کو اور ٹیک
کیا، پر دل جہاں رکھا تھا وہاں سے ایک ایچ آگے نہیں
بڑھا تھا۔

”تم میرا درد کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ وہ تکلیف کبھی
محسوس نہیں کر سکتے جو میں نے کی ہے۔“

اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ سر جھٹک کر اس
نے آنسوؤں کو آنکھ سے باہر نکالا۔ ہاتھ اسٹیرنگ سے
ہٹاتا تو کار بے قابو ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی کار اور اپنے آپ
قاپو باندھے کی بھرپور جدوجہد کر رہا تھا۔ کار تو کنٹرول میں
تھی مگر وہ خود۔

”تم یہاں سے چلے جاؤ۔ آئندہ مجھے اپنی شکل مت
دکھانا۔“

مہرز نے رفتار اور بڑھادی۔ اپنے اور اس کے
درمیان فاصلہ بھی بڑھا دیا۔ اس کا شہر بہت بہت پیچھے
رہ گیا تھا۔ پر اس کا خیال پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ وہ اس
کی ہر بات مانتا آیا تھا۔ یہ بھی مان رہا تھا۔ وہ اس سے
دور جانا چاہتی تھی۔ وہ دور جا رہا تھا۔ وہ کبھی اس کی شکل
نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ ملاقات کا ہر امکان ختم کر رہا
تھا۔ مگر ایک کک دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہی
تھی۔ کیا راہین کو کبھی معلوم ہو سکے گا کہ وہ اسے
دیوالوں کی طرح چاہتا رہا ہے جو وہ کتنا چاہتا تھا اس کا
موقع تو آج بھی نہیں ملا تھا۔

اس نے اپنا سیل فون اٹھایا اور راہین کا نمبر ملایا۔
اسی وقت ایک سرخ کار نے اسے اور ٹیک کیا۔ مہرز
نے ہارن پر ہاتھ رکھا اسے بجایا، مگر وہ ٹس سے مس نہ
ہوئی۔

راہین نے ہیلو کہا۔ مہرز کو ڈر تھا۔ وہ اس کی آواز
سننے ہی فون بند کر دے گی۔ اس لیے پہلی بات یہی کی
تھی اس نے۔ شکر ہے راہین اس کی بات سننے کے

لیے رضامند ہو گئی تھی۔ اور پھر مہرز نے کہہ دیا۔
حالانکہ وہ اس طرح یہ اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور
نہ ہی اس نے کبھی یہ سوچا تھا کہ محبت کے اعتراف کے
بعد وہ کبھی اس سے مل نہیں پائے گا۔ اسے دیکھ نہیں
پائے گا۔

شام کو راہین کی شگت میں گزراے گئے وہ چند گھنٹے
ہر خوف، ہر اندیشے سے پاک تھے۔ زندگی میں پہلی بار
اسے اپنی محبت کو حاصل کرنا ممکن نظر آ رہا تھا۔ اسے
کچھ معلوم تھا اس خواہش کا اظہار ہی راہین کو ہمیشہ کے
لیے اس سے دور لے جائے گا۔ وہ فکروں میں اپنی بات
کہہ کر مہرز نے فون منقطع کر کے سیٹ پر اچھال دیا۔
وہ راہین کا نفرت بھرا جواب سنتا نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ
اسی لمحے مرنے لگتا۔

سرخ کار ابھی تک اسے آگے نکلنے سے روکے
ہوئے تھی۔ غصہ میں جبرے سمجھ کر اس نے
ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھتے ہوئے اس کار کو دائیں جانب
سے اوور ٹیک کرنے کا ارادہ کیا۔ اس لمحے اپنی لین
تبدیل کرنے سے پہلے اسے انڈیکٹر دینے کا خیال نہیں
آیا تھا۔ اس لین میں تیز رفتاری سے آتے ٹرک نے
ہارن بجا کر اسے خبردار کیا تھا۔ مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔
اس اسپورٹس کار کو زو میں آنے سے بچانے کے لیے
اس نے پورا اسٹیرنگ گھمایا، اس کے باوجود ایک
دھماکے کے ساتھ ٹرک نے کار کو ٹکرایا تھی۔

مہرز کی اسپورٹس کار وہ ٹکر برداشت نہیں کر پاتی
اور پھر سڑک پر لہرا کر اپنا توازن کھوٹی ہوئی الٹ گئی۔ ورنہ
اسکریں کچی کچی ہو کر اس کے پورے جسم سے
لپٹ گئی تھی۔ اگر سیٹ بیلت نہ بندھی ہوئی تو
اسٹیرنگ بیل اس کے سینے کو توڑ دالتا۔

اس کی گردن میں زبردست جھٹکے لگ رہے تھے۔
کار اٹکنے کے باوجود رکی نہیں، بلکہ سڑک پر گھسٹتی
جا رہی تھی۔ پھر ایک جھٹکے سے اس کے پورے جسم کا
بوجھ بائیں طرف منتقل ہو گیا۔ کار اپنے بائیں حصے پر
الٹ کر آخر کار رک بی گئی۔ پیچھے تمام گاڑیاں رک گئی
تھیں۔ بھری پری سڑک پر لوگوں کا جھوم اکٹھا ہو رہا

تھا۔ مسلسل ہارن بج رہے تھے۔ لوگ جھج رہے تھے۔
اسے پکار رہے تھے۔ لیکن وہ انہیں دیکھ سکتا تھا نہ سن
سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا اپنا خون بہہ
رہا تھا۔

”تمہیں نہیں معلوم جب سر سے خون بہتا ہے تو
کتاورد ہوتا ہے۔“

اسے درد ہو رہا تھا اور بہت درد ہو رہا تھا، وہ جان گیا
تھا۔

”اور زخم دینے والے ہاتھ اپنے ہوں تو آنکھیں
اندھی ہو جاتی ہیں۔“

اس نے اندھی ہوتی آنکھوں کو کھلا رکھنے کا کلام
ی کو کش کی۔ دوڑتے قدم، اجنبی چہرے۔ اس
کے لیے پریشان تھے۔ سڑک پر اوندھی پڑی کار میں
لوہمان مہرز کو یقین ہو گیا۔ وہ مر رہا ہے۔ اس کے
حواس معطل ہو رہے تھے۔

زندگی ساتھ چھوڑ رہی تھی۔
”میرے مرنے کے بعد کیا وہ مجھے دیکھنے آئے
گی؟“

ذہن تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ بند ہوتی آنکھوں نے
دنیا سے منہ موڑ لیا تھا۔
آخری خیال یہی آیا تھا۔ ”کیا وہ آئے گی؟“

کار سیٹ کی پشت پر سر ٹکائے وہ آنکھیں بند کیے
بیٹھی تھی۔

”تم پی چپ کیوں ہو گویا؟“ مہ جیوں نے
سڑک پر نظریں جمائے ہوئے اس سے پیار سے
پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی۔ تھک گئی ہوں
شاید۔“ وہ بدقت مسکرائی۔

”تمہاری خاموشی کی وجہ سے آج مجھے بہ راستہ
بہت لبا لگ رہا ہے۔“ انہوں نے ہلکے پھلکے لہجے میں
کہا۔

”اب تو پہنچ گئے ہیں ٹائیکڑ فیلڈ۔ تھوڑی دیر میں

آپ کا گھر آہی جائے گا۔
 ”ہاں۔ لیکن پہلے میں فیول بھراؤں۔“ انہوں نے گاڑی گیس اسٹیشن کے احاطے میں لے جاتے ہوئے کہا۔ کچھ پیسے لے کر راین گاڑی سے اتری اور پیٹرول کا پمپ ہاتھ میں لے کر گاڑی میں پیٹرول بھرنے لگی۔

”مہ جیس کا سیل فون بجنے لگا۔ فون سنتی وہ بے حد گھبرا گئی تھیں۔ وہ جلدی سے پائپ واپس جگہ پر رکھ کر گاڑی کے اندر آگئی۔

”وہ ٹھیک تو ہے؟ میرے خدایا۔ میں پہنچ رہی ہوں۔“ مہ جیس نے سیل آف کرنے کے بعد نہایت پریشانی کے عالم میں گاڑی میں سڑک پر لا کر اسپتال کی طرف موڑی۔

”کیا ہوا خالہ۔ سب خیریت ہے؟“
 ”نہیں۔ خیریت نہیں ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نامیری بہت اچھی فریڈ کا بیٹا جو ہمارے فیوژن میں رہتے ہیں۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ بہت سیریس کنڈیشن ہے اس کی۔ وقار وہیں اسپتال میں ہیں۔“

”آچھا۔۔۔ رز؟ جن کے گھر آپ نے ایک بھجوا دیا تھا۔“ اسے یاد آگیا۔
 ”ہاں ہوتی۔ اس کا نام مہرز ہے۔“
 ”جی۔۔۔؟“ راین کی نگاہوں کے سامنے وہی ہنستا مسکراتا چوکیدم خون میں نہا گیا۔

وہ اپنے دھڑوڑاتے دل پر قابو پانے میں ناکام ہو چکی تھی۔

”اللہ کرے وہ ٹھیک ہو۔“ اسپتال کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی بے اختیار اس کا دل چاہا وہ کار سے باہر کود جائے۔ اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد اسے صحیح سلامت دیکھ کر اپنی تسلی کرنا چاہتی تھی۔

مہ جیس نے پارکنگ لائٹ میں گاڑی کھڑی کی اور

تیز تیز قدم اٹھاتے۔ اسپتال کے ایمرجنسی یونٹ کی طرف بڑھیں۔ استقبالیہ پر ہی وقار خالو نظر آگئے۔ راین کا ذہن آندھیوں کی زد میں تھا۔ اس نے بے قرار ہو کر ادھر ادھر دیکھا تو آئی سی یو کے باہر کارپڈور میں حسن نظر آیا۔

”کیا ہوا ہے اسے حسن۔۔۔ یو؟“ حسن کا کارپڈور وہ زور زور سے رونا شروع ہو گئی۔ ”بتاؤ مجھے۔۔۔ وہ زندہ ہے نا۔۔۔ وہ ٹھیک ہے نا؟“

”راین سنبھالو خود کو۔“ مہ جیس دوڑ کر اس کے نزدیک آئیں۔ اور اسے کندھوں سے تھام کر سہارا دیا۔

”نہیں خالہ۔۔۔ مجھ سے ناراض ہے۔ اس نے کہا تھا وہ مر جائے گا۔ دیکھیں وہ چلا گیا۔ اسے روک لیں پلیز اسے روک لیں۔ اب میں اس سے کبھی نہیں لڑوں گی۔ اسے واپس بلا لیں۔“ راین ان کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی۔ وہ حسن کا بازو کھینچ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے التجا کرنے لگی۔

”وہ تمہارا دوست ہے نا۔ تمہاری بات ضرور سنے گا۔ اس سے کوئی مجھے معاف کر دے۔ وہ دیکھو اس کی بارٹ بیٹ رک گئی ہے۔ وہ اسے لے کر جا رہے ہیں۔ انہیں روکو حسن۔“ راین کو شیشے کے بار بارٹ مانیٹر صاف نظر آ رہا تھا۔ جس میں دل کی دھڑکن سیدھی لکیری صورت چل رہی تھی۔

حسن نے مڑ کر دیکھا، راین ٹھیک کہہ رہی تھی۔ بارٹ مانیٹر دل کی دھڑکن لکیری صورت نظر آتے آتے معدوم ہونے لگی۔

”راین! وہ بالکل ٹھیک ہے۔“ حسن نے اسے کندھوں سے تھام کر نرمی سے سمجھایا۔ ”بارٹ مانیٹر آف کر دیا گیا ہے۔ اسے روم میں شفٹ کر رہے ہیں۔ کچھ گھنٹوں بعد اسے ہوش آجائے گا۔ اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔“

اسے یقین نہیں آیا۔ وہ ایک تک حسن کے ہونٹوں کی جنبش دیکھتی رہی۔ جو اسے مہرز کے زندہ ہونے کی نوید سنارہے تھے۔

حسن نے دوبارہ کہا۔ ”نبی از فائن راین!“
 ”اللہ کا شکر ہے۔“ مہ جیس نے راین کو اپنے بازوؤں میں بھرتے ہوئے اس کا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

مہرز ابھی تک خواب آور دواؤں کے زیر اثر تھا۔ راین اس کے بیڈ کے بالکل پاس کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے زخمی چہرے اور دماغ میں بازو پر موجود خراشوں پر باریک کھربند ابھرنے لگا تھا۔ پائیاں بازو دو جگہ سے فربک چھو تھا، جن پر بلا سٹرچ ڈھایا گیا تھا۔ کار الٹ جانے باعث اس کے سر کو شدید جھٹکا لگے تھے۔ زخم بھی آتا تھا پر زیادہ گہرائی نہیں تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی، وینڈا سکرین کی کچیوں سے آنکھیں محفوظ رہی تھیں۔ پولیس ڈاکٹر سے رپورٹ لے چکی تھی، وہ نشے میں نہیں تھا۔ یہ ایکسیڈنٹ ذہنی دباؤ جلد بازی کا نتیجہ تھا۔

راین سانس روکے جانے کب سے اس کے زخم گئے چلے جا رہی تھی۔ پھر بھول جاتی اور دوبارہ گنتے لگتی۔ اسی دوران اس کی پلکوں پر ٹھہرے آنسو چھلک کر مہرز کی کلائی پر گرے۔ اس باریک سی خراش پر جس کے کناروں پر ہلکا سا خون ابھی تک نازہ تھا۔ وہ آنسو اس خراش میں جذب ہوا اور مہرز کا ہاتھ لرزا۔

”جب تم روتی ہو، مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔“ اس نے سچ کہا تھا۔ راین کے رونے سے واقعی اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ لب بچھ کر فوراً پیچھے ہٹ گئی اور بے رحمی سے تمام آنسو پونچھ ڈالے اسے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی تھی۔ جب وہ کہہ رہا تھا کہ اس کا درد سمجھ سکتا ہے تو راین کو یقین نہیں آیا تھا۔ بھلا جب اس نے وہ درد سہا نہیں تو جان کیسے سکتا تھا۔ سمجھ کیسے سکتا تھا؟ مگر اب وہ جان گئی تھی۔ کسی تکلیف کا احساس کرنے کے لیے خود وہ زخم کھانا ضروری نہیں ہوتا۔ اگر ہم کسی کو تہ دل سے چاہتے ہوں تو اس کا ہر حال ہمارے اوپر اترتا ہے اس کا ہنستا

ہمیں ہنساتا ہے، اس کی خوشی ہماری خوشی ہوتی ہے، اس کے آنسو ہماری آنکھ سے بہتے ہیں اور اس کا درد۔۔۔ ہم اپنے جسم پر بہتے ہیں اور سکتے ہیں۔

یہ درد تو جسم کے تھکے ان سب سے بڑھ کر ایک زخم اور تھا جو اس کے دل کو گھائل کر رہا تھا۔ بچھتاوے اور افسوس کا سہا بے آب کی طرح تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا دل کو۔ مہرز کی اس حالت کی ذمہ دار وہی تھی اور سب سے بڑھ کر غم خوار بھی خود ہی تھی۔ ندامت کے آنسو ٹھہرنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

حسن آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتا ہوا اس کے نزدیک آگیا اور جھک کر سرگوشی کی۔ ”آٹھ راین یا ہر آٹنی بلا رہی ہیں، اب تم گھر جاؤ۔ رات بہت ہو گئی ہے۔“ اس نے سر اٹھا کر حسن کی طرف دیکھا۔

پتا نہیں کیوں اسے خوف محسوس ہوا کہ اس کمرے سے باہر آ سچین نہیں ہے۔ وہ مہرز کے پاس سے چلی گئی تو مر جائے گی۔ اس سوچ نے قدم جکڑ لیے تھے۔ ”صبح دوبارہ آجانا۔“ حسن اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

”کیا صبح ہوگی؟“ اس نے ساتھ کچھ اور بھی کہا جو حسن کو سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

”تم گھر جا کر آرام کرنا۔ جب مہرز کو ہوش آیا، میں تمہیں کل کر کے بتاؤں گا۔“

راین نے سر جھکالیا پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

پورا گھر خالی پڑا تھا، یقیناً خالہ اور خالو اسپتال جا چکے تھے۔ اس کی نظر ڈانٹنگ ٹیبل پر رکھے ہوئے ایک پیکٹ پر جا رہی۔ وہ میز کے نزدیک آئی اور پیکٹ کھول کر تمام چیزیں باہر نکال دیں۔

ایک سیل فون، چھاپیاں، ڈیڑا ٹیوٹک لائنس اور والٹ۔ ان میں سے دو چیزوں کو وہ اچھی طرح پہچانتی

تھی۔ سیل فون اور والٹ مہرز کا تھا، اس نے ڈرائیونگ لائسنس اٹھایا تو تصویر دیکھ کر اس کا دل آنکھوں میں سمٹ آیا۔ مہرز کی تصویر دیکھ کر اس کی بے تابی میں خاطر خواہ کمی آئی تھی۔ اپنے لیے چائے بنانے لگن میں آئی تو قرنجر لے گئے نوٹ کو پڑھا، جنہیں نے لکھا تھا، وہ دوسرے دن آکر اسے اپنے ساتھ دوبارہ اسپتال لے جائیگی۔ مہرز کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ حسن کو اپنی ٹریفنگ پر واپس آنا تھا اس لیے وہ مہرز کے پاس رک رہی تھیں۔ شام میں حسن دوبارہ آنے والا تھا۔

اپنی چائے لے کر وہ باہر لان میں کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس کی نظریں مسلسل مہرز کے گھر کا طواف کر رہی تھیں تاہم کیوں بڑی شدت سے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کئی طرح اس کے گھر کے اندر پہنچ جائے۔

ڈائننگ ٹیبل پر آکر پھر سے وہ پیکٹ کھولا نہایت عقیدت اور محبت سے ہر شے پہ ہاتھ پھیرتی مہرز کی تصویر کو دیکھ گئی۔ بہت آسمان ہوتا ہے درد سہنا چھتاتوے کا بوجھ اٹھانا بہت مشکل ہوتا ہے اور وہ تو شاید ہر مشکل کام کرنے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی سن کر وہ اچھل پڑی۔ دھڑ دھڑاتے دل کر قابو میں لاتی فون کی طرف بڑھی دوسری طرف وقار خلو تھے۔

”راہین۔ ابھی تھوڑی دیر میں مہرز کے آفس سے مشر جوزف آئیں گے۔ ہماری ڈائننگ ٹیبل جو پیکٹ ہے اس میں مہرز کے گھر کی چابیاں ہیں۔ وہ انہیں دے دیتا۔ بلکہ تم بھی ساتھ چلی جانا۔ مشر جوزف اسٹڈی میں جائیں گے اور وہاں سے اس کی کار کے انشورنس کے کاغذات لے آئیں گے۔ اوکے“

”جی۔“ اور اس سے پہلے کہ وہ مہرز کے بارے میں پوچھتی انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔

مشر جوزف دس منٹ بعد ہی آگئے۔ ان کے نیل بجائے پر اس نے چابیاں ہاتھ میں لیں دروازہ کھولا اور دھڑکتے دل کے ساتھ مہرز کے گھر کی جانب چل پڑی۔

مشر جوزف مطلوبہ فائل لے کر چلے گئے تو اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اب وہ اکیلی تھی۔ آج پہلی بار وہ اس گھر کے اندر آئی تھی۔ بالکل بھی اجنبیت محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اسے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ ہچکچی ہٹ بھی نہیں ہو رہی تھی۔ پورا گھر خالی پڑا تھا۔ مہرز کے کمرے کے علاوہ فی الحال اسے اور کچھ نہیں دیکھنا تھا۔ اس کا ارادہ وہاں کچھ دیر بیٹھنے کا تھا۔ اور بس پھر وہ واپس چلی جاتی۔

اتنا اندازہ تو تھا اسے کہ لان کی طرف آخری سرے پر اس کا کمرہ قدم اپنے آپ پرستے ہوئے جا رہے تھے۔ اسے کوئی تردد نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ ایک بے اختیار سی کیفیت طاری تھی جس کے زیر اثر وہ کچھ بھی سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھی تھی۔ اسے سکون کی تلاش تھی۔ جو اسے وہیں مل سکتا تھا۔ جہاں مہرز کی خوشبو تھی۔ اس کی موجودگی کا احساس تھا۔

دروازہ کھولتے ہی اس نے گرمی سانس کے ساتھ اس مخصوص ممک کو اپنے اندر اتار لیا، جو مہرز کی پہچان تھی۔ پتا نہیں واقعی اس کا کمرہ خوشبو سے ممک رہا تھا یا اسے لگ رہا تھا۔

کچھ دیر آئینے کے سامنے کھڑی رہی جیسے مہرز کا عکس ابھی تک وہیں ٹھہرا ہو۔ پھر پیٹلی۔ بیڈ کے نزدیک آئی اور سائڈ ٹیبل پر بچے فریم میں مہرز کی اپنے ماں باپ کے ساتھ تصویر کو ہاتھ میں لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ کافی دیر نہایت غور سے مہرز کو دیکھتی رہی۔ پہلی بار وہ اسے اس نظر سے دیکھ رہی تھی جو غیبی اس کے دل میں مہرز کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ وہ کتنا کڑ لکھتا ہے یہ اسے اب معلوم ہوا تھا۔ سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے اس نے وہ فریم واپس جگہ پر رکھ دیا۔ پھر جانے کیوں اس نے درازیں کھولیں ایک کے بعد دوسری پھر تیسری وہ ہر اس چیز کو بھر پور توجہ دے رہی تھی۔ جس پر مہرز سرسری سی نظر بھی شاید ہی ڈالتا ہوگا۔ پہلی دراز کو آہستہ سے اپنی جانب دھکیلا پھوٹے

بڑے پاکیزہ گفت و گو میں لپٹے رکھے ہوئے تھے اسے بند کرنے کے بعد اس نے دوسری دراز کھولی۔ چھوٹی سی البم ڈائری اور جیولری باکس۔ وہ بھی اس نے بند کر دی۔ پھر تیسری دراز کھولنے کے بعد وہ اسے بند نہیں کر پائی۔ جس میں چھوٹے بچوں کی کہانیاں والی کتابیں اور انگلش کاکس بھری ہوئی تھیں۔ راہین سانس روکے اس دراز میں پڑی کتابوں کو دیکھے گئے۔ وہ سب اس کی تھیں۔

اسے یاد تھا وہ بکس پڑھنے کے بعد مہرز کو دے دیا کرتی تھی مگر کتنے سال ہو گئے تھے۔ وہ انہیں اب تک سنبھال کر کیوں رکھے ہوئے تھا؟ لڑتے کانٹے ہاتھوں سے اس نے سب کچھ دوبارہ اسی طرح رکھا۔ اور دوسری دراز نکال کر اپنے سامنے رکھ لی۔ ڈائری اٹھائی کھولی۔ اس ڈائری میں کچھ بھی لکھا ہوا نہیں تھا۔ پوری ڈائری میں جا بجا اسمتھور ز اور بہت سی ٹائٹلز کے ریپز بیٹھ کیے گئے تھے۔ جو اس نے مہرز کو دیے تھے۔ کلاس دن سے فور تک۔ اسے ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا تھا یا پھر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اچھی طرح دیکھنے کے بعد اس نے ڈائری واپس رکھی اور جیولری باکس اپنی گود میں رکھ کر کھول لیا۔ چھوٹا سا سبز رومال ٹیک ٹوٹا ہوا کلب ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے کٹوے اس نے اپنی آنکھیں رگڑیں۔ وہ سب کچھ صاف صاف دیکھنا چاہتی تھی۔ ایک گرمی سانس لے کر اس نے حلق میں اٹکتے آنسوؤں کو گلے کے اندر اتار لیا۔ استعمال شدہ پنسلیں اس نے منہی منی کئی پنسلیں اٹھا کر دیکھیں جو اتنی چھوٹی ہو چکی تھیں کہ انہیں پکڑ کر کچھ لکھا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اس کی شروع سے عادت تھی۔ وہ ہمیشہ پنسل کو آخر تک استعمال کیا کرتی تھی۔ سب معمولی اور بے کار چیزیں جنہیں مہرز نے کئی خزانے کی طرح سنبھال کر رکھا۔ وہ سب راہین کی تھیں۔

البم میں ان کے اسکول کی بہت سی پیکچرز تھیں کلاس گروپ فوٹوز، پکنک کارنیول اور سب سے آخر میں فیوئل ٹنکشن کی تصاویر تھیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ

کروٹے ہوئے ساری تصویروں کو دیکھ رہی تھی۔ ”یہ محبت بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”میں نہیں مانتی۔“

”نہت مانو وقت خود ثابت کر دے گا۔“

اور وقت نے کیا ثابت کیا تھا۔ بیس اکیس سال۔ اس نے راہین کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کی ایک ایک یاد کو متاع حیات کی طرح سنبھال کر رکھا تھا۔

”میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں راہین آئی لو۔“

کیا تھی وہ۔؟ ایک عام سی لڑکی جسے وہ دیوانوں کی طرح چاہتا آیا تھا وہ پوری دراز راہین سے مہرز کی محبت کے ثبوتوں سے بھری پڑی تھی۔ سب سے پہلی دراز بھی نکال لی تھی اس نے۔ وہ چھوٹے بڑے گفت و گو بہن بہن میں سے اکثر گفت و گو کے کنارے سفید ہو چکے تھے، تقریباً دس گیارہ تھے۔ ہر ایک پر تاریخ پڑی تھی۔ چھوٹے سے کارڈ پر روش کیا گیا تھا۔

”ابھی برتھ ڈے راہین۔“

وہ اس کا گھر جانتا تھا۔ فون نمبر جانتا تھا۔ اس کے باوجود وہ کبھی اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ جس طرح وہ ہر سال اس کی برتھ ڈے یاد رکھتی رہی تھی وہ بھی رکھتا آیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس نے یاد رکھا تھا بلکہ ہر سال کا ایک گفت و گو بھی خریدتا تھا اس سال کا بھی جب وہ الگ ہوئے تھے، حالانکہ اس وقت بظاہر وہ اس سے شدید خفا تھا۔

اتنے پر غلوں انسان نے اسے چاہا، اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہا۔ اور اس نے کیا کیا؟ اس نے مہرز کو دھتکار دیا تھا۔ آخر کیا چاہیے تھا اسے دائمی خوشی؟ لازوال محبت؟ یا عزت و احترام؟

اسے مل تو رہی تھی ہاں اس بہت سے نہیں مل پائی تھی جس سے وہ امید کر رہی تھی مگر مل تو رہی تھی۔ لیکن اس نے شک کیا۔ اور ٹھکرا دیا۔

اس ضدی بچے کی طرح جسے کھانے کو مٹی نہ دی جائے تو مٹھائی کھانے سے بھی انکار کر دیتا ہے۔

اس نے بھی مریز کے ساتھ یہی کیا تھا۔ صرف مریز ہی کیلئے وہ شاہ زیب خراٹیلو فرانی خلاؤں اور کرنز کے ہوتے ہوئے بھی محبت کی کمی کارونا روئے جاری تھی اب تک۔ یہ ناشکری نہیں تو اور کیا تھا۔

نازنین کے ماہر نہ ہاتھ ایک لکڑی کے ہلاک کو خوب صورت جسم میں با آسانی تبدیل کر لیتے تھے پر اس سے اپنی بیٹی اپنے مطابق دھالی نہیں لگی تو سخت ہاتھوں سے اس کی صورت مسخ کرنے پر مل گئی تھی، اپنی بے بسی پر غصہ آتا تھا۔ اسے راین کو ماں سے متوقع محبت نہ ملی تو وہ خود ترسی کی دلدل میں دھنکتی چلی گئی تھی۔

دونوں ماں بیٹی میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ ایک خود پرستی میں مبتلا۔ ایک خود ترسی میں۔ دونوں کیفیات انسان کو صرف ”میں“ تک محدود رکھتی ہیں۔ وہ صرف اپنے بارے میں ہی سوچتے ہیں۔ بس۔ اور ان کے اس ”میں“ کا بھگت ان کے پیاروں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ایک ظالم تو دوسرا مظلوم بن کر تمام عمر اسی رنج میں گرفتار رہتا ہے کہ اسے اس کا حق نہیں ملا۔

یہ دونوں انسان بھی خوش نہیں رہتے، بے یقین، بے اعتبار رہتے ہیں۔ کسی نعمت کا شکر بھی ادا نہیں کر پاتے۔

اپنے من مندر میں خود اپنی مورت سجا کر نازنین اس کے سامنے سرسجود رہتی، بیعت لیتی، روپیوں کی زیور کی ہیروں کی سونے چاندی کی۔ سب چڑھانے لے کر بھی اس بت کے لبوں پر حوصلہ افزا مسکراہٹ نمودار نہیں ہوتی۔ وہ کسی کو کچھ نہیں دے سکتا، ہاتھ کی شکن تک نہیں۔ لبوں کی مسکراہٹ نہیں خوشی تو بہت دور کی بات ہے۔

ایسا ہی بت راین نے بھی خود پر ترس کھا کر بنایا تھا۔ وہ اس کی عبادت نہیں کرتی تھی۔ اس کے گلے لگ کر اپنا دل بٹا کر لیتی تھی، اس کا ہاتھ تمام کر روتی تھی، اب خوشی کے عالم میں وہ بت اسے نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اپنی ماں کے ہاتھوں سے بنائے بت کتنی آسانی سے توڑ ڈالے تھے اس نے اور اپنی مورت؟ اس کے

سامنے وہ خود کو بے جان محسوس کر رہی تھی ہاتھ کیسے اٹھاتی۔؟



اس کا ذہن بے وار ہوا تو اس نے بہت وقت سے آنکھیں کھولیں، کمرے میں نیلگوں سفید سی روشنی تھی۔ وہ شدید تھابت محسوس کر رہا تھا ٹوٹنے جسم میں ہلنے جلنے کی طاقت نہیں تھی۔ یومی لینے لینے وہ یاد کرنے لگا، آخری بار ہوش میں رہتے ہوئے اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ ایک سیڈنٹ۔

اسے یاد آگیا تھا۔ اور اس وقت وہ یقیناً ۱۲ ہسپتال کے بیڈ پر لیٹا تھا۔ لیکن اسے اس طرح بیڈ پر سیدھے لینے ہوئے کتنے گھنٹے یا دن گزر چکے تھے اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ آہستہ سے گردن ہلاتے ہوئے اس نے اپنے ارد گرد دیکھنے کی کوشش کی، کراخالی تھا۔

اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اسی سوچی جاگتی کیفیت میں اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی پھر بند ہونے کی اور پھر قدموں کی چاب لچہ۔ لمحہ نزدیک آنے لگی۔ کوئی اس کے بالکل پیاس اگر ٹھہر گیا۔ مریز بند ستور اپنی آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔

خاموشی کا وقفہ طویل ہوتے ہوئے وہ دوبارہ نیند میں چلنے والا تھا کہ اسے محسوس ہوا، اس کے ہاتھ میں کھمبے چند باریک سونیاں ایک ایک کر کے نکل رہی تھی۔ درد تحلیل ہونے لگا، ہر ایک سونے کے نکتے ہی محبت بھرا لمس جسم میں اترنے لگتا تھا اس کے زخموں کو سہلایا جا رہا تھا۔ ذہن یکدم پوری طرح بے وار ہو گیا۔

کچھ لمحوں بعد وہ جلدی لمس اس کی پیشانی پر بکھرنے لگا، پھر چرے پر۔ جہاں جہاں چھوا جاتا وہ حصہ درد سے خالی ہوتا جا رہا تھا۔

اس کے لب ہمہ سا مسکرائے۔
”کون؟“ اس نے بند آنکھوں سے دیکھنا چاہا۔
وہ لمس ٹھہرا، پھر مسکری سانس میں لینے چند الفاظ کا تعارف اس کے پورے وجود میں مراہت کر گیا۔ اس نے

آنکھیں کھول دیں۔ اسے ہوش میں آنا دیکھ کر وہ مسکرائی۔ جانے اس نے کیا کہا مریز کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، وہ کافی دیر سے اس کا ہاتھ اور پیشانی سہلا رہی تھی جس کے باعث ہر درد معدوم ہونے لگا تھا، پر اب اس کی انگلیاں ساکت تھیں، مریز نے پر سکون ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کہا۔

”رک کیوں گئیں۔ مجھے آرام مل رہا تھا۔“ اس کے ایسا کہنے ہی وہ لمس دوبارہ سے رگ جال میں زندگی بن کر اترنے لگا۔



مریز گہری نیند میں چلا گیا تو راین نے مزہم واپس میڈسن ٹرے میں رکھ دیا۔ وہ اس کے بازو اور چرے پر موجود خراشوں پر مزہم لگا رہی تھی۔ اب جبکہ وہ سوچکا تھا تو راین خاموشی سے اس کے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔

بہت محبت اور پیار سے۔ ایسی نظر سے اس نے آج سے پہلے کسی مرد کو نہیں دیکھا تھا۔ آخر مریز میں ایسا کیا تھا؟ میاں آنے سے پہلے اس نے اپنی پوری زندگی کا تجزیہ کر لیا تھا، اپنے تمام سوالوں کے جواب حاصل کر لیے تھے، اسے کیا نہیں ملا تھا۔ اور اسے کیا چاہیے تھا۔ وہ جان چکی تھی۔

کتاب زندگی کی سب سے طویل الجھن کا اختتام ہو گیا تھا۔ اور بڑے ہی عجیب انداز میں ہوا تھا۔ اس بل، اس لمحے مریز کے گھر میں اس کے بیڈ روم میں۔ اس کی دراز میں رکھی اپنی تمام چیزوں کو دیکھ لینے کے بعد اس نے پہلی بار خود پر غور کیا تھا۔ اور شاید پہلی بار اپنی ذات میں متقید اس یوتے دھوتے ماتم کرتے وجود سے گھن محسوس کی تھی، اسے کراہیت آرہی تھی اس ناشکرے بت سے جو خود اس کا ہم شکل تھا۔ اسی کی ذات کا پر تو۔ اس چھوٹے سے خزانے نے۔ اس کی تو قیر میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ وہ معتبر

ٹھہرا دی گئی تھی، نہایت قابل احترام ہستی جس کے لیے خود ترسی کے بت کو پاش پاش کرنا بے حد سہل تھا اور اس نے کر دیا تھا۔ اپنی زندگی کے چھبیس سالوں میں وہ کتنے مردوں سے ملی تھی۔ اس کے پایا جو ملا سے محبت کرتے تھے مگر جانوروں کی طرح سلوک کرتے اور بے عزت کیا کرتے تھے۔

وہ ترکان جو بہانے بہانے سے ایک کم سن بچی کو گود میں بٹھا کر اپنی حیوانی جبلت کی تسکین چاہتا تھا۔ اس کی ماں کی شاعری سے محبت کرنے والے، جو اپنی غلیظ نگاہوں سے اسے سر سے پاؤں تک ٹاپنے۔ رہتے تھے اور پھر زین۔ محبت کا دعوے دار۔ نکاح میں لانے کے بعد ذلیل کر کے چھوڑ گیا تھا۔ راین کی نظر میں محبت سے زیادہ ناقابل اعتبار کوئی تھائی نہیں۔

اسے عزت و تکریم پانے کی خواہش تھی، ہمیشہ سے، اور یہی خواہش اس سے وہ تمام فیصلے کرواتی چلی گئی تھی جس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی اسے۔

مریز وہ واحد شخص تھا جو صرف اس سے محبت نہیں کرتا تھا، اس کا احترام بھی کرتا تھا۔ اسے خود سے کتر نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی رائے اس کی ناراضی کو دیکھی ہی اہمیت دیا کرتا تھا، جس کی خود اپنے آپ کو دیتا تھا۔ فقط غیر مشروط محبت کا احساس اسے مریز کے قریب نہیں لایا تھا۔ نہیں!

صرف محبت ہوتی تو وہ بھی اعتبار نہ کرتی، کبھی مریز کی زندگی میں شامل ہونے کا فیصلہ نہ کرتی۔ صحیح دیکھا تھا اس نے۔ وہ خواب بھی نہ تھا۔ اس کی عمر بھر کی پیاس صرف مریز ہی، بچھا سکتا تھا۔ اور کوئی نہیں!





شہزادی عیاس خلیجی

تیرے سنگِ حسیں ہے کمر

مکمل ناول

جانتا تھا وہ آئے گی اس کے پیچھے۔ ہمیشہ کی طرح۔
تیز تیز میڑھیاں چڑھنے کے باعث اس کا سانس
پھول رہا تھا۔ وہ چپ چاپ رخ موڑے خفا خفا سا کھڑا
رہا۔

”اوہو! ایک تو تم نے یہ عورتوں کی طرح ذرا ذرا سی
بات بروٹھنا کہاں سے سیکھ لیا ہے؟“ وہ خاموش رہا۔
”مگر تیا ابا کچھ کہتے ہیں تو تمہارے بھلے کے لیے

سنگ مرمر کی تنگ میڑھیاں پھلا نکتا وہ تیزی
سے اوپر آگیا۔ مدھم چاند کی روشنی میں اس کے
پرکشش نقوش پر پھیلا اضطراب اور پاپوسی آسانی سے
دکھائی دے رہے تھے۔ چند لمحوں قبل اس سے کسی
جانے والی بات کے اثر نے اسے یوں سب کے پیچ سے
اٹھ آئے پر مجبور کر دیا تھا۔

”مرنضی! وہ بھی اس کے پیچھے ہی آئی تھی۔ وہ

ہی کہتے ہیں!

”کہیں ضرور کہیں۔ مگر یوں ہر کسی کے سامنے تذلیل کب لے؟“ وہ چٹکا۔

”مرضی!۔۔۔ اب میں آیا اور بین تہمارے لیے ہر کسی ہو گئے؟“ اس کے خفگی سے کہنے پر وہ جل ضرور ہوا۔ مگر سن پھیرے ہی کھڑا رہا۔

”پتا نہیں۔۔۔ مگر مجھے اچھا نہیں لگتا۔۔۔ ہر وقت ایک ہی رٹ، ایک ہی طعنہ، کچھ نہ کرنے کا، خالی بیٹھا رہنے کا۔ میں کوشش کرتا رہا ہوں۔ پڑھنے کے ساتھ نوکری کے لیے جوتیاں چٹا تو رہا ہوں۔ پھر کیوں مجھے بار بار ایسی باتیں سننے کو ملتی ہیں؟“

”اوہو!“ اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ”یہ باتیں تو تمہیں سرگرم رکھنے کے لیے ہوتی ہیں ناں بے وقوف!“ نیم سنجیدہ انداز میں کہہ کر وہ تھوڑا آگے بھکی۔

”یہ لفظ ہی تو تمہیں سرگرم عمل رکھتے ہیں۔ انہیں کتنے سمجھنا۔“ وہ شرر انداز میں بولی۔

”بس کر لیو کلاس؟ اب جاؤ یہاں سے۔ میں اوپر کچھ وقت سکون سے گزارنے آیا ہوں اور یہاں بھی تمہاری چیخ جیسی زبان۔۔۔“

”سوچ لو لو کہ! میں چلی گئی تو پھر واپس نہیں آؤں گی۔“ وہ ہمیشہ سے ایسے ہی تھی۔ غیر سنجیدہ۔۔۔ لا ایل۔

”ہاں ہاں۔۔۔ جاؤ۔“

”اوکے! پھر میں تو چلی۔ اور یہ جو تمہاری پسند کی میٹھی مٹی لائی تھی ناں۔۔۔ یہ بھی لے جا رہی ہوں۔“ ہاتھ میں تھپی کاغذ کی بی بی دو کھپوں میں مٹی لیے وہ واپس مڑی۔ مرضی نے تھوڑا سا ہلٹ کر دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے کھڑی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”نیدیدے!“ دونوں کھٹکھٹا کر پیش پڑے۔

مرضی چلتا ہوا چھت کی منڈیر کے پاس کھڑا ہوا۔ ام مریم بھی چلتی ہوئی اس کے پاس جا رہی۔ زرد زرد سا چاند ہلکی چاندنی کھیرے ہوئے تھا۔ چھت پر پھیلے سانے کے دامن میں زردی بہتی چاندنی بہت سحر

آفرین لگ رہی تھی۔ ام مریم آگے بڑھ کر اس کے ساتھ آکھڑی ہوئی۔

”لو کھاؤ۔۔۔ اپنی فیورٹ میٹھی مٹی۔“ مرضی نے ایک نظر اس کے بڑے ہاتھ کو دیکھا اور پھر اس کے چہرے کو جو خلوص و اپنائیت کی روشنی سے دمک رہا تھا۔

”میری شکل کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔ لون! اس نے کاغذ کی کپی اس کے ہاتھ میں تھادی اور خود بھی مکن سی کھانے لگی۔

مرضی کو اس پر نوٹ کے پیار آیا۔ وہ اسے اپنی مٹی میں سے دانے اس کی کون میں ڈالتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسے یہ کتنی پسند تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے حصے کی چیز بھی اسے دے دیا کرتی تھی۔ وہ تو اور بھی بہت کچھ جانتی تھی۔ یہ بھی کہ اگر اسے فوری طور پر منایا نہ جائے تو وہ اگلے کی روز تک منہ پھلائے پھر تھکا۔ اس لیے وہ ہمیشہ سے اسے منانے میں لحوں کی بھی تاخیر نہ کرتی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ سب کا دل ٹھنڈا رکھنے والی، سب کو خوش دیکھنے کی تمنا کرنے والی۔

”بھئی کبھی میں سوچتا ہوں ام مریم! تم ایسے حالات میں اتنی مطمئن کیسے رہتی ہو؟“ وہ اپنے دل کی بات زبان پر لے آیا۔

”مطلب؟“ تھپی پر دھرے مٹی کے دانے ایک ایک کر کے ٹوٹ گئی وہ اسے نا سمجھی سے دیکھنے لگی۔

”ہم اور ہمارے حالات ایسے تو ہیں نہیں کہ خوش باش پھرتے رہیں۔“ اس کی غیر حاضردماغی پر وہ قدرے جھنجھلا یا۔

”کیوں؟ ہمارے حالات کو کیا ہوا؟“

”تن پر ڈھنگ کا کپڑا نہ ہو۔ کھانے کو اچھا دستیاب نہ ہو تو کوئی کیسے خوش رہ سکتا ہے؟ کیونکہ مطمئن ہو سکتا ہے؟“

”اف! اللہ مرضی! کتنی بڑی بڑی باتیں کرتے ہو۔ شکر ہے رب کا کہ ہمارے تن پر کپڑا بھی ہے اور کھانے

کو اچھا بھی دستیاب ہے۔ اب اپنے ہاتھ میں یہ میٹھی مٹی ہی دیکھ لو۔“ بات کے اختتام پر وہ پھر چمکی۔

”مذاق نہیں۔“ وہ قہقہہ سی انداز میں بولا۔

”اچھا اچھا سو رہی!“ جھٹ معذرت کر لی گئی۔ وہ اسے دوبارہ تھا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”دیکھو ناں! ہم اپنے کھر کے حالات سے بخوبی واقف ہیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم نے اپنی تعلیم کس طرح پوری کی ہے۔ کیونکہ یہ ہی ایک رستہ ہے کہ ہم اپنے حالات سدھار سکیں۔ خوشحالی کا منہ دیکھ سکیں۔ پارٹ ٹائم جاب ڈھونڈنے کے چکر میں جوتے تو کیا پاؤں بھی گھس گئے ہیں۔ ایسا کب تک چلے گا یا۔“

”مرضی! تم پارٹ ٹائم جاب ڈھونڈ بھی تو ایسی کمپنیوں میں رہے ہو جو فل ٹائم ورکر بھی مشکل ہی سے رکھتے ہیں، کئی چھوٹی موٹی نوکری سے شروعات کر لو۔ اپنی ڈگری ساتھ ساتھ پوری کرو۔ تب تک ان شاء اللہ بہت اچھی جاب مل جائے گی تمہیں۔“

”ہونہ۔۔۔ یہ اچھی نوکریاں بھی صرف امیر زادوں کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ ہم جیسوں کے پاس تو نہ ٹکڑی سفارش نہ اتنا پیسہ کہ ان کا منہ بھر کر نوکری حاصل کر لیں۔“ کیسی نا اصفانی ہے۔۔۔ آخر یہ سب کچھ ان امیروں کا ہی حق کیوں ہے؟“ ہمارا کچھ حق نہیں ہے۔“

”کچھ نہیں۔۔۔ بہت کچھ ہے جس پر امیر غریب کالے گورے، شہنشاہ، گداگر سب کا برابر کا حق ہوتا ہے۔“ پوری آنکھیں کھول کر وہ بالکل اس کے سامنے کھڑی اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مرضی نے سر جھٹک کر منہ موڑ لیا۔

”ذرا ادھر دیکھو۔ وہ اوپر آسمان میں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کی بے مکی بات پر ادھر دیکھنے لگا۔

”ہاں! کیا نظر آیا؟ چاند۔۔۔ کتنا حسین ہے ناں؟ اس کی ٹھنڈی میٹھی روشنی کسی حسب و نسب دولت و شہمت، امیری و غریبی سے بے نیاز سب کے لیے

کیساں ہے۔ یہ تارے ہی دیکھ لو۔ یہ صرف کسی امیر آدمی کے آگے نہیں ٹٹماتے۔۔۔ پھر یارش جیسی نعمت سے بھی ہم محروم نہیں۔ سورج کی پیش سُرودی کی خنکی اور۔۔۔“

”بس بس۔۔۔ مان لیا کہ یہ سب ہر خاص و عام کے لیے ہیں۔ مگر ان سے پیٹ نہیں بھرتا۔ امیروں کی تجوریاں بھری ہیں، فخر و ذخیرہ خوراک سے لدے ہیں۔ ہر نعمت انہی کے لیے ہے۔ ہر چیز جیسے ان ہی کا حق ہے۔“

یہ برے حالات سے گھبرائے اور روشن مستقبل کے لیے بھاگ دوڑ کرتے اور اس میں مسلسل ناکام ہوتے ایک نوجوان کی بھڑاس تھی جو وہ اس لڑکی کے سامنے نکال رہا تھا جس سے وہ اپنی ہر بات بے فکری سے کر سکتا تھا۔

”کہہ تو تم صحیح رہے ہو۔ مگر یہ سمجھ لو کہ جس کے نصیب کا جتنا رزق لکھا ہے، وہ اسے ملتا ہے۔“

”تو شاید میرے نصیب میں رزق ہے ہی نہیں۔“

”ماتھے پر ہل ڈالو۔ پھر خفگی سے بولا۔

”کیوں نہیں ہے۔ ضرور ہے اور بہت زیادہ رزق لکھا ہے۔ یہ میں تمہاری چمکی پیشانی پر دیکھ سکتی ہوں کہ تمہارا مستقبل بہت نمایاں ہو گا لڑکے! بس بہت و جرات سے کوشش کرتے رہو۔ کامیابی تمہاری قدم بوسی کو ہمیں کہیں آس پاس ہی ہے۔“ کسی سیانے

بزرگی کی طرح سر دھتے ہوئے وہ اسے تسلیاں دے رہی تھی۔ مرضی نے سر جھٹکا۔

ام مریم کی یہ حد سے بڑھی ہوئی خوش فہمی اسے حیرت میں ڈالنے کے ساتھ ساتھ جھنجھلاہٹ میں بھی مبتلا کر دیتی تھی۔

”دیکھو۔۔۔ تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں؟“ وہ کھسک کر قریب ہوئی اور سر کو شیانہ انداز میں بولی۔

بجائے کوئی جواب دینے کے وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”ایک چیز ایسی ہے جو صرف تمہارے پاس ہے۔“

وہ کسی بڑے سے بڑے رئیس اعظم اور شہنشاہ سفیر وزیر کو بھی حاصل نہیں۔ بتاؤں کیا؟ وہ اپنی چستی آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

”ام مریم۔۔۔!“ ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر وہ قدرے جھک کر اسے بولی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ یہ جواب وہ جانتا تھا اور پورے دل سے اس کی سچائی کا اعتراف بھی کرتا تھا۔

کہ ام مریم کے لیے مرتضیٰ اور مرتضیٰ کے لیے ام مریم کا وجود تنگ دستی کے ان تاریک حالات میں بھی حوصلے و ہمت کا وہ نمونہ بن جاتو تھا۔ جسے وہ اپنی نم ہتھیلیوں میں لیے تبدیلی وقت کی اچھی امید باندھے آگے کی طرف قدم بڑھاتے چلے جا رہے تھے۔



چھ ہزار ماہوار آمدن کے حصول کے لیے جان مارنے والا عبدالرحیم کپڑے کی ایک دکان پر بطور سیلر مین کام کرتا تھا۔ یہ سیلر مینی اب کی بات نہ تھی۔ بلکہ بارہ سال کی عمر میں اس کا باپ اسے کپڑے کی جس دکان پر چھوڑ آیا تھا وہیں کام کرتے کرتے اس نے عمر بتادی تھی۔ سالوں کی وفاداری کے صلے میں ایک ایک سو روپیہ سالانہ بڑھتی تنخواہ ڈیڑھ ہزار سے چھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ساتھ ہی اسے سینئر سیلر مین کا درجہ بھی دے دیا گیا تھا۔ اس کا مالک اس سے خوش تھا۔ اس کی ایمان داری اور شرافت کی لوگ قدر کرتے تھے۔ کم کو ساعبدالرحیم اپنے حالات پر قانع اور صبر شکر کرنے والا شخص تھا۔ مگر وہ بیٹیوں کی ذمہ داری اور اس سے بسکدوش ہونے کا خیال اس کے ناؤں کندھوں پر بار لاو کے انہیں مزید جھکا دیتا تھا۔ اس کی بیوی حمیدہ دوسری بیٹی کی پیدائش کے وقت کچھ عرصہ علیل رہی اور اس سے قبل کہ بیماری کی تشخیص ہو پائی وہ ملک عدم سدھا رہ گئی۔

عبدالرحیم نے اپنی بساط کے مطابق بیٹیوں کو تعلیم دلوائی تھی۔ کم از کم یہ ایسا زیور تھا جس سے وہ اپنی

بیٹیوں کو آراستہ کر سکتا تھا۔ ام مریم بڑی اور حسین چھوٹی تھی۔ گورنمنٹ اسکولوں میں پڑھ کر خوب محنت کے نتیجے میں ملنے والی اس کا رشپ نے ہی دونوں کو کالج کے گیٹ کو عبور کرنے کا حق دار ٹھہرایا تھا۔ کیونکہ محنت کسی بھی ہو کبھی رائج نہیں جاتی۔

بی بی ایس سی کے بعد ام مریم اور ایف اے کے بعد حسین نے تعلیم کو خیر یاد کہہ دیا۔ دونوں میں محض تین سال کا فرق تھا۔ مگر عقل اور بردباری میں حسین ام مریم سے کہیں آگے تھے۔ ام مریم میں بڑی ہونے کے باوجود گلندرا پن تھا۔ وہ اپنے حال میں مگن رہنے والی لڑکی تھی۔ اسے نہ تو کبھی محلہ رسول نگر کی تنگ اور سانپ کی طرح بل کھائی لمبی لمبی گلیوں میں ایک دوسرے کے اندر دھنستے گھروں سے وحشت ہوتی تھی۔ نہ ہی ہر گھنٹے بعد ہوتی نوڈ شیڈنگ کے نتیجے میں پھیلے اندھیرے اور جس سے اس کی جان جاتی تھی۔ وہ اپنی ڈھائی مرلے کی چھت پر چڑھ کر اکا دکا آگے ہوا گئے جھونکوں سے ہی خوش ہو جاتی۔ چھت پر گھٹن تک ہونے کی واحد وجہ ذرا کی ذرا ترس کھاتی ہوا ہی نہ تھی۔ بلکہ دیوار سے ملحقہ چھت اور نیچے اس کا چھوٹا سا تنگ صحن بھی اسے انتہائی خوشگوار لگتا۔ پتہ تیارش کے دونوں میں برستے مینہ کو دیکھ کے کبھی کبھی پکڑوں کی عیاشی۔۔۔

دیوار کے اس پار مرتضیٰ کا وجود اس کے لیے انتہائی ٹھنڈک بھرا احساس تھا۔ مزاجاً ”مشرق اور مغرب ہونے کے باوجود دونوں میں گرمی دوستی تھی اور اب سے نہیں بچپن سے تھی۔ بچپن میں کبھی کھیلے گئے ”گھر گھر“ میں دو لہوا دہسن بننے کا روپ سلاسا منظر صرف ام مریم کے بچے عمر کے خوابوں میں شامل نہ ہوا تھا۔ بلکہ مرتضیٰ کے لیے بھی اس کا وجود ناگزیر تھا۔ خاص تھا۔

عبدالرحیم سے بڑے عبدالکریم تھے۔ ساری زندگی ایک پرچون کی دکان پر چاکری کرنے کے بعد انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنی کریانے کی دکان کھول

لی تھی۔ رسول نگر کے چوک میں ”عبدالکریم جنرل اسٹور“ کے چھوٹے سے مٹے مٹے لفظوں سے سجی ڈبہ نما چوکور دکان صرف اتنی تھی کہ تین اطراف کی دیواروں میں اوپر تک بنے لکڑی کے خانوں میں بھرے مسالاجات وال کھجی، چینی اور زمین پر دھری آنے کی تین چار بوریوں کے بعد بس اتنی جگہ بچ پائی کہ ایک اونچا اسٹول رکھ کر اس پر بیٹھا جاسکے۔

مگر عبدالکریم ”اپنے کاروبار“ کی برتری اکثر عبدالرحیم پر جتانے رہتے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہیں بھی اب نوکری کو چھوڑ کر کوئی چھوٹا موٹا اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔ مگر سرمائے کے بنیاد ناممکن تھا۔

گیارہ سال تک دونوں اپنے باپ کی چھوٹی واحد جائیداد اس پانچ مرلے کے گھر میں رہتے رہے۔ پھر بچوں کے بڑا ہونے کے عذر کو سامنے رکھ کے صحن سے ایک دیوار کھینچ کے ڈھائی ڈھائی مرلے کا بیوڑا کر لیا گیا۔

عبدالکریم کے پانچ بچے تھے۔ مرتضیٰ تیسرے نمبر پر تھا۔ اس سے بڑی دونوں بیٹیوں کو عبدالکریم نے جیسے تیسرے برادری میں بیاہ دیا تھا۔ اس کے بعد چھوٹی منزو اور کاشف بھی سرکاری اسکولوں میں تعلیم کھیت رہے تھے۔

ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ مرتضیٰ کی سوچ بھی بہت اونچی تھی۔ وہ ایک ہی جست میں امیری و غربی کے مابین اس لکیر کو پار کر لینا چاہتا تھا۔ رسول نگر کی تنگ گلیوں میں پورا بچپن تانے کے باوجود اب وہ اسے زہر لگتی تھیں۔ اس کا دم گھٹتا تھا۔ سبز مائل کابی زوہ اینٹوں والی انہی گلیوں میں پوری پوری دوسرے گلی ڈیڑا اور چھوٹے چھوٹے گڑھے کھود کر کھینچنے کھیلنے والا مرتضیٰ اب ان ٹوٹی گلیوں اور اونچی نیچی چھتوں والے گھروں سے بے حد تلالا تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرح پوری زندگی ڈھائی مرلے کے اس گھر اور چوک کی ڈبہ سی دکان کے چکر کاٹتے ہوئے نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ اپنی محنت اور ذہانت کے بل پر پنجاب یونیورسٹی کے ایم بی

اے کے اسٹوڈنٹس میں وہ نمایاں تھا۔ پڑھائی لڑ کے یونیورسٹی سے آنے کے بعد پارٹ ٹائم جاب کی تلاش میں اسے پورا سال گزر گیا تھا۔ مگر ڈھنگ کی ایک بھی جگہ پر اسے موقع نہیں ملا تھا۔

مگر ام مریم کا کہنا تھا کہ ”تبدیلی کائنات کا اصول ہے حالات کبھی کبھی ایک جیسے نہیں رہتے۔ دونوں کے الٹ پھیر لازم و ملزوم ہیں۔“



کمرے میں بڑھتے جس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے پہلے اوپر پھرت پر لگے عینے کو بجلی چلے جانے کے باعث ہولے ہولے گھومنے کے بعد رکتے ہوئے دیکھا اور پھر دووازے سے باہر چڑھ آنے والے سورج کی روشنی پر ایک نظر ڈالی۔ جس نے صحن کے ساتھ ساتھ مختصر سے برآمدے کا بھی کچھ حصہ روشن کر رکھا تھا۔ اس کی نگاہ سالوں پرانی دیوار گیر گھڑی پر پڑی۔ صبح کے نو بج چکے تھے۔

آنکھیں ملتی وہ اٹھ بیٹھی اور زور دار جھانکی۔ یہ گھڑی اس کے دادا کے زمانے کی تھی اور ابھی تک ساتھ بھا رہی تھی۔ اس نے سرانے رکھا دوپٹا اٹھا کر شانوں پہ پھیلایا اور بکھرے بال سمیٹ کر کچھو میں باندھے۔ ٹانگ کے نیچے بڑی چیل اسٹی باہر چلی آئی۔ بین صحن میں لگائی گئی واشنگ مشین سے کپڑوں کا آخری چکر نکالنے کے بعد اب انہیں کھنگال رہی تھی۔

یہ اس کی سالوں پرانی عادت تھی۔ علی الصبح بیدار ہونے کا خیال۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں تھا۔ بلکہ اگستے

کے ساتھ ہی سارا کام مارا مار پٹا کر وہ اس وقت بالکل فارغ ہو چکی ہوتی جب ام مریم بستر سے اٹھتی۔ ایسا نہیں تھا کہ ام مریم کال یا کام چورھی بلکہ نماز فجر کی ادائی کے بعد اسے نیند اس زور سے جھڑنے لگتی کہ وہ بے بس کی پھر بستر میں گھس جاتی۔ پھر اٹھنے کے بعد وہ اپنے کام ست روی سے ہی کسی مگر پوری دلجمعی سے بچاتی تھی۔ کھانا بنانے کی ذمہ داری ام مریم کی ہی تھی اور بقول عبدالرحیم کے ان کی بیٹی کے ہاتھ میں وہ ذائقہ ہے جو اس کی مرحومہ ماں کے ہاتھ میں تھا۔

ام مریم وہیں صحن میں لگے تل کے پاس بیٹھ کر منہ دھونے لگی۔ تل کے اوپر ایک چوکور سا چھوٹا شیشہ اور اسینڈ لگا گیا تھا۔ منہ دھونے کے بعد اس نے اسینڈ کے اوپر رکھے کنگھے سے بال سیدھے کیے اور ڈھیلی سی چٹا بنا کر بیڑھی پر بیٹھ گئی اور بین کو دیکھنے لگی جو اب کپڑے صحن میں بندھے تار پر پھیلا رہی تھی۔ اس وقت کپڑے کم تھے۔ ورنہ معمول کے دنوں میں چھت پر رکھائے جاتے تھے۔

”ناشتا بنا دوں؟“ کپڑے لگتی پر ڈالنے کے بعد وہ دوپٹے سے ہاتھ لے کر چھتی اس کے پاس آئی۔

”ناشتے کا تو بالکل بھی دل نہیں کر رہا۔ گرمی بھی تو بلا کی پڑ رہی ہے۔“

اس نے چھوٹے۔ مگر صاف ستھرے دھلے دھلائے سرخ اینٹوں والے فرش کی دائیں جانب بنی کیاریوں میں لگے موتھے اور گلاب پر نظر ڈالی۔ ان کے ساتھ اہلی کے پورے لگائے گئے تھے شبتوت اور امروہ کے۔ درخت بھی تھوڑے فاصلے پر لگے تھے۔ اس چھوٹی سی کیاری میں تین چار طرح کے پودے اور درخت لگے تھے کیاری میں پانی بھرا تھا۔

”آپا زینب آئی ہوئی ہیں۔ ان کا چھوٹا بیٹا کھلکا ہوا آیا تھا تو پتا چلا۔“

ہی اتار چکی تھی۔

”اوہو! ناشتا تو کر لو۔ آپا کہیں بھاگی تو نہیں جا رہیں۔“ مسکراتے ہوئے بین بولی۔ ام مریم کی بیڑھی چھتی وہ سمجھتی تھی اور اس کی وجہ بھی۔ مرضی کو دیکھنے بنائے سکون اٹانا ممکنات میں سے تھا۔

”اوہو تو کیا ناشتا بھاگا جا رہا ہے؟“ امی کے انداز میں کہتے ہوئے وہ چوٹھ پار کر کے اگلے ہی بل ساتھ والے نیلے دروازے کے پٹ کو دھکیل کر اندر تھی۔

”السلام علیکم آیا جانی۔ السلام علیکم تائی امی!“

ڈیوڑھی سے ہی سلام بھاڑتی وہ خوش دلی سے آگے بڑھی۔ سب ہی برآمدے میں بیٹھے تھے۔

”وعلیکم السلام! آج تو صبح صبحی چاند نکل آیا ہے۔“ زینب اسے محبت سے دیکھتے ہوئے بولی جو اس کے چھوٹے بیٹے کو گھر میں اٹھائے چناٹ چوم رہی تھی۔ وہ بھاگ کر صحن میں ہی اس کے قدموں سے جا پڑا تھا۔

”مبارک دلت ابھی ابھی منہ دھو کے آپ کی آمد کی اطلاع ملنے ہی پہنچے ہیں۔“ تائی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اچھا کیا آگئیں۔ تمہارے آنے سے تو رونق ہو جاتی ہے۔“

مرضی کے لیے ناشتا بنانے اٹھ گئیں۔ اس کا یونیورسٹی جانے کا نام تھا۔

ام مریم کی آواز سن کر اندر کمرے سے شرٹ کاٹین بند کرنا مرضی مسکراتے ہوئے برآمد ہوا۔

”اوئے چیل! ابھی اپنے معمولات میں بھی تبدیلی لے آیا کرو۔“ شرارت سے کہے جملے میں اس نے ام مریم کی روز صبح آمد کی طرف اشارہ کیا تھا۔ مگر ام مریم نے بھی ڈھٹائی کا ڈھول بجا رکھا تھا۔

”جوبدل جائے وہ کمزور ہوتا ہے محترم!“ اس نے ڈانٹ لگ جھاڑا اور خود ہی ہنس پڑی۔ کیا اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے مسکرا دیں۔ وہ ان کی پسندیدگی کو بت پہلے سے جانتی تھیں اور تائی کو چھوڑ کے باقی سب کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ بلکہ سب پورے دل سے آمادہ تھے۔

اس کا اخلاق اتنا ہی دل موہ لینے والا تھا کہ ہر ایک کو اپنا گرویدہ کر لیتا۔ اور یہی بات مرضی کو اس کی سب سے زیادہ پسند تھی۔

تائی رخشندہ ذرا تھکے مزاج کی تھیں۔ حالات سے گھبرا کر اکثر قسمت کی کم مائیگی کا رونا روتیں اپنے کرم بھوٹ جانے پر ناٹاں رتھیں۔ وہ کم از کم ”بھو“ کیسے ہی جان مار مار کر گزارا کرتے والے ”بھو کے بٹکے خاندان“ سے نہیں چاہتی تھیں۔ اپنے لائق فائق سپوت میں انہیں امید کی کرن نظر آتی تھی۔ جو مزاج کا کچھ حصہ انہی کا لے کر پیدا ہوا تھا۔ حالات سے خفا خفا سا انہیں ایک وہ بدل لینے پر سرگرداں۔

مگر ام مریم ہار ماننے والوں میں سے نہ تھیں۔ اس کی امید کی مشعل ہمیشہ جلتی رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ محبت سے کسی کا بھی دل جیتا جا سکتا ہے۔

ام مریم وہاں تک بیٹھی رہی۔ جب تک مرضی ناشتا کر کے مسکراتی نگاہوں سے اسے خدا حافظ کہہ کر یونیورسٹی کے لیے نکل نہیں گیا۔ گھر سے نکلتے مرضی کی چوڑی پشت کو محبت سے دیکھتے ہوئے بے اختیار اس نے آیت الکرسی پڑھ کر عتابانہ ہی اس پر

پھونکی تھی۔ اس کے تحفظ و سلامتی سے گھر واپس آجائے کی دعا بے ساختہ ہی اس کے لبوں پر در آئی تھی۔ یہ بھی اس کی سالوں سے پختہ عادتوں میں سے ایک تھی جیسے بدلنے پر وہ ہرگز تیار نہ تھی۔ ایسا گمان بھی اس کے لیے سوہان روح تھا۔

ام مریم کی صبح ہی مرضی کی صورت دیکھنے سے ہوتی تھی۔ وہ اپنی صبح کے سنہری ہونے میں ایک دن کا بھی ناغہ کرنے کے حق میں نہ تھی۔

ڈپارٹمنٹ کے سرسبز سے احاطے سے گزرتے ہوئے وہ دونوں آخری کلاس لے کر سرحد کے دیے گئے اسٹانٹنٹ کو ڈسکس کرتے ہوئے پارکنگ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سکندر کو اپنی گاڑی میں اسے مین روڈ تک لفٹ دینی تھی۔ ہاتھ میں بھی نوٹس کی کلپیڈ میں سے ایک اس نے الگ کر کے مرضی کے حوالے کر دی اور اسی کے متعلق بات کرتا ہوا اپنی سفید ہونڈا سوک کی جانب بڑھا کہ یکایک سی اور اس کے گروپ کے تین چار لوگ ہاتھوں میں بیٹ اور ہاکی تھامے سامنے آگئے۔ یہ بدنام زمانہ گروپ تھا۔ بد معاشی ان کا توبہ تھا۔

اس وقت بھی ان کے خطرناک عزائم ان کے چہروں پر پھیلی کرختی اور ہاتھ میں تھے ہتھیاروں سے عیاں تھے۔ اس سے پہلے کہ دونوں کچھ سمجھتے اور سنبھل پاتے، انہوں نے آگے بڑھ کر نابالغوں کی ہارپاکی اور بیٹ برسانا شروع کر دیے۔ اس اچانک حملے پر وہ حواس باختہ ضرور ہوئے تھے۔ مگر اپنے بچاؤ کے لیے انہوں نے بھرپور مزاحمت کی اور جوانی کا رروائی کے طور پر ایک دو کوری طر جیٹ بھی ڈالا تھا۔ مگر وہ تعداد میں پانچ تھے اور ہتھیاروں سے لیس تھے۔ نئے دو لوگ ان کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔

ان میں سے ایک نے جب سے جھوٹا۔ مگر تیز دھار والا چمکتا ہوا چاقو نکالا۔ اس کا مقصد سکندر اور مرضی کو ہراساں کرنا تھا۔ مگر مرضی کو لگا وہ چاقو سے حملہ کرنے

لگا ہے۔ بے اختیار دوڑ کر اس نے لڑکے کے چاقو والے ہاتھ کو پکڑنا چاہا۔ لہرانے کی وجہ سے وہ اس کا ہاتھ تو نہ پکڑ پایا۔ لیکن چاقو کا تیز دھار پھل اس کی مٹھی میں آگیا۔ نئے تیزی سے کھینچے ہوئے وہ لڑکا پیچھے ہٹا۔ خون ایک باریک دھار کی صورت میں مرتضیٰ کے ہاتھ سے بہنے لگا۔

ایک ہاتھ کو دوسرے میں تھامے دوڑ سے دھڑلے ہوئے مرتضیٰ کو زمین پر بیٹھتے دیکھ کر وہ فوراً سے پیشتر فرار ہو گئے۔

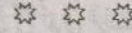
سکندر نے بھاگ کر مرتضیٰ کو اٹھایا اور سہارا دے کر گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بٹھا کر نشوونما سے بہت سے نشوونما کے اس کی ہیلی پر رکے۔ مرتضیٰ کا پیلا پڑا رنگ اسے پریشانی میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ گاڑی دوڑاتا ہوا قریب کے ہسپتال میں ایمرجنسی میں پہنچا۔ خون سے مرتضیٰ کی آستین بھر چکی تھی۔ ڈاکٹر نے فوری طور پر خون صاف کر کے طبی امداد پہنچانی شروع کر دی۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں سکندر کے والد عبدالرحمن ہمدانی وہاں پہنچ گئے۔ سکندر نے انہیں مختصراً سارا واقعہ سنایا۔

کچھ دن قبل سی کے گروپ کا ایک لڑکا فائن آرٹس کی ایک لڑکی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے پایا گیا تھا۔ لڑکی کی چیخ و پکار پر وہاں سے گزرتے سکندر نے لڑکے کو منع کیا۔ نتیجے کے طور پر وہ اس کے ساتھ ہتھم گتھا ہو گیا۔ اسی ہاتھ پائی میں سکندر نے اس لڑکے کی اچھی خاصی ٹھکانی کر دی۔ اسی کا بدلہ لینے آج پورے گروپ نے ان پر حملہ کیا تھا۔

”یہاں! یہ مرتضیٰ ہے۔ میرے چکر میں یہ بھی بری طرح چھنچھن گیا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے اور سنسان جگہ دیکھ کے انہوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔“

”فکر نہیں کرو۔ میں وی سی سے بات کرتا ہوں۔ یونیورسٹی میں ایسی بد معاشی کوئی کیسے کر سکتا ہے۔ ان کے خلاف ایکشن لیا جائے گا۔“ ان کی بات پر سکندر نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

”گیت ویل سون بیٹے۔“ مرتضیٰ کا کندھا تھپتھا کر وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے اور مرتضیٰ کا ذہن ان کی شان دار شخصیت اور برائے نوٹیں پر لگی ڈائنڈ ڈالٹی پن میں اٹکا رہ گیا۔ ان کے جانے کے بعد بھی عیش قیمت کولون کی منک پورے گمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ گمری سانس بھر کے اس نے آنکھیں موند لیں۔



صحن میں بچے پناگ پر بے تکلفی سے پھیل کر بیٹھی وہ کاشف کی بائو یونی کی پریکٹیکل نوٹ بک پر ڈایا گرام بنانے میں مگن تھی اور کاشف چہرہ دونوں ہتھیلیوں پر رکھے پورے اٹھماک سے اس کی ڈرائنگ دیکھ رہا تھا۔ نائی رخشدہ دوبار آکے چائے کا پوچھ چکی تھیں۔ اتنی مہیاں وہ عام حالات میں نہ ہوتی تھیں۔ مگر اس وقت ام مریم ان کے بیٹے کو پرہانے میں مصروف تھی۔ سو اتنا پوچھنا تو اس کا حق بنایا تھا۔ ڈایا گرام مکمل کر کے وہ ایک دم سیدھی ہوئی اور نوٹ بک والا ہاتھ دور لے جا کر آنکھیں سیکڑ کر جازہ لیا۔

”واہ۔۔۔ کیا شاہکار ڈایا گرام بنائی ہے میں نے۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ کاشف بھی تعریفی نظروں سے اتنی پرفیکٹ اور خوب صورت ڈایا گرام دیکھ کر خوش ہوا تھا۔

”ارے واقعی مریم آپ نے تو مکمل کر دیا۔“ وہ جوش و خروش سے گویا ہوا۔

”دیکھا پھر۔۔۔ ایسا کون سا کام ہے بھلا جو تیری مریم آپنی نہیں کر سکتی؟“ اس نے فرضی کالر جھاڑے۔ منہ زہی ان کے پاس جھکی ڈایا گرام دیکھ رہی تھی۔ ایک دم داخلی دروازہ کھلنے پر ام مریم نے سب سے پہلے مڑ کر دیکھا۔ مرتضیٰ دائیں ہاتھ پر سفیدی پابندھے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کی خون سے بھری آستین دیکھ کے مریم کا دل حلق میں آگیا۔ وہ تیزی سے سب چھوڑ چھاڑ کے تخت سے اترتی اور بھاگ کر اس تک پہنچی۔

”یہ۔۔۔ یہ کیا ہوا؟“ تشویش بھری آواز پر اندر سے رخشدہ نائی بھی نکل آئیں۔

”ارے! یہ کیا ہوا ہاتھ پر؟“ نائی بھی پریشان سی اس کی جانب لپکیں۔

”کچھ نہیں۔۔۔ بس ایک جھگڑا ہو گیا تھا۔“ اس نے نرمی سے سب کو بتایا اور اندر کی جانب بڑھا۔

”کس سے جھگڑا ہو گیا؟ کیوں ہو گیا؟ اتنی چوٹ کیسے آئی؟“ رخشدہ بیٹے کا زرد رنگ دیکھ کے فکر مند سی پوچھنے جا رہی تھیں۔

”یونیورسٹی میں کچھ لڑکوں نے جھگڑا کیا تو بس ہلکا سا زخم آگیا ہاتھ پر۔ آپ پریشان مت ہوں۔ میں ٹھیک ہوں۔“ انہیں مزید پریشان ہونے سے بچانے کے لیے اس نے چاقو والی بات حذف کر لی۔

”خاک ٹھیک ہو۔۔۔ صورت دیکھو اپنی۔ بالکل بلدی جیسی ہو رہی ہے۔“

”ٹھیک ہوں اماں۔“ وہ بے زار سا ہوا۔

”اچھا تو لیت جا دو۔۔۔ اے بچو! سمیٹو اپنا یہ کاٹھ کباڑ اور اٹھو یہاں سے۔ بھائی کو آرام کرنے دو۔“

مرتضیٰ کو لینے کی تاکید کرتے ہوئے انہوں نے کاشف اور منہو کو لتاڑا۔ وہ کتابیں سمیٹ کر فوراً کھٹک گئے۔

مرتضیٰ تخت پر لیٹ گیا۔ ام مریم اس کے ہاتھ پر بندھی پٹی اور ماتھے پر زخم کے نشان کو دیکھ رہی تھی۔

مرتضیٰ کی تکلیف پر اس کی آنکھیں لبا لب بھر آئیں۔

”مریم۔۔۔“ نئی نہیں آ رہی۔۔۔ تو مرتضیٰ کو ذرا یہ پنکھا جھل دے۔“ تھوڑی دیر بعد نائی پھر سے برآمد ہوئیں اور ہاتھ والا پنکھا اسے تھکا کر باورچی خانہ میں مرتضیٰ کے لیے دوڑھ لینے چلی گئیں۔

مرتضیٰ نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ام مریم اس کے سر ہانے دیے ہی وحشت زدہ سی کھڑی تھی۔ آنسو پھسل پھسل کر گال جھگوٹے لگے تھے۔ مرتضیٰ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔

”پگلی! میں ٹھیک ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔“ وہ جانتا تھا اس کی ذرا سی تکلیف پر ساری ساری رات نہ سو سکنے والی لڑکی کتنا پریشان ہوگی اسے یوں دیکھ کر۔

”مرتضیٰ یہ کیسے؟“ رندھے ہوئے گلے کے ساتھ اس نے اس کی خون آلود شرٹ اور ہاتھ کی جانب اشارہ کیا تو جویا! ”مرتضیٰ نے اسے پورا واقعہ مختصراً کہہ سنایا۔ پائی کچھ تو اس نے سنایا نہیں۔ مگر ہاتھ پر چاقو سے کٹ گئے کی بات نے اس کا پنکھا جھلتا ہاتھ ایک لمحے کے لیے ساکت کر دیا۔ اس نے ایک نظر پھر سے خون سے بھری آستین کو دیکھا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔

”اف یار۔۔۔ اوئے۔۔۔ کچھ نہیں ہوتا۔ تم عورتیں تو ذرا سی چھری انگوٹھے پر لگنے پر گھٹنہ آٹھ آٹھ آنسو بہاتی ہو۔ مگر مردوں کو ذرا ذرا سی چوٹوں سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔“ اس کے کہنے پر مریم خشکیں لگا ہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”ذرا سی چوٹ؟ آٹھ ٹانگے آتے ہیں ہتھیلی پر اور تم اسے چھوٹی سی چوٹ کہہ رہے ہو؟“ وہ دوبار تو پریشانی کے ساتھ ساتھ غصہ بھی اس کی آواز سے ہویدا تھا۔

اتنے میں رخشدہ دوڑھ لے کر آ گئیں۔ دونوں خاموش ہو گئے۔ دوڑھ پلانے کے بعد وہ گلاس لے کر واپس چلی گئیں۔ ان کی ہڈیاں جل رہی تھی۔

”اچھا! اب یوں منہ تو مت بناؤ۔ میں جان بوجھ کے تو نہیں لڑتاں۔“

اس نے دھیرے سے اس کی انگلی پکڑ کر کھینچی جو اس خوں مڑے ایک ہاتھ سے اسے پنکھا جھل رہی تھی۔

”مرتضیٰ! مجھے صرف اتنا بتاؤ۔ تمہیں کیا ضرورت تھی کسی کے لیے اپنی جان جو حکم میں ڈالنے کی؟“

”کسی کے لیے نہیں۔ کوڑتی باپ کے بیٹے کے لیے۔“ اسے چڑانے کے لیے وہ شرارتی انداز میں بولا تو مریم نے ٹکھے کی ڈنڈی کھینچ کر اسے دے ماری۔

”اوہ! مار ڈالا ظالم۔“ وہ حقیقتاً ”کراہا۔“

”اگر اس کا باپ ارب پتی بھی ہے۔ تو بھی کوئی ضرورت نہ تھی تمہیں خود کو یوں خطرے میں ڈالنے کی۔ اپنی جان کی قیمت روپوں میں مت لگایا کرو۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔“ وہ پنکھا تخت پر پٹخ کر اٹھی اور

باہر نکل گئی۔
مرضی اس کی پشت پر لہرائی چٹیا کو دیکھتے ہوئے مسکراتا رہا۔
وہ جانتا تھا کہ وہ ام مریم کے لیے کیا ہے۔ یہ اسے بتانے کی ضرورت نہ تھی۔

”دس گیارہ بارہ اور ساڑھے بارہ۔۔۔ صرف ساڑھے بارہ۔“ روئے گن کر اس نے ایک نظر ہاتھ میں تھی رقم پر ڈالی۔ پچھلے پانچ ماہ سے پیسے جوڑنے کے بعد بھی اتنی رقم اکٹھی نہ ہوئی تھی۔ جتنی اسے مطلوب تھی۔ حالانکہ ان مہینوں میں کسی بہت اہم ضرورت کے علاوہ اس نے کسی بھی چیز کے لیے روپے نکالنے سے حتی الامکان گریز کیا تھا۔
”افو۔۔۔ ابھی صرف ساڑھے بارہ ہزار ہوئے ہیں۔“ مایوسی اس کے چہرے پر صرف اس بل کے لیے لہرائی۔ مگر اگلے ہی بل پھر سے خوش کن خیال نے انگڑائی لے لی۔

”چلو! ساڑھے بارہ ہزار تو ہو گئے باقی بھی ہو ہی جائیں گے۔“ ساڑھے تین ہزار وہ آج کی ہوم یوشن سے لے کر آئی تھی۔ باقی کے ڈھائی ہزار کے لیے اس کا دل غیزی سے سونے لگا۔

”ابھی مسز صدیقی کے یہاں سے بھی پیسے ملنا باقی ہیں۔۔۔ کچھ دن میں وہ بھی مل جائیں گے۔“ اس کی آنکھوں میں جگنو سے تیرنے لگے۔ اس نے بہت احتیاط سے وہ نوٹ دوبارہ گنے اور تمہ کر کے ریویژن چڑھانے کے بعد اس سفید رومال میں باندھ دیے۔ جس پر وہ ہر نماز کے بعد دعائیں پڑھ پڑھ کے پھونکتی تھی۔ جیسے اس سے پیسے رکھے رکھے بڑھتا شروع ہو جائیں گے اور نہ رکتی تھی ہو جائے گی۔

اس نے رومال کمرے کے مغربی کونے میں رکھے بوسیدہ سے ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے چھپا دیا۔ اب تک کی اس کی پونجی۔ جو وہ مرضی کو کمپیوٹر خریدنے کے لیے دینے والی تھی۔

عبدالکریم مرضی کی بڑھائی کے خلاف تھے اور بقول ان کے اگر اسے کچھ کرنا ہی ہو تا تو بی اسے کے بعد کر چکا ہوتا۔ ان کا کہنا تھا کہ مرضی طرح طرح کی ڈگریوں کے نام لے کر صرف پیسے ضائع کر رہا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ مرضی ان کے ساتھ دکان پر بیٹھے اور کام کرنے میں ان کا برابر سے ہاتھ بٹائے۔ سودا سلف دکان میں بھرنے کے لیے انہیں اسی کی ضرورت پڑتی تھی۔ ملازم رکھنے کی استطاعت وہ نہ رکھتے تھے اور اس عمر میں بوجھ ان سے نہ اٹھایا جاتا تھا۔ چنانچہ ان کی امیدو آس کا محور مرکز محض مرضی کی ذات تھی۔ کاشف ابھی چھوٹا تھا۔ وہ اکثر کام میں گڑبگڑ جاتا تھا۔ لیکن مرضی با شعور نوجوان تھا۔ اسے اپنی بڑھائی اور قابلیت پر بھروسہ تھا۔ وہ ہر طرف سے کان بند کیے بس اپنی بڑھائی کی جانب متوجہ تھا۔ فاسٹ ایئر کے امتحانات قریب تھے۔ باتوں باتوں میں کمپیوٹر نہ ہونے اور اس مجبوری کے باعث دوست کے گھر جا کر پڑھنے کا تذکرہ یونی ام مریم کے سامنے کر دیا تھا۔

کرنے والا تو شاید اپنی بات بھول گیا ہو۔ مگر یہ ام مریم تھی۔ جس کے لیے مرضی کا ہر لفظ یاد رکھے جانے کے قابل تھا۔

اس کی ہر ضرورت، ہر خواہش پوری ہو جانے کے لیے تھی۔

مہینوں پیسے جوڑ کر وہ رقم اکٹھی کر پائی تھی اور اب مرضی کو دیے جانے والے اس سربراہ پر اس کے رد عمل کا سوچ کے ہی ام مریم کی آنکھیں جھجکا اٹھیں تھیں۔

سین برآمدے میں رکھے لکڑی کی ایک میز پر کپڑا بچھائے ابا کے کپڑے استری کرنے میں مگن تھی۔ بجلی جانے سے پہلے پہلے اسے کام پٹانے تھے۔ اندر باورچی خانے میں ام مریم کے ہاتھ بھی تیزی سے چل رہے تھے۔ آخری روٹی تیل کر اس نے گرم توے پر ڈالی۔ پھر ڈھکن اٹھا کر سالن کی تیاری کو دیکھنے لگی۔ غلٹ میں

وہ بھی تھی۔ مگر بجلی کا جانا اس کی وجہ نہ تھی۔ بلکہ اس کام سے فارغ ہونے کے لیے اسے تیار کرنا بھی چاہنا تھا۔ دوسرے چولے پر دھری بجتی بالکل تیار تھی۔ بلکہ سب سے پہلے اس نے یہی تیاری کی تھی۔ چنے کی دال گل چکی تھی۔ جو سب کے لیے بنی تھی۔ اس نے آخری روٹی توے سے اتار کر کپڑے میں لپیٹی اور بجتی دوبارہ گرم کرنے کے لیے رکھ کر باہر نکل گئی۔ صحن میں تل کے پاس بیٹھ کر اس نے منہ پر پانی کے چھپاکے مارے اور کنگھے سے بال سمجھانے لگی۔ کپڑے استری کرتی یمن نے ایک مسکراتی سی نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ جانتی تھی اب ام مریم کمال جانے والی تھی۔

آج یوشن سے واپسی پر مسز صدیقی نے بھی اسے پیسے دے دیے تھے۔ ان ہی پیسوں میں سے تین سو اگے کر کے اس نے راستے سے گوشت خریدا تھا۔ مرضی کو کل سے بخار بھی تھا۔ اس کی زرد پنی رنگت سے وہ پریشان سی واپس آئی تھی۔

لی آیس سی کے بعد ام مریم نے کچھ عرصہ ایک اسکول میں بطور سائنس ٹیچر پر بٹھایا تھا۔ وہیں ایک بچے کی والدہ نے اس سے ہوم یوشن کے لیے پوچھا تھا۔ یوں یہ سلسلہ چل نکلا۔ مسز صدیقی کے توسط سے ہی اسے قریبی گھروں میں یوشن ملنے لگیں۔ ہر کلاس کے گھروں میں کچھ کھٹے پڑھا کر اسے اتنے پیسے مل جاتے تھے۔ جتنے پورا مہینہ اسکول میں جان ہلکان کرنے کے بعد بھی نہ ملتے تھے۔ اسکول اس نے چھوڑ دیا۔ مگر یوشن جاری رکھیں۔

یوشن سے ملنے والے پیسے اس کے لیے بڑا سہارا تھے۔ جنہیں اکثر اپنی ضروریات کی تکمیل کے بجائے مرضی پر خرچ کر دیتی تھی۔ وہ خوش ہو، راحت میں ہو، ام مریم کے لیے یہ بات بے حد راحت بخش تھی۔ چٹیا میں بل ڈال کر اس نے پشت پر چھینکی اور بیٹھے میں اپنا جائزہ لیا۔ مرضی کو میک اپ سے لپی جی لڑکیوں سے چیز ہوتی تھی اور ام مریم کو تو میک اپ کی ضرورت ہی نہ تھی۔ سیدھی ٹانگ نکال کر سیاہ بالوں کی

چوٹی بنانی تو چہرے کے اطراف پھیری ٹیٹوں میں اس کا ساؤکی میں چمکتا پرکشش چروہی مرضی کے لیے سب کچھ تھا۔

کمرے میں جا کر اس نے ٹرنک کھول کر کپڑوں کے نیچے سے وہ سفید رومال نکالا جس پر وہ ہر نماز کے بعد باقاعدگی سے قرآنی آیات پڑھ کر پھونکتی تھی۔ آج ملنے والے روپے بھی وہ اس میں شامل کر چکی تھی۔ مٹی میں رومال دبائے وہ کچن میں چلی آئی۔ گرم پانی پیالے میں ڈال کر اس نے دوپٹا ٹیٹوں پر پھیلا دیا اور ٹرے اٹھا کر تاپا کے گھ کا دروازہ پار کر گئی۔

شام کا ملگجاپن اندھیرے میں ڈوب رہا تھا۔ سامنے چھوٹے سے صحن میں پیڑھی برتنی رخشنہ بیٹھی تھیں اور منہ اپنی کتاب کھولے جلتے بلب کے نیچے بیٹھی بل بل کے سبق یاد کرنے میں مصروف تھی۔ رخشنہ نے بڑے غور سے اندر آئی ام مریم اور اس کے ہاتھ میں تھی ٹرے کو دیکھا۔

”کیا لائی ہے بیٹی؟“ لہجے میں خود بخود مٹھاس کھل گئی۔

”تائی امی! مرضی کے لیے بجنی بنائی تھی تو سوچا گرم گرم دے آؤں۔“

”ہاں ہاں ضرور۔۔۔ اللہ تجھے سکھی رکھے۔ ہر ایک کا کہنا خیال رہتا ہے تجھے۔۔۔ جاو پر چلی جا۔۔۔ مرضی چھت پر ہے۔“ وہ اوپری دل سے دعائیں دیتے ہوئے بولیں۔

صحن سے میڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر آگئی۔ ہوا کا ایک تازہ جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ لڑکی موسم میں خوشگواریت در آئی تھی یا مرضی کو دیکھنے پر یہ احساس اس کے دل میں سرایت کیا تھا۔ وہ فیصلہ نہ کر سکی۔

وہ چارپائی کے پاس کھڑا ایک بازو پہنے دوسرا بازو آستین میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مڑواں نہیں پا رہا تھا۔ وہ ٹرے ایک طرف رکھ کر تیزی سے آگے بڑھی اور شرٹ کی آستین پکڑ کر اس کے بازو میں پسنا

دی۔ بائیں ہاتھ سے بن بند کرتے ہوئے مرتضیٰ مسکرایا۔ سامنے والے گھر کی چھت پر جلتے بلب کی زرد سی روشنی میں اس کے دھلے دھلائے چہرے پر نظر جما کے وہ بولا۔

”تمہیں کیسے پتا چل جاتا ہے کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے؟“

”اس میں میرا نہیں ٹیکنالوجی کا کمال ہے۔“ وہ چمکی۔

”اچھا! وہ کیسے؟“ ہونٹ ہنچنے وہ دلچسپی سے اس کی بوگنی سننے کے لیے متوجہ ہوا۔

”بہت آسان سی بات ہے یہ تو۔۔۔ ادھر تمہیں میری ضرورت ہو تو تمہارا دل ”ام مریم ام مریم“ نکارتا ہے اس دیولیتھ کی لہریں یہاں سے وہاں تک مرتضیٰ رہتی ہیں۔ میرے دل میں لگے ”سنسز“ مجھے الٹ کر دیتے ہیں اور میں اس پکار پر لبیک کہتی ہوئی دوڑی دوڑی آپہنچتی ہوں۔“ اس کی بات پر وہ کھکھلا کر ہنسا۔

ام مریم نے اسے نظر بھر کے دیکھا اور بے ساختہ اس ہنسی کے پیشگی ہونے کی دعا کی۔ وہ اب چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

ام مریم نے مٹھی کھول کر اس کے سامنے کی۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”خود دیکھ لو!“ مرتضیٰ نے رومال کھولا اور سرخ سرخ نیلے نوٹ دیکھ کر حیران سا اس کی صورت تنے لگا۔

”تمہارے ایگزامز آر ہے ہیں ناں مرتضیٰ! تو یہ پیسے تمہارے کمپیوٹر کے لیے ہیں۔ تاکہ تم گھر پر اچھی سی تیاری کر کے شاندار نمبروں سے پڑھائی پوری کر سکو۔“

”ام مریم۔۔۔ اتنے پیسے کہاں سے آئے ہیں تمہارے پاس؟“ وہ اب تک حیران پریشان سا تھا۔ ام مریم بے حد محفوظ ہوئی۔

”آپس کی بات ہے۔ کسی کو تینا نامت۔۔۔ ڈاکا ڈالا ہے۔ چھری کی نوک پر راہچمکوں کو لوٹا ہے۔“ وہ

مرگوشی کے انداز میں بول رہی تھی۔

”سیریس ہو جاؤ مریم۔۔۔ اور تاؤ مجھے بچ۔“

”اف! اتنے سنجیدہ مت ہوا کرو۔ خواہ خواہ یار عرب لگنے لگتے ہو۔ بڑی بڑی مونچھوں اور بھاری تن و لوتش کے کسی پہلوان کی طرح۔“

وہ چمک رہی تھی۔ مگر مرتضیٰ کی خشکیں نگاہوں کو دیکھتے ہوئے اسے سنجیدہ ہونا پڑا۔

”ظاہر ہے۔۔۔ جمع کیے ہیں۔ تم بھی کیسے بے سرو پا سوال کرتے ہو۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”اتنے سارے روپے ایک دم کیسے جمع ہو گئے؟“ وہ ابھی تک مشکوک نظروں سے اسے تنک رہا تھا۔

”ایک دم کہاں؟ یہ تو میں نے اسی دن جمع کرنے شروع کر دیے تھے۔ جس دن تم نے کمپیوٹر نہ ہونے کے باعث پڑھائی متاثر ہونے کا بتایا تھا۔ تب سے اب تک تو۔۔۔“ وہ انگلیوں کی پوروں پر حساب لگانے لگی۔

”پورے ساڑھے پانچ ماہ ہونے والے ہیں۔ ہر مہینے یوشنز کے پیسے اکٹھے کر کے اتنی رقم ہو گئی۔“

بشاشت اس کے چہرے کے ایک ایک نقش سے پھوٹ رہی تھی۔ مرتضیٰ اس کی اتنی چاہت پر گم صم سا اسے دیکھ گیا۔ اتنی محبت نے اسے لگ کر ڈالا تھا۔

اتنا تو اس کے سکے ماں باپ نے بھی کبھی اس کے لیے نہ سوچا تھا۔ وہ ایک نظر پھیل پھیل پھرے پیسے دیکھ رہا تھا تو بھی ام مریم کو۔۔۔

”ام مریم۔۔۔“ وہ بول نہیں پا رہا تھا۔

ام مریم نے مرتضیٰ کی سرسری سی کئی بات نہ صرف یاد رکھی تھی۔ بلکہ اس مسئلے کے حل کے لیے کوششیں بھی کرتی آئی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ بولے تو کیا بولے محبت کی سمجھ سی دبیز چپ پھد دیر دونوں پر چھائی رہی۔

”یہ پیسے میں نہیں لے سکتا ام مریم!“ ہتھیلی پر دھرے نوٹ اسے جہاں یہ احساس دلا رہے تھے کہ وہ ام مریم کے لیے بہت خاص ہے۔ وہیں اسے شرمندگی میں بھی دھنسا رہے تھے۔ وہ مرد ہو کے ایک لڑکی سے

اتنا بڑا احسان کیسے لے سکتا تھا۔

”کیا مطلب ہے نہیں لے سکتے؟“ اسے غصہ آیا۔

”بس نہیں لے سکتا۔“ نظریں نیچی کیے وہ بولا۔

دانت وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

”مرتضیٰ! یہ پیسے تمہاری پڑھائی میں مدد کے لیے ہیں۔ کسی عیاشی کے لیے نہیں دے رہی جو تم اس طرح غیروں جیسا بناؤ کر رہے ہو۔“ وہ خفا خفا سی بولی۔

”ہاں۔۔۔ پڑھائی کے لیے ہی سہی۔ یہ جمع کرنے چاہئیں۔“ مرتضیٰ کے لہجے کی اجنبیت مریم کو تنگ کر گئی۔

”تم تو ایسے کر رہے ہو۔ جیسے پہلی دفعہ میں کچھ دینے لگی ہوں۔ تم بھول گئے بچپن سے اب تک میری ہر چیز کے لیے۔ بلکہ بچپن کر رہ پڑتے آئے ہو تو اب کیا ہوا ہے؟“

”وہ بات اور تھی ام مریم۔۔۔ لیکن یوں پیسے میں کیسے۔۔۔“

”مرتضیٰ۔۔۔ یہ میں تمہارے لیے نہیں کر رہی۔ یہ تمہارے لیے ہے۔ ہمارے اچھے کل کے لیے۔ اس گھر کی خوشحالی کے لیے۔ شاندار نمبروں سے تمہاری ڈگری کے لیے۔“ تمہاری کامیابی سے میری خوشی مشروط ہے مرتضیٰ! تمہارا مستقل انکار مجھے دکھ دے رہا ہے۔“

اس کے ٹین کنوڑوں سے پانی پھوٹ پڑا۔ وہ رخ موڑ گئی۔

”اس طرح ناراض مت ہو ام مریم۔“ بہت دیر بعد وہ بولا۔

”تو پھر یہ رکھ لو۔“ ام مریم نے اس کی ہتھیلی بند کر دی۔

ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر اس نے رومال لبیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔

بھگی آنکھوں کے ساتھ وہ ہنس دی تو مرتضیٰ یک

نک اسے دیکھے گیا۔

گہری ہوئی رات کی نیلگوں روشنی میں اس کے چہرے پر چھائی خوش امیدی کے جگنو وہ با آسانی دیکھ سکتا تھا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں ام مریم! میں تمہارے لیے بہت کچھ کروں گا۔ دنیا جہاں کی خوشیاں تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔ میں ان سب سے ایک بہترین مستقبل کا وعدہ کرتا ہوں۔ جنہوں نے میری پڑھائی کے لیے اتنی قربانیاں دی ہیں۔ ان شاء اللہ اچھے دن بھی آئیں گے اور پھر ہم سب مل کر رہیں گے ایک ساتھ خوش باش۔“

مرتضیٰ کے جذب سے کہنے پر ام مریم نے صدق دل سے ”آمین“ کہا اور بخنی کا پیلا اس کی طرف بڑھا دیا۔



”پہلو مرتضیٰ۔۔۔“ سکندر اس کے قریب آ کر بولا اور گھوم کر اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مرتضیٰ کتابوں میں سر دیے اسائنمنٹ بنانے میں مصروف تھا۔

”کیسے ہو اور ہاتھ کا زخم کیسا ہے اب؟“

”زخم تو بھر گیا ہے۔ ویسے بھی اتنی بڑی چوٹ تو نہیں تھی کہ تم یوں فکر مند ہوتے پھرو۔“ اس کے یوں بولنے پر سکندر ہنس پڑا۔

”فکر تو غرنی پڑتی ہے میرے بھائی! آخر کو میرے باعث ہی تم مصیبت میں پڑے تھے۔“

”چلتا ہے یا رامیری جگہ کوئی اور ہوتا تو بھی مدافعت کے لیے تمہارے ساتھ ہوتا۔“ دونوں میں اچھی دوستی تو نہ تھی۔ مگر مرتضیٰ کلاس کا لائق فائق اسٹوڈنٹ تھا۔ اسی وجہ سے کلاس کے دوسرے اسٹوڈنٹس کی طرح سکندر بھی اس سے اچھی سلام دعا رکھتا تھا۔ جو اس دن کے حادثے کے بعد اچھی دوستی میں بدل گئی تھی۔

وہ مرتضیٰ کا احوال پوچھنے دوبار اس کے گھر بھی گیا

تھا۔ خستہ حال، اکھڑے پلستر والی بیٹھک میں بوسیدہ گھن گلی کر سی پر بیٹھ کے اس نے بڑی حیرانی سے اپنی زلوں حالی پر شرمندہ سے اس ہونہار طالب علم کو دیکھا تھا۔ جس کی قابلیت کے چرچے پروفیسرز کے مابین اور ڈپارٹمنٹ کے باہر تک تھے۔

”مررتضیٰ! تمہارے پاس وقت ہو تو میرے پاس ایک آفر ہے۔“ کچھ لمحوں بعد سکندر بولا تو کچھ کہنے کی بجائے مرتضیٰ سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

”ایک مینٹک کے لیے پلان مجھے اسلام آباد بھیجنا چاہ رہے ہیں۔ کوئٹہ اور پریزنٹیشن امپریس ہوگی تو ہی پروجیکٹ ہمیں مل سکے گا، ٹائی کی کسی معروف کمپنی کا پروجیکٹ ہے اور شرکی بڑی کمپنیز یہ گریڈ پروجیکٹ حاصل کرنے کی سرٹوکیٹس کر رہی ہیں۔“

تھوڑی تفصیل بتا کر اس نے مرتضیٰ کو دیکھا۔ جو بڑے دھیان سے اس کی بات سن رہا تھا۔

”پاپا! ایک ڈیلیکیشن کے ساتھ چین جا رہے ہیں۔ اس لیے اس مینٹک کے لیے مجھے جانا ہو گا۔ ویسے تو میں نے کلائی سٹنگز میں پریزنٹیشن دی ہے مگر اتنے بڑے پیمانے پر پہلی بار جاؤں گا۔ پاکستان کی مختلف کمپنیز وہاں اکٹھی ہوں گی۔ اس لیے یہ ٹاسک آسان نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں تم بھی میرے ساتھ چلو۔ یا یوں کہہ لو کہ تم اتنے قابل ہو کہ مجھے تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”مگر ایذا منو۔“

”ایگزیزمز میں تو ابھی مہینہ پڑا ہے۔ یہ مینٹک نیکسٹ ویک ہے۔ تم سوچ لو آرام سے۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔ پھر بھی میں تو چاہوں گا تم ساتھ چلو مجھے بھی تسلی رہے گی کہ ایک ذہین و فطین آدمی میرے ساتھ ہے۔“

اس کی بات پر مرتضیٰ ہنس پڑا۔

”چلو دیکھتے ہیں فی الحال تو یہ اسائنمنٹ مکمل کرو، کل سمٹ بھی کروانی ہے۔“

اثبات میں سرسلا کر سکندر کتب ایڈیٹر کو اپنے چل دیا اور مرتضیٰ ایک بار پھر نوٹ بک پر جھک گیا۔

”ہرا۔۔۔ مریم آئی جیت گئیں۔۔۔ جیت گئیں!“

صبا اور صالحہ زور زور سے تالیاں پیٹنے لگیں۔ تنہا سا گڈو بھی خوشی سے قہقاریاں مار رہا تھا۔ وہ اس وقت بچوں کے ساتھ اپنے صحن کے بیچ چاک سے لکیریں کھینچنے ”اسٹاپو“ کھینچنے میں مگن تھی۔ ایک پاؤں پر اچھلتی کودتی وہ بین کے ساتھ مقابلے پر تھی۔ یہ یہ وہ جیت گئی تھی۔ بین کو ان سب کاشوق نہ تھا مگر ام مرتضیٰ کے کہنے پر زور سے تھیلے لگ گئی تھی۔ مریم تو بچوں کے ساتھ بچی بنی رہتی تھی۔ گڈو آپا زینب کا بیٹا تھا۔ چار سالہ صبا اور چھ سالہ صالحہ بڑی آپا سرین کی بیٹیاں تھیں۔

اس اقدار کو دونوں اپنے میکے آئی ہوئی تھیں اور حسب معمول بجے صبح ہوتے ہی چیتنے چلاتے شور مچاتے اپنی ”مریم کپانی“ کے پٹنگ پر چڑھ کر اسے جگا چکے تھے مگر بجائے کو فٹ زہ ہونے کے اس نے مندی مندی آنکھوں سے انہیں دیکھا اور شاشت سے مسکرا دی تھی۔

”واہ جی واہ! آج تو ہمارے گھر میں رونق اتری ہے۔“ بستر سے اٹھتے ہوئے وہ چمکی تھی۔ جب تک

منہ ہاتھ دھو کر وہ باہر آئی بچوں نے اس نے گرد گھیرا ڈال لیا اور تب سے وہ سب مل کر صحن میں دھواچو کڑی پچا رہے تھے۔ برآمدے میں بیٹھے عبدالرحیم، مریم اور بچوں کو دیکھتے ہوئے مسکرائے جا رہے تھے۔ خوب تھیل کھینچنے کے بعد وہ انہیں لطیف سا کرہنسا رہتی۔ خصوصاً ”نخنہ گڈو کی کھکھلاہٹ تو اس کے دل میں گد گد سی کر دیتی تھی۔

”مریم آئی! ہمیں مندی لگائیں نا۔۔۔“ صالحہ جب بھی ٹائی کے ہاں آتی اپنے ساتھ کون ضرور لے کر آتی اور مریم سے بطور خاص اپنے ہاتھوں پر تیل بوٹے

بنوائی اور پھر انہیں سکھانے کے لیے تھپی تھپی ہتھیلیاں بلند کیے پھرتی رہتی۔ اس کی دیکھا دیکھی صبا بھی شروع ہو گئی۔ تو وہ ان کی انگلی پکڑے تالیاں گھرا گئی۔ صالحہ بھاگ کر کون اٹھالائی اور ام مرتضیٰ دونوں تالیاں کے پاس ہی چو کڑی مار کے بیٹھ گئی۔ تھپی صالحہ کی تھیلی پکڑنے کے کون کی نوک سے خوب صورت پھول بنانے کے ساتھ ساتھ وہ ان کی خیر خیریت بھی پوچھتی جاتی۔

”مریم آئی! آتانی سائیں ناں جو اس دن آپ نے سنائی تھی پرنی اور جاو گئی والی۔“ صبا کا حافظہ بڑا تیز تھا۔ صالحہ اپنے ڈیرائن بنوانے کے بعد اب دور بیٹھی اس پر پھونکیں مار رہی تھی۔

”کہانیاں تو رات میں سنتے ہیں نا جانو! تو آپ رات کو آتا پھر میں آپ کو کہانیاں سناؤں گی۔“

”لیکن ابھی کیوں نہیں سنا سکتیں؟“ وہ بے صبری ہو رہی تھی۔

”کیونکہ دن میں کہانیاں سننے سے ماموں گھر کا رستہ بھول جاتے ہیں اس لیے!“ اپنے بچپن میں سنی اوٹ پٹانگ سی بات اس نے ان کے سامنے دہرا دی۔

”ارے واہ۔۔۔ ماموں تو گھر ہی ہیں پھر رستہ کیسے بھولیں گے؟“ دور بیٹھی صالحہ نے اپنے تئیں حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔

”جب وہ آپ کے گھر آئیں گے ناں پھر رستہ بھٹک جائیں گے اس لیے کہانی رات میں ہی چلے گی اوکے۔“

مرتضیٰ کے گھر پر ہونے کا سن کے وہ بے چین سی ہوئی تھی۔ اسے اتنی دیر ہو گئی تھی آئے ہوئے لیکن مرتضیٰ نے نہ تو اسے آواز دی تھی نہ اس کی آواز سن کے خود بار آیا تھا۔ وہ تو یہی خیال کیے بیٹھی تھی کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ جلدی جلدی صبا کو بھی مندی لگا کے اس نے اسے پیچھے کے نیچے بیٹھنے کو کہا اور خود پین میں چلی آئی۔ تائی رخشندہ چائے پکوں میں انڈیل رہی تھیں۔

”اے مریم! یہ سرین اور زینب کو تھماوے اور تیسرا کپ مرتضیٰ کو دے!“ اس کے سر میں درد ہو رہا ہے، صبح سے اس موئے کمپیوٹر میں دماغ کھپا رہا ہے۔“

پلیٹ میں کپ رکھ کے وہ باہر آگئی۔ اور برآمدے میں بیٹھی سرین اور زینب کو چائے پکڑا دی۔ تیسرا کپ لیے وہ اندر کمرے کی جانب بڑھی۔ تائی کے پاس مہمان نوازی کا خاص رجحان نہ تھا۔ اور وہ تو مہمان بھی بھی نہیں، گھر کی ہی تھی۔ مگر گھر کا فرد ہونے کی حیثیت سے بھی کبھی جھوٹے منہ سے اسے اس پر ایسی کوئی مہمانی نہ کی گئی تھی اور ام مرتضیٰ نے بھی یہ فرق کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل میں کدورتیں پالنے والوں میں سے نہ تھی۔

مرتضیٰ سامنے کی دیوار کے ساتھ کونے میں رکھے کمپیوٹر کے آگے بیٹھا تھا۔ ام مرتضیٰ کے پیچھے دینے کے تیسرے ہی روز وہ کمپیوٹر لے آیا تھا۔ گھر میں سب ہی حیران تھے مگر ام مرتضیٰ نے اسے پیچھے دینے کا بتانے سے منع کیا تھا۔ اس لیے مرتضیٰ نے یہی بتایا کہ اس نے جمع کیے تھے پیسے اور کچھ ادھار لے کے کمپیوٹر لایا ہے جو وہ خود کما کے چکاوے گا۔

اس نے بڑھ کر چائے زور سے ٹیبل پر رکھی تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ ام مرتضیٰ کے چہرے پر ہلکی سی خفگی تھی۔ یہ تمنا ہٹ یقیناً اس کی اتنی دیر کی موجودگی کو نظر انداز کیے جانے کے باعث تھی۔

مرتضیٰ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کا فون بجنے لگا۔ دائیں ہاتھ سے فون اٹھا کر سننے لگا۔ اسے پھر سے مصروف دیکھ کے ام مرتضیٰ جانے کے لیے مڑی مگر مرتضیٰ نے اس کی کلائی پکڑ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ناراض ناراض سی منہ پھلائے پاس بڑی کر سی پر ٹک گئی۔ چند فٹ بعد فون بند ہو گیا تو وہ اس کی جانب مڑا۔

”یہ اتنا منہ کیوں پھلایا ہوا ہے تم نے؟“

”کوئی نہیں منہ پھلایا ہوا“ میں ٹھیک ہوں اور آپ

کو اتنی پرواہ کیوں ہو رہی ہے؟ آپ میں صرف ایک وہ ناراضی میں تم سے ”آپ“ پر آجاتی تھی۔ خفگی کے بے ساختہ اظہار پر مرتضیٰ کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”اوہو اتنی سی بات پر خفگی۔۔۔ بری بات ام مریم۔“ یہ اتنی سی بات ہے کہ پچھلے آٹھ گھنٹے سے میں آئی بیٹھی ہوں اور تم یوں کمرے میں چھپے بیٹھے ہو جیسے گھر میں ہو ہی نہیں۔“

”کام کر رہا تھا مریم! ویسے بھی مجھے پتا تھا تم خود ہی آجاؤ گی تھوڑی دیر تک۔“

”اچھا موڈ سیٹ کرو یہ دیکھو میں صبح سے اس کام میں سرگھبرا ہوں۔“

مریم نے قدرے رخ موڑ کر کمپیوٹر اسکرین کی طرف دیکھا۔ کسی انٹرنیشنل کمپنی کا ویب پیج کھلا تھا۔ ”کیوں ایسا کیا کر رہے ہو؟“ ناراضی بھول بھال کر وہ دلچسپی سے دیکھنے ہوئے پوچھنے لگی۔

”میں اس کمپنی کا بیگ گراؤنڈ اور پروگریس رپورٹ پر دیر سچ کر رہا تھا۔ وہ میرا دوست ہے ناں سکندر“ اس نے ایک کانٹریکٹ کے لیے پریزنٹیشن کی تیاری میرے سپرد کی ہے۔“

مرتضیٰ اسے کمپنی کے شاندار ریکارڈ سے آگاہ کرنے لگا اور ام مریم چہو تھیلی پر رکھے اس کی بات بغور سننے لگی۔

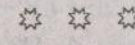
”میٹنگ اسلام آباد میں ہے دو تین دن میں واپسی ہو جائے گی وہاں بڑے بڑے لوگوں سے ملنے کا موقع ملے گا۔ بزنس ڈیولپمنٹ کیسے ہوتی ہیں کاروباری داؤ پیچ سیکھنے اور بہت کچھ دیکھنے کا موقع ملے گا۔“ مرتضیٰ پر جوش سا کہہ رہا تھا۔

”تم دعا کرو کہ جو اتنی محنت کی ہے وہ وصول ہو جائے“ کانٹریکٹ سکندر کو مل جائے۔“

”سکندر کے لیے اتنی محنت کیوں کر رہے ہو تم؟“ وہ ابھڑ رہی تھی۔

”ام مریم! تم نہیں سمجھو گی ان معاملات کو۔۔۔ میں یہ کیوں کر رہا ہوں یہ سوچنا چھوڑو اور بس اس لیے دعا کرو کہ میں محنت کر رہا ہوں۔“ مریم کا ہاتھ تھامے وہ اسے دعا کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

لیکن وہ خود بھی جانتا تھا کہ ام مریم کی دعاؤں کا محور اسی کے نام سے شروع ہو کر اسی کے وجود پر ختم ہوتا تھا۔



اسلام آباد کی صاف ستھری کشادہ سڑکوں پر دوڑتی سیاہ و نوسیع رتبے پر پھیلی ایک عظیم الشان بلند و بالا عمارت کے سامنے آرہی تھی۔ مرتضیٰ اپنی جانب کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی اپنی گاڑیاں پارک کرتے سوئڈ بوئڈ بریف کیس، لپ ٹاپ، بیگ اٹھائے ہوئے لوگ بلڈنگ میں داخل ہو رہے تھے۔ عمارت کے وسیع رقبے اور اونچائی کو دیکھتا ہوا مرتضیٰ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈرائیونگ سیٹ سے نکلتے سکندر نے ڈیش بورڈ پر ہاتھ مارا پھر بیک سیٹ پر متلاشی نگاہیں دوڑائیں۔

”اوہ فو!“ اس کی تشویش بھری آواز سن کر بلڈنگ میں داخل ہوتے لوگوں کو دیکھتا مرتضیٰ اس کی جانب پلٹا۔

”یار! بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ وہ پریزنٹیشن والی فائل شاید کمرے میں ہی رہ گئی ہے۔“ اس کے بلجے سے پریشانی ہوید اٹھی۔ پریشان ہونا بڑا بھی تھا کیونکہ آج کی اس میٹنگ میں پریزنٹیشن اس فائل کے ڈیٹا کے بل پر ہی دی جانی تھی جو مرتضیٰ نے کئی دن کی لگاؤ محنت کے بعد تیار کر کے اس کے حوالے کی تھی اور جس پہ ایک نظر ڈالتے ہی سکندر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ایسی ریسرچ پر جتنی بہترین پریزنٹیشن ڈیٹا کسی نے یکجا نہیں کیا ہو گا۔

مگر غلطی سے وہ دو فائل واپس چھوڑ آیا تھا اور اب شدید الجھن میں گھر اخود کو کوس رہا تھا۔ میٹنگ ہال

سے ہوٹل کا فاصلہ کم سے کم بھی بیس منٹ کا تھا اور آنے جانے میں لگنے والا وقت بہت زیادہ۔۔۔ جبکہ میٹنگ اگلے دس منٹ میں شروع ہونے والی تھی۔ سکندر پر شدید جھنجھلاہٹ طاری ہو گئی، مرتضیٰ بھی فکر مند تھا۔

”مرتضیٰ! یوں کرو تم اندر جاؤ یہ کارڈ رکھ لو۔“ اس نے اے آر گروپ آف کمپنیز کا کارڈ اسے تھمایا۔

”میں ہوٹل جا کر فائل کے ریکارڈ آنے کی کوشش کرتا ہوں، اگر ہم دونوں غیر حاضر ہوں گے تو مسئلہ ہو گا۔ تم ہماری کمپنی کے ممبر کی حیثیت سے کانفرنس روم میں جاؤ میں بس ابھی آیا۔“

تیزی سے اسے سمجھا تا وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھا۔ مرتضیٰ کو ڈرائیونگ نہ آنے کے باعث اسے یہ سب خود کرنا تھا اور بہت تیزی سے کرنا تھا۔

”مگر میں ایسا کیسے۔۔۔“ اس کی گھبراہٹ میں یکدم اضافہ ہو گیا تھا۔ اتنے بڑے بڑے لوگوں کے سامنے جا کر بیٹھنے کے خیال سے ہی اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔

”کم آن مرتضیٰ! جب تک ہماری پریزنٹیشن کی باری آئے گی۔ میں آچکا ہوں گا۔ تمہیں وہاں جا کر صرف ہماری کمپنی کی جانب سے شرکت کی یقین دہانی کروانی ہے۔“

تیز تیز لوٹا وہ اسپڈ میں گاڑی نکال لے گیا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس نے بھی اتنے لوگوں کے سامنے پریزنٹیشن نہ دی تھی۔ وہ اپنی کلاس کا کانفیڈنٹ اسٹوڈنٹ تھا مگر اپنے ڈائریکٹ کا ہونما طالب علم تھا۔ مسئلہ اس کا نہیں تھا، مسئلہ تو بس اس کلاس کے فرق کا تھا۔ وہ اپر کلاس سے جس حد تک مرعوب تھا اس سے کہیں زیادہ نروس بھی تھا۔ وسیع و عریض ہال نمائندگی کی خشک فضا میں بھی اس کے چہرے پر آنے پینے کے خفے فطرے صاف دیکھے جاسکتے تھے۔

اس نے جیب سے سفید رومال نکال کر چہو صاف کیا۔ یہ ام مریم کا دیا رومال تھا۔ اسے مریم کے خیال سے

ہی تقویت مل گئی۔ وہ ریسپشن کی طرف بڑھ گیا۔ لڑکی نے اس کی رہنمائی کی۔

مرتضیٰ نے ہال پر تفصیلی نگاہ ڈال کر ایک بار پھر رومال سے چہو صاف کیا۔ خود کو یہ احساس دلانے کے لیے کہ وہ تنہا نہیں ہے، ام مریم کی ہمت بندھاتی خوشبو اس کے ساتھ ہے۔ وہ چلتا ہوا دائیں جانب خالی نشستوں میں سے ایک پر آکر بیٹھ گیا۔ ہال میں موجود تقریباً تمام نشستیں بھر چکی تھیں۔ صرف چند ایک خالی تھیں۔

اپنی چھبیس سالہ زندگی میں پہلی بار وہ ایسی کسی میٹنگ میں شرکت کر رہا تھا۔ اس نے اپنی بہترین شرٹ پر چیک والی ٹائی لگائی تھی جو وہ دونوں محل ڈھالی سوئی خرید کر لایا تھا۔ مگر ارد گرد بیٹھے لوگوں کی ڈائمنڈز سے جڑی ٹائی ہنڈ اور گھڑوں کے چمکتے ڈائل اس کی خود اعتمادی کو بار بار ڈمگا رہے تھے۔

وہ کبھی اتنا نروس نہیں ہوا تھا جتنا اس وقت ہو رہا تھا۔ گھڑی نے دس بجنے کا اعلان کر دیا تھا۔ تمام لوگوں نے ہاتھیں ترک کر کے فوراً نشستوں پر اپنا رخ سامنے کی طرف کر لیا تھا۔ جہاں متعلقہ انٹرنیشنل کمپنی کا ڈیپارٹمنٹ آچکا تھا۔ مرتضیٰ نے گھڑی دیکھتے ہوئے بے ساختہ سکندر کے آجانے کی دعا کی۔ تعارف کا مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔ معروف کمپنیز کے چیئرمین اور ڈائریکٹرز کے برائے تعارف کے بعد اس کی باری بھی آئی تو قدرے اٹکتے ہوئے اے آر گروپ آف کمپنیز کے حوالے سے اس نے اپنا تعارف بھی کروادیا۔

اس چھوٹے سے لمبائی مرحلے نے ہی اس کے ہاتھوں میں لریز شطاری کردی تھی۔ بھلا اتنا گھبرانے والی کیا بات تھی۔ اس نے خود کو پرسکون کرنے کے لیے کرسی کی بیک سے پشت نکال۔ فلی ایئر کنڈیشنڈ فضا میں مدھم مدھم سی جھنجھٹاہٹ بھی مہم گئی جب پہلی پریزنٹیشن کا آغاز ہوا۔ مرتضیٰ نے بڑے دھیان سے اس کے Contents کا تجزیہ کیا۔ ان کا انداز بیاں اتنا متاثر کن تھا کہ مرتضیٰ ساری گھبراہٹ بھول

گر پرینٹیشن دینے والے کے براہِ اعتماد اور قابل کر لینے والے کے لیے پر غور کرنے لگا۔ کاروباری طرز کی ان پرینٹیشنز کا تجربہ کافی سکھا دینے والا تھا۔ مرتضیٰ کے لاشعور میں کلبلائی برس میں بننے کی نادریدہ خواہش اسے ایک ایک بات میں دوپٹی لینے پر اکسارہی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں سرک رہی تھیں مگر سکندر اب تک نہ آیا تھا۔ ایک کے بعد دوسری پھر تیسری پرینٹیشن بھی ختم ہو گئی۔

چوٹھی باری اے۔ آرگروپ آف کمپنیز کی تھی۔ کوآرڈینر نے ان کا نام نکالا۔ تمام لوگ منتظر لگا ہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگے تو وہ پھر سے گھبرا گیا۔ مرتضیٰ عبدالکریم کو فوری فیصلہ کرنا تھا۔ اب تک وہ صرف اس لیے مطمئن بیٹھا تھا کہ ابھی اتنی کمپنیز باقی ہیں تو ان کی باری آنے تک سکندر رہی جائے گا مگر اتنی جلدی ان کا نمبر آجائے گا یہ اس کی توقع کے خلاف تھا۔

کیا یہ قسمت کی طرف سے کوئی اشارہ تھا؟ کیا یہی وہ دستک ہے جس کی آواز کے لیے چوٹ سے کان لگائے اس جیسے لوگ عمر بتا دیتے ہیں؟ وقت کم تھا۔ کچھ کرنے کا وقت تھا۔ صحیح فیصلہ کا وقت تھا اور فیصلہ ہو گیا!

اس نے سامنے دھرا پانی کا گلاس اٹھا کر لیوں سے لگایا اور دو تین گھونٹ بھر کر خود میں ہمت جمع کر کے پورا وزن قدموں پہ ڈال کے اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہاں موجود ہر فرد اپنی پرینٹیشن کے پیچھے زیاں پٹ ساتھ لے کر اٹھا تھا صرف وہی تھا جو خالی ہاتھ اپنی سیٹ سے اٹھ آیا تھا کیونکہ اس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔

چند ثانیہ خاموش رہنے کے بعد پرینٹیشن کا آغاز اسی طرح کیا جس طرح اس نے بائوں کو کتے دیکھا تھا۔

اس کے پاس کوئی پیپر نہیں تھا مگر اس کے ذہن میں وہ تمام اعداد و شمار اور ریسرچ گھومتے گئے جسے اس نے بہت ڈھونڈنے کے بعد سیکھا تھا اور جو بار بار بوجھنے اس کے ذہن پر نقش ہو چکی تھیں۔ اس نے مختصر اے آرگروپ آف کمپنیز کا تعارف کو دیا جو یقیناً کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ مگر سب کی طرح رہا اسے بھی یہ کرنا تھا۔ پھر وہ مار کٹھا کر وائٹ بورڈ پر کچھ گرافس بنانے لگا۔ وہ ان پوائنٹ کو بیان کر رہا تھا جو اے آرگروپ آف کمپنیز اور اس انٹیلین کمپنی میں یکساں تھے۔

اس کی اور باقی لوگوں کی پرینٹیشن میں ایک واضح فرق تھا۔ باقی تمام لوگ اپنی کمپنی کی ترقی اور پس منظر کو بیان کرنے میں لگے تھے جبکہ مرتضیٰ نے اس انٹیلین کمپنی کے باریک مگر چند اہم نکات سامنے رکھنے کے بعد اسی کی مناسبت سے اپنا مدعا سامنے رکھا۔ اس نے اپنی ریسرچ کے حوالے سے ہی ڈیٹا کیسٹن کے ممبران کا دل موہ لیا تھا۔ نوجوان کی اس حکمت عملی پر بہت سے چروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

وہ پراجیکٹر استعمال نہیں کر رہا تھا کیونکہ اس کے پاس پراجیکٹر پر چلانے کے لیے کسی قسم کا ڈیٹا نہیں تھا۔ وہ سی ڈی بھی اسی فائل میں رہ گئی تھی جو سکندر نے تیار کی تھی۔ مگر بجائے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر شانے اچکاتے ہوئے میٹنگ سے لاشعور ظاہر کرنے کے وہ اتنا مواد لیے ڈائس پر آگیا تھا جو کسی کمپیوٹر کی مانند اس کے دماغ میں محفوظ تھا۔ وہاں موجود ہر فرد دلچسپی سے اس نوجوان کو دیکھ رہا تھا جس کے ہاتھ تیزی سے وائٹ بورڈ پر کچھ ڈرا کرتے زبان وضاحت دیتی اور پھر مٹا کر وہ نئے سرے سے کوئی نئی لاجک دینے لگتا۔

وہاں بیٹھے ہر شخص نے اعتراف کیا تھا کہ جس گریڈ پر انجیکٹ کے حصول کے لیے وہ سب وہاں اکٹھے ہوئے تھے اس انٹرنیشنل کمپنی کے متعلق اس لڑکے سے اچھی ریسرچ کی نے نہیں کی تھی۔ انٹیلین ڈیولپمنٹ بھی اس کے منہ سے وہ حقائق

من کر بہت متاثر تھا جس کی باریکی میں کوئی اترا تھا۔ مرتضیٰ نے اپنی کوٹیشن آغاز میں ہی دینے کی حماقت نہیں کی تھی۔ اس نے صرف ایک نقطے پر مختلف لاجکس اکٹھی کر دی تھیں کہ یہ پراجیکٹ اے آرگروپ آف کمپنیز کو ہی کیوں ملنا چاہیے۔ سکندر اس پرینٹیشن کے درمیان ہی آچکا تھا اور مرتضیٰ کے ساتھ جا کر کھڑا ہونے کے بجائے وہ حیرت سے منہ کھولے اسے بنا لگے بنا رکے بولتا دیکھ رہا تھا۔

مرتضیٰ کو اپنے ساتھ لا کر یقیناً اس نے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا ورنہ آج اپنی کوٹائی کے باعث وہ نہ صرف ایک بڑے کانٹریکٹ کو اپنے کانپاس کھوپکا ہوتا۔ بلکہ اپنی کمپنی کی ریسرچ میں بھی سوال کھڑا کر دیتا۔ مرتضیٰ نے زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ اختتامیہ جملے بول کر اس نے کوٹیشن سامنے رکھیں جو سکندر اسے راستے میں بتا رہا تھا۔ وائٹ بورڈ سے ڈیٹا مٹا کر خود اعتمادی سے سب کی جانب ایک مسکراہٹ اچھالتا وہ یہ سوچتے ہوئے اپنی نشست کی جانب بڑھ گیا کہ ام مرمی صحیح تھی ہے زندگی ہر انسان کو خود کو جیت لینے کا ایک موقع ضرور دیتی ہے۔ تب انسان کو حواس بافتہ ہونے کے بجائے خود اعتمادی سے آگے بڑھ کر اس سے استفادہ حاصل کرنا چاہیے۔

سکندر کے پر جوش انداز میں اس سے ہاتھ ملانے نے مرتضیٰ کو بتا دیا تھا کہ زندگی اسے وہ سنہری موقع دے چکی ہے اور کیوں نہ دیتی کہ گزشتہ رات سے اٹھے ہاتھ اور ہلتے لب مستقل اس کی کامیابی کے لیے دعاگو تھے۔

”بعض اوقات کسی کے ایک حرف دعا سے قسمتیں بھی جگمگ اٹھتی ہیں لیکن اگر انسان اسے رب کی رحمت سمجھے تاکہ اپنی عقل کل کا کمال۔۔۔ مسلسل بلکی بلکی مگر تسلسل سے۔۔۔ اور اس سے پہلے کہ تقدیر پلٹ جائے۔ بشر کو دروازہ کھول ہی دینا چاہیے۔!“

وہ بھی اسے بڑھ آیا تھا۔ دروازے کے باہر سکندر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ مرتضیٰ سے اُلپٹا۔ ”مصطفیٰ! ہم نے وہ کانٹریکٹ حاصل کر لیا ہے۔ کھلکھلاتے ہوئے سکندر نے اسے بہت بڑی خوش خبری سنائی۔ مرتضیٰ بھی حیران حیران سا خوشی سے منور چہرے اسے دیکھنے لگا۔

”بہت بہت مبارک ہو سکندر۔“

”ناں، میرا اس میں کوئی کمال نہیں جو کیا صرف تم نے کیا، تمہاری وجہ سے یہ کانٹریکٹ ہمیں ملا ہے۔ میرے ساتھ چلو تم۔ پاپا بہت خوش ہیں، وہ تم سے ابھی ملنا چاہتے ہیں۔“

”ابھی۔۔۔“ مرتضیٰ نے ایک نظر اپنے حلقے پر ڈالی۔ آف وائٹ ٹی شرٹ کے سامنے ہٹاؤ براؤن بہت بار دھلائی کی وجہ سے اتنا نادریدہ دکھا تھا کہ بھرا لگنے لگا تھا۔ ”ہاں ابھی۔ تم قیافت پینچ کر آؤ میں باہر کھڑا انتظار کرتا ہوں۔“ مرتضیٰ کو تذبذب دیکھ کر سکندر نے آسانی پیدا کی۔

”تم آؤ ناں، اندر بیٹھو۔“

”نہیں نہیں۔ میں ٹھیک ہوں، تم بس جلدی آ جاؤ بار۔“ اس کے بے صبری سے یوں کہنے پہ مرتضیٰ مسکراتے ہوئے مڑ گیا۔



اے آرگروپ آف کمپنیز کی بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر بائیں جانب بنے سچے سجائے دفتر کا انٹیریر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ باقی باہر مال میں بنے مختلف کمپن میں تمام در کر اپنے کام میں منہمک تھے۔ ڈائریکٹر عبدالرحمن حمدانی اس وقت شیشے کے جھازی سائز میز کے پیچھے پیچھے انٹرکام کا ریسپونڈر اٹھائے مرتضیٰ کے لیے کولڈ ڈرنک اور کچھ اسمینکس کا کمرہ رہے تھے۔ اس کا استقبال اس کی سوچ سے بھی زیادہ پر جوش طریقے سے ہوا تھا۔ عبدالرحمن اس سے بہت خوش تھے۔

”آپ کو اندازہ ہے کہ کتنی بڑی کمپنیز کے سامنے سے کانٹریکٹ جیت کر لائے ہیں آپ؟“ وہ ہنستے ہوئے

مرغی سے پوچھ رہے تھے وہ منات سے مسکرایا۔
”سرا ایسی میٹنگ میں شرکت کا پہلا موقع تھا اس لیے میں خاصا نروس تھا۔ لیکن شکر ہے اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے اتنی ہمت دی اتنی طاقت دی کہ میں ایسی بڑی کمپینز کے ڈائریکٹرز کے سامنے بول سکوں اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔“

”بیلا! میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ مرغی ان لوگوں میں سے ہے۔ جنہیں اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے کے لیے محض ایک موقع ہی کافی ہوتا ہے۔“
سکندر نے بھی بے ساختہ اس کی تعریف کی۔

مرغی کو اتنی اہمیت جیسے وہاں اڑانے لگی۔ شرما کی ایک نائی گرامی کمپنی کا ڈائریکٹر خود اس کی صلاحیتوں کا متعرف تھا۔

”ایم بی اے مکمل کرنے کے بعد کیا کرنے کے ارادے ہیں آپ کے بیٹا؟“

”ارادے تو بہت بلند ہیں سر۔۔۔ جاب ہی کروں گا۔ مگر جاب تو بس ایک آتماز ہو گا۔ منزل نہیں۔ میں بزنس کرنا چاہتا ہوں۔“

اس کی بات پر عبدالرحمن مسکرائے۔

اپنے سامنے بیٹھے اس قابل نوجوان کے نقوش میں انہیں اپنا آپ نظر آیا۔ جس میں کچھ گزند کا جنون تھا جو صرف قسمت کی جانب سے ایک موقع ایک اشارے کا منتظر تھا۔ خود انہوں نے یہ کمپنی جس طرح کھڑی کی تھی یہ جدوجہد کی ایک لمبی داستان تھی

اتنے وقت مرغی نے اجازت چاہی تو عبدالرحمن حمدانی نے خود اٹھ کر گرم جوشی سے اسے گلے لگایا تھا۔ عمارت کے داخلی دروازے سے باہر نکلتے ہوئے مستقبل میں کچھ کروکھانے کے خیال سے اس کا چہرہ متمم رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں روشن دنوں کی لودیتے ننھے ننھے بے شمار چراغ جگمگا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

وقت معمول کی رفتاری سے گزر رہا تھا۔ مرغی کے

امتحانات اچھے سے ہو گئے اور جتنے اچھے پتیرز ہوئے تھے اسے یقین تھا کہ بہت شاندار نمبر سہی مگر ایک دن رزلٹ آنے کا اور چند مہینوں بعد نتیجہ آنے پر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ پنجاب یونیورسٹی کے گولڈ میڈلسٹ اسٹوڈنٹس کی فہرست میں مرغی عبدالکریم کا نام بھی شامل ہو چکا تھا۔ پورا گھر اس کی کامیابی پر نازاں تھا اور ام مریم تو جیسے سے سر ہی نہیں اٹھایا رہی تھی۔

اسے لگتا تھا کہ اب کامیابی اور اس کے بچ کوئی نہیں آسکتا۔ لیکن قسمت کو جانے کیا منظور تھا۔ اسے اچھے رزلٹ کے بعد بھی اسے — تو کوری نہ مل رہی تھی اور اس چیز نے اسے ہر شے سے متفر کر دیا تھا۔ ہر بات سے بے زار کر ڈالا تھا۔ ام مریم کی ہمت بندھ چلی تھی اب اسے طفل تلیوں کے سوا کچھ نہ لگتیں۔ کیونکہ انسان اتنا ہی بے صبر ہے۔ وہ سب کچھ فوراً ہی مل جانے کی تمنا کرتا ہے۔

”صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔“ ام مریم کی یہ بات سن سن کر وہ تھک گیا تھا اور تقدیر اس کی بے صبری پر مسکرائے چلی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ سر جھاڑ منہ پہاڑ مٹی سے اٹے صحن میں بیٹھی روئی اور فالتو اشیاء میں سے کام آجانبے والی چیزیں الگ کر رہی تھی۔ کلفنڈوں اور پچی برائی کتابوں کو ایک تھیلے میں بھر کر وہ روئی والے کو بھجوانے کا سوچ رہی تھی۔ سامنے والے کمرے کے ساتھ موجود چھوٹے سے اسٹور کی صفائی آج بڑے دن بعد کی تھی۔ ارادہ تو بہت دلی سے تھا مگر وہ سستی کر جاتی تھی۔ سینے نے کچن کی تفصیلی صفائی پر کمر کس رکھی تھی۔

ڈھائی مرے کے اس گھر میں دو بیٹیوں کے ہاتھوں کے سلیقے اور سکھ دینے کی گہری چھاپ نظر آتی تھی۔ کمروں میں سالان کی بھر مار نہ تھی۔ اس لیے گھر صاف ستھرا اور پرسکون لگتا تھا۔ سامنے والے کمرے میں دو

بگ بہن پر کڑھی ہوئی سفید چادریں بچھی تھیں ان کی مروجہ ماں کے جینز کی ایک آئینے اور چھوٹی سی میز پر بنی کھار میز اور ان ہی کا بوسیدہ سائریک دوسری طرف کپڑوں کی ایک چھوٹی الماری بھی تھی۔ ام مریم اور بین اس کمرے میں عرصے سے سوئی آئی تھیں۔

اماں کے انتقال کے بعد عبدالرحیم نے ہی انہیں ماں کی طرح پالا تھا۔ ہر ضرورت کا خیال رکھا، بے شک ان کی حیثیت کم تھی مگر اس کے مطابق انہوں نے اپنی بیٹیوں کو کوئی کمی نہ ہونے دی اور وہ دونوں بھی صابر وقامت کرنے کا وصف عبدالرحیم سے ان میں آیا تھا۔ عبدالرحیم کا بستر داخلی دروازے کے ساتھ والے باہری کمرے میں بچھا تھا۔ وہاں لکڑی کی تین کرسیاں اور ایک چھوٹی پتائی بھی رکھی تھی۔ آنے جانے والے مہمانوں کو وہیں بٹھایا جاتا تھا۔ یوں یہ کمرہ بیٹھک کا کام بھی دیتا تھا۔ سامنے والے کمرے کے دائیں جانب اسٹور تھا۔ اور چھوٹے سے برآمدے کے باہر صحن کے ایک جانب کچن اور باقیہ روم اور دوسری جانب دیوار کے ساتھ ایک کپڑی بنی تھی۔

سالوں پہلے عبدالرحیم نے ام مریم کی ضد پر وہاں زمین کھود کر کھاد ڈالی تھی اور نتیجتاً اتنے سالوں کی محنت سے شتوت اور امروہ کا ایک ایک چھتنا ر درخت چھوٹے سے صحن پر سایہ گلن رہتا اور گرمیوں میں سورج کی تیش شتوت کے اس گھنے درخت میں منہ گھساتی گھریں گھنے کی کوشش میں ہی ہانپ جاتی۔ ام مریم نے کیاری میں درختوں کے ساتھ ساتھ ’موتیا‘ گلاب کے پودے لگا رکھے تھے۔ جب کبھی موتیا کے پھول کھلتے سارا گھر بھنی خوشیوں سے مینے لگتا۔ گلاب سے زیادہ موتیا کے یہ اجلے اجلے گلے ہوئے سفید پھول ام مریم کی کمزوری تھے۔ جب بھی کلیاں آتیں تو دن بھر وہ ان منہ بند کلیوں کے نظارے سے خوش ہوتی رہتی اور سر شام کھلتے ہی توڑ کے دو پھول اپنے کانوں میں پیس لیتی۔

یہ پھول اسے قسمت کی دین لگا کرتے، جب بھی

کھلتے، ام مریم کے لیے کوئی خوشی دستک دے کر صحن میں آکھڑی ہوتی۔ ساری فالتو اشیاء کھانے لگا کر اس نے صحن دھویا اور خود منالے گھس گئی۔

نہا کر باہر آئی تو ایک بار پھر اس کی نظر امروہ کے اطراف میں گئے موتیا پر پڑ گئی۔ وہ مسکرا دی۔ ایک پودے پر چار پانچ پھول ایک ساتھ کھلے تھے اور وہ ہمیشہ کی طرح لاشعوری طور پر خوشی کی منکسپانے کے لیے منتظر تھی۔ کچن کے باہر تخت پر بیٹھ کر وہ اپنے گیلے بال سلجھانے لگی۔

وہ گیلے بالوں کا آبشار سامنے کی طرف کیے دھیرے دھیرے ان پر کٹکٹھا پھیر رہی تھی۔ اچانک داخلی دروازے پر ہونے والی آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ مرغی کو آٹا دیکھ کے وہ کھل اٹھی۔ اس کے قدموں میں تیزی اور چہرے پر دے دے دے جوش کی سرخی تھی۔ آتے ہی اس نے ام مریم کے ہاتھ پکڑے اور اس کے بالکل سامنے بچوں کے مل نشین پر بیٹھ گیا۔ مرغی کے چہرے پر چھائی سرخی کسی بہت بڑی خوشی کی غماز تھی۔ ”بوجھو ام مریم۔۔۔ میں تمہارے لیے کیا خبر لایا ہوں؟“

”آں۔۔۔ تمہاری جاب لگ گئی؟“ اسے سوچنے کی ضرورت نہ تھی پھر بھی سوچنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولی۔ تو مرغی کھلکھلا کر ہنسا۔ اس کی کھلکھلاہٹ میں خوشی کی کھٹک تھی۔

”اس سے بھی بڑی بات ہے۔۔۔ تم بوجھو۔“

”اس سے بڑی کیا بات ہوگی۔۔۔ پر اتنا باندھ نکل آیا ہے کیا؟“

”بس سمجھو گاٹری ہی نکل آئی ہے۔ سکندر ایک نئی کمپنی اشارت کر رہا ہے اور اس نے مجھے چالیس پریسنٹ کی پارٹنرشپ آفر کی ہے۔“ فرط انبساط سے اس کی آواز ٹپک رہی تھی۔

”اتنی بڑی آفر۔۔۔“ مریم آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتے ہوئے خوشی و حیرت کے سمندر میں غرق ہو گئی۔

”ہاں اور وہ بھی بتا کی انوسٹمنٹ کے۔۔۔ چالیس

فیصد کے حساب سے جتنی انویسٹمنٹ میرے حصے میں ہوگی۔ وہ میری محنت اور کام کے عوض ملنے والا ہے۔ میں سے تھوڑی تھوڑی کر کے ادا ہوتی جائے گی۔“ اس نے اور مضبوطی سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ جس کی آنکھیں خوشی کے مارے نم سی ہو گئی تھیں۔

”زندگی نے مجھے خود کو جیت لینے کا موقع دے دیا ہے ام مریم۔ تم جتنی ہونا اس پار تشریف کا کیا مطلب ہے؟ پرنس کرنے جا رہا ہوں میں، چھوٹے پیمانے پر سہی عمر اپنا کام کرنے جا رہا ہوں، یہ ہم سب کے دلدار دور کر دے گا، یہ موقع ہم سب کو اس کنویں سے نکال دے گا۔“ وہ جوش سے بولتا جا رہا تھا۔

اثبات میں سر ملائی ام مریم کی نم آنکھوں سے آنسو بہہ کر گالوں کو بھگونے لگے۔ وہ اپنے رب کی خواہشوں پر اپنی دعاؤں کے اسی قدر جلد مستجاب ہو جانے پر رنگ سی بیٹھی تھی۔

مرقئی کی پیشانی پر پھیلی طمانیت کی ٹھنڈی سی چھاپ ام مریم کو رب العزت کے حضور سر بسجود ہونے پر اکسارتی تھی۔

”تم مجھے بہت نہ دلائیں تو آج میں یہ سب نہ کر پاتا مریم۔“ تھینکس، تھینکس اے لائٹ۔“ وہ حقیقتاً اس کامنوں تھا۔ کہ وہی تو اس کے لیے اتنے گھپ اندھیرے میں امید کی کرن خوش امیدی کی شعل بن کر روشن تھی۔



سکندر کی پیشکش مرقئی کے لیے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔

عبدالرحمن حمدانی بہت عرصے سے یہ کمپنی سکندر کے نام سے شروع کرنے کا سوچ رہے تھے اور صرف اس کے ایم بی اے مکمل ہونے کے انتظار میں تھے، باقی انتظامات تو مکمل تھے۔ سکندر سمجھ دار لڑکا تھا مگر یہ بات عبدالرحمن بھی جانتے تھے کہ غیر متوقع صورت

حال اس کے ہاتھ پاؤں پھلاؤتی ہے۔ اسلام آباد کی اس میٹنگ کے لیے انہوں نے سکندر کو بہت بریفنگ کے بیچا تھا مگر صرف ایک فائل ہوٹل کے کمرے میں رہ جانے اس کے سارے اعتماد کو پانی کا بلبلا بنا دیا تھا۔ ایسے میں مرقئی کے بروقت فیصلے اور وائس منڈی سے صورت حال سنبھالنے نے اس سال کا سب سے بڑا کانٹریکٹ کھونے سے بچا لیا تھا۔

وہ مرقئی سے بہت خوش تھے اور نئی کمپنی اپنے بڑے کے حوالے کرنے سے پہلے انہوں نے سکندر سے مکمل مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ مرقئی کو یہ آفر دیں۔

پھر سب کچھ اتنی تیزی سے بدلا تھا کہ ہر دیکھنے سننے والا منہ میں انگلی داہے رہ گیا تھا۔ کمپنی کے ابتدائی کاموں اور کانفرنس کے چکر میں وہ دونوں گھر سے غائب رہتا۔ رات گئے گھر لوٹا بھی تو بس سوئے آتا۔ اٹھ کر کپڑے بدلتا اور ایک بار پھر جو کھنڈیا کر جاتا۔ اس پر دھن سوار ہو گئی تھی۔ اس ایک موقع نے اسے اور بھی سرگرم کر دیا تھا۔ کاروباری اسرار و رموز اس نے دنوں میں سیکھ لیے تھے، چند مہینوں میں ہی ان تمام حربوں کو استعمال کرنا وہ سیکھ چکا تھا جسے سمجھنے میں لوگ کئی سال لگا دیتے ہیں۔

اس نئی کمپنی نے آغاز میں ہی مارکیٹ میں ایک نام بنانا شروع کر دیا تھا جو یقیناً ایک ذہین اور برجوش نوجوان کی محنت کا نتیجہ تھا۔ یہ خوش آئند بات تھی۔

پہلے کانٹریکٹ سے حاصل ہونے والے پرافٹ میں سے انویسٹمنٹ کا کچھ حصہ ادا کرنے کے بعد بھی رقم اتنی تھی کہ لاکھ کروڑ تمام رات یہی سوچتا رہا کہ توںوں کی اس گڈی کو وہ کہاں حفاظت سے رکھے۔ اسے گھر کا کوئی کونہ اتنا محفوظ نہ لگ رہا تھا۔ اگلی صبح اٹھتے ساتھ ہی اپنے سرہانے کے غلاف میں چھپائی

پانچ پانچ ہزار کے توںوں کی سنہری گڈی لیے وہ ام مریم کے پاس جا پہنچا تھا۔ مریم کی فینڈ میں ڈوبی آنکھیں اتنے سارے روئے ایک ساتھ دیکھ کے تقریباً ابل پڑی تھیں اور مرقئی اس کے رد عمل پر محفوظ ہو کے جی بھر

کے ہنسا تھا۔ ایسے میں بینک اکاؤنٹ کی ضرورت ناگزیر تھی۔ پھر اکاؤنٹ بھی کھل گیا اور ہر مہینہ اس کے اعداد و شمار میں اضافہ ہونے لگا۔ گھر کا ہر فرد خوشی سے تقریباً دیوانہ ہو چلا تھا۔

حالات ٹھیک ہوتے ہی سب سے پہلے اس نے گھر کو کھنا شروع کیا تھا اور صرف چار ماہ میں ہی ایک صاف ستھرے علاقے میں آٹھ کمروں والا گھر خرید لیا تھا۔ گھر ڈبل اسٹوری تھا۔ چار کمرے نیچے اور چار اوپر۔

خوب صورت رنگ و روغن والے اس گھر میں سفید ماربل کے فرش تھے۔ کھلے کھلے کمروں میں چاک کی چمٹیں خوب صورتی میں اور اضافہ کرتی تھیں۔ جس روز وہ رخشندہ اور عبدالکریم کو یہ گھر دکھانے لایا جت سے ان کی آنکھیں بھٹ گئی تھیں۔ حالانکہ یہ کوئی بہت بڑا بنگلہ نہ تھا۔ مگر دو کمروں والے تنگ ڈبے کے مقابلے میں یہ محل ہی لگ رہا تھا۔ نئے گھر میں پرانی کرسیوں، دیبک زدہ پینٹوں کا کوئی کام نہ تھا اس لیے مناسب سا ضروری فرنیچر بھی خرید لیا گیا۔ گھر خریدنے کے لیے کم پڑنے والے پیسے سکندر نے دیے تھے۔ پارٹنر ہونے سے پہلے وہ اتنے دوست تھے اس لیے سکندر کی طرف سے خرچ ہونے والے پیسوں کو مرقئی کی سہولت کے مطابق واپس کرنے کی بھی پیشکش تھی۔ سب کچھ سیٹ ہو گیا تھا۔

اچھا گھر اچھا کھانا تن پر خوب صورت ملبوس۔ انسان ان ہی مادی چیزوں کے لیے جدوجہد کر رہا ہے گھر بدلنے سے جہاں ام مریم بہت خوش تھی وہیں مرقئی کے الگ ہو جانے اور چلے جانے۔ پر وہ بہت دلہواشتہ بھی تھی۔ اس نے ظاہر نہ کیا لیکن مرقئی سمجھتا تھا۔

جن نیلے کواڑوں کو وہ دن میں درجنوں بار پار کرتی تھی وہ اب مقفل پڑے رہتے، چھت پر ساتھ والی منڈیر سے جھک کر وہ صحن میں دیکھتی وہاں اڑتی دھول اور ویریائی اس کے دل میں ڈیرے ڈالتے لگتی۔



ان ہی دنوں ایک بہت اچھے گھر سے ام مریم اور بین کے لیے رشتے آئے۔ وہ لوگ اپنے دونوں بیٹوں کی شادی ایک ساتھ کرنا چاہتے تھے۔ کھاتے پیتے گھرانے سے آیا رشتہ کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ عبدالرحیم نے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ ان کی فکر بجا تھی۔ دونوں بیٹیاں خیریت سے اپنے گھروں کی ہو جائیں یہی تو بس ایک خواہش تھی ان کی۔

مگر ام مریم کے لیے کوئی اور رشتہ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ یہ بات بچپن ہی سے ڈھکے چھپے انداز میں سب پر عیاں تھی کہ ام مریم مرقئی کے لیے ہے۔ گھر کا ہر بڑا چھوٹا اس بات کو جانتا تھا چنانچہ عبدالرحیم نے آنے والے رشتے کے لیے ام مریم کی رائے لینا بھی ضروری نہ سمجھا اور صرف بین کے لیے ہاں کر دی۔ بین کے سسرال والوں کو بہت جلدی تھی۔ لوگوں نے باتیں بنائیں کہ بڑی کو چھوڑ کے چھوٹی کو بیاہ رہے ہیں مگر جاننے والے اندر کی بات بھی جانتے تھے۔ چنانچہ یوں بین عبدالرحیم شادی کر کے بین احمد رضابن کے پیا گھر سدھا گئی۔

عبدالرحیم نے اپنی ساری پونجی نکال کے بین کو وہ سب کچھ دیا جو ان کی حیثیت کے مطابق تھا۔ ام مریم کے لیے وہ دوبارہ جمع کر لیں گے، یہ سوچ کر سب کچھ بین کی شادی پر خرچ کر دیا۔ تایا ابانے بھی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور بخیر و خوبی تمام کام انجام پائے تھے۔ مرقئی بہت کم وقت کے لیے آتا تھا مگر منڈی سے لے کر یارات تک اس نے تمام فنکشن میں شرکت کی تھی اور سارا وقت ام مریم کے بچے سنورے روپ کو نظروں کے حصار میں لیے رکھتا تھا۔

ام مریم نے اب شام کو گھروں میں جا کر ٹوشن لینا بند کر دیا تھا۔ عبدالرحیم کے دکان جانے کے بعد وہ گھر کو اکیلا نہ چھوڑ سکتی تھی۔ ویسے بھی اب سب کاموں کی ذمہ داری اسی پر آ گئی تھی۔ اس لیے وہ گھر میں ہی ان بچوں کو پڑھانے لگی جنہیں پہلے بین پڑھاتی

تھی۔

دن بھر کے کام پنا کر وہ دوسرے میں کچھ دیر سو جاتی پھر اٹھ کر بچوں کو برساتی اور فارغ ہو کے شہوت کے درخت کے نیچے گری پچھا کر گھٹنوں کے گرد بانو لپیٹ کر رضی کے فون کا انتظار کرنے لگتی۔ گزشتہ کچھ مہینوں سے یہ بھی اس کی عادت بن گئی تھی۔ روزانہ کے وعدے کے باوجود ہفتے میں دو تین بار وہ کال ضرور کر لیتا تھا۔ مگر روز انتظار کا نام مریم نے نہیں چھوڑا تھا۔ یہ فون مرتضیٰ نے اس کی سالگرہ پر تحفے میں دیا تھا۔

اتنے مہنگے تحفے پر وہ بجائے خوش ہونے کے رونے بیٹھ گئی تھی۔ اس کا دل اتنا ہی چھوٹا تھا۔ باوجود خوش امیدی اور توقع کے جب وہ توقع پوری ہو جاتی تو اس کا چڑا جتنا دل اسے سہارا نہیں دیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ چھت پر کپڑے پھیلا کر نیچے آئی تھی جہاں صحن میں فرش پر بچے اپنے اپنے کھانے رکھے لکھنے پڑھنے میں مشغول تھے۔ صاب کے کسی سوال میں اٹھتے ہوئے وہ نئے برے سے حل کرنے لگی تھی کہ آہٹ پر چونکی۔

دروازے سے رخشندہ تائی اندر داخل ہو رہی تھیں ساتھ میں منزو بھی تھی۔ جب سے گھر چھوڑا تھا۔ انہوں نے آتا ہر دم کم کر دیا تھا کیونکہ نیا گھر کافی دور تھا۔ خود مریم بھی گھر دیکھنے صرف ایک ہی بار وہاں گئی تھی۔ ام مریم اٹھ کر بے اختیار تائی کے گلے جا لگی۔ اپنے دنوں بعد ان کی آمد پر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں تھیں۔ کچھ دیر رخشندہ جڑ بڑی کھڑی رہیں۔

”جیسا سے حلق میں کانٹے پڑے ہیں مریم! اتنی گرمی میں اب کیا گلے سے چٹی ہی رہو گی۔“ تائی نے اسے الگ کرتے ہوئے بے زاری سے کہا۔ ام مریم ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ منزو سے ملنے لگی۔

”تائی اماں! آپ بیٹھیں ناں۔ میں ابھی شربت بنا کر لائی۔“ وہ بچن کی طرف بھاگی اور جلدی سے سکنجبین بنا کر لے آئی اور تخت پر پڑے رہی جہاں رخشندہ اپنی چادر کو پھیلا کے دونوں ہاتھوں میں تھام کر پکے کی طرح جمل رہی تھیں۔

”تو بے کتنی گرمی ہو گئی ہے اور تیرا دل نہیں جبران ہوا۔“ بھانجی نے صحن میں بیٹھی ہے؟“ وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی جنہوں نے خود پوری زندگی بونے میں پڑنے والی سخت گرمی میں محض پٹھے گزار دی تھی۔ پھر وہ مسکرا دی۔ تائی کی طبیعت وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔

”اچھا لیں آپ شربت پیئیں میں ہاتھ والا پنکھا لے آؤں اندر سے بیڈ مثل فین بھی خراب ہے۔“ وہ اٹھی پھر جاتے جاتے رکی۔ اس کے دل میں نے بھی کام کرنا بند کر دیا ہے شاید۔ سر ہاتھ مار کے وہ پھر پٹی۔

”تائی اماں! آپ اندر چل کر بیٹھیں ناں پکے کی نیچے۔“

”نہیں! بس ٹھیک ہوں اور یہی جا ہاتھ والا پنکھا ہی لے آ۔“ سر ہلائی وہ مڑی۔ عرصے بعد ان کی آمد وہ کھل سی اٹھی تھی۔ اپنوں کے ساتھ کا سکھ بھی کتنا پیارا لگتا ہے۔

تائی رخشندہ غیروں کی طرح تکلف سے تخت پر بیٹھی تھیں۔ اسے عجیب سا لگنے لگا۔ پنکھا بھلتے ہوئے وہ منزو سے چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھتی رہی جو اسے اپنی شاہنگ دکھا رہی تھی۔

”کیا ہوا تائی امی۔ بیٹیں ناں شربت۔“ بڑی دیر سے ہاتھ میں تھے گلاس کو جوں کا توں دیکھ کے وہ بول ہی پڑی۔

”عجیب سا زائقہ ہے اس شربت کا تو۔“ ان کی عجیب سی بات پر وہ سوالیہ انداز میں منزو کی طرف دیکھنے لگی۔

”وہ۔ امی منل وائر کہہ رہی ہیں۔“ تیرہ سالہ منزو نے شرمندہ شرمندہ سی وضاحت دی تو مریم کو زور کی ہنسی آئی مگر ضبط کر کے انہیں دیکھنے لگی۔

”بی بیانی مجھے ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے اب توجی بھی نہیں کرنا ایک گھونٹ پینے کا بھی۔“

”اچھا تائی اماں! میں آپ کو بوتل منگوا دیتی ہوں۔“ اپنے تئیں اس نے بے حد مناسب بات کی تھی۔

”یہ بابا نہ مجھے تو معاف رکھو! اب دوسروں تلیں بی کے مجھے اپنا معذہ خراب نہیں کروانا۔“

مناجات سے سر ہلائی ام مریم کو ہنسی چھپانا بہت دشوار۔ لگنے لگا تو وہ ٹرے اٹھا کر سوچتے ہوئے کچن میں رکھنے چلی گئی کہ انسان خواہ کتنی ہی ترقی کر لے اسے اصل، اپنے ماضی کو نہیں بھولنا چاہیے۔ آگے کی زندگی جینے میں آسانی ہوتی ہے۔



اس نے کرپٹ بدل کر پھر گھڑی کو دیکھا جو دوپہر کا ڈیڑھ بج رہی تھی اور سر ہانے کے قریب ہاتھ پھیر کر اسے سی کار میوٹ ڈھونڈنا چاہا پھر سائڈ لیپ کے پاس وہ اسے مل گیا۔ ریمورٹ سے اسے سی آن کر کے وہ الٹائیٹ گیا۔ کمرے کی پھیلتی خنکی اسے پھر سے نیند کے حوالے کرنے لگی۔

یہ اسے سی اس نے پچھلے مہینے ہی لگایا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ ان کے ہاں دولت کی ریل چلی ہو گئی تھی اور پیسہ برس رہا تھا۔ آسانبات نہ سہی مگر بہت سی سہولیات اس گھر میں آگئی تھیں۔ اس نے اماں بابا کے کمرے میں ایک اسے لگایا تھا دو سرا اپنے کمرے میں منزو اور کاشف بھی رخشندہ کے کمرے میں ہی سوتے تھے۔ اب اتنی رہی بھی۔ نہیں آئی تھی کہ وہ ہر کمرے میں اسے سی اور بی بی لگوا دیتا۔ ہاں بس اتنا ہوا تھا کہ عبدالکریم کی قلیل آمدنی میں جس گھر کا گزارا کھینچنا کر ہو رہا تھا اور کوئی ضرورت پوری کرنے کے لیے کسی وقت پیٹ بھی کاٹنا پڑا تھا۔ آج کم سے کم کھانے پینے کے لیے ہاتھ تنگ نہ تھا۔

کمرہ ٹھنڈا ہو چکا تھا اور نیم خواہیدہ سی کیفیت میں دو دو ہیا رنگت والی روحا سے یاد آرہی تھی وہ رات کو ہی کراچی سے واپس آیا تھا۔ آفس کے کام سے ایک سیمینار میں شرکت کرنے وہ اور سکندر کراچی گئے تھے۔

کراچی میں انہوں نے شیرین جیسے مہنگے ہوٹل میں پورے چار دن گزارے۔ اس لکڑی کمرے کا فریچر

کارپٹ اور انٹیریئر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مرتضیٰ نے پہلی دفعہ ایلیٹ کلاس کے کسی ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ اسے ایک ایک چیز متاثر کر رہی تھی۔ روز باقاعدگی کے ساتھ بیڈ شیٹس اور کٹن کورز تبدیل کیے جاتے۔ دھیز کارپٹ کو ویکووم کلیئر سے صاف کرنے والا عملہ بے حد مستعد تھا۔ ڈھونڈنے بھی کمرے میں گرد کا ایک ذرہ تک دکھائی نہ دیتا۔ حتیٰ کہ ہاتھ روم اس قدر چمک رہا ہوتا کہ اس کے فرش اور دیواروں پر اسے اپنا عکس نظر آتا۔ ایک سے بڑھ کر ایک امپورٹڈ شیمپو صابن اور شیونگ کا سامان وہاں دستیاب تھا۔ ان چار دنوں میں مرتضیٰ کو گمان ہوا کہ کسی ریاست کا راجہ ہے۔

چوتھے روز ضروری کام نمنہ کر وہ شام کے وقت ساحل سمندر پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ سورج ڈوبنے کا اس سے حسین منظر مرتضیٰ نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ساحل کی گیلی ریت پر چلتے چلتے مسکراتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ اگر ام مریم ہوتی تو وہ بھاگ جیسے پانی کی لہروں کو بھاگ بھاگ کے اپنے پیروں سے لپٹا دیکھ کے خوشی سے دیوانی ہی ہو جاتی۔ چلتا چلتا وہ دور آگیا تھا۔ سکندر کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا وہ اسے بلا رہا تھا۔ سکندر کی ایک کزن اسے وہاں اتفاقاً مل گئی تھی اور وہ خاصا مسرور تھا۔ مرتضیٰ کا بھی اس سے تعارف ہوا۔ خوب صورت اسٹافٹس سی دو لڑکیاں بڑی بے تکلفی سے اس سے ملیں۔ شاید ان میں ہاتھ ملا کر ہیلو کہنے کا رواج عام تھا مگر مرتضیٰ جیسے شخص کو بہت عجیب لگا۔ سکندر اپنی کزن کے ساتھ چلتا ہوا دور نکل گیا۔ وہ اسی بے نیازی سے اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہی تھی۔ روحا سکندر کی کزن عفراتی فریڈ اور کلاس میٹ تھی۔ اور کل ہی دونوں ایک فیشن شو میں شرکت کے لیے کراچی آئی تھیں۔ وہ فیشن ڈیزائننگ کی اسٹوڈنٹس تھیں روحا بے پناہ حسن کی مالک تو نہ تھی مگر اس کی بے حد اچلی گوری بے داغ رنگت اس کا بے پروا انداز اور اس کی اسٹافٹس ڈریسنگ جیسے نظر کو جکڑتی تھی۔ اردو سے زیادہ انگریزی بولتی روحا کچھ ہی

دیر میں اس سے بے تکلف ہو کے آپ سے تم پر آ چکی تھی۔ ام مریم کے بعد یہ پہلی لڑکی تھی جس سے مرتضیٰ نے اتنی دیر اور اتنی زیادہ باتیں کی تھیں۔ اسے اچھا لگا۔ ان چاروں نے ذرا کھینچ لیا۔ جاتے وقت اس نے مرتضیٰ کا موبائل نمبر مانگ کر اسے ہکا بکا کر دیا تھا۔ پھر اس نے سوچ کے سبر جھکا کہ جس سوسائٹی سے وہ تھیں وہاں یہ عام بات تھی۔

اسے نہیں پتا چلا وہ کب سے روحا کو سوچے جا رہا تھا۔ نیند کب کی اڑ گئی تھی۔ کروٹ لے کر اس نے بے تکی سے خیال کو ذہن سے جھٹکا اور موبائل نکال کر لا شعوری طور پر ام مریم کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری تیل بری فون اٹھالیا گیا۔

”السلام علیکم!“ اس کے بولنے سے قبل ہی ام مریم کی چمکتی ہوئی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرانی۔ اس کی ساری کلفت جاتی رہی۔ سوچ کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھ بیٹھا وہ ایک ہی سانس میں اس کا حال احوال، گھر والوں کی خیر خیریت کے ساتھ ساتھ آفس روٹین بھی پوچھتے جا رہی تھی۔

وہ مرتضیٰ کے غیر متوقع۔ فون آجانے پر بہت خوش تھی۔

”کتنے دن سے تم نے گھر کا چکر نہیں لگایا مرتضیٰ! ابا کتنا یاد کرتے ہیں تمہیں۔“

”صرف پچایا یاد کرتے ہیں مجھے؟“ زیریں لب دبا کر وہ شرارت سے بولا۔

”نہیں“ چچا کی صابزدادی بھی آپ کو صبح و شام باقاعدگی سے یاد کرتی ہے، آکے مل جائیں اس سے پہلے کہ آپ کی صورت بھی اسے بھولنے لگے۔“

”ام مریم مرتضیٰ کو بھی بھول سکتی ہے کیا؟“

”ام مریم تو نہیں مگر مرتضیٰ شاید ام مریم کو بھول سکتا ہے۔“

اس کے شکوہ نکال ہونے پر مرتضیٰ کھلکھلا کے ہنسا اور شام میں آنے کا وعدہ کر کے فون بند کر کے نہانے چل دیا۔

شام کی سرمئی چادر پھیلتے ہی ام مریم نے رگڑ رگڑ کر منہ دھویا اور اپنا سب سے اچھا سوٹ نکال کر پہنا۔ آنکھوں میں کاجل کی لیکر س بھی کھینچیں۔ سافلی رگٹ میں گندم کے سنہری خوشوں جیسی چمک تھی۔ پرکشش نقوش پر چھوٹی سی ناک اور مناسب سادبانہ۔ وہ بہت خوب صورت نہ تھی مگر بڑی بڑی گہری آنکھوں میں کبھی کبھی کاجل ڈال لیا کرتی تو اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے کو حرم میں ڈال سکتی تھی۔ آج کاجل لگانے کی زحمت اس نے بڑے دن بعد کی تھی اور جس کے لیے کی تھی اس کے انتظار میں کانا ایک ایک منٹ بھاری ہو گیا تھا۔

نیوشنز والے بچوں کو جلدی جلدی بڑھا کے چھٹی دیتے ساتھ ہی وہ بچن میں تھی مرتضیٰ کی پسند کے شامی کباب بنانے لگی۔ اس کی تیاری کے بعد ساتھ چاول دم پر رکھ کے جلدی سے رائتہ تیار کیا۔ یہ مرتضیٰ کا من پسند کھانا تھا۔ جو بے حد دل سے تیار کر کے وہ پلاہر لگی کپڑے استری کر کے پن کے اب بالکل تیار تھی۔

عبدالرحیم دوسرے اپنے ایک دوست کی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے گئے تھے۔ ام مریم نے سوچا وہ بھی اتنے دن بعد اچانک مرتضیٰ کو گھر پا کر بے حد خوش ہو جائیں گے۔ موسم خوشگوار ہو چلا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔

سرمئی ٹیلا سا آسمان اب ہلکا ہلکا سیاہ پڑنا شروع ہو گیا تھا اور ام مریم کی منتظر آنکھوں کی جوت بھی۔ بے چینی سے چھوٹے سے کھن کے چکر کاتی ام مریم نے تھک کے مرتضیٰ کے موبائل پر کل کرنا شروع کر دی تھی۔ نمبر بند تھا۔ اس نے کان سے موبائل ہٹا کر حیرت سے اسکرین پر سے جواب موصول نہ ہونے کے بعد حیرت غائب ہوئے دیکھا۔ کچھ لمحے بے یقینی سے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے پھر تیزی سے نمبر ڈائل کر دیا۔

نمبر اب بھی بند تھا۔ اسے پریشانی ہونے لگی،

مرتضیٰ اتنا غیر ذمہ دار تو کبھی نہ رہا تھا اور اس کے معاملے میں تو کبھی بھی نہیں۔ وہ چپ چاپ سی تخت پر بیٹھ گئی اور نظریں جھکائے اپنے پیروں کو دیکھنے لگی مگر اس کے کان اب بھی دروازے پر ہونے والی مانوس سی دستک کے منتظر تھے۔ کیا پتا وہ رستے میں ہو اور نیٹ ورک کی خرابی کے باعث نمبر نہ مل رہا ہو۔ اس نے بے اختیار نیٹ ورک کی خراب سروں کو کوسا۔ آدھا آدھا ہنسنے اور پھر رینگتے رینگتے دیکھنے بھی گزر گئے رات پوری طرح پھیل گئی تھی۔

وہ اب تک تخت پر یونہی اطراف میں دونوں ہتھیلیاں رکھے، سر جھکائے بیٹھی پیروں پر نظر جمائے ہوئے تھی مگر اب اسے اپنے پر نظر آتا بند ہو گئے تھے۔ پورا گھر اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر صحن میں لگے بلب کو جلانے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ عبدالرحیم ابھی تک گھر نہیں آئے تھے۔ تنہائی اور اندھیرے سے خوف زدہ ہونے والی ام مریم اس وقت ہر طرح کے احساس سے قطعی بے نیاز تھی۔ اسے کسی اور چیز کی وحشت نے سہکت کر رکھا تھا۔

اسے کسی اور دھڑکے نے جلد کر رکھا تھا۔ اس کے اندر وہ اپنے سے جنم لینے لگے خوش گمانی کی عینک گر کر پیروں کے نیچے آ کر ترخ گئی تھی۔ وہ بدلتے وقت کی بے رحمی سے واقف ہو رہی تھی۔ ہاں وقت واقعی بدل گیا تھا۔ تو کیا رشتے بھی بدلنے تھے؟ اسے لگا مرتضیٰ عبدالکرم اس کی رسائی سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ خوف کے مارے اسے بھر جھری سی آگئی۔

نہیں۔ نہیں! ہو سکتا ہے کوئی ضروری کام آن پڑا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ ادھر آنے کے لیے نکلا ہو اور کوئی آرجنٹ میٹنگ میں جانا پڑ گیا ہو۔ ہو سکتا ہے۔ وہ ترخا ہوا خوش امیدی کا چشمہ اٹھا کر پھر اسے دیکھنے لگی تھی۔

ہاں ہو سکتا ہے۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مرتضیٰ ام مریم سے ملنے نہ پہنچے۔

ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ام مریم نے آواز دی تھی اور مرتضیٰ اس کی پکار پر لپک کتاباں نہ پہنچا تھا۔ ام مریم کی سانس ساکن نہ ہوئی تو اور کیا ہوتا۔

شام کو گیراج میں ٹراؤزر کے پانچے فولڈ کیے۔ آستین چڑھائے اپنی بایک دھو رہا تھا۔ گھر دلنے کے کچھ دن بعد ہی یہ بھی آگئی تھی۔ اسے مگر اس کی خاص ضرورت نہ پڑی۔ کیونکہ آفس کی گاڑی اسے پک اینڈ ڈراپ دیتی تھی۔ البتہ خود کہیں جانا ہوتا تو یہ بایک استعمال میں لانی جانی ورنہ یونہی کھڑی رہتی۔ ام مریم نے ابھی یہ بایک نہیں دیکھی تھی اس لیے وہ اسے سربراہی دینا چاہ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ پچاکی طرف جانے والا تھا۔ لیکن پاس پڑے موبائل پر موصول ہونے والی کال نے اس کے ارادے پر مٹی ڈال دی۔ ”روحا کالنگ“ کے جگمگاتے الفاظ حیرت سے دیکھتے ہوئے اس نے نیس کا مٹن دبا دیا۔ یہ لڑکی اس کی سوچ سے زیادہ ایڈوائس تھی۔

”ہائے مرتضیٰ! کیا ہو رہا ہے؟“ کال ریسو ہوئے ہی وہ چمکی۔ ”کچھ خاص نہیں“ آپ سنائے کیسے مزاج ہیں؟“ روحا کی بے تکلفی کے باوجود وہ اسے ”آپ“ کہہ کر ہی مخاطب کر رہا تھا کیونکہ یہ اس کی فطرت تھی۔ اس لیے اس نے بھی مروا ”خوش دلی سے استفسار کیا۔

”مزاج ٹھیک نہیں، موز بھی آف ہے۔“ وہ لہجے کو اداس کرتے ہوئے بولی۔

”ارے وہ کیوں؟“

”عقرا کی بچی تو کراچی میں ہی انک گئی ہے ناں تو میں اکیلی یور ہو رہی ہوں۔“

”اچھا تو یہ بات ہے۔ سکندر بھی اب تک وہیں ہے۔“

”ظاہر ہے جہاں سکندر ہو گا عقرا لے تو وہاں موجود رہنا ہی ہے۔“ اس کی معنی خیز بات پر وہ دونوں ہنس

روح اسے وہ اتنا مرعوب تھا کہ چاہتے ہوئے بھی
نکار نہ کر پایا۔ اس نے سوچا فون کر کے ام مریم کو پھر
کسی دن آنے کا کہہ دے۔ قسمت خراب کہ جب وہ

روحانی بین لڑکی تھی۔ وہ سامنے والے کے مزاج اور
 عیت کو مد نظر رکھ کر اس سے بات کرتی تھی۔ اپنے
 حلق تو وہ مرتضیٰ کو پہلی ملاقات میں ہی بتا چکی تھی۔
 وجہ اس سے اس کے متعلق جاننے بھیجی تھی۔

مرتضیٰ نے بہت دھیان اور دلچسپی سے اس کی باتیں سنی تھیں۔ وہ ایسی ہی تھی کسی کی بھی توجہ لینے والی۔۔۔۔۔

کمرے میں آکر اس نے لائیس آن میں اور جیسے
سے والٹ اور موبائل نکال کر ٹیبل پر رکھا۔ ہند پڑے
موبائل کو دیکھ کے ایک دم اسے سب یاد آگیا جو وہ بڑی
دیر سے بھولا بیٹھا تھا۔

آگے بڑھ کر اس نے چار جرڈھونڈ کر فون چار جنگ پر لگایا اور وہیں کرسی پر بیٹھ گیا تاکہ فون آن ہوتے ہی وہ ام مریم کو کال کر کے آج کے لیے معذرت کر کے آئندہ پھر کسی دن آنے کا پکا وعدہ کر لے۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا جو ساڑھے گیارہ بج رہی تھی۔ لیکن اسے پتا تھا کہ وہ نہیں سوئی ہوگی۔ چند منٹوں کی چار جنگ کے بعد موبائل آن ہو گیا۔ اس نے مریم کا نمبر ڈائل کر کے فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی مگر مکمل خاموشی رہی۔ وہ کچھ نہیں بول رہی تھی۔

”ام مریم۔۔۔“ اس نے پکارا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔

”ام مریم!“ اسے دوبارہ پکارنا پڑا۔ اب کی بار ایک بو جھل سی سانس خارج کرتے ہوئے اس نے سلام کیا تھا۔

”سو تو نہیں گئی تھیں؟“ سوال ہی غلط تھا۔ ”سو سکتی تھی؟“ تین لفظوں پر مبنی اس شکوے سے پر سوال نے تھوڑی دیر کے لیے مرتضیٰ کو لب بستہ سا کر دیا۔

”مجھے پتا ہے تم ناراض ہو مریم! یقین کرو میں آنے والا تھا۔ شام تک بالکل تیار تھا۔“

”کوئی بزنس میٹنگ آگئی ہوگی۔“ ام مریم کی آواز بہت بو جھل ہو رہی تھی۔ شاید وہ روتی رہی تھی۔

”آل۔۔۔ ہاں، وہ ایک دم ہی ضروری کام پڑ گیا اور میٹنگ کینسل نہیں کر سکا تھا اس لیے آ نہیں سکا۔“

وہ ام مریم سے چھپانا نہیں چاہتا تھا مگر زندگی میں پہلی بار ایسے کسی لڑکی کے ساتھ شام بتانے کے بعد وہ ام مریم کو کس منہ سے سب بتاتا۔ اس جھوٹ پر اس کا ضمیر اسے شرمندہ کر رہا تھا۔

”خفامت ہو یا رہیں پھر کسی دن ضرور۔۔۔“ وہ اس سے اگلی بار آنے اور زیادہ دیر رکنے کا وعدہ کرنے والا تھا کہ ام مریم کی بات نے اس کا اطمینان بھی رخصت کر دیا۔

”یہ کون سی بزنس میٹنگ تھی مرتضیٰ! جو فانیو اشار

ہو ٹل میں تھلاڑی کے ساتھ ہو رہی تھی؟“

اس کے سوال نے کچھ لمحوں کے لیے اسے لنگ سا کر دیا۔

”بین لینے فریڈنڈ کے ساتھ اسی ہوٹل میں دعوت پر انوائٹڈ تھی۔“

اس نے ٹھہر ٹھہر کر ٹھنڈے لہجے میں ہوٹل کا نام لیا تو بجائے تسلیم کرنے کے وہ ڈھٹائی پر اتر آیا۔

”تو تمہاری بہن نے فوراً“ تمہیں رپورٹ پہنچا دی۔“ وہ تلخ ہو گیا۔

”میری بہن تمہاری بھی کچھ لگتی ہے۔“ جواباً اس نے بھی سخت لہجے میں کہا۔

”میں جس کے ساتھ مرضی گھوموں، ڈنر کروں یا میٹنگ میں کسی کو جواب دینے کا پابند نہیں۔“ کچھ دیر پہلے اپنی حرکت پر ہونے والی شرمندگی بھک سے اڑ گئی تھی اور اب وہ دیدہ دلیری سے اعتراف کر رہا تھا۔

”اگر مرتضیٰ رات گئے تک کسی لڑکی کے ساتھ گھومتا پھرے تو کیا ام مریم اس سے پوچھنے تک کی مجاز نہیں ہے؟“ وہ چیخ رہی تھی۔

”ٹھیک ہے پوچھو، مگر شک کرنے والے انداز میں نہیں۔“

”کون ہے وہ؟ کو لیگ یا کلائنٹ؟“ ام مریم کا لہجہ کڑوا ہٹ سے بھر رہا تھا۔

”دوست ہے وہ میری۔“ مرتضیٰ کے منہ سے یہ الفاظ اسے بڑے آجنبی سے لگے۔

”دوست؟ آج سے پہلے تو تم نے ایسی کوئی دوستی نہیں پائی مرتضیٰ تو پھر آج تمہیں اس کی ضرورت کیونکر پڑ گئی؟“

”دوستوں کی ضرورت انسان کو ہمیشہ رہتی ہے پھر وہ لڑکا ہے یا لڑکی اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اس سوسائٹی میں یہ فضول سوچ ہے ہی نہیں۔“

”مت بھولو کہ تم بھی اسی سوسائٹی سے ہو جہاں ایسی باتیں معیوب سمجھی جاتی ہے۔“ وہ اس سے جرح کر رہی تھی۔

”ہاں یہ الگ بات ہے کہ اب تمہاری سوچ بہت

ایڈوانس ہو گئی ہے۔“ مریم بولتی گئی۔ ”اپنی غلطیوں کو روشن خیالی کہہ کر پردہ ڈالنے والی سوچ۔“

”اچھا اگر یہ اپنی معیوب بات ہے تو تمہاری مجھ سے دوستی کیوں ہے؟“

مرتضیٰ کی بات نے اسے دونوں ہاتھوں سے دھکا دیا تھا۔ وہ لڑتے لڑتے رک سی گئی۔ شام سے بھیگتی آنکھیں کابل سے بے نیاز ہو چکی تھیں پھر سے بھر آئیں۔

”وہ اس لیے کہ تم میرے تایا زادو ہو مرتضیٰ! میں نے تمہارے ساتھ اپنا بچپن بتایا ہے، اور ہم میں صرف یہی ایک رشتہ تو نہیں ہے۔“

آنسو ضبط کرتی وہ ٹھہر ٹھہر کے بولی۔

”تو پھر اپنی سوچ بدل دو، کنوئیں کی مینڈک نہ بنو زندگی اس پس ماندہ رسول نگر سے باہر بھی ہے۔“

مرتضیٰ کا ایسا لہجہ تو اس نے بھی نہیں سنا تھا۔ دکھ کی انتہا نے اسے بولنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ بڑی دیر بعد وہ بولی تھی۔

”میری زندگی رسول نگر کے اندر ہی ہے اور میں اس کنوئیں کی مینڈک بن کے ہی خوش ہوں سوچو وہی بدلیں جن کے حالات بدل گئے ہیں۔“

”اوہ! تو میرے حالات بدل جانے پر جلن ہو رہی ہے تمہیں؟“ اس نے جیسے تیز دھار چاقو سے کٹ لگا دیا۔

”جلن۔۔۔ اور مجھے؟“ سارا جھگڑا، سارے الفاظ بھک سے اڑ گئے۔

”ہاں جلن ہو رہی ہے کیا؟ سب تو مجھ سے حید کرنے ہی لگے ہیں مگر مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ تم بھی میرے حالات سدھر جانے پر حید کرنے لگو گی میرا اسٹیکس، میری سوچ بدلتے دیکھ کر تم سے سہا نہیں جا رہا، میں اپر کلاس میں گھومتا پھرتا ہوں تو تمہیں تکلیف ہو رہی ہے تم تو میرے۔۔۔“

اس کی تیر برساتی زبان کو بریک لگ گئے۔ دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ اس نے غصے سے فون پٹھوایا۔

شاید دولت کی تیز سنری چمک انسان کی وہ بیٹائی چھین لیتی ہے جس سے وہ محبت خلوص اور ایثار و وفا میں اپنے رشتوں کو دیکھتا ہے۔

وہ لڑکی جس نے بڑے سے بڑے وقت میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس نے مرتضیٰ سے تب سے محبت کرنی شروع کر دی تھی جب اسے صبح سے لفظ محبت کا ادراک بھی نہیں ہوا تھا۔

کیا ایسی لڑکی مرتضیٰ عبدالکریم سے حد کر سکتی ہے؟

حسد۔۔۔ جلن۔۔۔ ہاں۔۔۔ جلن تو اسے ہو رہی تھی۔ اور یہ طے تھا کہ یہ جلن اسے تمام رات جگا کر رکھنے والی تھی۔ بھگتے گالوں کو رگڑتے ہوئے وہ تخت پر سیدھی لیٹ کے آسمان تکٹنے لگی۔

ان میں تو کبھی تلخ کلامی تک نہ ہوئی تھی۔ ام مریم نے پیشے مرتضیٰ کی بات سنی تھی اور ہمیشہ اس کی بات مانی تھی پھر اب سرد لہجے میں منہ پر بات مارنے والا انداز وہ کیونکر رواشت کر لیتا۔ اسے ام مریم پر بہت غصہ تھا ویسے بھی اب اسے کچھ سوچنے کی ضرورت کم ہی ملتی تھی۔ آئس کے بعد جم چلا جاتا۔ اب اس نے وہاں کی باقاعدہ ممبر شپ لے لی تھی۔ وہاں بہت سے لوگوں سے اس کی جان پہچان ہو گئی تھی۔ بہت سے نامور لوگوں کو سامنے سے دیکھنے اور بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ پوش علاقے میں موجود یہ جم خانہ اپر کلاس کے لیے وقت گزاری کی بہترین جگہ تھی۔ مرتضیٰ بھی آہستہ آہستہ ان ہی کے رنگ میں رنگنے لگا۔

روحاً باقاعدہ تو جم خانہ نہ آئی تھی لیکن جس روز آجاتی، وہ شام خوشگوار ثابت ہوتی۔ چمکتی ہوئی روحا اس سے دنیا جہاں کی باتیں کرتی پھر وہ چائے یا کافین پیتے اگر وقت ہوتا تو ڈنر بھی کر لیتے۔ سکندر اور عفرانے بہت بار انہیں بھی آؤٹنگ کے لیے ساتھ انوائٹ کیا تھا۔ وہ چاروں فیک اینڈز پر اب اکثر اکٹھے پائے جاتے۔ مرتضیٰ کی زندگی ایک انٹوے ہی ٹریک پر چل پڑی

موسم بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ گرمیوں کی طویل دہریں سکڑ کر چھوٹی ہوئی جارہی تھیں۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی در آئی تھی۔ محلہ رسول نگر کے صحن اور چھتوں پر سوتے لوگ اب کمروں میں سونے لگے تھے۔ رات کو ٹھنڈ ہوتی البتہ دن خوشگوار رہتا۔

ام مریم بچوں کو یوشن پر بٹھا کر فارغ ہوئی اور موبائل اٹھا کر چھت پر آگئی۔ ہوا میں دل کو سکون دینے والی تھکیاں تھیں۔ چارپائی پر بیٹھ کر اس نے موبائل سامنے رکھ لیا۔

یہ بھی اس کے معمولات کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔ وہ موبائل کو اب لاپرواہی سے ادھر ادھر نہیں چھوڑتی تھی۔ یہ مرتضیٰ کی کل کی شدت سے منتظر تھی۔ وہ جانتی تھی جلد یا بدیر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گا۔ اپنی کوتاہی پر پچھتاوا ہو گا اور وہ اسے فون کرے گا۔ زندگی میں پہلی بار ام مریم رو بھی تھی اور وہ مرتضیٰ کی جانب سے منانے جانے کی منتظر تھی۔ شام کی خنک سی ہوائے چوٹی سے نکلے بالوں کو چہرے کے گرد پھیلا دیا تھا۔ جنہیں وہ ہاتھ سے سمیٹ کے کانوں کے پیچھے اڑتی جارہی تھی۔ یکدم اسے گلی میں اپنے گھر کے دروازے کے آگے رکشہ رکنے کی آواز آئی۔ اس نے تجسس سے منڈیر پر سے جھانکا۔

”ابا! وہ چیٹی اور تیزی سے نیچے کی طرف لپکی۔

نذیر انکل رشتے والے کی مدد سے عبدالرحیم کو اٹھانے اندر لا رہے تھے۔ ان کے سر پر بی بندھلی تھی۔ انہیں اندر چارپائی پر لٹا کر رکشہ والا چلا گیا۔

”ابا! کیا ہوا ابا کو؟ نذیر انکل کیا ہوا ہے؟“

نذیر احمد بھی کپڑے کی اسی دکان پر ملازم تھے۔ ”جہاں عبدالرحیم کام کرتے تھے وہ ایک بار وہ ان کے گھر بھی آئے تھے اس لیے مریم جانتی تھی۔

”بیٹا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے آپ رونا بند کریں۔“ وہ اسے ایکسپڈنٹ کے متعلق بتانے لگے۔

جو بے طرح روتے ہوئے عبدالرحیم کے سرہانے بیٹھی تھی۔ دکان کے لیے استعمال ہونے والی موٹر سائیکل پر مال لے کر آنے کے لیے عبدالرحیم ہارکٹ گئے تھے اور سلمان موٹر سائیکل کی پچھلی نشست پر بندھوا کر واپس آ رہے تھے۔ جب بھری سڑک پر اوور لوڈ ہو جانے والی بایک ڈمگا گئی اور ساتھ والی لین سے آئی گاڑی سے ٹکرا کے دوڑ جا گری۔ ام مریم نے متوحش ہو کر آنکھیں بند کر کے لیٹے عبدالرحیم کو دیکھا۔ ہاتھ پر پٹی کے علاوہ دایاں بازو پیٹوں میں جلا تھا اور ٹانگ فریجس ہو چکی تھی۔ وہ پریشان کیسے نہ ہوتی۔

”تم کو ہمت سے کام لینا ہو گا بیٹا اللہ کا شکر ہے اس نے جان بچالی۔ میں آتا رہوں گا یہ دوائیں رکھیں اور کھانے کے بعد باقاعدگی سے دیں۔ یہ درد کم کریں۔ ڈاکٹر نے انہیں دو ماہ تک چلنے پھرنے سے منع کیا ہے، ٹانگ کافر پیچسز ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا۔ مگر خود کو اکیلا مت سمجھنا کسی بھی چیز کی ضرورت ہو مجھے فون کر لینا بیٹا!“ اسے تسلی دے کے وہ چلے گئے۔

اور عبدالرحیم کو دیکھ دیکھ کے ہلکتی مریم بین کانمبر ملانے لگی۔ اسے بتا کر اس نے مرتضیٰ کو فون کیا۔ کال پھر نہیں لی۔ اس نے گھر پر فون کیا اور مائی رخشدہ کے فون اٹھانے پر ابا کے ایکسپڈنٹ کا پتا کے تھک کر موبائل رکھ دیا۔ اس ناتواں سی جان کے لیے ایسا برا غم سہارا مشکل تھا۔ وہ اپنوں کو آوازیں دے رہی تھی۔

بین کے آنے سے اسے بہت حوصلہ ملا تھا۔ عبدالرحیم بہت مشکل سے ہاتھ کو ہلایا رہے تھے اور ٹانگ تو ایک انچ بھی سرکاتے تو درد سے کراہتے۔ اس پڑوس والے بھی ان کا حال پوچھنے آئے تھے۔ ایک روز مائی رخشدہ بھی بھولے سے آئی تھیں اور اوپر کی دل سے عیادت کر کے چند منٹ بیٹھ کے چلی گئی تھیں۔ ام مریم کا خیال تھا کہ مرتضیٰ خواہ کتنا بھی ناراض ہو، خون کا رشتہ تو ہے۔ اب تو وہ چکر لگائے گا ہی۔ لیکن وہ غلط ثابت ہوئی۔ کئی دن گزرنے کے بعد بھی نہ تو مرتضیٰ آیا تھا اور نہ عبدالرحیم نے بھائی کی خیریت دریافت کی تھی۔ اب مریم نے انتظار کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ دولت کے سامنے رشتے اپنی وقعت کھوئے لگے ہیں۔ اور مرتضیٰ جیسے شخص کے بارے میں یہ سوچنا بہت تکلیف دہ تھا کیونکہ اس سے مریم کا صرف خون کا رشتہ نہ تھا، دل کا بھی تھا۔ بین کچھ دن رہ کے واپس چلی گئی۔ سسرال کے بکھیڑوں کے باعث وہ زیادہ دن رگ نہ سکتی تھی۔

عبدالرحیم کی خدمت میں اس نے کوئی کمی نہ چھوڑی مگر اب اسے اور ہی فکریں ستانے لگی تھیں۔ عبدالرحیم تو اب کچھ ماہ کے لیے بستر کے ہو رہے تھے اور ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ اس کے بعد بھی انہیں معمول کے انداز میں چلنے پھرنے میں وقت لگے گا۔ ام مریم نے کچھ رقم پس انداز کر رکھی تھی۔ اس سے ان کا علاج چلا رہا۔ اور اب یوشن والے پیسوں میں سے ہزار کا آخری نوٹ فقی میں تھا۔ دروازے میں کھڑی تھی کہ کسی جاننے والے کو دے کر اسٹور سے آیا کے لیے دوائیں منگوا سکے۔ دوائیں بہت ہسکتی تھیں اور گھر کا خرچ الگ۔ ہر مہینے آنے والے پانی ویس و بجلی کے بل بھی ادا کرنے تھے۔ کسی کے سامنے ہاتھ وہ نہیں پھیلا سکتی تھی۔

اس نے سوچا کہ اسے کوئی نوکری کرنی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ وہ بالکل خالی ہاتھ رہ جائے اسے کچھ تو کرنا تھا۔ اخبارات میں دیکھ دیکھ کر وہ کچھ جگہوں پر انٹرویو بھی دے آئی تھی اور اب وہاں سے انٹرویو کال آنے کی منتظر تھی۔

ہوٹل میں زرد نارنجی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میوزک کی ہلکی ہلکی دھن ماحول کو روپاں پرور بنا رہی تھی۔ باہر کی نسبت اندر کا ماحول قدرے گرم تھا۔ ٹیبلز کے گرد بیٹھے بے فکر سے لوگوں کے وقفوں وقفوں سے آتے قہقہوں کی آواز سکون بھری فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھیں۔ ایک دیوار کے پاس والی نیبل پر آنے سامنے بیٹھے وہ دونوں بھی ماحول کی خوب صورتی کو محسوس کرتے ہوئے باتوں میں منہمک تھے۔

روح اور عفر کا شاندار رزلٹ آنے پر دونوں نے آج یہاں ٹریٹ دینی تھی مگر سکندر اور عفر کو کیس اور جانا پڑ گیا تھا۔ پچھلے مہینے ان دونوں کی منگنی ہو گئی تھی دونوں بہت خوش تھے۔ اس وقت بھی مرتضیٰ ان ہی کے متعلق روحا سے بات کر رہا تھا۔

”دونوں اس منگنی سے بہت خوش ہیں۔ کیا یہ پہلے سے ایک دوسرے میں انوالو تھے؟“ وہ روحا سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں انوالو تو کافی عرصے سے ہیں۔“

”چلو اچھی بات ہے پھر تو۔۔۔ محبت کا خوب صورت انجام تک پہنچ جانا ہی اچھا ہے انسان مطمئن و سرشار رہتا ہے۔“

اس کی بات پر روحا نے زوردار قہقہہ لگایا اور کافی دیر ہنسی رہی۔ پھر بمشکل ہنسی روک کر بولی۔ ”یہ کس زمانے کی باتیں کرتے ہو تم؟ اب تو رشتے ضرورت اور مفاد کی بنیاد پر طے ہوتے ہیں۔ سکندر اور عفر نے بھی اس رشتے میں باہمی مفاد سب سے پہلے مد نظر رکھا ہے۔ یہ محبت و حبت کون کرتا ہے اب کسی سے؟ حالات بدل جائیں تو دل بھی بدل جاتے ہیں اور رشتے بھی۔“

وہ مذاق اڑا رہی تھی اور مرتضیٰ کا چچ والا ہاتھ منہ تک جاتے جاتے رک گیا تھا۔ وہ بھی تو حالات بدلتے ہی سب کچھ بھول گیا تھا۔ محبت بھی رشتے بھی۔ مرتضیٰ کے چہرے پر سایہ سالر آ گیا۔

”کیا ہوا؟“ مرتضیٰ کو غیر معمولی طور پر یکدم خاموش دیکھ کے وہ پوچھنے لگی۔

”کچھ نہیں“ اس نے سسکرانے کی کوشش کی اور سر جھکا کر خود کو کھانے میں مصروف ظاہر کرنے لگا۔ روحا نے شانے اچکائے اور کھانا کھانے لگی۔ کچھ دیر بعد روحا کا موبائل بجایا۔ نبرد دیکھ کے اس نے کال دیا اور مرتضیٰ سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔

چند لمحوں بعد فون پھر بجایا۔ اس نے پھر کال دیا۔ مرتضیٰ نے اس سے نہیں پوچھا کہ کس کی کال ہے۔ اس کی روحا سے اچھی دوستی تھی مگر وہ ذاتی

نوعیت کے سوال نہیں کرتا تھا۔

اگلی دفعہ روحا کا فون نہیں بجاتا بلکہ مسیح ٹون نے روحا کو ہاتھ میں کھینچ کر پیغام پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ پیغام پڑھ کے اس کے چہرے پر الجھن پھیل گئی۔ وہ متذنب سی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”ابنی پر اہلم؟“ مرتضیٰ نے کھانے سے ہاتھ روک کے پوچھا۔

”نہ۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں ذرا واش روم سے فریش ہو کے آتی ہوں!“ وہ اٹھ کر اس طرف چل پڑی جہاں واش رومز بنے تھے۔ مرتضیٰ کرسی سے ٹیک لگائے روحا کے الفاظ یاد کرنے لگا۔

”محبت و جنت کون کرتا ہے کسی سے۔“ بالوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے اس نے گہری سانس خارج کی۔ وہ کتنی آسانی سے اسے اتنی سخت باتیں کہہ گیا تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اسے کامیاب دیکھ کے ام مریم سے زیادہ کوئی خوش نہیں تھا۔

اسے کامیاب ہوتے دیکھ کر ام مریم سے زیادہ فخر کسی کو نہیں تھا۔ پھر کیسے اس نے یہ کہہ دیا کہ وہ اس سے حسد کرتی ہے۔ کیسے! اسے شدید تاسف ہونے لگا۔

موبائل پر آنے والی کال نے اس کا دھیان کھینچا۔ سکندر کی کال تھی۔ وہ اسے اپنے ایک دوست کے گھر بلا رہا تھا۔ جس نے ایک پراجیکٹ کی کچھ ضروری باتیں ڈسکس کرنی تھیں۔

موبائل جیب میں رکھ کے اس نے والٹ نکال کر بل اوکریا اور نظریں ادھر ادھر گھمائیں۔ روحا ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ اٹھا اور اس طرف چل پڑا جہاں وہ گئی تھی۔ واش رومز کا دروازہ کھلا تھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ ادھر سامنے کی راہداری میں اچھی طرح دیکھ کے وہ پلٹنے لگا تو ہلکی ہلکی باتوں کی آواز پر اس نے ذرا پیچھے ہٹ کر اس سمت دیکھا جہاں سے آوازیں آرہی تھیں۔ وہ دائیں جانب پتلی سی ایک اور راہداری تھی جو شاید

ہوٹل کے کچن سے جالٹی تھی۔ اس نے آگے ہو کر جھانکا تو حیران سا رہ گیا۔ روحا رخ موڑے کھڑی تھی اور اس کے پاس ایک وجیرہ لڑکا کھڑا کچھ کہہ رہا تھا۔ ان میں کسی بات پر بحث ہو رہی تھی۔ مرتضیٰ کے دیکھنے ہی دیکھتے اس لڑکے نے روحا کا بازو پھینچ کر اپنی طرف کیا اور آگے جو ہوا اس سے زیادہ دیکھنا مرتضیٰ جیسے شخص کے لیے مشکل ہو گیا۔

اتنی غیر اخلاقی حرکت کرتے دیکھ کے مرتضیٰ کا چہرہ سرخ ہو گیا وہ تیزی سے مڑا اور ٹیبل کی طرف جانے کے بجائے باہر کی طرف بڑھ گیا۔ روحا کو ضروری کام اچانک آجائے پر اپنے جانے کا میسج کرتے وہ گیٹ پر پہنچا ہی تھا کہ روحا کا میسج آگیا۔ اس نے اپنا انتظار کرنے کا کہا۔ وہ ہونٹ پیچھے کھڑا رہا۔ چند ہی منٹ بعد وہ اسے آتی دکھائی دی۔ نارمل انداز میں بالوں میں ہاتھ چلاتی وہ اسے پارکنگ کی طرف آنے کا اشارہ کر کے اس طرف بڑھ گئی۔

”اتنی کیا جلدی تھی کہ میرے آنے کا بھی انتظار نہ کیا؟“ اس کے پاس پہنچتے ہی وہ بولی۔

”سکندر کی کال آرہی تھی۔ بلا رہا ہے شاید ضروری کام ہے اس لیے میں چلا آیا۔“ حتی الامکان وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ دانت پر دانت جمائے وہ بہت مشکل سے خود پر جبر کیے ہوئے تھا۔

”ہاں تو کیا ہوا؟“ میں واش روم تک ہی گئی تھی وہاں عمر بتانے تو نہیں گئی تھی۔“ اس کے نیم سنجیدہ انداز میں کہنے پر مرتضیٰ کے ضبط کا پیمانہ چھلک پڑا۔

”مگر تم واش روم میں تو نہیں تھیں۔“ وہ اس کی بات کو لا پرواہی سے نظر انداز کرتی گاڑی میں بیٹھ کر اسے اشارت کرنے لگی۔ مرتضیٰ لب پیچھے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ایسی غیر اخلاقی گہری ہونٹ حرکت کر کے آنے کے بعد بھی وہ پرسکون بیٹھی تھی۔ شرمندگی کی ہلکی سی رمتق اس کے چہرے پر نہ تھی۔

”کون تھا وہ؟“ سامنے دیکھتے ہوئے مرتضیٰ نے بڑے ضبط سے پوچھا۔

”کون؟“ روحا کے انجان بننے کا ڈراما اسے مزید غصہ دلایا رہا تھا۔

”وہی جس کے ساتھ تم وہاں کھڑی تھی۔“

”اوہ۔۔۔“ روحا کو سمجھنے میں ایک لمحہ لگا تھا۔

”وہ میرا بوائے فرینڈ تھا۔“ خفا میں اس سے بہت عرصے سے یہاں میں نظر آتی تو بات کرنا چاہتا تھا، مجھے مانتا چاہتا تھا اس لیے میں۔۔۔“

”تم لوگ بات کر رہے تھے یا بے حیائی پھیلا رہے تھے؟“ مرتضیٰ کی آواز خود بخود بلند ہو گئی۔ اسے شدید غصہ آ رہا تھا وہ روحا کو اچھی دوست ماننے لگا تھا۔ اتنا تو وہ حق رکھتا تھا کہ کچھ غلط کرنے پر اس سے پوچھ سکتا، اسے روک سکتا، اور یہی وہ کر رہا تھا۔

”واٹ ربش کیا کو اس ہے یہ۔“ تمہیں کیا براہم ہے؟ میں اپنے ہر فعل کے لیے آزاد ہوں، آج تک کسی نے مجھ سے اس طرح کی جواب طلبی نہیں کی تو تم کون ہوتے ہو؟“ وہ بھی اکھڑے میں چینی۔

”کسی نے جواب طلبی کی ہوئی تو تم یوں اپنی نفس کی غلام نہ ہوتیں۔“

”فار گاڈ سیک مرتضیٰ! اپنی یہ تھرو کلاس منٹلٹی چھوڑ دو۔ چلتا ہے یہ سب۔“

”میں تھرو کلاس منٹلٹی رکھتا ہوں تو بھی کوئی برائی نہیں، عزت اور حیا انسان کے اندر ہونی چاہیے، خواہ وہ کسی بھی کلاس سے تعلق رکھتا ہو۔“

”کروی ناں وہی گھٹیا بات؟“ تم جیسے لوگ خواہ کتنا ہی ہم جیو میں گھسنے کی کوشش کریں، کتنا ہی کانتوں چچوں سے کھانے کا سلیقہ سیکھ لیں۔ رہیں گے وہی اجڈ اور گنوار عمو سال پرانی ذہنیت کے مالک، جو کنویں کا مینڈک بن کے ہی زندگی گزارنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔“

مرتضیٰ کو لگا اس نے اسی کے الفاظ اس کے منہ پر دے مارے ہیں۔ جو کبھی اس نے ام مریم کو کہہ کے اذیت کی کھائی میں دھکیلا تھا۔ بحث کے دوران روحا گاڑی سڑک کے کنارے روک چکی تھی۔

مرتضیٰ نے ایک جھٹکے سے اپنی طرف کا دروازہ کھولا

اور باہر نکل آیا۔

تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے وہ دوڑ چلا گیا اور روحا نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

مرتضیٰ کا ذہن روشن خیالی کے اس پہلو کو قبول ہی نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ آج غلط ثابت ہو گیا تھا۔

اسے آج اندازہ ہوا تھا کہ جس کلاس کے طور اطوار اپنانے کی کوشش میں وہ اپنے رشتوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا، وہ تو اس کی فطرت سے میل ہی نہیں کھاتے تھے۔

وہ تو ہمیشہ سے محلہ رسول نگر میں رہنے والے دقیاوسی مگر پاک صاف سوچ رکھنے والے لوگوں کا ہی حصہ تھا۔ اس کی تربیت اسی صحیح غلط اور اچھے برے میں فرق دکھاتے ہوئے کی گئی تھی۔

ام مریم کے ساتھ تنہائی کے ایسے سینکڑوں مواقع ملے تھے مگر بھی اسے کوئی غلط سوچ تک نہ آئی تھی۔

اسے آج وہ ٹوٹ کر یاد آئی تھی۔

ام مریم نے ہمیشہ اسے آگے بڑھنے کے لیے ہمت بندھائی تھی۔ پھر جب وہ آگے بڑھ آیا تو اپنے پیچھے رہ جانے والی مریم کو کیسے بھول گیا۔ کیسے۔۔۔ کیسے اس نے ان رنگینوں میں خود کو گم کر کے ام مریم کے وجود کو بھلا دیا۔ وہ رنگینیاں جن کی عمر صرف لچائی ہے جن کی کشش صرف چند ٹھانے کی ہے۔

ان جیسی سطحی چیزوں کے لیے اس نے ام مریم کے انمول وجود کو کیسے نظر انداز کر دیا؟

وہی تو تھی اس کی خواہشوں کی تکمیل کے لیے ہر نماز میں دعا کرنے والی۔

اس کی کامیابی و کامرانی کے لیے منتیں ماننے والی۔

پھر اس نے کیسے رخ بدل لیا ام مریم سے۔۔۔؟

آسمان پر اڑان بھرنے والا پرندہ تھک کر اب زمین پر اتر رہا تھا۔

سکندر کے ساتھ آنے والی میٹنگ ڈسکس کرتے ہوئے وہ اے آر گروپ آف کمپنیز کی عمارت میں

داخل ہو رہا تھا۔ انہیں عبدالرحمن نے بلایا تھا۔ داخلی دروازے کے بغل میں راہداری سے گزر کر وہ اندر آفس میں داخل ہونے لگا تھا جب چند فٹ دور سے اس کا رخ میں لپٹی گزرتی ہوئی لڑکی دیکھ کے چونکا۔ ایک سیکنڈ کے بھی دسویں حصے کی اس جھلک میں اسے لگا وہ ام مریم ہے۔ لیکن ام مریم یہاں کہاں سے آئی۔ وہ اچھٹا ہوا مڑا اور دیکھنے لگا۔ لڑکی اب داخلی دروازے سے باہر جا رہی تھی۔ سکندر بیچرے ضروری پیچہ زنگوا رہا تھا۔ ساکت کھڑے مرضی میں حرکت ہوئی وہ باہر کی جانب بڑھا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا وہ ام مریم ہی تھی۔ لیکن جب تک وہ دروازے تک پہنچا لڑکی سڑک پار کرے سامنے آئی دین میں سوار ہو گئی تھی۔

وہ اچھٹا ہوا سا واپس پلٹ آیا۔ عبدالرحمن حمدانی ہمیشہ کی طرح مرضی سے پرتاک انداز میں ملے تھے۔ مرضی کا ذہن مسلسل اسی جانب لگا تھا۔ جھجکتے ہوئے اس نے عبدالرحمن سے کچھ دیر قبل ان کے دفتر سے نکلتی لڑکی کے متعلق پوچھا۔

”وہ لڑکی ہاں ام مریم نام ہے اس کا ایک جاننے والے کے توسط سے جب کے لیے آئی تھی وہ بتا رہے تھے کہ لڑکی ضرورت مند ہے والد کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ اس لیے اسے ارجنٹ جاب چاہیے، لیکن میرے پاس تو صرف سیکرٹری کی پوسٹ خالی ہے اور اس کا تجربہ بالکل صفر ہے اور تم تو جانتے ہو کہ سیکرٹری چاہیے جو بند اور رینڈر رہنی چاہیے۔ خیر میں دیکھوں گا کوئی جاب دیکھسی آئی تو بلا لیں گے۔“ مرضی ان کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔

”والد کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔“ اس کا دل غ

سائیں سائیں کرنے لگا۔

”لڑکی ضرورت مند ہے۔“ ایسے کون سے حالات آگئے ہیں کہ مریم یوں۔۔۔ وہ سوچ کر ہی گم صم سا ہو گیا۔

کتنا گھٹیا شخص تھا وہ جس نے پلٹ کر پچا اور ام مریم کی خبر تک نہ لی۔ اتنے برے حالات میں بھی کہ

جب مریم باری باری جاب کی تلاش میں پھر رہی ہے وہ ایک جھجکتے سے اٹھا اور عبدالرحمن سے معذرت کرتا تیزی سے گھر کی جانب چل پڑا۔ وہ اماں اور ابا کو بھی پچا کے ایکسیڈنٹ کا پتا کے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن جب گھر میں داخل ہوئے ہی اماں کو اطلاع دی تو جواب سن کر وہ ساکت ہو گیا۔

”ہاں میں گئی تو تھی عیادت کرنے، اب کیا بھائی صاحب کی بیٹی سے ہندہ کر بیٹھ جاتے سارے؟“

”اماں! آپ نے بتایا تک نہیں گھر میں؟“ حیرت اور دکھ کے ساتھ ساتھ ماسف نے اس کی رنگت زرد سی کر دی۔

”کیا بتاتی؟ تمہارے ابا کی طبیعت ویسے ہی ٹھیک نہیں اور تم اپنے دفتری کاموں میں مصروف باقی کیا منزہ اور کاشف جاتے ان کی خیریت پوچھنے؟“

”اماں! آپ بتائیں تو سہی، کیا سوچتے ہوں گے پچا کہ حالات بدلنے پر پلٹ کر دیکھا تک نہیں پوچھا تک نہیں۔“

”سوچتے ہیں تو سوچتے رہیں، ہم نے سب کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔“

اماں کی بات بروہ دکھ اور افسوس سے سر ہلانے لگا۔ لیکن رخشندہ کی تو شروع سے یہی عادت تھی۔ کم از کم اسے ہی دھیان رکھنا چاہیے تھا۔ اتنے عرصے میں سوائے چند ایک بار کے اس نے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا تھا۔

”آپ نے بہت غلط کیا ہے اماں! بہت۔۔۔ لیکن آپ سے زیادہ قصور وار میں ہوں جو کچھ پچا کو بھول گیا، میری غلطی ہے سب اتنے برے حالات پر پڑے ہیں ان پر کہ ام مریم نوکری کے لیے دھکے کھاتی پھر رہی ہے اور ہم انجان بنے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔۔۔ تف ہے مجھ پر!“ اپنے بالوں کو ہاتھوں کی مٹھیوں میں بھینچتا وہ اٹھ گیا۔

”بس اپنی جان کو روگ لگا لیتا اب اس کی فکر میں گھلتے رہنا پاؤں لگا ہوا گیا ہے اس ٹکڑی کے لیے۔“ تیزی سے باہر نکلے مرضی کو پیچھے سے آئی رخشندہ

کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں مگر اب وہ رکنا نہیں چاہتا تھا اسے اب دیر نہیں کرنی تھی یہ طے تھا اسے ام مریم کو کہ اپنے ہی لفظوں کی بازگشت نے تڑپا کر رکھا تھا۔

”میں تمہارے لیے بہت کچھ کروں گا ام مریم جس نے میرے لیے اتنی قربانیاں دی ہیں۔ ہم سب ایک ساتھ رہیں گے خوش حال و خوش باش!“

وہ تھالی میں وال ڈالے جن رہی تھی۔ ابا کے لیے کچھ دی بھائی تھی۔ سچ مسز صدیقی کے شوہر کی کال پر وہ ایک جگہ انٹرویو دینے گئی تھی۔ ابا کے پاس ہمسائیوں کے تیرہ سالہ فخر کو چھوڑ کے وہ غلت میں گھر سے نکلی تھی۔ اس وقت جاب ملنا اس کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ آفس ڈھونڈنے میں اسے مشکل پیش نہیں آئی تھی لیکن وہاں سے بھی اسے کوئی مثبت رسالہ نہیں ملا تھا۔ وہ نامیدی سی لہتی تھی۔

صبح ہی موتیا کے پودے پر پھول کھلے تھے۔ صحن میں گھٹا تھا لیکن اسے اب موتیا کے سفید پھول خوش بختی کی علامت نہ لگا کرتے۔ اس کا بخت سو گیا تھا۔ مطلع صبح سے ابر آلود تھا۔ بادلوں نے پورے شہر کو ڈھک رکھا تھا۔

انٹرویو سے واپسی پر بارش شروع ہو چکی تھی لیکن بہت ہلکی بھوار پڑ رہی تھی۔ گھر آکر اس نے صحن میں تار پر پھیلے کپڑے جلدی جلدی سینے اور ابا کے لیے کھچڑی بنانے کا سوچ کے وال منگوائی۔ وہ اندر کمرے میں سو رہے تھے۔ عبدالرحیم کے سر اور۔۔۔ بازو کے زخم تو بھر گئے تھے مگر وہ اب بھی خود سے چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوئے تھے۔ ایکسیڈنٹ نے ان کے گھٹنے کے جوڑ کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ بڑے بھائی نے ان کی خیریت پوچھی نہ ان کے چہیتے بیٹھے نہ ہی یہ زحمت گوارا کی۔

وہ تو ایسا گیا تھا کہ پلٹ کر دیکھا تک نہ تھا۔ انہیں اب افسوس ہوتا تھا کہ عین کے ساتھ ساتھ انہوں

نے ام مریم کے لیے بھی اقرار کیوں نہیں کر لیا۔ اپنے گھر میں مطمئن تو ہوں۔

دولت آنے پر مزاج اور نظریں تو سب سے پہلے بدلتی ہیں، بس وہی اپنی سادگی میں غشوش غمی میں جیتے رہے۔

ام مریم نے وال صاف کرنے کے بعد چاول والا شہر اٹھا کر اس میں سے مٹھی بھر کے تھال میں ایک طرف انڈیلے اور صاف کرنے لگی۔ اداس اداس سی کاجل سے بے نیاز آنکھیں تھالی میں پڑے نگر چن رہی تھیں۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ اس نے ان

سنی کر دی۔ اب دروازے پر ہوتی دستکوں پہ اس

نے چونکا چھوڑ دیا تھا۔ دستک دوبارہ ہوئی۔ مکے میں

سے کوئی ہو گا۔ یہ سوچ کے بھی وہ ٹھس بیٹھی رہی۔ وہ

اتنی مایوس اور دل برداشتہ تھی کہ جھوٹے منہ بھی کسی

سے مسکرا کے نہیں مل سکتی تھی۔ دستک بدستور ہوئی

رہی۔ وہ تھالی ایک طرف رکھ کے اٹھی اور جھکے

قدموں سے بھیتے صحن میں پڑتی پھوار سے گزر کر باہر

رہی۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ اس نے ان

سنی کر دی۔ اب دروازے پر ہوتی دستکوں پہ اس

نے چونکا چھوڑ دیا تھا۔ دستک دوبارہ ہوئی۔ مکے میں

سے کوئی ہو گا۔ یہ سوچ کے بھی وہ ٹھس بیٹھی رہی۔ وہ

اتنی مایوس اور دل برداشتہ تھی کہ جھوٹے منہ بھی کسی

سے مسکرا کے نہیں مل سکتی تھی۔ دستک بدستور ہوئی

رہی۔ وہ تھالی ایک طرف رکھ کے اٹھی اور جھکے

قدموں سے بھیتے صحن میں پڑتی پھوار سے گزر کر باہر

رہی۔

Herbal
سوہنی شیمپو
SOHNI SHAMPOO

اس کا استعمال سے چندوں میں خشکی ختم
گرتے ہوئے بالوں کو رکتا ہے
بالوں کو شیمپو اور چمکدار بناتا ہے

قیمت 90/- روپے
رجسٹری سے منگوائی پر ادھر سے آرڈر سے منگوائے والے
دو ٹیمیں 250/- روپے تین ٹیمیں 350/- روپے
اس میں ڈاک خرچ اور جھنگ چارج شامل ہیں۔
بڑے ریٹیل ڈاک سے منگوائے کا پتہ
تلی کس 53 اور گریب راکٹ ایم اے جٹاں روڈ کراچی۔
دفتر خریدنے کے لیے:
کتبہ عمران ڈاک 37 اور روڈ بازار کراچی۔ فون نمبر 32216361

کی طرف جانے لگی کہ دستک دینے والا ضبط کھوکے کو اڑدھکیل کر خود ہی اندر آ گیا۔ ام مریم جہاں تک پہنچی تھی وہیں جم گئی۔

آنے والے نے صحن تک کا مختصر سارستہ بہت ست روی سے طے کیا۔ سر جھکا کے بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے وہ اس کے پاس رکا جو پتھر پی ابھی تک دروازے کو ہی تک رہی تھی۔

چند لمبے وہ اس کے پاس کھڑا پھوار میں بھیکتے فرش کو دیکھتا رہا۔ پھر چلا ہوا اندر کمرے کی جانب بڑھ گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

ام مریم کے وجود میں تب بھی کوئی جنبش نہ ہوئی۔ بہت باریک سی پھوار کے بے حد تھے تھے قطرے اس کے بالوں میں اٹکنا شروع ہو گئے تھے۔ اندر وہ جانے کیا بات کر رہا تھا، اسے پتا نہیں چلا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور وہ عبدالرحیم کے ناتواں سے وجود کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھائے اس کے سامنے سے گزر کر باہر لے گیا۔

ام مریم کے چہرے پر بارش کے قطروں اور آنسوؤں میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ سب گڈھ ہو گیا تھا۔ اگر آنسوؤں کا بھی رنگ ہوتا تو یہ بارش بھی ام مریم جیسے لوگوں کا بھرم نہ رکھ پاتی۔ مرتضیٰ آتے ہوئے سکندر کی گاڑی لے آیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اگر اسے تمام عمر چھپتاوے اور بے سکونی میں نہیں تو اسے وہی کرنا تھا جو اس کے دل کی رضا تھی۔ آٹھ کمروں کے گھر میں ان دونوں کی جگہ بہت آسانی سے بن جاتی۔ ام مریم کو آج نہیں تو کل اسے لے ہی جانا تھا۔ تو پھر عبدالرحیم چچا کو کیوں نہیں۔

اگر وہ خود اس کنویں سے نکل آیا تھا تو یہ اس کا فرض تھا کہ وہ انہیں وہاں تنہا چھوڑا بلکہ ان کا ہاتھ تھام کر وہ بند لگی عبور کر جاتا جس کے بعد زندگی کی روشن صبحیں ان کی منتظر ہوتیں۔

گاڑی کی پچھلی سیٹ پر عبدالرحیم کو لٹا کے وہ پھر اندر آیا۔ ساکت کھڑی ام مریم کی نگاہیں اب موتیا کے

خوشنما پھولوں پر جمی تھیں۔ اس کے قریب آکر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

”چچا کی دوا میں اور کچھ ضروری چیزیں سمیٹ لو، باقی بعد میں آکر لے لیانا۔“ اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے اس نے بدایت دی جو شاید اس نے نہیں سنی تھی۔ وہ یوں ہی ساکت کھڑی تھی۔

”مریم۔۔۔ میں تم سے کہہ رہا ہوں۔“ اس نے نرمی سے پھر اپنی بات بہرائی مگر اسے یونہی کھڑا دیکھ کے وہ خود کمرے میں چلا گیا۔ پلنگ کے پاس رکھی پتائی پر سے دوا میں انہی کرنے لگا۔ پھر نکل گرچین میں چلا آیا، کچھ ڈھونڈنے کے بعد واپس کمرے میں چلا گیا۔ ام مریم اس کے ادھر ادھر پھرنے کا کوئی نوٹس نہیں لے رہی تھی۔ بس اس کا دل رو رہا تھا۔

ایک شمار میں دوا میں انہی کر کے اندر کا دروازہ بند کر کے وہ صحن میں آ گیا۔

”چلو۔“ اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ چلے لگا تو ام مریم نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا اور رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ بارش کی پھوار اب اس کے بالوں اور پشت پر اوس کی مانند کرنے لگی تھی۔

اتنے عرصے کے بعد اچانک اسے سامنے دیکھ کے اس پر جمی ناراضی کی برف اب پگھل رہی تھی مگر وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مرتضیٰ نے گہری سانس بھری اور دوا والا اشار تحت پر رکھ کر اس کے پاس آ گیا۔ اسے منانا نہیں آتا تھا۔ وہ اس سے کبھی خفا نہیں ہوتی تھی۔ اب ناراض تھی تو اسے روشنی ہوئی مریم کو منانے کا ڈھنگ نہیں آ رہا تھا۔

”یار! خود ہی مان جاؤ، مجھے منانا نہیں آتا یہ تم جانتی ہو۔“

بڑے بھونڈے انداز میں کہہ کر وہ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جیسے کوئی رستہ ڈھونڈ رہا ہو ام مریم کی ناراضی دور کرنے کا۔

بارش نے اب دونوں کو بھگو ڈالا تھا۔ بالکی پھوار

مستقل پرنے سے اب مرتضیٰ کی شرٹ بھینکنے لگی تھی۔

”ایک بار غصے میں کچھ کہہ دیا تو اس سے حقیقت بدل تو نہیں گئی۔ میں تو اب بھی وہی مرتضیٰ ہوں، ام مریم کا مرتضیٰ۔“

ام مریم نے پہلی بار نظر اٹھا کر براہ راست اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”میں تو تمہاری کامیابیوں سے حسد کرتی ہوں، بھول گئے؟“ جیسے مکرانیت سے پر لہجے میں اس نے سوال کیا۔

”نہیں۔۔۔ اگر ایسا ہوتا تو آج میں ناکام تمہارے پاس کھڑا ہوتا۔“ اس نے پھر ام مریم کی رخ دکھائی پکڑ کے اوپر کی۔

”کس لیے آئے ہو تم، میں نے تو تصور کرنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ تم کبھی اس گھر میں قدم بھی رکھو گے۔“ وہ بے حد نالاں تھی۔

”اگر ایسا ہوتا تو تمہارے موتیا پر پھول کھلنا بند ہو چکے ہوتے۔“ وہ ام مریم کی ان پھولوں کو خوش بختی کی علامت سمجھنے والی بات سے واقف تھا۔

مریم خاموش ہو گئی۔ اسے اس شخص سے روٹھنے کا سلسلہ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ جب تک نظروں سے اوجھل تھا۔ مریم اس سے خفا تھی۔ مگر اسے سامنے سے دیکھ کے اس کی ناراضی ہوا میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔

”جانتی ہو مریم! تم نے زندگی میں کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کی سوائے ایک کے۔“ وہ اب اسے ہنسانے کے کوشش کرنے چلا تھا۔ مریم نے نہیں پوچھا کہ وہ کس بات کے متعلق کہہ رہا ہے۔

”تم نے کہا تھا ناکال سورج، چاند، ستارے، بارش، ہوا، یہ سب ہر خاص و عام کے لیے یکساں ہیں؟ تو تم نے صحیح کہا تھا۔ دیکھو، اس صحن میں ہم دونوں ہی اس بارش میں بھیک رہے ہیں حالانکہ مجھ جیسے ریس میں

اور تم میں بہت فرق ہے۔“ ہنسائی کی کوشش رائیگاں گئی تھی۔ وہ یونہی لب لباب نہ کھڑی تھی۔

مرتضیٰ سنجیدہ ہو گیا۔ اسے واقعی منانا نہیں آتا تھا۔ ”تم صحیح کہتی تھیں مریم! دولت کے ساتھ ساتھ محبت بھی ضروری ہے دولت کے بغیر تو زندگی گزر سکتی ہے لیکن محبت کے بنا زندگی ادھوری اور نامکمل ہے۔ میں دولت باکر بھنگ گیا تھا لیکن اب جان گیا ہوں۔ اپنوں کے بنا کوئی بھی خوشی مکمل نہیں ہو سکتی۔ اللہ نے نوازا تھا اس لیے کہ میں اپنے ساتھ ساتھ اپنوں کو بھی اس بند لگی سے نکال لے جاؤں، مجھ سے کو تباہی ہوئی ہے میں مانتا ہوں، لیکن مریم! تم نے یہ نہیں سنا کہ صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے؟“ وہ جھک کر اس سے پوچھنے لگا۔

”کہتے ہیں۔“ منہ پھلائے پھلائے ہی وہ بولی تو مرتضیٰ ہنس پڑا۔ پھر رازدارانہ انداز میں اس سے بولا۔

”چلو کہتے ہوں گے، تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں؟ کسی کو بتانا تم۔۔۔ پتا ہے ایک چیز ایسی ہے جو صرف میرے پاس ہے، کسی ریس اعظم شہنشاہ! امرا، سینٹر وزیر کسی کو بھی حاصل نہیں۔۔۔ بتاؤں کیا؟“ وہ مسکراہٹ لبوں میں دبائے اس کو چھ رہا تھا۔

اور مریم جواب جاننے کے باوجود اشتیاق سے اس کی صورت ٹٹکتے لگی۔

”ام مریم! اس کے بالوں کی بھیگی لٹیں کان پہچنے اڑتے ہوئے وہ یار سے بولا تو مریم کھلکھلا کے ہنس پڑی اور مرتضیٰ اپنے مضبوط ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھامے گھر کا دروازہ کھول کر گیا۔

صداقت کی کست

”ای۔ ای۔ ای! کدھر ہیں؟ میں نے رات سائے الماری پر اپنی فائل نکال کر رکھی تھی۔ کہاں گئی وہ؟“ عروہ نے ساری الماری کھنگال ڈالی مگر فائل نہ ملی۔ عروہ کا بارہ صبح بھی چڑھ گیا۔ ایک تو ویسے ہی آج دیر سے آنکھ کھلی اور اوپر سے دین والا بھی جلدی گیا۔ آج تو اسے اپنی انٹرنس کی اسائنمنٹ جمع کرانی تھی اور اس نے رات ہی اتنی محنت سے مکمل کر کے فائل میں لگا کر سامنے الماری پر دھری تھی اور اب صبح فائل غائب تھی سپارہ تو ہائی ہوتا ہی تھا۔

”ادھر ہی ہوگی۔ آرام سے ڈھونڈو۔“ ای دوپٹے سے ہاتھ پوچھتی چکن سے نکلی تھیں۔ ”ڈھونڈو۔ ہر جگہ دیکھ لیا۔ کہیں نہیں ہے۔ یقیناً“ آپ کی مہارانی صاحبہ نے رکھ دی ہوگی سنبھال کر۔ اور ایسی سنبھالی ہے کہ اب مل ہی نہیں رہی۔“ اس نے پتے ہوئے دانت پیسے۔

دین والا ہارن پر بارن دیے جا رہا تھا۔ ای جلدی سے کمرے میں گئیں اور واپسی پر ان کے ہاتھ میں نیلی فائل تھی جو رات اس نے سامنے الماری پر دھری تھی۔ وہ طنزیہ مسکرائی۔ جتنا ہی ہوئی مسکراہٹ سے دیکھا۔ ”میں نے کہا تھا نا اس نے رکھی ہوگی۔ یہ کہاں سے ملی؟“ اس نے بیگ کا ندھے پر ڈالا اور جلدی سے فائل تھامی۔

”اندر ریک پر رکھی تھی۔“ ای نے کہا مگر اس نے سنا ہی نہیں۔

”میری صفائی کہیں نہیں دیکھی تھی۔ اگلے کی زندگی عذاب بنادو۔“ منہ ہی منہ میں بیڑی داتی وہ جلدی

سے باہر لپکی جمال دین والا پانچ منٹ سے کھڑا بارن دے کر پورا محلہ سربراٹھا چکا تھا۔ نانکہ درانی کی دو ہی بیٹیاں تھیں۔ بڑی عروہ جوبی۔ اے کی طالبہ تھی اور اس سے چھوٹی فردا ایف۔ اے کی طالبہ تھی۔ عروہ یوں تو سمجھ دار تھی مگر تھوڑی کال اور ست واقع ہوئی تھی۔ جو چیز جہاں سے اٹھائی واپس اسی جگہ رکھنے میں سستی دکھا جاتی۔ سوچتی ہی رہ جاتی کہ ابھی اٹھا کر رکھتی ہوں اور بس پھر جو اسے سنی

پڑتیں۔ بھلا کس کے ہاتھوں؟ اپنی چھوٹی بہن کے۔ جی ہاں۔ فردا اتنی ہی صفائی کی شوقین تھی جتنی عروہ چور تھی۔ خط تھا اسے صفائی کا۔ کوئی چیز جگہ سے اچھ بھر بھی نہ ملے۔ سلمان بکھرا ہوا نہ ملے۔ ہر شے سے نفاست جھٹک رہی ہو۔ سامنے کی الماریوں پر تپائیوں، انگٹھوں یا صوفوں پر کچھ بھی دھرانہ ملے۔ سارا دن وہ چیزوں کو ٹھکانے لگانے میں جتنی رہتی۔ ترتیب سے رکھتی یا اپنے حساب سے ترتیب بدلتی رہتی۔ ساتھ میں سارا زلہ عروہ پر ہی گرتا، جس کی چیزیں اکثر جابجا بکھری نظر آتیں۔ عروہ ہزار بار کوشش بھی کر چکی تھی مگر پھر بھی کہیں کوئی کسر نہ ہی جاتی تھی کہ فردا کو بولنے کا موقع مل جاتا۔

”میں تمہارے باپ کی نوکر نہیں لگی ہوئی کہ پورا دن تمہاری چیزیں سمیٹتی رہا کروں۔ جب دیکھو کمرہ اٹھرا پڑا ہوتا ہے۔ صبح جب میرے بعد جاگی تھیں تو بستر کیوں نہیں سمیٹا؟ کل کے کپڑے دھل کر آئے

ہوئے ہیں۔ ابھی تک بکھرے کیوں پڑے ہیں؟ سمیٹے کیوں نہیں؟ ہر وقت میں ہی گھر سمیٹتی رہا کروں۔“ وہ زور و شور سے کمرہ سمیٹتی ہوئی اونچی آواز میں بول رہی تھی۔ عروہ کان لیٹے ناشتا کر رہی تھی۔ ”کمرے کا حال دیکھو۔ کیا ہو رہا ہے؟“

عروہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ارد گرد دیکھا۔ سوائے صوفے پر کپڑوں کے انبار اور شمن آلود بستر کی چادر کے ایسا تو کچھ نظر نہ آیا جس کا وہ رونا رہی تھی۔ نجانے وہ کس حال کی بات کر رہی تھی؟ عروہ نے سر جھٹک کر ناشتے کی طرف دھیان کیا۔

”کس قدر ڈھیٹ ہو تم عروہ! کان پر جوں تک نہیں رہتی تمہارے سوائے کھانے پینے کے کوئی کام ہے بھی تمہارا۔“ فردا نے کھا جانے والی نظموں سے دیکھا تو عروہ کے حلق میں نوالہ سا چھن چکا۔ ”اب کیا کر دیا ہے میں نے ایسا؟“ بھرے منہ سے وہ بمشکل بول پائی۔

”یہی تو رونا ہے کہ تم کچھ بھی نہیں کرتیں سوائے کام پر جانے کے۔“ عروہ نے معصومیت سے آنکھیں ہٹھکائیں اور نوالہ نگلا۔ ”یہ گھر ہے عروہ لی گھر۔ مگر تم نے شاید ہوٹل سمجھ رکھا ہے۔ آئے کھائے آرام کیا بس۔“

وہ تڑپ اٹھی اس الزام پر۔ ”ایسا تو مت کہو۔ اتنے کام تو کرتی ہوں میں۔“ ”اچھا۔ مثلاً؟“ اس نے دونوں ہاتھ کمر پر ٹکا کر ایرو اچکائے اور کڑے تیروں سے اسے گھورنے لگی۔

”مثلاً۔“ میں شام کی چائے کے ساتھ کچھ نہ کچھ بنا کر رکھتی ہوں سب کے لیے اور میں سارا دن سنک میں بڑے برتن دھوتی ہوں۔ اور سارا دن گیٹ پر جا جا کر دیکھتی ہوں کہ کون آیا ہے؟ گھر بھر کے کپڑے استری کرتی ہوں۔ سب کے دھلے دھلائے کپڑے سمیٹ کر جگہ پر رکھتی ہوں اور۔ اور۔۔۔“ وہ انگلیوں پر سوچ سوچ کر گنوار رہی تھی۔

”بس بس۔ بہت ہو گیا۔ بہت کام کرتی ہیں آپ۔“ فردا نے ہاتھ ہوا میں گھڑا کر کے اسے خاموش ہو جانے کا عندیہ دیا۔ عروہ کی چلتی زبان کو چپ لگی۔ ”کیوں ان کاموں کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟ ہر کام اہم ہوتا ہے چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔“ اس کے چہرے پر ہلاکی معصومیت تھی جس نے فردا کو مزید تپا دیا۔ ”ساری زندگی بس ایسے چھوٹے کام ہی کرتی رہنا۔“

میں ہمارے باپ کی لور میں ہوں کہ ہمارے بکھڑے سینٹی رہا کروں۔ آئندہ مجھے اگر تمہاری کتابیں پڑھ کر یا کچھ بھی سامان باہر نظر آیا تو میں اٹھا کر گلی میں پھینک دوں گی۔ سمجھیں؟“

اس قدر کھیلے لہجے میں وہ بولی کہ عروہ کی آنکھیں بھر آئیں اتنی جھٹ پر۔ ناشتا دیں چھوڑ کر وہ کچن میں چلی گئی۔

بڑی بہنوں والی عزت دینا تو درکنار، فزوا اکثر اس کے ساتھ اتنی تلخ ہو جاتی کہ اس کا دن گزارنا مشکل ہو جاتا۔ اس کے الفاظ ہتھوڑے کی طرح اعصاب پر برستے۔ حالانکہ وہ اکثر کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھی۔ کھانا پکانے کا بھی سلیقہ تھا۔ صرف اس ایک کام میں سستی دکھا جاتی۔ نہ گھر کی حالت پر غور کرتی اور نہ ہی حالت سدھارنے کا خیال آتا۔ اس لیے روز اسے فزوا سے کبھی براہ راست سننے کو ملتی، کبھی ای سے کھلوا دیتی۔

اور وہ۔۔۔ کبھی جواب دیتی، صفائیاں پیش کرتی، معافی مانگ لیتی اپنی غلطی پر تو کبھی خاموش ہو جاتی اور کسی کو سننے میں بیٹھ کر آنسو بہا لیتی۔ خود سے عہد کرتی کہ آئندہ خیال رکھے گی مگر ہر بار سستی آڑے آ جاتی اور عہد ٹوٹ جاتا۔

”جسٹ پرفیکٹ۔ کتنی زبردست اسائنمنٹ بنائی ہے عروہ کی بچی! میڈم تعریف نہ کرتیں تو کیا کرتیں۔ مائیکرو اسکوپ لے کر دھوئیں تو بھی غلطی نہیں نکل سکتی۔ قسم سے لٹ ہے۔“ جویریہ نے چپس منہ میں رکھتے ہوئے اس کی بنائی انگلیش کی اسائنمنٹ کا ناقدانہ جائزہ لیا اور آگے فریج کو پکڑا دی، جو دیکھے بغیر بھی جانتی تھی کہ یہ اسائنمنٹ بھی اس کی دیگر اسائنمنٹ کی طرح زبردست ہوگی۔

”کون سی بات ہے؟ میڈم عروہ در لانی صاحبہ تو یوں بھی ہر کام پر فیکٹ ہی کرتی ہیں۔“

مکراتی ڈھیروں تعریف پر بھی اس کا چہرہ بجا بجا رہا۔ فریج اس کے اسکول گئے زمانے کی دوست تھی۔

محسوس تو کرتی مگر جویریہ کی موجودگی کے سبب خاموش رہی۔ کتنی دیر وہ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کر رہیں اور عروہ بس غائب دماغی سے ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی۔

جویریہ کی دین آگئی تو وہ جلدی چلی گئی۔ یوں بھی کالج آف ہو چکا تھا۔ ان دونوں کی دین آئے میں ابھی وقت تھا پھر فریج نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیا ہوا ہے۔ منہ پر بارہ کیوں بن رہے ہیں؟“ اس نے ہالٹا چاہا مگر فریج بھی پوچھ کر ہی دم لینے والوں میں سے تھی۔

”بس یونی۔ تم سب میری یوں تعریفیں مت کیا کرو۔ جسٹ پرفیکٹ۔ کیا پرفیکٹ ہے مجھ میں؟ کچھ نہیں۔“ اس کی آواز بھڑائی تو فریج چونکی۔

”کوئی انسان بالکل پرفیکٹ نہیں ہوتا۔ بٹ پور آر جسٹ کلوز ٹو اٹ۔“ اس نے زچ ہو کر فریج کی جانب دیکھا۔

”پلیز فار گاڈ سیک یار! کوئی پرفیکٹ نہیں ہوں میں۔ جب دیکھو ای اور فزوا مجھے لعن طعن کرتی رہتی ہیں۔ اتنی تنقید کرتیں اگر میں اتنی پرفیکٹ ہوتی تو؟ تم لوگ خواہ خواہ میری تعریفیں کر کے میرا دل آسمان پر مت پہنچاؤ۔ مجھے زمین پر ہی رہنے دو پلیز۔“

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تو فریج نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگالیا۔ کچھ دیر وہ روتی رہی اور جب دیکھا کہ وہ خود ہی آنسو پونچھ کر چپ ہو گئی۔

”فزوا۔۔۔ کتنی ہے کہ میں گھر میں محض بکھراوا کرنے کو ہوں اور بس۔ میں ناکارہ ہوں۔ فالٹو ہوں۔ بتاؤ فریج میں ایسی ہوں کیا؟“ فریج نے سرفنی میں ہلاتے ہوئے اس کا ہاتھ تھپکا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے، دماغ خراب ہے فزوا کا۔ تم کیوں اس کی باتوں کو اتنا سیرسلی لیتی ہو اور تم اس قابل ہو عروہ! تب ہی ہم تمہاری تعریفیں کرتے ہیں اور جائزہ تعریفیں کرتے ہیں۔ پوڈیز رواٹ۔“

فریج کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ فزوا اور امی واقعی اسے لعن طعن کرتی ہوں یا عروہ کسی کام میں سستی بھی دکھا سکتی ہے۔ کلاس میں سب سے جلدی اور پوری

ذمہ داری سے کام کرنے والی عروہ کی لور۔ تمام اساتذہ بھی اس بنا پر اس کی بہت تعریف کرتیں اور اسے پسند کرتی تھیں۔ اس کے کسی کام میں دھوئیں نے سے بھی نقص نہ لکھا تھا۔

ایک بار کلاس میں سب لڑکیوں کو مختلف ٹائٹل دیے گئے تھے۔ اس میں ”ڈی موسٹ ایفیشنٹ گرل“ کا ٹائٹل عروہ در لانی کو ملا تھا۔ وہ واقعی سراپے جانے کے قابل تھی تو پھر۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان اکثر وہی زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے قدرے مختلف۔ ایسا ہی کچھ عروہ کے ساتھ بھی تھا۔ پڑھائی میں بہت اچھی تھی۔ کالج کے تمام فنکشنز، ذمہ داریوں کو بخوبی نبھانے والی عروہ در لانی کی زندگی کا دوسرا کمزور پہلو بھی تھا کہ وہ گھریلو معاملات میں بے حد ست اور کاہل تھی۔ کچھ وہ دست بھی تھی اور کچھ فزوا اور امی کی اکثر تنقید کا نشانہ بننے کی وجہ سے جان بوجھ کر سستی دکھا جاتی کہ کام کر کے بھی وہ باتیں سنتی ہے تو بہتر ہے کرے ہی نہ۔

”فریج۔ میں جانتی ہوں کہ میں ست ہوں۔ کاموں کو اکثر ٹال جاتی ہوں مگر۔ میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتی۔ بس مجھ سے ہو جاتا ہے۔ میں کو شش کر کے بھی اپنی اس عادت سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔ ہر انسان میں کچھ برائیاں ہوتی ہیں اور کچھ اچھائیاں۔ میری اس خامی کو میری سزا بنا کر ہر روز کیوں پھوٹے لگائے جاتے ہیں۔ فزوا کو شوق ہے صفائی کا بلکہ خطہ ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟ میں اس جیسی نہیں ہوں۔ میں اس جیسی نہیں بن سکتی۔ ہاں مان لیا کہ وہ بہت اچھا گھر سمیٹ سکتی ہے اور میں اس کام میں ناکام ہو جاتی ہوں تو بہت سے کاموں میں وہ بھی ناکام ہے اور میں کامیاب مگر میں تو اسے طعنے نہیں دیتی۔ مگر حد ہے۔ میری اس کمزوری پر بات بات پر مجھے بے عزت کیا جائے۔ روز صبح و شام۔ اگر میرے گھر میں بھی مجھے ذہنی سکون نہیں تو میں کدھر جاؤں؟“

فریج سے بات سن کر فزوا دانت نکالنے لگی جیسے بڑے فخر کی بات ہو جبکہ عروہ نے سر جھٹک دیا۔

”بندہ ایسا بھی نہ ہو کہ ڈیڑھ دو ہفتے بعد نمائے پتا نہیں اسے خود سے کراہیت کیوں محسوس نہیں ہوتی۔ لوگ بھاگتے ہوں گے دو در دو سے۔“

فزوا بھی کہاں چپ رہنے والوں میں سے تھی۔ دویدو جواب دیا۔ ”تمہیں آتی ہے بدلو؟ تم بھاگتی ہو دور؟ نہیں نا تو پھر اور بھی کوئی نہیں بھاگ سکتا۔“

”تمہیں صفائی کا خطہ صرف گھر کی حد تک ہی ہے۔ اپنی ذات سے نہیں۔ خود بے شک ہفتے دو ہفتے نہ نماؤ مگر گھر چمکتا چاہیے۔“ اسے بھی اب ایک کی دوستانہ کاموقع مل ہی گیا تھا سوا تھ سے کیوں جانے دیتی۔

”جو ظاہر ہے وہ تو چمکنا رہنا چاہیے۔“ تولیہ جھٹک

کر اس نے سامنے کئی ریلنگ پر پھیلا دیا اور خود ایک نظر نیچے گلی میں جھانک کر پیچھے ہو گئی۔

”کیوں صفائی کا حکم محض ظاہر کو چکانے کے لیے ہے۔ باطن اور اندر کو گندنا چھوڑنا چاہیے۔ جو لوگوں کے سامنے ہے وہ صاف رہے جو نظروں سے پوشیدہ ہے وہ گندنا ہی رہنے دو۔“

اس کے طنزیہ انداز اور مسکراہٹ پر فروا کا دل جل کر رہ گیا۔ کچھ کہنے کو منہ کھولنے ہی والی تھی کہ اسی سچ میں بول پڑیں۔

”کیا فضول کی بحث کر رہی ہو تم دونوں۔“
”فضول کی بحث کہاں ای! ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اسے گھر کی گند کی کو صاف کرنے کا جنون ہے۔ مگر اپنے آپ کو نہیں دیکھتی، دونوں ایک ہی جوڑا اپنے رکھتی ہے ہفتہ ہفتہ نہالی نہیں۔ پھر نیچے کس منہ سے بولتی ہے؟“

فروا جواباً خاموش تھی۔ فی الفور کوئی جواب ہی نہ بن پایا۔ ابی بھی چپ ہو گئیں۔ اس کے دل کو قرار سا آیا تھا۔ ٹھیک تاک کر نشانہ لگایا تھا۔

ابی کی خالہ زاد بہن رابعہ جو فیصل آباد میں مقیم تھیں۔ ان کی بیٹی کا چند روز قبل ہی زچگی کے دوران انتقال ہو گیا تھا۔ ابی اس وقت چند وجوہات کی بنا پر نہ جاسکیں۔ اب ارادہ بن رہا تھا کہ ان کی طرف سے ہو آئیں۔ جوں ہی ابی نے ارادہ ظاہر کیا وہ دونوں بھی ساتھ جانے کو تیار ہو گئیں۔

”تو کیا ہوا ابی۔ ہماری بھی آؤٹنگ ہو جائے گی۔ کتنا وقت گزر گیا کہیں آنا جانا نہیں ہوا۔“ فروا نے پیار سے ان کے گرد بازو جا مل گئے۔

”پیچھے تمہارے ابو اسکے ہوں گے۔ کون دیکھے گا انہیں؟ کھانا پکانا، گھر بار کون دیکھے گا۔“ ابی منتظر تھیں۔

”اوہو ابی۔ ہم کون سا مہینہ بھر کے لیے جارہے ہیں۔ دودن کی بات ہے۔ کھانا بنا کر فریز کر جائیں گے۔“

روٹی ابو تندور سے آئیں گے۔ کیا مسئلہ ہے؟ اس نے چنگیوں میں مسئلہ حل کر دیا۔ ابی نے گھور کر دیکھا تو اس نے مسکرا کر ابی کو دیکھا۔
”انتا اچھا حل تو نکالا ہے ابی پلیز نا۔ ہمیں بھی جانا ہے۔ ابو کوئی سچے تھوڑا پیسہ پچھلے سال جب عارف ماموں کی بیٹی کی شادی ہوئی تھی تب بھی تو ابو گھر میں اکیلے تھے نا۔“

ابی خاموش رہیں، مطلب شہر رضامند تھیں۔ عروہ بھی اٹھ کر ابی کے گھٹنوں سے لگ کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے دونوں کی آس بھری، جگہ گاتی نگاہوں کی طرف دیکھا اور ہولے سے مسکرا دیں۔

”یا ہوو۔“ دونوں نے غور لگایا تو ابی کھل کر مسکرا دیں۔

”مگر پہلے سے بتاؤں۔ رابعہ اصولوں کی بہت سخت ہے۔ وہ گھر آئے مہمانوں کا بھی لحاظ نہیں کرتی۔ سب سے اپنے وضع کیے اصولوں پر عمل کرواتی ہے۔ کر ٹل کی بیوی ہے مگر اس کامیاں اتنا سخت نہیں جتنی وہ ہے۔ صفائی تھرائی کا خطبہ ہے اسے۔“

ابی نے ہولانے کی کوشش کی تو فروا تو خوشی سے جھوم اٹھی۔

”لو پھر تو میری اور ان کی خوب جمنے والی ہے۔ بڑا مزا آئے گا۔“

عروہ نے برا سامنے بنایا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

دودن بعد وہ تینوں فیصل آباد واپس خالہ کے گھر پہنچیں۔ مین گیٹ سے اندر تاحد نگاہ سبز ہی سبز، گھاس اتنی نفاست سے تراشی ہوئی تھی لگ رہا تھا جیسے کوئی سبز مخملی قالین بچھا ہوا ہو۔ طرح طرح کے پودے، پھول بہار دکھانے میں پیش پیش تھے۔

”رابعہ کو باغبانی کا بے حد شوق ہے۔ گھٹنوں خود بھی اور نوکروں کو بھی اس کام میں لگائے رکھتی ہے۔ یہ سب اس کی محنت ہے جو نظر آرہی ہے۔“

تب ابی نے بتایا۔ عروہ نے ستاسی نظروں سے بار بار گردن کھما کھما سارے لان کا جائزہ لیا جبکہ فروا تو کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئی۔ اس کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ پودوں سے جھولنے لگے، گھاس پر قلا بازیاں لگائے یا پھول سوگھ سوگھ کھمک اندر اتار لے۔

”اف ابی۔! کیا زبردست لان ہے رابعہ خالہ کا۔“ ابی اسے کھینچ کر داخلی دروازے کی طرف لائیں۔ جہاں باہر ریک میں بڑی بڑی چیل رکھی تھیں۔

”مہڈم آپ اپنے جوتے اتار کر یہ چیل پہن کر اندر جائیں گی۔“ ساتھ چلتے نوکر نے ادب سے انہیں

ماکن کا حکم پہنچا دیا۔ کچھ دیر تو تینوں کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ پھر ابی نے ہی اشارہ کیا کہ جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔

بڑے بڑے ہاتھ روم سیلہو پینے من من قدم اٹھائے وہ اندر داخل ہوئیں۔ سارے نوکر یونیفارم پہنے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ سامنے ہی صاف ستھرا استری شدہ ایک بھی ٹشمن سے پاک لباس پہنے ہال بنائے پروقار سی شخصیت ملنے کو آگے بڑھی جو یقیناً

رابعہ خالہ مطلب مسز فرقان تھیں۔ ملنے ملانے کے بعد تینوں کو ڈرائنگ روم میں پہنچایا گیا۔ فروا خوب چوڑی ہو کر صوفے میں دھس گئی اور ابھی صوفے کی انتہی پر ہاتھ رکھائی تھا کہ مسز فرقان بول اٹھیں۔

”بیٹا پلیز! سیدھے بیٹھیں۔ صوفے خراب ہو جاتے ہیں نا۔“

اتنی محاسن تھی لمحے میں کہ فروا کو یقین ہی نہ آیا کہ جو الفاظ اس نے سنے ہیں کیا واقعی وہی ادا ہوئے۔ گڑبڑا کر وہ سیدھی بیٹھ گئی۔ ملازمہ تب تک کولڈڈر نکالنے آئی تھی۔ گلاس ٹرے سے اٹھا کر جوں ہی عروہ نے میز پر رکھنا چاہا مسز فرقان ترپ اٹھیں۔

”رکھیں بیٹا۔ شہناز! باجی کو نیبل میٹ رکھ دیں“ شہناز نے جلدی سے نیبل میٹ سامنے کے عروہ شرمسار سی گلاس ہاتھ میں لیے بیٹھی اب رکھ نہ

تھی۔ کئی دوسری باتیں رہیں۔ مسز فرقان اب ابی کے ساتھ باتوں میں مگن تھیں۔ وہ دل ہی دل میں گلے کر رہ گئی۔ گھر میں فروا کی صورت مصیبت کیا کم تھی جو یہاں آکر وہ ہر اعذاب بھگتنا پڑ گیا۔ اسے افسوس ہی ہوا اپنے یہاں آنے پر۔

کئی دیر وہ اس طرح سیدھی بیٹھی رہیں۔ کسری اکثر لگتی تھی۔ پلوید لیتی فروا نے بے زاری سے عروہ کا چہرہ دیکھا، جہاں چھائے تاثرات اس کے چہرے سے مختلف نہ تھے۔

کچھ دیر بعد ہی دہلی تلی سی خوب صورت نقوش کی حامل ایک لڑکی اندر داخل ہوئی، جسے مسز فرقان نے ان سے اپنی ہو کہہ کر متعارف کروایا۔ ادیبہ بڑی ہی ملنسار لڑکی تھی۔ کافی دیر وہ دونوں اس سے گفتگو کرتی رہیں۔ پھر کھڑکھانے کے بہانے دونوں اس کے ساتھ اندر چلی گئیں۔

اندرا لاونج میں دو گول میٹوں سے بنے ادیبہ کے بیٹے تھے۔ بڑی شرافت سے دونوں لی وی کے آگے بیٹھے کارٹون مودی دیکھ رہے تھے۔ پورا گھر دیکھنے کے بعد وہ دونوں ادیبہ کے کمرے میں چلی آئیں۔

”ماشاء اللہ بہت ہی شاندار گھر ہے اور اس سے زیادہ آپ نے مین مین کر رکھا ہے۔“ فروا نے دل کھول کر تعریف کی تو وہ بلا ارادہ مسکرا دی۔ ”بس سب آنٹی کی وجہ سے ہے۔ وہ دن رات گھر کی دیکھ بھال اور صفائی تھرائی میں لگی رہتی ہیں۔“

”رابعہ خالہ کافی سخت مزاج ہیں، لگتا ہے۔“ عروہ کے جیلے پر اس کے لیوں کی مسکان اور گہری ہوئی۔
”سخت مزاج تو نہیں ہیں، بس کافی سے زیادہ اصول پسند ہیں۔“

”بہت اچھی بات ہے بندے کو ڈسپلنڈ ہونا چاہیے۔ کیوں فروا؟“

عروہ نے فروا کو یونہی چھیڑا۔ وہ محض ”ہوں“ کر کے رہ گئی۔ اب عروہ کو مزا آنے لگا تھا۔ چلو کوئی تو تھا جو فروا کو بھی رچ کر نہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔
”ہم کب تک ان ہاتھ روم سیلپر زمیں گھومتے

ریں گے؟“
”جب تک آپ یہاں رہیں گی۔“ ادیبہ نے مسکرا کر ہی جواب دیا۔ بڑی ہمت تھی کہ وہ اس گھر میں رہتے ہوئے اس قدر مسکرا سکتی تھی۔
”ماما ام شیراز کے گھر جارہے ہیں۔“ دونوں بیٹوں میں سے ایک نے اندر کمرے میں جھانکا۔ ادیبہ نے سر ہلاتے ہوئے اجازت دی۔

”واپس آکر مرنے والے ہاتھ سے شاور لے کر اندر آنا“ ورنہ دادو بہت ڈانٹیں گی۔ آپ ہمیشہ بھول جاتے ہو جارہے!“
مال کی تنبیہ پر اس نے چہرے کے زاویے بگاڑتے ہوئے لالروانی سے اوکے کما اور چلا گیا۔ ادیبہ نے ان دونوں کو دیکھ کر وضاحت کی۔
”آئی کا یہ اصول ہے کہ جو جتنی بار گھر سے باہر جا کر اندر آئے گا۔ وہ پہلے نماز کھین باہتہ روم سے پھر اندر داخل ہو گا۔ بیٹوں کے لیے تو پھر بھی اس اصول میں نرمی ہے۔ مگر بچے تو جب بھی کھیل کرتے ہیں ہمارے بغیر اندر داخل ہونا منع ہے۔ کھیل کھیل کر گندے جو ہو جاتے ہیں۔ آئی کو گندے ذرا نہیں پسند۔ کتنی کتنی بار گھر کی صفائی ہوتی ہے ایک ہی دن میں۔ سب کو ہی خیال رکھنا پڑتا ہے۔“ دونوں کے منہ کھلے کھلے رہ گئے۔

”ہائیں۔۔۔ اتنے کڑے اصول۔“ فروا نے زنج ہوتے ہوئے کہا۔

”بس آئی بہت زیادہ صفائی پسند ہیں۔“
فروا پھر تری عروہ کی ہنسی چھوٹے پھوٹے رہ گئی۔ لو جی کہہ بھی کون رہا تھا جو پورا دن اپنے گھر والوں کی زندگی اجیرن کیے رکھتی ہے اسی صفائی کے پیچھے۔

”رات میں سونے سے پہلے سب کو نماز سونا پڑتا ہے۔ چاہے وہ گھر والے ہوں یا گیسٹ ہوں۔“ فروا نے عروہ سے کہیں زیادہ برا بنایا۔ ہمارے کی تو وہ حد درجے چور تھی۔ دو روز کے قیام میں دوبارہ نہانا۔ وہ بھی رات میں۔ کیا مصیبت تھی بھی۔ آرام کی غرض سے دونوں امی کے ہمراہ گیسٹ روم میں چلی آئیں۔

”ای امی آپ تعزیت کرنے آئی تھیں۔ ہو گئی نا تعزیت۔ ایک دن بہت سے رہنے کو۔ کل صبح واپس چلے گئے۔“ عروہ نے بیڈ پر آئی پالتی مارتے ہوئے بکیر گود میں رکھا۔

”اب آئے ہیں تو دو تین روز تو رکھیں نا۔“ امی بڑے اطمینان سے لیٹ گئی تھیں۔ اتنے سکون پر سب سے زیادہ آگ فراد کو ہی لگی۔

”امی! آپ کی یہ کزن مجھے ٹھکی ہوئی لگتی ہیں۔ تو بس گھر والوں کی بہت ہے جو ایسی خاتون کو برواشت کرتے ہیں۔ رو بوٹ بنا کر رکھا ہوا ہے سب کو۔ سانس بھی ان کی مرضی سے لیتے ہوں گے۔ میں تو نوکروں پر حیران ہوں۔ کیسے پورا دن گھن چکر بنے رہتے ہوں گے۔ اور ادیبہ بھابھی۔ اف امی! ایسی بسو ہے وہ۔ بے چاری کیسے پورا دن ایسی سانس کے ساتھ گزارتی ہوگی۔“

”آہستہ بولو۔ دیواروں کے بھی کلن ہوتے ہیں۔“ امی نے نوکا تو وہ دھٹائی سے ہنس دی۔

”اوہو امی۔ کلن ہی ہوتے ہیں نازیباں تو نہیں جو کسی دوسرے کو تار میں گے۔“

”چلو پیچھے ہٹو۔ مجھے تھوڑی دیر آرام کرنے دو۔ اب سر میں درد ہو رہا ہے۔ رات کا کھانا لگے گا تو اٹھوں گی۔“ امی نے آنکھیں موند لیں۔ عروہ بھی کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گئی۔ کب سے سیدھی بیٹھ کر دکھائی تھی۔

”کھانے میں بھی نچلانے کتنے روز اینڈ ریویشن ہوں گے۔ گیسٹ بھی پناہ مانگتے ہوں گے یہاں آکر۔“ کمرے کا جائزہ لیتی وہ پردے ہٹا کر باہر لان کا نظارہ کرنے لگی۔

”ویسے ایک بات کہوں۔“ وہ جھانک جھانک کر باہر دیکھ رہی تھی۔ عروہ کی بات پر خاص دھیان نہ دیا۔ ”میں نہیں نہیں لگتا کہ بڑھاپے تک تم بھی اسی طرح سٹیا جاؤ گی۔“ عروہ کی بات پر وہ کرٹ کھار پٹی۔

”ہائیں۔۔۔ میں کیوں؟“
”کیونکہ شاید تمہیں احساس ہی نہیں دن بدن تم

بھی صفائی کے پیچھے اتنی ہی پاگل ہوتی جا رہی ہو اور دوسرے کے لیے ناقابل برواشت حد تک اڑھٹنٹھ۔“ اس نے صاف گوئی سے کام لیا اور فروا شکل دیکھتی رہ گئی۔ عروہ نے اسے کہاں سے کہاں ملا دیا تھا۔

”کس قدر بد تمیز بہن ہو تم۔ میں ایسی سائیکو لگتی ہوں؟ اور تم مجھے بد دعائیں دے رہی ہو کہ بڑھاپے میں ایسی سٹیاں بد بھی ہو جاؤ گی میں۔ تھپ ہے تم پر عروہ درانی۔“ اسے بڑا قلق ہوا تھا۔

عروہ نے معصوم سی صورت بنائی۔ ”موسم میں نے کون سی بد دعا دے ڈالی ہے۔ سیدھی بات کی ہے اور تم سب سے سے اکھڑ گئی۔ ہو سکتا ہے اپنی جوانی میں وہ بھی ایسی نہ ہوں۔ بس صفائی کا تھوڑا شوق ہو۔ اب وقت گزرنے کے ساتھ تو بندہ بول بھی عجیب سا ہو جاتا ہے نا۔ جھپٹی اور سنگی سانس۔ تو وہ بھی ہو گئیں۔ بھلا بتاؤ اس درجے صفائی کا کیا فائدہ کہ بندہ دن میں کتنی بار گھر کی جھاڑ پونچھ کروائے اور یہ جوتے جو ہمارے پاؤں سے ہزار گناہ بڑے ہیں ان سے خود کا تو داغ چل گیا ہے دو سروں کو بھی اذیت دیتی ہیں۔ قسم سے فروا تم ایسی ہو جاؤ گی عقرب۔“

فروا کا دل ہول اٹھا۔ وہ شاکی نظروں سے بہن کو گھورتی رہی جو اب مزے سے چادر تانے سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔ کیا واقعی عروہ چو کہہ رہی ہے؟ اپنا موازنہ راجہ خالہ سے کرتے اسے جھرجھری سی آگئی۔

”استغفر اللہ۔ اللہ نہ کرے۔ میں بھی کیا کیا سوچنے بیٹھ گئی۔ یہ عروہ بھی نا۔“ اس نے پردے برابر کر دیے اور سامنے رکھائی دی آن کر کے آواز بند کیے خالی خولی چلتی پھرتی تصاویر دیکھنے لگی۔

رات کا کھانا تقریباً ”دس بجے لگا جب ان کی آنتیں قل ہو اللہ پڑھ کر داغ مفارقت بھی دے گئیں تو کھانے کے لیے بلالیا گیا۔

”شکر ہے خالہ کو خیال آیا کہ گھر آئے مہمانوں کو

کھانے کا بھی پوچھے ہیں ورنہ میں کوسوں روٹنے کی ہشاید یہ بھی کوئی اصول ہو گا کہ کھانا کھانے سے بھی گھر گندہ ہوتا ہے۔“ عروہ نے سرگوشی کی۔ امی نے گھور کر دیکھا۔

فروا پیٹ پکڑے ہنس ہنس کر دھری ہو رہی تھی۔ ”آپ چلو ڈاؤنٹنگ روم تک اس سے پہلے کہ کھانا اٹھالیا جائے اصول نمبر دو کے تحت۔“ امی بات کے اختتام تک ہلکا سا مسکرائیں۔

”امی آپ بھی۔“ فروا نے قہقہہ لگایا۔ ڈاؤنٹنگ ٹیمبل پر ادیبہ، بچوں خالہ کے علاوہ انکل فرقان بھی تھے۔ بارعب سی شخصیت والے ریٹائرڈ کرٹل۔ جن کی زوجہ محترمہ ان سے کہیں زیادہ بارعب واقع ہوئی تھیں۔ انکل سے ملنے کے بعد وہ بیٹوں پھر بیٹھ گئیں۔

”نائلہ! یہ ایپرن پہن لیں کھانے کے لیے اور آپ دونوں بھی بیٹنا۔“

ایپرن پہنتے ہوئے وہ کو فٹ سے سامنے بیٹھے کینوں کو دیکھنے لگیں جو بڑے سکون سے ایپرن پہنے کھانے میں منہمک تھے۔ ان کے آنے سے قبل ہی کھانا شروع کیا جا چکا تھا۔

”آپ بھی کھانے کے لیے بیٹھ جائیں۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد کھانا اٹھالیا جائے گا۔ پہلے ہی آپ لوگ کھانے پر لیٹ نہنچے ہیں۔“

دونوں نے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں اور کھانے پر ٹوٹ پڑیں۔

”آرام سے۔“ کھانا نیچے نہیں گرنا چاہیے۔“ فروا نے عروہ کو آٹھنگی سے تنبیہ کی مبادا خالہ انہیں کچھ گر جانے پر ”گیسٹ آؤٹ“ ہی نہ کر دیں۔ پندرہ منٹ تک وہ جتنا کھا سکیں کھا گئیں۔

پندرہ منٹ بعد برتن اٹھالے گئے۔ صد شکر وہ بیٹ بھر چکی تھیں۔ کھانے کے بعد ساتھ لگے سنک سے سب نے ”فروا“ ”فروا“ ہاتھ دھوئے اور لاؤنج میں چلے آئے۔

”ہمارے گھر کا اصول ہے رات سونے سے پہلے

سوتے ہیں۔ آپ لوگوں کے ہاتھ روم میں گاؤں پینگ ہوں گے سونے سے نکل میں سب کے روز ورت کروں گی۔“

فروا کا تو داغ کھول اٹھا۔ ”خالہ! آپ نے یہ سنری اصول نہیں لکھ کر لٹکا کیوں نہیں دیے؟ سب سے مناسب جگہ باہر والا گیت ہے۔ وہاں آپ کو لکھ کر لگانا چاہیے تاکہ آنے والا باہر سے بڑھ کر ہی شکر یہ کے ساتھ اجازت چاہے۔“ اس نے بھی لمبے میں سیرنی گھول کر ایسے انداز سے کہا کہ باقی سب تو مسکرا دیے مگر خالہ کا رنگ اڑ گیا۔

”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں راجہ۔ یہ یونی بکٹ رہتی ہے۔“ اسی نے اسے بازو سے دلوچ کر وضاحت کی۔ بازو پر پڑنے والا دیاؤ اتنا شدید تھا کہ وہ بلبلاتا رہی۔

”ویسے خالہ! آپ کو بچپن سے ہی صفائی کا اس قدر شوق تھا؟“ اسی کا ہاتھ بازو سے ہٹاتے ہوئے پھر سے ڈھیٹ بن کر اس نے سوال کیا۔

”شوق تو ہمیشہ سے تھا مگر آپ کے انکل سے شادی کے بعد مجھے بڑے ڈپٹن سے رہنا پڑا۔ بس عادت ہی ہو گئی پھر تو۔ اب تو جہاں گندگی دیکھوں مجھے دور سے بڑنے لگتے ہیں۔“ عروہ پوری صورت حال سے حظ اٹھا رہی تھی۔

”بہت ہی اچھی بات ہے۔ میں نے پوری زندگی آپ جیسی ڈسپلنڈ خاتون نہیں دیکھی۔ ناگس ٹو میٹ یو خالہ!“ بمشکل مسکرا کر وہ کمرے میں چلی گئیں۔

”ای میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ کل صبح ہم نے نکل جانا ہے۔ ناشتے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ راستے سے کچھ کھالیں گے۔ میرا تو داغ چھٹنے لگا ہے اس گھر میں ایک دن گزار کر رہی۔“

فروا کمرے میں آتے ہی دھپ سے بستر پر گری اور جوتے اتار کر ایک ادھر اچھالا اور دوسرا دھر۔

”داغ درست ہے مے بغیر کیسے چل پڑیں؟“ اسی نے نمائے کی تپاری پکڑی۔

”نہ میرے منہ سے کچھ نکل گیا تو پھر نہ کہے گا۔“

”اچھا۔ چپ کر جاؤ۔ صبح دیکھیں گے۔“ اسی کہتے ہوئے نمائے کھس گئیں اور عروہ صوفے پر بیٹھی لی ڈی دیکھنے لگی۔

”کیسی روٹ فیل ہے یا ر؟“ فروا کے تبصرے پر بھی وہ لٹ سے مس نہ ہوئی۔

”کیا مصیبت ہے اب رات کے اس پہر بندہ نمائے اور گاؤں پن کر سونا۔ اف خدا! مجھے تو ہول اٹھ رہے ہیں۔“ گل پیٹتے ہوئے اب وہ کمرے میں چکراری تھی۔ عروہ سکون سی بیٹھی لی وی دیکھ رہی تھی۔

”میں تم سے مخاطب ہوں میڈم۔ تمہیں کوئی فرق ہی نہیں پڑتا جیسے پنک پر آئی بیٹھی ہو۔“ اس کا شانہ جھجھوڑ کر وہ وہیں صوفے پر ٹپک گئی۔

”تو مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ گھر میں تمہاری سنو“

یہاں خالہ کی۔ ”وہ ڈھیٹ بنی بیک کی جیب سے چس نکال کر کھانے لگی۔ کچر کچر کی آواز بھی فروا کے اعصاب پر جھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔

”میں آتی سا کیو تو نہیں ہوں۔“

”عمر کا فرق ہے نا تب ہی۔“ عروہ کی دل جلی مسکراہٹ اسے سچ چلائی تھی۔

”کیا مطلب؟“

”تم اس لیے تنگ ہو رہی ہو کہ وہ تم پر حاکم بن کر تمہیں اپنے مطابق چلا رہی ہیں جبکہ گھر میں یہی کام تم خود کرتی ہو دوسروں پر۔“

”عروہ! میں اتنی بھی گئی گزری نہیں۔“ فروا نزوٹھے پن سے بولی۔

”ہاں شاید۔ مگر مجھے گھر میں بھی اپنا آپ محکوم لگتا ہے اور یہاں بھی۔ فرق تو ڈا سا ہے۔ تم ذرا کم ظالم حاکم ہو اور خالہ۔ ہر حال حاکم تو دونوں ہی ہونا اور ایک حاکم دوسرے حاکم سے اسی طرح خار کھاتا ہے جیسے کہ تم خالہ سے کھاری ہو سچیل۔“ فروا اب کی بار چپ سی رہ گئی۔

اسی نہا کر نکلیں تو عروہ نمائے کے لیے کھس گئی اور

عروہ کے نکلنے کے بعد فروا کو چاروں چار نمائنی پڑا۔ منظر فرقان بھی نے نام کی ایک تھیں۔ ”واقعاً“ رات سونے سے پہلے ان کے کمرے کا چکر لگا کر گئیں اور ساتھ میں کہہ بھی گئیں کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو نوکر حاضر ہیں رات بھر۔

”نو نوکروں کو رات کو بھی سکون نہیں لینے دیتیں۔“ فروا نے چکر کر دھندل لی۔

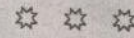
اگلی صبح ہی فجر کی نماز پڑھ کر انہوں نے سلمان باندھا۔ صبح صبح خالہ باہر لان میں واک کر رہی تھیں۔ ان کے جانے کا سن کر اندر چلی آئیں۔

”۲“ رے اتنی جلدی کیا ہے؟ چند دن رکتیں تو ناملہ! بچیاں پہلی بار آئی ہیں۔ میں آج گاڑی منگوا دوں گی۔ ڈرائیور ہو گا۔ تھوڑا کھو مو پھو۔ شرو دیکھو۔“

عروہ اور فروا کسی صورت مان کر نہ دیں۔

”۳“ چھاپلو میں ناشتا بنوا دوں۔ ناشتا کر کے جانا۔“

ناشتے کی میز پر اپن پنے وہ روٹ بنی ناشتا کر رہی تھیں۔ ناشتے کے فوراً بعد اجازت چاہی۔ باہر دروازے کے قریب دھرے اپنے جوتے پہنے اور باہر کھڑے ڈرائیور کے ہمراہ اسٹیشن تک آگئیں۔



وہ کالج سے لوٹی ٹولڈون کے کارپٹ پر دھلے کپڑوں کا ڈھیر نظر آیا۔

”نہ آج پھر مجھے سننے کو ملے گا کہ کپڑے دھل کر آئے تو اٹھائے کیوں نہیں۔“ اس نے بیک سامنے الماری پر رکھا اور

کپڑے تبدیل کرنے کے لیے آئی۔

”ہاں! یہ کیا آج تو میرے کپڑے صوفے پر ہی دھرے ہیں۔ صفائی بی بی نے اٹھائے کیوں نہیں؟“

اس نے جلدی سے کپڑے تبدیل کیے اور پن میں چلی آئی۔

”۴“ آج سب خیریت ہے نا؟ فروا کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟ میں لوٹی تو باہر صحن میں بیٹھی ٹاول پڑھ رہی تھی جبکہ اندر کوئی چیز جگہ پر نہیں ہے۔ یہ جیسے ہو گیا؟“

”نہ میرے منہ سے کچھ نکل گیا تو پھر نہ کہے گا۔“

”اچھا۔ چپ کر جاؤ۔ صبح دیکھیں گے۔“ اسی کہتے ہوئے نمائے کھس گئیں اور عروہ صوفے پر بیٹھی لی ڈی دیکھنے لگی۔

”کیسی روٹ فیل ہے یا ر؟“ فروا کے تبصرے پر بھی وہ لٹ سے مس نہ ہوئی۔

”کیا مصیبت ہے اب رات کے اس پہر بندہ نمائے اور گاؤں پن کر سونا۔ اف خدا! مجھے تو ہول اٹھ رہے ہیں۔“ گل پیٹتے ہوئے اب وہ کمرے میں چکراری تھی۔ عروہ سکون سی بیٹھی لی وی دیکھ رہی تھی۔

”میں تم سے مخاطب ہوں میڈم۔ تمہیں کوئی فرق ہی نہیں پڑتا جیسے پنک پر آئی بیٹھی ہو۔“ اس کا شانہ جھجھوڑ کر وہ وہیں صوفے پر ٹپک گئی۔

”تو مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ گھر میں تمہاری سنو“

یہاں خالہ کی۔ ”وہ ڈھیٹ بنی بیک کی جیب سے چس نکال کر کھانے لگی۔ کچر کچر کی آواز بھی فروا کے اعصاب پر جھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔

”میں آتی سا کیو تو نہیں ہوں۔“

”عمر کا فرق ہے نا تب ہی۔“ عروہ کی دل جلی مسکراہٹ اسے سچ چلائی تھی۔

”کیا مطلب؟“

”تم اس لیے تنگ ہو رہی ہو کہ وہ تم پر حاکم بن کر تمہیں اپنے مطابق چلا رہی ہیں جبکہ گھر میں یہی کام تم خود کرتی ہو دوسروں پر۔“

”عروہ! میں اتنی بھی گئی گزری نہیں۔“ فروا نزوٹھے پن سے بولی۔

”ہاں شاید۔ مگر مجھے گھر میں بھی اپنا آپ محکوم لگتا ہے اور یہاں بھی۔ فرق تو ڈا سا ہے۔ تم ذرا کم ظالم حاکم ہو اور خالہ۔ ہر حال حاکم تو دونوں ہی ہونا اور ایک حاکم دوسرے حاکم سے اسی طرح خار کھاتا ہے جیسے کہ تم خالہ سے کھاری ہو سچیل۔“ فروا اب کی بار چپ سی رہ گئی۔

اسی نہا کر نکلیں تو عروہ نمائے کے لیے کھس گئی اور

عروہ کے نکلنے کے بعد فروا کو چاروں چار نمائنی پڑا۔ منظر فرقان بھی نے نام کی ایک تھیں۔ ”واقعاً“ رات سونے سے پہلے ان کے کمرے کا چکر لگا کر گئیں اور ساتھ میں کہہ بھی گئیں کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو نوکر حاضر ہیں رات بھر۔

”نو نوکروں کو رات کو بھی سکون نہیں لینے دیتیں۔“ فروا نے چکر کر دھندل لی۔

اگلی صبح ہی فجر کی نماز پڑھ کر انہوں نے سلمان باندھا۔ صبح صبح خالہ باہر لان میں واک کر رہی تھیں۔ ان کے جانے کا سن کر اندر چلی آئیں۔

صحنہ صبر و شکر



سر نہ ہو ڈالے چلتی جاتی ہے۔
منتظر حسین کی انگلی کا پور ہیک گیا۔ اس نے زندگی
میں پہلی بار اس کو شانوں سے پکڑ کر تھام لیا۔ اس وقت
وہ خود اپنے احساسات کے شعور سے قاصر تھا۔ وہ محبت
نہی یا ہمدردی۔
اک سسکی اس کے شانے کے پار اتر کر مٹی میں مل
گئی۔

”منتظر حسین! میں تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں،
میرے دل کی شادابی اگر تمہارے وصل سے ہر مند
ہے تو دل کی ویرانی تمہارے ہجر سے مقل۔“
آنسوؤں میں بھیگی آواز کی لڑکھڑاہٹ نے پانچ فٹ
نواچ کے منتظر حسین کو لڑکھڑایا تھا۔
اس نے مضطربانہ نگاہ ارد گرد دوڑائی جیسے اس کو
تلاش تھا۔ رات شام کے شانے پھلانگ کر اتر آئی۔
سندر اس کی تمنائی بانٹنے اس کے پاؤں میں آ بیٹا۔
ریت پاؤں کے نیچے وقت کی طرح سرکتی جاتی تھی،
سندر ایسی محبت رکھنے والی لڑکی کی یاد کی امر بلیں

سمندر کی بے گراں وسعتیں تاحد نگاہ پر محیط
تھیں۔ ٹھانیں مارنے۔ بحر بے کنار کے کنارے
منتظر حسین کی نگاہ اس ایک منظر پر اٹک کر رہ گئی۔
وہ لڑکپن کا خوش رکھنے والا لڑکا سمندر کی طرف بڑھتا۔ لہر
قریب آئی تو بھاگنے سے اجتناب برتا۔ کبھی وہ جیت
جاتا تو کبھی لہر اسے ارٹکاب و اجتناب کے الوکھے کھیل
میں کیسا سرور تھا۔

اس مسرور سے لڑکے کو دیکھتے ماضی کا کوئی سماں اس
کی آنکھ میں اتر آیا تھا۔
جب سمندر ایسی گہری آنکھوں والی کی پکلوں کی
جھار پر اس کی اشد انگلی کا پور آنکا۔ محبت اجتناب و
ارٹکاب کے بیچ کسی سبھی خوف زدہ رہتی ہے۔
امید و بیم کی یہ کیفیت کھائل کرنے کے لیے کافی ہے۔
اجتناب و ارٹکاب ہجر و وصل کے کنارے ہیں۔
ان میں سے اک مکمل اختیار کرنا کم از کم آدمی کو
اک کنارے کے سپرد تو کر دیتا ہے اور محبت کیف و مستی
کے عالم میں کسی اونچ نیچ کے بغیر اپنی ڈگر پر



اس کے روئے زمین سے نکل کر جسم و جاں سے لپٹی جا رہی تھیں۔

”سفر تاریخ کا ہو زندگی کا۔ یا محبت کا۔ یا ایک زمین سے دوسری زمین تک کا۔ ہمیشہ روح اور جسم کو مضطرب و مضطرب دھکی اور تھکا دینے والا ہوتا ہے۔“ وہ اس کے سفری بیگ میں چیزیں سمیٹتے ہوئے۔
وہ تو لپے سے منہ پونچھتے مسکرایا۔ ”لگتا ہے تم ان سارے سفروں کا ادراک رکھتی ہو۔ ہم تو جہاں ہیں وہیں گن ہیں۔“

”ہوں؟“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”شاید ہمارے جیسے لوگ ہمیشہ ہی اسیر اور اک رہتے ہیں۔“ متبسم ہو کر منتظر حسنین پر نظر مرکوز کی۔ وہ پر قیوم کا چہرہ کاؤ کر کے اس کی طرف پلٹا۔ ”نا سمجھ میں آنے والی باتیں اور چیزیں۔۔۔ ان سے میں ہمیشہ دور بھاگتا ہوں۔“
”ہاں۔ عقل۔ استدلال۔ شعور اور دل۔ انسان کے لیے ہمیشہ مشکل ترین خطرناک اور بے رحم ثابت ہوتے ہیں۔“ بیگ بند کر کے وہ صوفے پر ٹک گئی۔
”اور۔۔۔ تاریخ۔ زندگی۔ محبت۔۔۔ ان کے بارے میں تو میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ بس جو جہاں جب بھی اچھا لگے اس کو اپنالو حاصل کرلو۔“ اس نے شانے اچکائے۔ ”اور جو برا لگے اسے چھوڑ دو۔“
”بھئی بے خبری میں بھی عافیت ہوتی ہے۔“ وہ سادگی سے مسکرائی۔ وہ بیگ اٹھا کر ٹی وی لاؤنج میں آیا۔

”چھا آئی! چلتا ہوں۔ آٹھ دن بعد پھر آپ کا مہمان بنوں گا۔“ وہ کہتے ان کے سامنے جھک گیا۔ انہوں نے شانوں سے پکڑ کر پیشانی کا بوسہ لیا۔
”مہمان کیوں بیٹا۔ یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔“ وہ بیگ اٹھا کر گاڑی میں آ بیٹھا۔

اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ایرپورٹ تک سارا راستہ وہ خاموش رہی۔
”اتنے ماہ سے دیکھ رہا ہوں بہت چپ چاپ رہتی

ہو۔ کوئی وجہ؟“ اس نے مسکرا کر سر کو نفی میں جنبش دی۔

”وجہ کوئی نہیں۔ طبعاً خاموش ہوں۔ ویسے آپ کو تو مکمل کمپنی دیتی ہوں۔ کوئی شکایت؟“
”ارے نہیں! اچھے تو تمہارے اور اپنے گھر میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ زیادہ اپنائیت بھرا ماحول ملتا ہے۔ جو کہ ہمارے گھر میں افراد کی کمی کی وجہ سے نایاب ہے۔ گھر پر بھی کبھی تم مجھے بہت کھوٹی کھوٹی اور اس لگتی ہو۔ ایک جلد سکوت۔ سنائے کی کیفیت۔“ وہ سوٹ کیس کھینچتے ہوئے۔ ”رک کر بولا۔

وہ لمحہ بھر کے لیے سن سی رہ گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی بکھری دھڑکنوں پر قابو پایا۔
”کیا یہ میرے جذبے سے واقف ہو چکا ہے۔“ اس نے بغور اپنے ساتھ چلتے منتظر حسنین کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر بے فکری والا ابلی پن دیکھ کر اس نے اپنی سوچ کی نفی کی۔

”میرے خیال سے میرا اکلوتا پن اس کا بڑا سبب ہے اور شاید کچھ ہاتھ بے تحاشا مطالعے کا بھی ہے۔“ وہ بھنوں سیکر کر لا پرواہی سے بولی۔
”چھاب تم جاؤ۔ رات پھیلتی جا رہی ہے۔ آئی انتظار کر رہی ہوں گی۔“ لاؤنج میں پہنچ کر وہ رکا۔
”ویسے کہنے کی ضرورت تو نہیں پھر بھی اپنا خیال رکھنا۔“

”مشورے کا شکریہ۔“ اس کی ہنسی بے ساختہ تھی۔
وہ پلٹی۔ گاڑی کا لاک کھول کر بیٹھی اور ریورس گیر لگا کر بغیر اس کی طرف دیکھے گاڑی اشارت کر دی۔

بعض دفعہ اسے یہ سب کچھ خواب کی مانند محسوس ہوتا۔ ساری عمر اچھا کھانے پینے پونے اوڑھنے کو ترستا ہی رہا تھا۔ مگر اچانک اتنی آسائشات سہولیات وہ قسمت پر حیران بھی تھا اور نازاں بھی۔

اس کی یادوں میں وہ دن پتھری طرح نقش تھے جب ریورس کی آئیڈیشن کے لیے اس کی ماں نے اپنا حق ہر کار بچا تھا۔ اس نے دیکھا تھا وہ لپٹی ہی دیر تک بار کو لیے کم سی بیٹھی رہی تھیں۔ مگر تب اسے احساس نہیں ملا کہ وہ اس وقت ہمارے بندھی کٹی ہی خوشگوار یادوں کے حصار میں گھر چلی ہیں۔ اس وقت اعلیٰ تعلیم کا جنون اس کے سر پر سوار تھا۔

اس کا ماموں رکشہ چلا کر گزر بسر کرتا تھا۔ ممبائی بولی میں ہی بی بی کے مرض کا شکار ہو گئی تھیں۔ اور اسی میں ان کی فوتگی ہوئی۔ اور پھر کئی آبادی میں بنے گھر میں وہ کہاں اور ماموں رہ گئے۔ کئی عیسائی کے بل دے کر وہ انتہائی بچا پاتے جس سے گھر کا راشن اور اثر تک اس کے تعلیمی اخراجات ہی چلا سکے۔ روزانہ پچاس روپے جب خرچ میں وہ کیسے گزارہ کرتا یہ وہ ہی جانتا تھا۔

ماموں کی مالی حالت دیکھ کر وہ کلستارہ جاتا۔ تب آنکھوں میں اعلیٰ تعلیم کے بعد اچھی پوسٹ کے خواب اس کے اندر نئی توانائی بھردیتے۔

”بس تعلیم مکمل کرنے کی دیر ہے ماموں کو تو میں راج کر اؤں گا۔“ اچھے علاقے میں گھر اور زندگی کی آسائشات اس کی پہلی ترجیح بن چکی تھیں۔ جب بھی اپنے خواب ماں کو بتاتا وہ خوش ہو کر اسے دعا تو دیتی مگر ساتھ میں یہ نصیحت بھی کرتی کہ ”بیٹا! تمہارے حصے کا رزق تو ہمیں ہر حال میں ملے گا بس ذرائع حلال استعمال کرنا ہم نے ہمیں حلال لقمہ کھلا کر جو ان کیا ہے۔“ تب وہ فوراً اپنی صابر شاہکاراں کے ہاتھ تھام کر چوم لیتا اور دل ہی دل میں رزق حلال کا عہد پختہ کر لیتا۔

”ماں! میں محنت کروں گا۔ دو ملازمتیں کروں گا مگر حلال لقمے میں حرام کی آمیزش نہیں کروں گا۔“
تب ان کے ہاتھ دعا کے لیے بلند ہو جاتے۔

”محبت انسان کو موم کی طرح پگھلا دیتی ہے۔ پانی کی

پیارے بچوں کے لئے

قصص الانبیاء



تمام انبیاء علیہ السلام کے بارے میں مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ حضرت محمد ﷺ کا شجرہ ہفت حاصل کریں۔

قیمت 300/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمر ان ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی۔ فون: 32216361

طرح بہادری ہے۔ ہوا کی طرح اڑا دیتی ہے۔ آگ کی طرح جلادیتی ہے۔ مٹی کی طرح دبا دیتی ہے۔ میں حیا حسین۔ جس معاشرے سے تعلق رکھتی ہوں وہاں لڑکیوں کا اندر ہی اندر سلگنا اور شب بھر آنکھوں کو بھگودینا یہاں کے رواج ہیں۔ اس سماج نے ابھی عورت کو اپنی زندگی کے فیصلوں میں مختار نہیں بنایا۔ یہاں عورت ابھی تک ذاتی ملکیت تصور کی جاتی ہے۔ وہ محبت تو کر سکتی ہے لیکن اس کے اظہار پر پابندی ہے۔ حالانکہ محبت تو انسان کو سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ مان، مرتبہ، محسب نسب۔ محبت کی وجہ سے شاہی تخت ٹھکرائے گئے۔ بادشاہ بھکاری بن گئے اور حکمران مفتوح ہو گئے۔

دائری کے آگے اور افاق خالی تھے۔ وہ جو بیٹی کی مزاج پر سی کرنے آئے تھے۔ اس کے کمرے میں ہکا بکا کھڑے تھے۔
”کیا حیا کا بخار ٹینشن کا نتیجہ ہے۔ محبت کی تپش ہے۔ اور میں اسے بیماری پر محمول کرتا رہا۔“
وہ متفکر، پریشان، فوراً ”کمرے سے نکلے تھے۔

چھ ماہ بعد وہ گاؤں آئے تھے۔ خوشی سے نہال ہوتی سبز بریلی نظروں کو تراوت بخش رہی تھی۔ تانے بان سے ہلکی پھلکی گفتگو کرتے ہوئے بارہا دل ہکا۔ نیچے اتر کر اپنی زمینوں میں چل قدمی کریں۔ وہ دونوں اطراف کی نئی فصلوں کو دیکھ کے خوش ہوتے رہے۔

کیا اس کے دلوں میں پھوٹنے والی پھٹیل۔ دھان کی ہری بھری فصلیں اور قد آور کماؤں کے بیجوں بیج بننے والی ٹیڑھی میڑھی راہوں پر دوڑیں لگائے پھلاٹکس مارنے اور پانی کے واٹر میں نہانے پاؤں لٹکا کر بیٹھنے کے کناروں پر بیڑی، جاسن، آم کے پھیلے۔ درختوں کو دیکھ کر ان کے ذہن میں بے شمار باتیں، یادیں، شرارتیں تیرنے لگیں ان کے بچپن کی ہم جوبلی، شرارتوں کی ساتھی۔ ”اب کیسی ہوگی؟“ وہ سوچ کر مسکرائے۔

”حیر!“ انہوں نے زیر لب نام لیا۔ دل چاہا کاش وہ

کھیں سے اب بھی سامنے آجائے۔ وہ دونوں میڑھی میڑھی یک دھڑکیوں پر بھاگتے دوڑتے عجیب خواہش تھی۔ کیا بچپن کی زندگی بھی عزت بھی پھر لوٹی ہے؟ یادوں کے موتی جیتے جیتے خاموشی کے کتنے ہی لمحے دبے پاؤں چپ چاپ کھٹکتے چلے گئے۔ تانے بان نے اپنے نئی سوالوں کے جواب میں کسی ان دیکھے منظر میں گم حسم انہیں دیکھ کر اپنی زبان تالو سے چپکالی۔
”شوق زدہ شام کے اوپر رات نے آنے سے پہلے سرمئی چادر سے دھرتی کو ڈھانپ لیا۔ تانے کی ٹنگ ٹنگ آہستہ آہستہ مدھم مدھم ہوتی چلی گئی۔ مغرب کی اذانیں ہو چکی تھیں۔ جب انہوں نے گاؤں کی حدود میں قدم رکھا تھا۔ کچے کٹھنوں سے اٹھنے والا دھواں اس بات کی علامت تھا کہ حضرت انسان پیٹ بھر نے کے انتظامات میں مگن ہیں۔

حویلی کا لکڑی کا لوہے کی میض لگا بہت بڑا دروازہ سامنے تھا۔ سوٹ کیس تانے سے اتارا ہی تھا کہ بخشش دوڑنا آیا اور آتے ہی ان کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے کر اپنے کاندھے پر رکھ لیا۔

”چھوٹے ملک جی! اندر حویلی میں ملکانی جی آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“

انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر حویلی کے اندر قدم رکھا۔

اب کی بار فصل آیا تو سے واپسی پر وہ اک احساس اور احسان تلے دیا ہوا تھا۔ ماضی کی کسمپرسی پر غمزہ بار بار کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتا۔ اتنی آسائش کی ملکیت کے باوجود ساری زندگی ترستار رہا۔

”اگر وہ اپنے باپ کے گھر میں پیدا ہوتا تو کیا اتنی مشقت بھری زندگی گزارتا؟“

کالج سے یونیورسٹی تک وہ شام کو ٹیوشن پڑھا کر اپنی تعلیم کے اختیارات پورا کرتا تھا اور کچھ ماں سلانیوں کے رقم جوڑتی۔

ماں سے بے تحاشا محبت کے باوجود ذہن میں وہ

آنے والی سوچ کو روک نہ پایا۔
”آخر میں نے ایسا کیوں کیا۔ خود بھی ساری عمر شقت کرتی رہی اور مجھ سے بھی کرواتی رہی۔ آخر میں نے ایسا کیوں کیا۔ کیوں اس نے مجھے باپ کا پتا نہیں دیا۔ ہمیشہ باپ کے ذکر پر کئی کئی کرات بدل دیتی۔“

وہ منظر اس کے تصور میں تاحال محفوظ رہا۔ جب انٹرنیشنل یونیورسٹی لے کر وہ گھر آیا تھا۔ تب ماں کے خوش ہوتے دیکھتے چہرے کو دیکھتے ہی اس کے دل میں باپ کا خیال آیا اور زندگی میں پہلی مرتبہ سر پلا سوال بن کر ماں کے سامنے آکر اُٹھا۔

”ماں! آخر بتاتی کیوں نہیں ہو کہ میرا باپ کون ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ زندہ ہے کہ مر گیا؟“

تب ماں کی آنکھوں میں زرا وقت نمی بن کر اتر آیا۔ اس کے لب تھر تھرائے کچھ بولنا چاہا مگر آواز حلق میں ہی گھٹ گئی۔ اجلا رنگ خوف سے تاریک ہو گیا۔ ایک لمحے میں ماں کے چہرے سے رونق اور زندگی کو اترتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر یکبارگی مرنی چھا گئی۔ ماں کے پورے وجود کو یوں ٹوٹے بکھرتے دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔

ماموں نے پانی کا گلاس ماں کو تھمایا۔ چارپائی پر بٹھایا اور اس کو لے کر باہر نکل آئے۔

”بیٹا! آئندہ اپنی ماں سے کبھی یہ سوال مت کرنا۔ ورنہ وہ جیتے جی مرجائے گی۔ اپنی ماں کی زندگی بھی تم ہو اور دولت بھی۔ تمہارا باپ اک امیر شخص تھا اور ہم غریب لوگ یہ شادی صرف چند دن کی پسند کی بنیاد تھی۔ اس کے بعد اس نے طلاق دے کر تمہارے ماں کو اپنی زندگی سے نکال دیا۔

طلاق کے ٹھیک چار ماہ بعد تمہاری ولادت ہوئی۔ میری کوئی اولاد نہ تھی میں نے بہن کی واپسی اور تمہاری ولادت کو دل سے قبول کیا۔ تم ہی بتاؤ کیا میں نے تمہاری تعلیم و تربیت یا پرورش میں کوئی کمی رہنے دی ہے کیا؟“

”میں نہیں ماموں! کیسی باتیں کرتے ہیں؟“ وہ جی

بھر کے شرمندہ ہوا۔ ماموں اس کے ایڈمیشن کی فیس کے لیے رکشہ بیچنے کا سوچنے لگے تھے۔ ماں نے ہی سمجھایا تھا کہ اس کے بغیر گزارا کیسے ہو گا۔ تب ماموں نے ہنس کر کہا تھا۔ ”یہ میری ذمہ داری ہے مزوری کروں گا! ٹھیکہ لگاؤں گا مگر تم لوگوں کو بھوکا بیٹھنے نہیں دوں گا۔“

”یہ گہری سوچ کسی راز کا پتا دیتی ہے۔ آپ کی یادداشت میں کوئی احساس، کوئی یاد لمحہ موجود کی موجودگی سے زیادہ اہم ہے جو حاضر کو منظر سے غائب کر دیتی ہے۔“

وہ پر یقین لمحے میں بولتی حیا کو دیکھ کر خوش دلی سے بھنوں اچکا کر مسکرایا اور اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے لیا۔

”حیا حسین! تمہاری باتیں مجھے ہمیشہ لاجواب کر دیتی ہیں۔ تم واقعی ذہین لڑکی ہو۔“

حیا حسین کا فوراً ”دل چاہا کہ دے۔“

”یہ اور اک تو مجھے محبت نے دیا ہے۔ اس میں ذہانت کا کیا دخل ہے؟“ پھر اپنے اس خیال کو جھٹک کر بولی۔

”یہ طنز ہے، تعریف مذاق۔ یا خوشامد؟“
وہ کھل کھلا کر ہنسا اور اس لمحے حیا کے دل کی دھڑکنوں نے یقین دلایا کہ اس کی زندگی کی ساری خوشیاں اس کی ہنسی سے پھوٹی ہیں۔

”ان میں سے کچھ بھی نہیں۔ یہ حقیقت اور سچائی ہے۔“ اس نے پہلی بار حیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انتہائی یقین سے کہا تھا اور اس کے لفظوں کی سچائی آنکھوں کے رستے دل کے نہال خانوں میں اترنے لگی۔

”ماں! اجہر کیسی ہے؟“ حسین رضا گرم پراٹھے کے اوپر رکھے مکھن کے پیڑے میں نوالہ ڈبو کر منہ میں رکھتے بولا۔

پہلی سے میری بیٹی۔ آج تو مجھے ان کے پنڈ لے چل۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

اس کے دل میں وہاں جانے، اسے دیکھنے بات کرنے کا اشتیاق گڑ گڑبڑ گیا۔

بیٹی بیٹھی کھل کھل کے کناروں سے اُٹھتی فوراً“

بے غشیل کو آواز دے کر ناگہ لانے کا کہا۔ راستہ اس کے خیالات میں کٹ گیا۔ ہوش اس وقت آیا جب اماں اسے پکار کر اترنے لگی۔

سب سے ملنے کے بعد اس کی متلاشی نظریں حیرا کو ہی تلاشتی رہیں۔ پتا نہیں کس کھوہ میں جا چھپی تھی۔ تب ہی وہ آئی۔ اس کے کیلے بال پشت پر صیلے تھے۔ شاید نما کر نکلی تھی۔ وہ اگر اماں کے گلے لگ گئی۔

پھر پلٹ کر بے نیازی سے اسے سلام کرنے کے بعد اماں سے اتنے دنوں بعد آنے کا شکوہ کرنے لگی۔

اماں اسے اپنی مصروفیت، حسین رضا کی زمینوں کی دیکھ بھال اور بڑھائی کے بارے میں بتاتی رہی۔ اب کی بار اس نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا۔ اماں جب نماز پڑھنے کے لیے وضو کرنے لگی تو موقع میسر آیا۔

”اماں! میں اتنی دیر سے اتنا انتظار کروا یا۔“

بچپن والی بے تکلفی لہجے میں عود کر آئی۔

”کس نے کہا تھا انتظار کرنے کو؟“ لبوں پر شرارتی مسکراہٹ چلی۔

”دل نہ لے۔“ اس نے دونوں بازو سینے پر باندھ کر اسے دیکھا۔

”اپنے دل کو ٹیکل ڈال کر رکھ۔“ وہ ہنسی۔

”تمہیں ٹیکل ڈال دوں، عمر بھر کے لیے خود سے باندھ لوں۔“

”چل۔“ بڑا آیا باندھنے والا۔“ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

تب ہی اماں کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ پھر شرافت سے بیٹھ گیا۔ وہ اسے گھورتے مسکرا کر باہر نکل گئی۔

”چھپو! جائے نماز بچھادی ہے۔“

”جیتی رہو بیٹی! جیتی رہو۔“

”اماں! میری فیس۔“ ماہم نے ڈسٹے ڈسٹے مال سے کہا۔ فٹ پال کے ٹکڑے جوڑتی اس کی ماں نے ایک نظر اسے دیکھا۔

”کہاں سے لاؤں تمہارے لیے پیسے، یہاں تو بیٹ نہیں پلتا۔ ساری عمر محنت کی، فیکٹری کے دھگے کھائے پھر بھی چار پیسے نہ جمع ہو سکے۔“ وہ روپائی ہو گئی۔

اس نے سر جھکا لیا۔ اس چھوٹے سے کوارٹر میں ساری زندگی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترستے گزری ہے۔ کیا تعلیم حاصل کرنے کی خواہش بھی پوری نہ ہو سکے گی۔

”اماں! آج آخری تاریخ ہے۔ یہ فیس دے دیں۔ بعد کی یوشن پڑھا کر پوری کر لوں گی۔“ منت سے بولی۔

”اتنا اونچا کیوں اڑ رہی ہے تو کس لیے؟ میں تو تیری شادی کی تیاری کر رہی ہوں۔ اک اک پیسہ جوڑ کے بس کوئی اچھا رشتہ آجائے، اس کے انتظار میں ہوں۔“ وہ نامحمانہ انداز میں سمجھانے لگی۔

”اماں! شادی کی بات نہ کریں، مجھے ہر حال میں پڑھنا ہے۔ اچھی جاب کرنی ہے۔ آگے بڑھنا ہے۔“ اس نے عزم سے کہا۔

”ارے کیوں چڑھ گئی ہے تجھے خواہ مخواہ کی ضد دیکھ۔“ تعلیم تیرے مقدر میں ہی نہیں تھا۔ اب مقدر سے تو کوئی نہیں لڑ سکتا ناں!“

”وہ میرے مقدر میں ضرور ہوتا، اگر میں بھی اعلا تعلیم یافتہ اور کھاتے پیتے گھرانے سے ہوتی تو اسے بچپن کی مشکلی توڑنے کی جرات نہیں ہو سکتی تھی۔ اب میں اسے کسی مقام تک پہنچ کر دکھاؤں گی۔“ اس کے لہجے میں اک عجیب بے قراری در آئی۔

”تجھے اچھی طرح پتا ہے کہ تیرا باب نشئی تھا۔ ابھی دنیا کے تختے پر آئی بھی نہیں تھی تو کہ وہ ایسا

مہیا کہ پھلوٹ کر نہ آیا۔ مجھے یقین ہی نہیں آیا مگر پھر راتے راتے صبر آ گیا۔ اور یقین بھی۔“ وہ نم آنکھیں دپٹے کے پلو سے پوچھتے بولی۔

”وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میری بس نے سہارا دیا۔ سر چھپانے کو چھت ملی، پیٹ بھرنے کو مزووری۔ ورنہ تو ہمارا ماں بھی جانور رکھا جاتے۔ لاہور میں تو کوئی بھی ہمارا نہ تھا۔“

”اماں! یہ داستان میں بچپن سے سنتی آئی ہوں۔ میری فیس کا مسئلہ حل کریں۔“ وہ خوشامدانہ انداز میں بولی۔

”دیکھ! ماہم! جو ایک ایک پیسہ جوڑ کے تیرے چیز کے لیے جمع کرتی ہوں۔ وہ تو اپنی تعلیم کے چکر میں اڑا دیتی ہے۔ کہاں سے کروں گی تیری شادی؟ بول۔“

”اماں! کیوں پریشان ہوئی ہو۔ نوکری کر کے سارے پیسے واپس لوٹا دوں گی۔“

”ہاں تو کرایا تو جیسے درختوں پر آگئی ہیں کہ تو راہ چلتے تو ڈلائے گی۔ ارے یہاں تو اچھے اچھے گھرانوں کے بڑے بڑے لکھ کے سرکوں پر دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ بغیر رشوت سفارش کے یہاں نوکری نہیں ملتی۔“

”خوشن! اب دے بھی دے۔ کیوں دل توڑ رہی ہے بیٹی کا۔“

اس نے خوش ہو کر تخت پر سلامتی کرتی خالہ کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔ جو اپنے نام کی مانند ہمیشہ اس کے حق میں اچھی صلاح دے کر ماں کو ٹھنڈا کر دیتیں۔ اماں نے آدھا جوڑا ہوا فٹ پال گھنٹوں سے پرے کیا اور اٹھ کر صندوق سے پیسے نکالنے لگی۔

محبت کے بھی عجیب اطوار ہیں۔ اپنے منتشر خیالات کی انجمن سمجھاتے سمجھاتے آنکھوں میں خواب، دل میں درد، ذہن میں تصویر یا ر سچائے محبت کے کارہنر میں مجسوم مصروف رہتے ہیں۔

میں حیا حسین۔ اسے دیکھ کے ہی اسیر ہو گئی۔ حالانکہ وہ اتنا خوبصورت نہیں کہ دیکھنے والے

ٹھٹھک کر رہ جائیں۔ وہ حسن کی اس معراج پر بھی نہیں کہ اک بار دیکھنے کے بعد بار بار دیکھنے کو دل چاہے۔ میں اس احساس کو سمجھنے سے مکمل طور پر قاصر ہو چکی ہوں کہ پھر میں اسے دیکھ کر کیوں پھر کی ہو گئی۔

ایک ہی جگہ جم کر آگے نہ بڑھ سکی۔ میری نظریں اس سے ہٹتی نہیں، وہ میری بینائی، عقل سے شناسائی، دل سے دانائی، ایک لحظہ چرا کر لے گیا۔ مجھے اک ہی منظر نے مبسوت کر دیا۔

اور میں حیا حسین کسی مندر کی دیو داسی کی طرح اس کے چروں میں پڑی ہوں۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے آنکھیں موندے۔ منتظر غزنوی کی طرح آیا اور مجھے مفتوح جینا کر میری ذات کا مومنات ڈھایا۔“

لکھتے لکھتے ہاتھوں پہ بھی محبت کی جھلک اتر آئی تھی۔ اس نے سر رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

وہ ہلکے سے دستک لے کر بیٹی کو گڈ ٹائٹ کہنے کمرے میں آئے تھے۔ اسے سوتا پاتا کر رائٹنگ ٹیبل پر پڑی ڈائری اٹھالی۔

”منتظر حسین۔“

شمالی علاقوں کے ہاٹوں کی برف باری سے پھوٹنے والی اک سرد کہر میں لٹنی شام لاہور گورنمنٹ کالج کے اسپتال کے کمر انمبر انیس کے باہر اتر آئی۔

چوکر کمرے میں چار بیڈ تھے۔

کوٹے میں پڑے بیڈ پر لیٹا ہوا حسین رضا کورس کی کتابوں سے منہ موڑے دیوان غالب میں مگھ تھا۔

دل سے تیری نگاہ جگر میں اتر گئی

دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

غزل کا اک اک مصرعہ اس پر وارفتی طاری کرتا

رہا۔ حیران کا جو اس کے سامنے جسم ہو گیا۔

گو کہ اس کے پاس خط و قاصد و فون کی مانند بھرپور وسیلہ اظہار کا زلیخہ نہ تھا مگر اس کے سامنے آتے ہی حیران کے لب مسکرا اٹھتے۔ چہرے کی تباہی اور شکفت

بیانی عروج پر ہوتی۔ اس کی اک اک ادا اس بات کی

گواہی دیتی کہ حسین رضا کی محبت میں گرفتار و سرشار ہے۔

اس موسم سرما میں وہ فوراً "گاؤں آنے کے ارجنٹ" تار پہ سلمان سفر باندھ کر ریل میں آسوار ہوا۔ عجب طرح کے وسوسوں کے ناک اسے ڈس رہے تھے۔

مالٹی کی میٹھی تھی۔ پتا نہیں کیا ہوا بوجوں بھلایا گیا۔ ماں کے لیے دعائیں مانگنا آئینہ پر اترنا خاندانی نانگہ بان کو نہ پا کر جی جان سے ہول اٹھا۔

"یقیناً" کوئی پریشانی کی بات ہے۔ ورنہ ایسا تو کبھی نہ ہوا کہ میں لاہور سے آؤں اور سواری پہلے سے آئینہ پر موجود نہ ہو۔

وہ سوٹ کیس اٹھا کر نانگہ کرائے پر کر کے آ بیٹھا۔ سارا راستہ سرمائوں میں بے پرواہ پریشان بیٹھا رہا۔ کوئی خیال کوئی منظر اس کی توجہ کچھتے میں ناکام رہا۔

"سب خیر ہے ناں؟" سانسے سے دوڑتے ہوئے آنے والے ہشخصل سے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں چھوٹے ملک جی! ملک خنیں رضا کی شادی ہے۔"

"بھائی کی۔" اسے خوشگوار حیرت نہ گھیرا۔

"تمہارے ماموں کا دوبارہ کے سلسلے میں کراچی جا رہے تھے۔ میں نے پکڑ لیا۔ پہلے مجھے بی بیہ کر دے دو پھر چھوڑوں گی۔ بس آنا "فانا" تیار ہوئی۔ جلدی میں تمہیں تار بھیجا۔"

ماں مسلسل جوش سے بولتی جا رہی تھی مگر اس کے پاؤں سے زمین کھٹک گئی۔

اس کی مثال اس مسافر کی سی تھی جو منزل پر پہنچ کر تہی دامن رہ گیا ہو۔

تقدیر کی کبھی انہی تحریر اس کی زندگی کی لوح پر برق رفتاری سے رقم ہو گئی اور وہ اپنی انہی ست رفتاری کے باعث حسن کی جلوہ گاہ سے جبری خلوت گاہ میں ساکت و ساکن رہ گیا۔

حسین رضائے شادی کی ساری رسومات میں بخار میں جلتے ہوئے غائب دماغی کی کیفیت میں حصہ لیا۔

مگر وہ تباہ کن ساعت جب منہ دکھائی کے لیے دیوار کو پکڑ کر آگے کر دیا گیا۔

"بھرجانی کو سلامی دے پگے!" اماں کی سرشار آواز ابھری۔

اس لمحے محبت کی تپش اور نارسائی کی آگ میں جلتے ہوئے حسین رضا کی لال جھبھو کا آنکھوں میں ساری تلخی، سارا کرب سمٹ آیا۔

اس وقت حسین رضا کے نام پر حسین رضا کے پلو میں بیٹھی دلہن نے بے خودی سے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔

بس یہی لمحہ قیامت خیز تھا۔ حسین رضا کے انگ انگ سے پھوٹ کر نکلنے والے بے وفائی کے طعنوں نے اسے جلا کر رکھ دیا۔

رات ہونے تک دلہن کی طبیعت خراب ہوئی۔ کسی نے نظر لگنے کی قیاس آرائی کی تو کسی نے جن و پری کے سامنے کی خجراؤ لائی۔ کسی نے جاوڑ ٹونے کو قصور وار ٹھہرایا۔ مگر حسین رضا کے لیے صرف سماگ رات ہی نہیں، ساری عمر کے لیے کمرابدری مقدر ہوئی۔

حمیرا کو آنے دن پڑنے والے بے ہوشی کے دورے طویل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ماں پوتے کی آس لیے قبر میں جاسوئی۔

حسین رضائے شہر میں ہی تعلیم کی تکمیل کے بعد کائن فیکٹری میں فیچر کی جاب کر لی۔

"سر! یہ فائل کمپلیٹ ہے۔ اس میں منصوبے پر لگنے والی رقم کا تخمینہ، نقشہ اور مکمل معلومات ہیں۔"

وہ ان کے پیچھے آفس میں داخل ہوتے بولا۔

ایم ڈی صاحب نے کوٹ اٹار کر کرسی کی پشت پر رکھا اور مشتفانہ نگاہ اس پر ڈالی۔

دیکھتے تذبذب کا شکار نظر آتے رہے۔ کبھی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھنساتے۔ کبھی ہاتھ سیدھے کر کے فائل کے اوپر رکھتے۔

"منظر دیکھو! مجھے تمہاری قابلیت، ذہانت اور ایمان داری دیکھ کر بے حد خوش ہوئی ہے۔ درحقیقت تم بہت اچھے انسان ہو اپنے باپ کی طرح۔"

"سر! آپ جانتے ہیں میرے باپ کو؟" اس کے لہجے میں تجسس و حیرانی نمایاں تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ اولاد میں والدین کی تربیت و شرافت منتقل ہوتی ہے۔ تمہیں دیکھ کر یہی احساس ہوتا ہے کہ تم بہت اچھے نیک طبیعت والدین کی اولاد ہو۔ میری دلی خواہش ہے کہ میرے منہ بولے بیٹے سے تحقیق بیٹھیں جاؤ۔"

"جی سر! وہ کرسی پر بیٹھے حیرت سے آگے سرک آیا۔ اس کا عکس نیبل کے شیشے میں واضح دکھنے لگا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میری صرف ایک ہی بیٹی ہے جیسا۔ بے حد حساس، آرنسٹک مزاج، کتابوں کی رسیا، زمانے کی اونچ نیچ سے بہت دور اس کے لیے مجھے تم سے بہتر لوکا نہیں ملے گا۔"

"سر! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"جیسا! تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے معاشرے میں کوئی بھی باپ اپنی بیٹی کا رشتہ خود نہیں دیتا۔ مجھے تم پر پورا مان اور بھروسہ ہے۔ اس لیے خود بات کی ہے۔

بہر حال انکار اور اقرار کا حق تمہارے پاس محفوظ ہے۔ ہر صورت تم اس آفس میں کام کرتے رہو گے۔"

"سر! میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا۔" وہ عاجزی سے سر جھکا کے بولا۔

"تمہی قابل ہو۔ یہ فیصلہ مجھ پر چھوڑ دو۔ تم سوچنے کے لیے وقت لے سکتے ہو۔"

"جی سر! وہ سعادت مندی سے بولا۔

"میں اس نئے کنٹریکٹ سے فارغ ہو کر کراچی کا چکر لگاؤں گا۔ کنٹرکشن کاجازہ لوں گا۔ تم جیسا کہ سائنٹ پر لے جانا تاکہ اگر کام اس کی مرضی کے خلاف ہو رہا ہو

تو وہ تبدیلی کروالے۔

"جی بہتر سر! ٹیکسٹائل مل کی تیار ہونے والی شاندار عمارت ان کے تصور میں آسانی، جوحیا اور اس کے متوقع شوہر کو گفت کرنی تھی۔

یہ کیا ہوا تھا اس کے ساتھ جو خواب آنکھوں میں سجائے، ریزہ ریزہ ہو گئے۔ کرجیاں تھیں، جو مسلسل چبھ رہی تھیں۔

"ہاں کی تو مجھے کوئی فکر نہیں جیسے ہی لوکا ڈاکٹر بنے گا۔ فوراً اس کا بیہ کر دیں گی۔" ماں اٹھتے بیٹھتے تشکر سے کہتی۔

بچپن سے سنت اس کو یہ الفاظ اڑ رہے تھے۔ مگر جیسے ہی وہ ڈاکٹر بنا۔ اچھے گھرانے کی لڑکی بیہ لایا۔ وہ اپنی غوث کسمپرسی کے ساتھ اس امید پر گزارہ کر رہی تھی کہ شادی کے بعد اس کی خواہشات پوری ہوں گی۔ مگر اب ایک دم سے یہ دھکا۔ اور سے ٹھکرائے جانے کا احساس۔ انا پر سخت ضرب لگی۔

اس کے اندر اس صدمے کے بعد آگے بڑھنے کو نچا معیار زندگی حاصل کرنے کی جستجو اور لگن بڑھ گئی۔ پڑھنا ہے۔ اور آگے بڑھنا ہے۔

وہ سارے کام کا جائزہ لے کر بہت تھک چکی تھی۔ اپنے آفس میں دو تبدیلیاں کرانے کی ہدایات دے کر منتظر کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی۔

"کنٹائنارم لگے گا؟"

"تقریباً ایک ماہ اور۔" وہ گیٹ سے گاڑی نکالنے لگا۔

"گھر چلیں!" اس نے سوالیہ انداز میں جیبا کو دیکھا۔

"شام ہو گئی ہے۔ ایک چکر سمندر کا نہ لگائیں؟"

جانچتا آیا تھا۔ اس کے سر اے کا نقوش کا جائزہ لیتا رہا۔ اپنے ساتھ بیٹھی حیا پر آگ نظر ڈالتا پھر وند اسکرین میں دیکھتا۔ یہ میرے ساتھ بیٹھ کر کسی لگ رہی ہے اس نے سوچا۔ اس کی رنگت گندی، حیا کی سائلی مائل۔ ان دونوں کی ناک ستواں تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں ایک گہرائی اور اپنے لیے محبت ہلکورے لیتی نظر آتی۔ گھٹی پلکیں اس کے حسن میں اضافے کا باعث تھیں۔ جبکہ حیا کے مقابلے میں اس کی آنکھیں چھوٹی تھیں۔ گھٹی مونچھیں بھرے بھرے ہونٹ۔

ساحل کی ریت پر اپنے ساتھ چلتے ہوئے بہت بھلی لگ رہی تھی۔ سمندر کی بھیگی تیز ہوا سے حیا کا دونا ڈر اس کے گرد لپٹ گیا۔ اس نے اک قدم آگے آکر دوپٹے کا تھما ہوا پلو اس کے سامنے کیا۔ وہ بے ساختہ ہنسی۔ دوپٹا اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

”لگتا ہے میوزک میں تمہاری دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اتنے اچھے گانے چلتے رہے مگر تمہاری توجہ ہی نہیں ہوئی۔“

یکبارگی اس کا دل چاہا کہ وہ تمہارے ہوتے ہوئے کسی چیز میں دلچسپی نہیں ہوتی۔ مگر صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

”تو تم کیوں رہتی ہو؟“ ”کسی کی قربت کے احساس میں گم رہتی ہوں۔“ ”کس کے؟“ وہ عین اس کے سامنے راستہ روک کے کھڑا ہوا۔

”اس کے جو ہر قدم پر میرا راستہ روکے کھڑا ہوتا ہے۔“ وہ کہنے کو کہہ گئی۔ مگر اس کی بھرپور مسکراہٹ دیکھ کر جھینپ گئی۔

”ایسا کافیصلہ قبول ہے؟“ اس نے نگاہ حیا کے چہرے پر مرکوز کر کے استفسار کیا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ وہ اس کی مرتکز نگاہ

سے گھبرا کر سمندر کی موجوں کو دیکھنے لگی۔ ”یہ دلی رضامندی ہے یا سعادت مندی؟“ اس نے خوش دلی سے ہنستے ہوئے بازو پیٹے پر پابندھے۔ ”دونوں ہی۔“ ہوا کی طرح سرسراتی آواز اس کے وجود سے ٹکرا کر اسے ہوا میں اڑا لے گئی۔ دونوں سرور کی کیفیت کو دل میں جذب کر کے رہے۔

دور سمندر کی گود میں لیٹنے والے سورج نے اک آنکھ میچ کر محبت سے انہیں دیکھا اور مطمئن ہو کر سو گیا۔

☆ ☆ ☆ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی گھر میں بیٹھنا وہ بھر ہو گیا تھا، وہ تھکا ماندہ زینن سے آنا کہ گھر جا کر سکون کا سانس لے گا۔

گھر جو انسان کی پناہ گاہ، تسکین، آرام، خوشی و سرور کا مرکز ہوتا ہے وہ گھر اس کے لیے صرف ایک قیام گاہ بن چکا تھا۔ وہ کمرے کی طرف آتا تھا دروازہ بند ملتا۔ ماں کا کمر اس کی سر اے تھا۔ وہ مسافر اس میں رات گنتا، پھر علی الصبح اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے چلا جاتا۔ گھر میں اس کے کھانے پینے کا خیال ملازمہ رکھتی اور اوپر کے کام، کپڑے، جوتے، تیل، کنگھی، سرمہ، عطر دینا، بخشن کی ذمہ داری تھا۔

سوئے اتفاق حمیرا سے اس کا سامنا ہو بھی جاتا تو اس کے پاگل پن کے دورے اس کو گھڑی بھر گنتے نہ دیتے۔ وہ اپنے بال نوچتی وہ سبتے لگ جاتا تو اس کے پال نوچتی، چنگیاں کاٹتی، اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑنا شروع کر دیتی۔ پورے گاؤں میں یہ بات زبان زد عام تھی کہ حسین رضا کی بیوی حمیرا کے اوپر شادی کی پہلی رات ہی خطرناک سائے کا اثر ہو گیا۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیاں کھسر پھسر کرتیں۔ سہاگ رات جس دلہن پر زیادہ روپ آجائے اور اس پر کوئی جن عاشق ہو جائے تو اس کو اپنی بیوی بنالیتا ہے۔ کبھی بھی شوہر کو دلہن کے قریب نہیں جانے دیتا، شوہر پاس جائے گا تو

بیوی کو دور رہے گا۔ عورتیں جھری لیتیں اور ایسی فرسودہ باتوں سے خوف زدہ ہو کر کانٹوں کو ہاتھ لگا کر فوراً ”توبہ“ مانگ رہتیں۔ اس کے آئے دن کے دوروں سے تنگ آکر حسین رضا زمینوں پر بنے ڈیرے پر رہنے لگا۔ وہاں فٹنی کی بیٹی زبیدہ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی، مگر سلیقہ مند، خوبصورت اور نوجوان تھی۔ نوجوان تو وہ بھی تھا۔ بیوی کے پاگل پن سے پریشان ایک جائے پناہ زبیدہ کے وجود میں میسر آئی تو اسے گنوایا نہیں۔ فٹنی سے رشتہ مانگ کر سادگی سے نکاح ردھوا لیا۔ زبیدہ اس کے دل کی رانی کے ساتھ گھر کی ملکہ بھی بن گئی۔

ڈیرے پر ہی اس نے خوبصورت گھر بنوایا۔ حویلی کا جو دورے تیسرے روز چکر لگاتا تھا اب ہفتوں بعد ملازمہ کو راشن پانی کا خرچا دے کر کھڑے کھڑے چلا جاتا حمیرا کو دیکھے بغیر۔

ان ہی دنوں حسین رضا زمینوں میں اپنا حصہ وصول کرنے حویلی پہنچا تو صرف حمیرا، ملازمہ اور بخشن کو پایا۔

☆ ☆ ☆ ”مجھے یہ رشتہ قبول ہے سر آپ جیسے فرشتہ صفت انسان سے رشتہ جڑنا میرے لیے باعث سعادت ہے اور جیسا جیسی جنٹنس لڑکی کالا نف پار ٹرن بننا بہت بڑی خوش نصیبی۔“

فیصل آباد پہنچے ہی ایم ڈی صاحب کے بلاوے پر نہایت اعتماد اور بروقت طریقے سے اس نے اپنی رضامندی سے مطلع کیا۔

”برخوردار! مجھے تم سے اسی سعادت مندی کی توقع تھی۔“ ڈائریکٹر صاحب بہت خوش تھے۔

انہوں نے اپنی کرسی چھوڑ دی، ٹیبل کی دوسری طرف سے گھوم کر اس کی طرف آئے وہ تعظیماً کھڑا ہو گیا۔

انہوں نے گلے لگا کر پیشانی چومی۔ ”آئی لو یو مائی سن۔“ اس کی آنکھوں میں بے ساختہ نمی تیر گئی۔ اس کا باپ ہوتا تو وہ بھی شاید اتنی ہی شاندار شخصیت کا مالک ہوتا۔ اس نے ایم ڈی کی آنکھوں کی چمک کو کئی گنا بڑھتے دیکھا۔

”سر! میرا اس دنیا میں ماموں کے علاوہ اور کوئی نہیں، باپ کو تو زندگی بھر نہیں دیکھا۔ ماں کی علیحدگی ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود جب سنا کہ بابا ان کو چھوڑنے کے بعد جلد ہی فوت ہو گئے تھے تو صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور بیمار ہو گئیں۔ کچھ عرصے کے بعد ان کی بھی وفات ہو گئی۔ میں چاہتا ہوں زندگی کے اتنے بڑے موڑ پر ماموں میری خوشیوں میں شامل ہوں۔“

”ضرور۔ ضرور برخوردار۔ کہاں رہتے ہیں تمہارے ماموں؟“ ”سر! اسی شہر میں۔“

”تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ چلو ابھی لے آتے ہیں۔“ ”سر آپ؟“ اس نے تعجب سے کہا۔ ”ہاں۔ کیوں میں نہیں چل سکتا۔“ ”کیوں نہیں سر؟“ وہ دل سے مسکرایا۔ وہ ان کی لاش پھن کرتی بی ایم ڈی میو میں آ بیٹھا۔ ”کہاں چلیں؟“ ایم ڈی صاحب کے استفسار پر وہ قدرے کھسیانا سا ہو گیا۔ اسے افسوس ہوا۔ اس نے کوئی بہانہ کر کے انہیں آفس میں ہی کیوں روک دیا۔

”سر! آپ کو تو پتا ہے کہ میرا تعلق جھنگ روڈ پر فیصل آبادی مضافات سے ہے۔“

جب گاڑی ان تنگ گلیوں میں پہنچی تب تک اس کی فطری خود اعتمادی لوٹ آئی تھی۔ اس کے پاس ذہانت و علم کی دولت تھی جو خریدی نہیں جاسکتی۔ اس سوچ پر مطمئن ہوا۔ وہ گاڑی سے اتر کر تنگ گلیوں میں چلنے لگا، تیسری فلی میں اپنے کمرے کے سامنے پڑے تالے کو دیکھ کر رک گیا۔

OSEM[®] SILKY TALCUM POWDER



”سر! اس وقت یقیناً ماموں کام پر گئے ہوں گے۔ اصل میں وہ رکشا چلاتے ہیں۔ میں نے شاید آپ سے ذکر کیا تھا۔“

”ارے منتظر بیٹا! کیسے ہو۔“

انہوں نے لال دھاری دار رومال شانوں پر پھیلائے سفید ٹوپی پہنے متناسب قد و قامت کے آدمی کو بغور دیکھا جو منتظر سے گلے مل رہا تھا۔

”سر! یہ ہمارے پیش امام ہیں، میں نے قرآن شریف ان ہی سے پڑھا ہے۔“

”جی۔ یہ ان ہی گلیوں میں مل کر جوان ہوا ہے۔ بس جناب پوت کے پاؤں پالنے میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ میں تو شروع سے کہتا تھا کہ اپنی ذہانت اور علم سے یہ بہت ترقی کرے گا۔ بہت آگے جائے گا۔“

وہ جو انسانی کمزوری کی بنا پر اک لمحے کے لیے شرمندہ ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے تعریف نے پھر پر اعتماد بنادیا۔

”جی۔ میں دل سے قدر کرتا ہوں، اس لیے اس کے محسن و مربی ماموں سے بذات خود ملنے آیا ہوں۔“

انہوں نے مصافحہ کرتے پیش امام کو مدعا بتایا۔

”جناب! ہم تو سمجھے کہ حمید کو منتظر میاں لے گئے ہیں۔ وہ تو کافی عرصے سے کسی کو نظر نہیں آیا۔ اس کا رکشا بھی نہیں۔ ہم سمجھے کہ بیچ دیا ہے۔“ وہ حیرت و استعجاب سے منتظر کو دیکھنے لگے۔

”ماموں کہیں چلے گئے ہیں؟“ اسے سخت دھچکا لگا۔

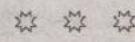
”کہاں جاسکتے ہیں۔“ خود کلامی کی۔

”ان کا کوئی دوست رشتہ دار؟“ انہوں نے استفسار کیا۔

”نہیں سر! مجھے تو ایسا کوئی بھی قریبی عزیز یاد نہیں پڑتا، جن کے پاس وہ جائیں، وہ بھی اتنے عرصے کے لیے۔“ وہ پریشانی سے بولا۔

گندی ٹالی سے ٹراتے ہوئے مینڈک باہر آنے لگے۔ بدلو کا اک بھکا اٹھا۔ اس نے گھبرا کر ایم ڈی صاحب کو ناگواری سے ناگ پر رومال رکھتے دیکھا۔

”چلیں سر! کہیں اور بتا کرتے ہیں۔“



پشیمانی، ندامت اور احساس جرم کا اک نہ رکنے والا سلسلہ تھا، جس میں وہ غرق ہو رہا تھا۔ آسائش و آرام کا عادی ہو کر وہ اپنے ماموں کو بھول بیٹھا، جس نے پالا پوسا، پڑھایا لکھایا۔ اعلا عہدے پر پہنچ کر اپنے محسن و مربی سے بے خبر رہا۔

ڈھائی ماہ پہلے جب ان سے ملنے آیا تھا تو ان کو اپنے ساتھ چلنے کا کہا تھا۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں برائے گھر میں جا کر نہیں رہوں گا۔ تم اپنے مالک کے گھر میں رہتے ہو، اپنا گھر لو گے تب ہی چلوں گا۔

اسی دن واپسی میں ضروری فائلیں دینے آفس پہنچا تو سرنے اسے دامادی میں لینے کا عندیہ دیا۔

چاہنے کے باوجود وہ یہ خوش خبری ماموں کو نہیں سنا سکا۔ اس کی فلائٹ کا ٹائم ہو چکا تھا۔ کراچی میں نئی ٹیکسٹائل مل کے انفراسٹرکچر کے جھمیلوں میں پھنسا رہا۔ حیا کا مرکز نگاہ۔ اس کی پسندیدگی اب ڈھکی چھپی

بات نہ تھی۔

ماموں کی گشدگی نے اسے بوکھلا دیا۔ اس نے ایم ڈی صاحب کی مدد سے پولیس اسٹیشنز، ہسپتالز، ایڈجی سینٹر کا ریکارڈ چیک کروایا۔ ہر جگہ ڈھونڈا، مگر کوئی پتا نہیں چل سکا۔ ڈائریکٹر صاحب نے چاروں طرف اپنے آدی پھیلا دیے ڈھونڈنے پر مگر کہیں سے امید افزا خبر سننے کو نہ ملی۔

وہ ماما اور ماما کی طرح ماماوں کو بھی رو پیٹ کر بیٹھ گیا۔ مگر اک کسک ضرور تھی جو میں بن کر دل میں چبیتی رہی۔

ڈائریکٹر صاحب نے جس طرح ماماوں کو ڈھونڈنے میں اس کے ساتھ تنگ دود کی تھی اس بنا پر اس کے دل میں ان کی عزت کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ حیا کا مسلسل فون پر رابطہ اسے ڈھارس بندھا تا۔

میں دنوں کے بعد ناکام و نامراد وہ کراچی لوٹ آیا۔

حوالی کی اجڑی حالت اک نوکرانی کے رحم و کرم پر دیکھ کر اسے رنج پہنچا۔ وہ حیران کے کمرے میں آیا۔

”یہ میں کیساں رہا ہوں؟ تمہیں دورے پڑتے ہیں یا آسیب کا سایہ ہو گیا ہے؟“ وہ حیرت سے گویا ہوا۔

”تم سے بڑا آسیب میری زندگی میں نہیں آسکتا حسین رضا! بڑا دل تھے نامور تھے تب ہی پریت کی ڈور کو توڑ کر چھپ کر بٹھ گئے۔ نہ اپنا پتا چھوڑا نہ کبھی لوٹ کر خبر لی۔“ وہ لکھنے سے حلیے بکھرے بالوں و حشمت زوہ لال بھجھو کا آنکھیں لیے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

کتنے ہی لمحے گزر گئے۔ وہ حیرت و دکھ سے اس کے طعنے سنتا اس کے اجڑے وجود کو دیکھتا رہا۔

”بولتے کیوں نہیں مجھے برباد کرنے والے! جواب دو۔“

اس کی حالت دیکھ کر وہ اپنی صفائی میں اک لفظ نہ بول سکا۔ ”میں نے اپنا وجود تمہیں ودیعت کیا، میرا وجود تمہاری محبت کا اسیر تھا۔ پھر کیسے کسی اور کے حوالے

کرتی۔ تمہیں ہی تو سوچی تھی اپنی محبت جذبہ اور ہر اک احساس، پھر کیوں منہ موڑ کر بھاگ گئے بڑوں کے بے ہمت لوگوں کی طرح۔“

حمیرا کے ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچ گئے۔ وہ ساکت رہ گیا۔

”میری اس حالت کے ذمے وار تم ہو حسین رضا صرف تم۔“ وہ اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ اس کے اندر اتنی ہمت نہ تھی کہ خود کو چھڑا سکے۔ وہ جب بولنے چہچہے روتے جھنجھوڑتے تھک گئی تو خود ہی اس کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا، تھک کر زمین پر بیٹھ گئی اور سر گھٹنوں میں دے کر سکنے لگی۔

اس کے اچھے بال پورے وجود پر بکھر گئے۔ وہ چند ثانے اسے یوں ہی دیکھتا رہا۔ پھر مے مے قدموں سے کمرے سے باہر نکل آیا۔

”بیٹا! اسے ایسے ہی دورے پڑتے ہیں۔ کوئی اس کے پاس جانے کی کوشش کرے تو دور ہی سے غرائے لگتی ہے۔ میرے قریب مت آؤ۔ میرے قریب مت آؤ۔“

اس کے جھکے سر، پھٹے گریبان کو تاسف سے دیکھ کر ملازمہ دکھ سے بولی۔ وہ اس کی دیگرگوں حالت پر پشیمانی سے گلستا رہا۔ دل تو کر رہا تھا ایسے کی طرح طوطا چشتی کر کے میاں سے بھاگ جائے مگر وہ اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ بہر حال وہ اس کی محبت تھی اور اس کی محبت کی وجہ سے درد میں شریک رہے گا۔ دجوتی کرے گا۔ یہ فیصلہ کرنے میں اس کے دل نے صرف اک لمحہ لگایا تھا۔

”رشیدہ! اتنے اچھے رشتے کروائے ہیں محلے کی لڑکیوں کے، بس میری ماما پر ہی تیری نظر نہیں پڑتی۔“ چھوٹے سے کھن میں پڑے تخت پر دونوں پاؤں اوپر رکھ کر بیٹھی رشیدہ جانے کا کپ تخت کے گونے پر رکھتے آنکھیں سکڑتے حیران ہوئی۔

”ارے کیوں خورشید! تیری بیٹی کی تو بچپن سے

تیرے بھانجے کے ساتھ نسبت طے تھی۔“

”ارے مجھے نہیں پتا اس نے تو اپنے ساتھ بڑھنے والی ڈاکٹری سے بیاہ رکھا۔“ صالحہ خالہ نے تاسف سے کہا۔ ”بس وہ دن آج کا دن، جیتے جی بسن ہمارے لیے مگر۔“

”اب پھر دکھڑے شروع۔“ ماما جی بھر کے جھنجھلائی۔ اپنی بے وقعتی کا دکھ بھلانا بھی چاہے تو نہیں بھول پاتی۔

”ارے کیوں دل چھوٹا کرتی ہے۔ کیا کسی ہے بھلا اپنی ماما میں۔ خوب صورت، بڑھی لکھی، عمدہ اخلاق والی، ایک چھوڑ دیوں رشتے اس کے لیے۔“ رشیدہ نے انگلیوں میں پڑی انگوٹھیوں کی نمائش کرتے ہوئے ہاتھ ابریا۔

”جانتی ہوں تمہیں بھی اور تمہارے تھرڈ کلاس رشتوں کو بھی۔“ وہ دانت پیٹتے بڑبڑاتی، اور خود کو انتہائی ہنڈ سم، ہم سفر کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے دیکھنے لگی۔

”ارے کیا ہوا ماما! بیٹھے بیٹھے سو گئی کیا؟“ آنکھیں کھول کر ناگوار سے ماں کو دیکھا۔

”تو استری رکھ کر کپڑوں پہ کھڑی ہے اور کوئی ہوش ہی نہیں۔“

اس نے چونک کر استری والا ہاتھ اوپر کیا۔ اکلوتے اچھے جوڑے کو جلا ہوا دیکھ کر دل موس گرہ گئی۔

”ہائے! ابھی پچھلے ماہ ہی تو آٹھ سو روپے کا سوٹ لایا تھا۔ وہ بھی جلا دیا۔“ تجھے کیا قدر ہوگی نکلوے جوڑتے جوڑتے انگلیاں نیڑھی ہو گئیں میری۔“ وہ روہا سی ہو کر بولی۔

”اب جل گیا تو کیا کروں۔“ وہ جھنجھلائی۔ ”اماں چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بھی تم تو جان کو آجاتی ہو۔“

قیس جلنے کا غم اوپر سے ماں کی نصیحتیں۔

”اب میں کیا پس کر کا بج جاؤں؟“

”حمیرا کو اس حالت میں تنہا چھوڑ کر آپ نا انصافی

کر رہے ہیں۔“ وہ زمین پر اس کے مقابل کھڑا اسے احساس دلانا رہا تھا۔

”وہ آسیب زوہ ہے، کبھی ٹھیک نہیں ہوگی۔ اماں نے اپنی زندگی میں کوئی دعا دوا نہ چھوڑی، ہر جتن کرنے کے بعد بھی اس کا مرض بڑھا ہے، کھانا نہیں، ہشخشاں پتا رہا تھا کہ اس نے تمہارے ساتھ بھی کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔“

وہ لا پرواہی سے کہتے حد نگاہ تک پھیلے گندم کے سنہرے کھیتوں کو دیکھنے لگا۔

”وہ ذہنی مریض ہے۔“ چند لمحے کی خاموشی بعد وہ بولا۔ ”آپ کو اس کے علاج معالجے پر توجہ دینی چاہیے۔“

”مگر وہ علاج سے ٹھیک ہو سکتی ہے تو تم علاج کروالو اس کا۔ میری طرف سے اجازت ہے مجھے دیکھ کر تو وہ مرنے مارنے پر رل جاتی ہے۔ اسی لیے میں نے گھر جانا ہی چھوڑ دیا۔“

”بھائی! وہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ علاج سے ٹھیک ہو جائے گی۔“

”دیکھو حسین رضا! میرے اوپر اور بھی ذمے دار ہیں۔ زمینوں کے حساب کتاب، مزارعوں کے مسائل، آس پاس کے زمین داروں سے چھوٹی چھوٹی چوقشیں، کس کس بات کو دیکھوں، تم میرے بھائی ہو، کچھ تو میری ذمہ داریاں پاتو۔“

”ٹھیک ہے میں اسے ساتھ لے جانے کی کوشش کرتا ہوں، ہو سکتا ہے۔ وہ علاج سے ٹھیک ہو جائے۔ آپ ماما حیدہ کو ساتھ بھیج دیں۔“

وہ واپسی کے لیے پلٹا۔ بھائی کے ساتھ اس کی یہ تیسری ملاقات تھی جو حمیرا کے بارے میں فیصلہ کن ثابت ہوئی۔

اس نے گھنٹہ گھر چوک پر سواری اتاری۔ اسی وقت ایک تو مند شخص رکشے میں آکر بیٹھا۔ تیل سے چپکے بال، بڑی بڑی موچیں، دھونی باندھے اس شخص

کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا کہ پہلوان ہے۔ اس نے مسکرا کر سواری کو دیکھا۔
”کتنے جانا لے جاتی؟“
”جھنگ روڑے تک آگے۔“
”ابھی تے دور اے جی کرایہ زیادہ ہوگا۔“
”آہو جی! اسیں ایسا کرایہ دیواں گے کہ جی خوش ہو جائے گا۔“

اس کا رکشا جھنگ روڑی طرف رواں دواں تھا اور رکشہ چلانے والا پنجابی دھرتی پر بسنے والے صوفیا کے کلام میں تسکین قلب کا متلاشی اپنی تنہائی اور دنیا کی بے تابی کا نوہ کرنا، پایا فرید گنج شکر کے دوسے گنگنا تھا۔

روڈ پر گاڑیوں کا شور تھا، مگر اندرونی فضا میں اس کی آواز کا سحر پہلوان جی کو آئینہ دکھا رہا تھا وہ پریشان ہوا تھا اس حقیقت سے۔

”اوپا جی تسی او تھے رہندے سی؟“
اس نے گنج شکر کے دھوکے کی فضا سے نکل کر اسے بغور آئینے میں دیکھا۔

”بس جی! سفر تے پنجابیاں دے پیراں نال جز گیا اے“ مسافر نے اتنا امن پسند مشغلہ اے۔
”میں بھی پہلے لاہور میں رہتا تھا، پھر بد قسمتی سے حالات خراب ہو گئے، دھکے کھاتے کھاتے گوجرانوالہ، پھر سیالکوٹ، اب کافی عرصے سے فیصل آباد میں رہتے ہیں، آگے دیکھتے ہیں یہ سفر کراچی پر ختم ہو گیا ابھی اور آگے جانا ہے۔ ہو سکتا ہے اوھر ہی ختم ہو جائے۔“ وہ پنجابی میں بول رہا تھا۔

”بس بھابی اوھر ہی روک دو۔ ہمارا سفر ختم ہو گیا۔“

اس نے رکشا روک کر کرایہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مسافر نے اسے ہاتھ سے کھینچ کر پاس تیزی سے رکنے والی ویگن میں اٹھا کر ڈال دیا۔ یہ اتنا آنا ”فانا“ ہوا کہ اسے سوچنے بجھنے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔

ملن کا سہمے جب رات وصال میں مستقل کمین ہونے لگے تو محبت کرنے والے اپنی خوش نصیبی پر نازاں و فضاں ہوتے ان سہموں کو اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھ کر آنکھوں سے پختے ہوئے دل میں محفوظ رکھتے ہیں۔

ان کے بچہ وائی ملن کا موسم آیا تھا اور اس موسم کی نوید دینے ان کے دوست و احباب برقی قمقموں سے سجے ہال میں آمو جوہ ہوئے۔ وہ محبت کی روشنیوں سے جگمگاتے چہرے کے ساتھ دلسن کے روپ میں منتظر حسین کے دل میں اتر گئی۔

”اپنی قسمت پر یقین نہیں آتا۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے و فوراً سر سے ہوا۔ وہ مسکرائی۔
”میرے غم دوراں کے دکھ اپنوں کی کمی کا غم اور کرب تمہاری یہی مسکراہٹ مٹا دے گی۔“

اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی اپنے ہاتھ کو تھامے منتظر حسین کے ہاتھ پر اس نے گرم جوشی سے دباؤ ڈالا۔

”میری ساری خوشیاں تمہاری اور تمہارے سارے غم میرے۔“

شب وصال وہ جو بیٹھے میرے پہلو میں مسکرانے لگی شب متاب

دولہانے کان کے قریب سرگوشی کی۔ وہ مسکرا کر مجھ بول ہوئی۔

ہاں اثر یہ ہوا محبت کا ہم سے آنے لگا ہے ان کو حجاب محبت سے چور آواز نے اس کو خوشیوں کے سنگیت کی نوید دے دیں۔

”تم نے ایسا کیوں کیا حمیرا؟“ لاہور پہنچنے پر اس کا بدلا روپ دیکھ کر حیران ہوا۔

جب تک وہ کھانا اور یجن کی ضروری چیزیں لے آیا تب تک ماسی حیکہ نے چھوٹے سے فلیٹ کی صفائی کر دی۔ وہ بھی نما کر صاف ستھرے لباس میں اجلی

اجلی سی اس کے سامنے آئینیں۔ ماسی حیدہ تھکی ہوئی تھی۔ کھانا کھا کر سو گئی تھی۔ ویسے بھی اسے انیم کھانے کی عادت تھی۔ گھوڑے بچ کر سوتی تھی۔

”یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتی ہوں حسین رضا! تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے بولی۔

”مجھے تو پتا ہی نہیں چلا! اماں نے بھائی کے لیے تمہارا رشتہ ڈال دیا، چلا تو میرے ہاتھ کٹ چکے تھے۔ میں کیا کرتا۔ مگر تم نے جو خود ساختہ پاگل پن خود پر طاری کر رکھا، کیوں خود پر ایسا عذاب مسلط کیا۔“

”محبت سے بڑی سزا اور جبر سے بڑا کوئی عذاب ہو گا۔“ وہ غائب دماغی سے بولی۔
”پھر بھی تم نے اچھا نہیں کیا۔“ وہ گہری سانس بھر کر نفی میں سہلاتے بولا۔

”تم نے اچھا کیا۔ کبھی پلٹ کر خبری ہی نہ لی، میں کن حالوں میں ہوں۔“

”میں تمہاری ازدواجی زندگی میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ میں تمہیں بھول بیٹھا تھا، صرف یہ خیال تھا اب تم اپنے شوہر کے ساتھ خوش رہو۔“

وہ اس سے نظریں چراتے بولا۔
”میری خوشیاں تو تم سے وابستہ تھیں، تمہاری دید سے منسلک۔ تم نے تو دیدار کے لیے ہی ترسا دیا۔ مجھے غصہ آتا جب تمہاری کوئی خبر نہ ملتی، تب مجھے حسین رضا سے اور نفرت ہو جاتی وہی تو جدائی کا سبب تھا۔“ وہ یک ٹک اسے دیکھتے کرب سے گویا ہوئی۔

”تمہیں کبھی بھائی پر رحم نہیں آیا؟“
”مجھے تو خود پر رحم نہیں آیا۔ حسین رضا! تو وہ جو ہماری جدائی کا محرک بنا اس پر کیسے آتا۔ مجھے تو تمہارے دچھوڑے و واقعی پاگل کر دیا۔ میں تو تمہاری تھی، پھر اس کی کیسے ہوئی۔ اسی لیے میں اس کی کبھی سن ہی نہ سکی، مرنے کا وہ بالآخر مجھ پر مسلط ہو جاتا اس کے تسلط سے آزادی کا اک یہی ذریعہ تھا۔“

پاگل پن۔

وہ وحشت سے بولتی رہی اور حسین رضا ہمدردی سے اسے دیکھتا رہا، وہ اس کی نہیں ہو کر بھی اسی کی رہی۔ اس کے دل میں اس کی قدر کچھ اور بڑھ گئی کہ وہ آج تک اس کے نام پر بیٹھی تھی۔ پہلے کی طرح پہلے جیسی۔

”تم واقعی اتنی خوب صورت ہو یا مجھے لگ رہی ہو؟“ شب عروس میں چیا حسین کے دونوں ہاتھوں کو پکڑے منتظر حسین حیران سے کہہ رہا تھا۔

”کیا اس کی وجہ بہترین ڈریس، جیوری یا میک اپ ہے۔ ہرگز نہیں مجھے تو ان پکڑوں میک اپ کا کوئی ذوق ہی نہیں، صرف یہ کہ تم میرے دل کی ملکہ ہو۔“

چیا حسین کی آنکھیں و فوراً سر سے ختم ہو گئیں۔ ”حبا! تم میری زندگی کا واحد رشتہ ہو۔ میری زندگی تم سے شروع ہو کر تم ہی پر ختم ہوتی ہے۔ تمہیں پا کے مجھے لگ رہا ہے کہ میں مکمل ہو گیا ہوں، مجھے پوری کائنات مل گئی ہے۔“

خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹتی تھی۔ ”کائنات تو میری مٹھی میں ہے۔“ وہ شرما کے مسکرائی۔

منتظر حسین نے اس کے ہاتھ میں اپنے ہاتھ کو دیکھا اور ہنس دیا۔

”میں نے محبت کی کائنات کو پایا ہے، چپ چاپ تمہیں دل میں بسایا اور قدرت نے میراں ہو کر تمہیں مجھے سونپ دیا۔“ وہ جذب سے گویا ہوئی۔

”میری پوری کوشش ہوگی کہ زندگی میں تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہ ہو۔ محبت کی کمی کا کوئی شکوہ نہ ہو۔ لوگ رشک کریں، ہم پر ہماری محبت پر ہماری ہم سفری پر، بولو وعدہ کرو ہمیشہ میرا ساتھ دوگی؟“ اس نے اس کے دونوں ہاتھ دبا کر وعدہ لیا۔

”میں تو سہلپا تمہاری چاہت ہوں۔ چیا حسین اب چیا حسین نہیں رہی۔ چیا منتظر حسین بن گئی ہے۔ میں

تو کب کی ختم ہو گئی۔ تمہاری ذات میں ڈھل گئی۔
محبت نے مجھے موم کی طرح پھلادیا ہے جس سانچے
میں ڈھالو گے ڈھل جاؤں گی۔
”میں تمہیں اپنے دل کے سانچے میں ڈھالوں گا“
تب تم میرا دل بن جاؤ گی میں تمہیں اپنی آنکھ کے
سانچے میں ڈھالوں گا تو میری نظر بن جاؤ گی۔ ”وہ کہنی
کے بل پر اڑا رہا گیا۔

”میں تمہاری رون کے سانچے میں ڈھل جاؤں گی
تو تمہارا ہونا اور وجود تمہاری ذات میں گم کر بیٹھوں
گی۔“ وہ اس کے سامنے اٹھ کر بیٹھ گیا۔
”تو پھر آؤ۔ میں تمہیں اپنی روح کے سانچے میں
ڈھال کر اپنا بنا لوں گی۔“

وہ اس کی شرارتی نظروں سے شراباگئی۔
زندگی اپنی ساری خوب صورتی، حسن، محبت کے
ساتھ اس کے پہلو میں پڑی تھی اور سہاگ رات کی
خوشبو اپنے مدھم سرول کی تان اس کے ارد گرد کھینچی
جاتی تھی۔



”کیا تم مجھ سے شادی کر سکتے ہو؟“ اخبار پڑھتے
سین رضائے چونک کر حیرانی سے اسے دیکھا۔
”جیرا۔۔۔ اپنی بات کا مطلب سمجھتی ہو؟“
”ہاں۔۔۔ سمجھتی ہوں۔“ وہ تن کر اس کے سامنے
آکھڑی ہوئی۔

”پاگل ہو تم۔“ وہ اخبار نیل پر بیٹھ کر اٹھا۔
”اس لیے ناکہ میں تمہارے بھائی کی بیوی ہوں۔
مگر میں نے کبھی اس نام و نہاد شادی کو تسلیم نہیں کیا۔
بندھن دل کا دُغ کا، روح کا نہ ہو تو دنیا کا ہر قاعدہ
قانون اس کو رد کرتا ہے۔“

وہ نظریں جھکا کر آہستگی سے گویا ہوئی۔
”تم میرے بھائی کی منگوان بیوی ہو تم نے سینکڑوں
افراد کے سامنے اس بندھن کا اقرار کیا ہے۔ اس کی
زر خرید لوٹدی نہیں ہو۔“ وہ اس کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کر مضبوط لہجے میں بولا۔

”میں نے اس نکاح کو کبھی بھی دل سے تسلیم نہیں
کیا۔ نہیں باقی معاشرے کے ان رسم و رواج کو جو
ہندو معاشرے سے آئے ہیں اور جو عورت کو موروثی
سمجھ کر کسی بھی کھونٹے سے باندھ دیتے ہیں۔ اسلام
دلی رضامندی کو اہمیت دیتا ہے جو جو جبر کے جسمانی
نکاح کو نہیں۔“

وہ ہنسی انداز میں چیخ کر بولی پھر روتے ہوئے لجاجت
سے کہنے لگی۔

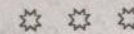
”میں طلاق لے لوں گی، پھر تو راضی ہو جاؤ گے نا؟“
اس کی آنکھوں سے پنے والے آنسوؤں نے اس
کے دل کو نرم کیا۔ وہ جیسے لہجے میں بولا۔

”دیکھو حیرا! مجھے تم سے ہمدردی بھی ہے اور محبت
بھی۔ مگر تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں کس منہ سے
بھائی کا سامنا کروں گا۔ دنیا کیا کہے گی، میں محبت پر
عزت کو قربان نہیں کر سکتا۔“

”ہم گاؤں جائیں گے ہی نہیں وہاں اپنے چھ کی
زمین بچ کر نامہ ہم اپنی دنیا الگ بنائیں گے۔“
وہ اپنی محبت کے ہاتھوں بے بس سانسے دیکھ رہا
تھا۔

”ہم اس طرح کب تک رہیں گے۔ میں تمہارے
بغیر مراؤں گی حسین رضا! مراؤں گی، یا اب خود کو
مار لوں گی۔ ختم کر دوں گی۔“ وہ روتے روتے پھر ہنسی
ہوئی۔

”خدا کے لیے حیرا! ایسی حرکت بھول کر بھی نہ
کرنا۔ ورنہ میں خود کو بھی معاف نہیں کر سکوں گا۔“
وہ اس کی جنونی طبیعت سے واقف تھا پریشان ہو کر
بولا۔



”تیا! کیا کروں۔ یہ لڑکی تو کسی بھی رشتے کے لیے
مانتی ہی نہیں، چوہہ جماعتیں پاس کر لی ہیں، پھر بھی کہتی
ہے ابھی اور پڑھنا ہے، میں ایکی جان کب تک اس
کا بوجھ ڈھونڈ رہی ہوں۔“

وہ سر پر پٹی باندھے اپنی ہمارا زور دہن کے آگے

دکھڑا روئے بیٹھ گئی۔
”بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے خورشید! مگر غلط تیری
بیٹی بھی نہیں۔“ صالحہ خاتون نے ناک کی پھنگ پر
گری عینک کو درست کرتے کہا۔

”تیا! بہت اونچا اڑنے کے خواب دیکھتی ہے۔
ڈرتی ہوں کہیں گرنے جائے۔“

”اندھ نہ کرے خورشید! کسی بد شگونی کی باتیں منہ
سے نکالتی ہو اچھا ایسا کیوں نہ کریں اک چکر گاؤں کا
لگائیں ہو سکتا ہے وہاں کوئی اچھا رشتہ مل جائے۔“

”تیا! اسے شہر کے لڑکے پسند نہیں آتے د ساتوں
پر تو خاک بھی نہیں ڈالے گی۔“ خورشید بد دل ہو کر
بولی۔

”رے بس بھی کر خورشید! دنیا بہت بدل گئی ہے۔
کیا شہر کیا گاؤں، سب آگے بڑھنے کی جستجو میں ملن
ہیں، چل رشتہ نہ سہی رشتے داروں سے ہی مل لیں
گے۔ کتنے سال ہو گئے گاؤں کا چکر نہیں لگایا۔“

”ہاں تیا! جب سے ماہم کے لیا گم ہوئے۔ دو باری
گاؤں جانا ہوا اب گاؤں میں بھی تو مزارا نہیں رہا۔ ملکوں
کا تو خاندان ہی تباہ ہو گیا۔ چھوٹے۔ چودھروں
نے تو دنگا فساد برپا کر رکھا ہے، دل ہی نہیں کرنا جانے
کو۔“

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر ماضی کی راکھ کپڑے لگی۔
”ہم کون سا ملکوں کی حویلی جائیں گے۔ وہ تو بڑی
مکانی کی موت کے بعد ہی دیران ہو گئی تھی۔ اب تو ہم
بھی ان کے کمی نہیں رہے۔ اپنی مزدوری کرتے ہیں،
کھاتے ہیں، پڑھیں تو پڑھیں، دل کھینچتا ہے، ان
کھیتوں پرانے گھروں کی جانب، جواب کھنڈر بن چکے
ہوں گے۔“ صالحہ خاتون کا دل کر رہا تھا، پر لگ جائیں تو
اڑ کر پہنچ جائیں۔

”اچھا ہے تیا! ماہم بھی دیکھ لے گی کہ اس کا
خاندان کوئی اونچے خیل والا نہیں، ملکوں کے کمی تھے
کچے کوٹھوں میں بسنے والے، ہو سکتا ہے یہ دیکھ کر
اونچے خواب آنکھوں میں بسا نا چھوڑ دے۔“ وہ دور کی
کوڑی لائیں۔

”رے چھوڑ خورشید! تیری بیٹی یہ باتیں نہیں
سمجھے گی۔“ وہ منہ پر دوپٹے کا پلور کھتے بٹنے لگیں۔



”کبھی کبھار مجھے لگتا ہے، میں کسی یونویا میں آ گیا
ہوں، جہاں سکھ ہی سکھ ہیں، محبت ہی محبت۔“

وہ مری میں بے اپنے ذاتی ہٹ کی بالکونی میں
کھڑے برف باری سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”محبت تمہاری رفاقت ہے، محبت تمہارا وجود ہے
منتظر! ایسا لگتا ہے جیسے میں تو کبھی ہی تمہاری منتظر!۔“

وہ اس کے اوور کوٹ کے کالر پر گرتی برف ہٹاتے
بولی۔ اس نے اپنے بائیں کندھے سے برف ہٹاتے
اس کے دائیں ہاتھ پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ دیا۔

”مجھے زندگی سے بہت شکایات تھیں۔ مجھے لگتا تھا
میری ذہانت کو غیبت کھا جائے گی، مگر زندگی نے مجھے اتنا
کچھ دیا کہ کبھی تو لگتا ہے جیسے خوبصورت خواب
دیکھ رہا ہوں۔ آنکھ کھلے گی تو یہ خواب ٹوٹ جائے گا۔
کیس یہ سب چھن نہ جائے۔“

”یہ خواب نہیں ہے منتظر! تمہیں دیکھ کے تو مجھے
محبت کا مفہوم سمجھ میں آیا ہے۔ میں تمہیں کبھی نہیں
چھوڑ سکتی۔“

اس کے مدھم لہجے میں محبت کی پیش تھی۔

”تمہاری محبت میری زندگی کی سب سے بڑی
حقیقت ہے۔ میں تمہارا شریک زندگی ہی نہیں
شریک محبت بھی ہوں حیا منتظر! اس کے منہ سے
سرو کی وجہ سے نکلنے والی بھاپ نے حیا کے بالوں کو
چھو، وہ کھلکھلا کر بنی۔

”اندھ چلو یہاں بہت سردی ہے۔“



”اندھ کافی تیش ہے۔ سردی کا احساس کم ہو رہا
ہے۔“ وہ آتش دان کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

وہ کافی بیٹا کر مڑی۔ اس کے چہرے پر سکون اور
مسکراہٹ دیکھ کر اندر ہی اندر اسے گہری طمانیت
محسوس ہوئی۔

”مہرین اندازہ نہیں جیا! تمہارا اطمینان اور محبت مجھے کتنی خوشی دیتا ہے۔“ کافی کے مک کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

”زندگی کتنی خوبصورت ہو گئی ہے۔“ خوشی سے حیا کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

”بالکل تمہارے وجود کی طرح۔“ اس کے شانے پر اپنا بازو محاسن کر کے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

محبت کی تپش، آگ کی تپش، وجود کی تپش آپس میں گھل مل گئی۔ خوشبو نے ان کے گرد گھیرا تنگ کر دیا۔

حسین رضا کی کام سے شہر آیا تھا۔ وہاں حمیرا کو بہتر حالت میں دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہوئی۔

حسین رضا بھائی کو یوں اچانک دیکھ کر ہکا بھکا گیا۔ ماسی حیدہ تو اپنی ماں کی بیماری کا سن کر ایک ہفتے بعد ہی چلی گئی تھی۔ اس کی ماں دو سرے گاؤں میں رہتی تھی۔ اس نے یہ بات حسین رضا کو نہیں بتائی تھی۔ حمیرا اسے دیکھ کر فوراً ”باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا یہ وہی حمیرا ہے۔“ وہ حسین رضا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”بھائی! اعلان سے کافی فائدہ ہوا ہے، ڈاکٹرز کافی پر امید ہیں۔“ اس نے جھوٹ بولا۔ حالانکہ وہ ایک بار بھی ڈاکٹر کے پاس نہیں لے کر گیا تھا۔

”بہت اچھا بھی بہت اچھا۔“ وہ خوشی سے بولا۔

”اب تو میری غویلی آباد ہو جائے گی۔“ زبیدہ کو میں نے ابھی تک ڈیرے پر ہی رکھا ہوا ہے کیونکہ غویلی مجھے آسیب زدہ لگتی ہے۔“

وہ سگریٹ کا سٹ لگاتے بولا۔

باورچی خانے میں تیج و تاب کھاتی حمیرا مجبوراً چائے بنانے لگی۔

”دل کر رہا ہے زہر ہو تو ڈال دوں حسین رضا!“ وہ وانت پیش کر رہی تھی۔

”بے مشعل کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“ کچھ چیزیں لے کر

ایک ہفتہ بعد آئے گا۔ ابھی ملی نہیں۔“

”جی بہتر بھائی! وہ سعادت مندی سے بولا۔“

”فصلوں کی کٹائی شروع ہو چکی ہے۔ واپس جانا ضروری ہے، کوشش کروں گا کہ ایک ماہ تک آ جاؤں۔“

”جی بھائی! میں خود آپ کے پاس آنے والا تھا۔“

”اچھا! اس سلسلے میں؟“ وہ صوفے پر بیٹھا ٹانگ پر ٹانگ رکھتے بولا۔

”میں اب جاب نہیں کر سکتا۔ آپ زمین میں سے میرا حصہ دے دیں، تاکہ بیج کر کوئی کاروبار شروع کر سکوں۔“

”کیا؟“ وہ سیدھا ہو گیا۔ ”تم آبائی زمین بیج دو گے؟“ اس نے حیرت و استعجاب سے استفسار کیا۔

”جی بھائی! نہ میں گاؤں میں رہ سکتا ہوں، نہ ہی زمین پر کام کر سکتا ہوں۔“

”حسین رضا! میں تمہیں ملکوں کی سات پشتوں پر داغ لگانے کی اجازت بھی نہیں دوں گا۔ اگر پیچھے تو وہ بھی میں خریدوں گا۔“ جتنی فیصلہ کر کے بولا۔

”ٹھیک ہے بھائی!“ مجھے تو اپنے حصے کی رقم ہی چاہیے، آپ لے لیں تو زیادہ بہتر ہے۔“ وہ کہہ کر مسکرایا۔

”اچھا ہے، اپنی زمین اپنے گھر ہی رہے گی۔ ارے بھی یہ چائے کمال رہ گئی، پھر اس نے فوراً“

لہجے کو سنبھالا۔ ”حمیرا بھائی اچھے لے آئیں تاکہ بھائی کو یقین آجائے کہ ان کی بیوی ٹھیک ہو رہی ہے۔“

اس نے ہنس کر باورچی کی طرف دیکھا۔ وہاں سے چائے کی ٹرے اٹھائے، حمیرا کی لال بھبھو کا آنکھیں دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر حسین رضا نے ناامیدی سے سر نوٹھی میں جنبش دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ ابھی تک ملل ٹھیک نہیں ہے۔

سیالکوٹ سے بس میں بیٹھ کر راجن پور کے سارے راستے وہ بوری ہوئی رہی۔ وہ رہ کر خالہ اور لالہاں پر

غصہ آ رہا تھا، جن کو سالوں بعد اپنا گاؤں یاد آیا اور اسے زبردستی لے کر آئی تھیں، یہ بھانہ بنا کر کہہ جو ان جہان لڑکی کو پیچھے گھر میں اکیلا کیسے چھوڑ جائیں۔

”کھن سے چور وہ راجن پور کے بس اسٹاپ پر گاؤں جانے والے کسی رکشے کی تلاش تھیں۔“

”مہرین اور سفر کرنا ہے؟“ وہ غصے سے بڑبڑائی۔

”اے بیٹا! اب بس بھی کر سارا راستہ منہ پھلائے بیٹھی رہی۔ اب تو صرف آٹھ گھنٹے کا راستہ ہے اے بے! وہ بھی دن تھے، جب ہم یہ راستہ پیدل طے کر کے اس روڈ پر آتے تھے، پھر کہیں جانے کو بس ملتی تھی۔“ صالحہ خاتون اسے نصیحت کرتے پرانے دور کی یاد کو تازہ کرنے لگیں۔

”لو مل گیا رکشا۔“ خالو لیا کر رکشے میں آگے بیٹھے دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی۔

رات کے چھوٹے چھوٹے نیلیوں بعد سبز چھوٹے چھوٹے ٹھٹھ دیکھ کر اسے یکدم خوشی کا احساس ہوا۔ شرکی آلودگی سے پہلی بار نکل کر وہ گاؤں کو دیکھ رہی تھی۔ انہیں دیکھ کے کچھ کھوں سے نکلنے والی عورتوں کا اک غول ان کے گرد جمع ہو گیا۔

اس کی ماں اور خالہ ہنس ہنس کر ان سے گلے مل رہی تھیں، جبکہ وہ تھوڑی دھچپی سے حیران ہو کر ان ملنے والیوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو گلے ملتے ہی میل ملاپ نہ رکھنے کے کئی شکوے لے بیٹھی تھیں۔

”ارے خالہ خورشید! یہ تیری بیٹی ہے کیا؟“ اک صحت مند لڑکی پر اندہ بھلاتے ہوئے بولی۔

”ہاں یہ میری بیٹی ہے۔ پوری سولہ جماعتیں پاس کی ہیں۔“ وہ فخر سے بتانے لگی۔

”اچھا تو نوکری نہیں کرتی؟“ استفسار ہوا۔

”ارے نوکریاں کہاں ملتی ہیں۔ آج کل اتنی آسانی سے۔“ ماپوسی اس کے لہجے سے ظاہر تھی۔

”ماسی! تو بول چھوٹا نہ کر میری ماں! آج کل گاؤں آئی ہوئی ہے، میں اس سے تیری بیٹی کی نوکری کی بات کروں گی۔“ بڑے پن سے دلاسا دیا۔ ماہم کی توجہ

فوری طور پر اس پر گئی۔

”میرا نام نہ نہا ہے۔“ وہ خود ہی اپنا تعارف کرانے لگی۔

”کبھی کبھی میں سوچتی ہوں، محبت آخر ہے کیا چیز۔ دو اجنبی انسانوں کے بیچ اگر قیام کر لے تو ساری دوری پاٹ دے۔ ساری اجنبیت کو ختم کر دے نیست و نابود کر دے اور دو انسانوں کو یوں یکجا کرے کہ دونوں کی ساری حدیں ہی ختم ہو جائیں۔“

وہ استعجاب سے بولی رہی۔ وہ محبت سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ اتنے قریب بیٹھے تھے جیسے ہاتھ کی دو انگلیاں۔ بھورین ہوٹل کے اک خوبصورت کمرے میں وہ اپنی بیوی کو معصومیت سے بولتے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا، اک عجیب سرشاری و محبت تھی، جو وجود سے لپٹ کر بہنی مون کو حسین سے حسین تر بنا رہی تھی۔ ایک طرف جلتے بیٹری گرمی کو ان کے تنس کی گرمی ملت دے رہی تھی۔

”تیرا محبت میں بھیگتا، جو محبت ہے۔“

تیرے نازک سراپے کی اٹھان محبت ہے۔

تیرے بالوں کی درازی محبت ہے۔

تیری آنکھوں کا شمار محبت ہے۔

تیرے ہونٹوں کی لالی محبت ہے۔“

وہ کھکھلا کر ہنسی۔

”تیری یہ خوبصورت ہنسی، جو راہ چلتوں کو بھی دم سا دھ کر رکھنے پر مجبور کر دے، یہ ہنسی محبت ہے۔“

”اچھا بس!“ وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔

”اب بتا چلا محبت کیا ہے؟“ وہ اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھتے بولا۔

”ہاں۔ میری آنکھوں میں بیٹھا منتظر حسین محبت ہے۔“

”اور میری آنکھوں میں بیٹھی حیا حسین محبت ہے۔“

احتیاط کرتے کرتے وہ دونوں تنگ آچکے تھے۔ وہ پہلے والی بے باکی نہیں دکھا سکتی تھی۔ اور وہ پہلے والی بے تکلفی سے پکارتے پکارتے رک جاتا۔ آگ تو بخشل دوسری حمیدہ جو چند دن پہلے آگئی تھی۔ حمیدہ کو چھوٹا فلیٹ کھانے کو دوڑتا۔ بخشل کو شرکا دھواں نہ بھاتا۔

”چھوٹے ملک جی! نہ باہر سکون ملتا ہے نہ ہی گھر میں باہر شور دھواں اندر دم گھٹنے لگتا ہے۔“ وہ دوپہر کو آکر ان کی ایسی ہی باتیں سننے پر مجبور تھا۔ گھر کے کاموں سے حمیدہ نے دانستہ ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ بخشل سارے کام کرنا اور دوپہر کا کھانا وہ لے آتا۔ رات کا بخشل اور حمیدہ مل کر بناتے۔

”چھوٹے ملک جی! آپ روزانہ باہر کا کھانا لے آتے ہیں۔“

”کیا کروں بخشل مجبوری ہے۔“ وہ معنی خیزی سے حمیدہ کو دیکھتے بولا، جو پرانے حلیے میں آگئی تھی۔ نہ بالوں میں گنگناہٹ نہ کپڑے بدلتے۔

”میری بات مائیں تو اب شادی کر لیں۔ کب تک یہ بازار کی کھانا کھاتے رہیں گے۔“

”بس کیا کروں۔ کوئی لڑکی ہی پسند نہیں آتی جس سے شادی کروں۔“ اس نے ہنس کر حمیدہ کو دیکھا۔ جس نے اسے نظر بچا کر آنکھیں دکھائی تھیں۔ حمیدہ سخت چڑی ہوئی تھی کہ بخشل کیوں یہاں رہ رہا تھا۔ کھل کر بات کرنے کا موقع بھی نہ ملتا۔ مجبوراً وہ بھی رات کے پچھلے پہر جا کر حسین رضا کا پاؤں ہلا کر اسے جگاتی، پھر اپنے غصے کا اظہار کرتی کہ ان دونوں کو فوراً روانہ کر دو گاؤں۔

وہ ڈر کر اسے آہستہ بولنے کو کہتا۔ وہ اور بگڑتی۔

”تھوڑا صبر کرو۔ زمین کا حساب کتاب لے لوں تو جان چھڑاؤں گا سب سے۔ اپنی بھی اور تمہاری بھی۔“ وہ اسے دلا سڑیتا۔

ایسی ہی ایک رات بخشل نے ان کو کھسپہ پر کرتے دیکھ لیا۔

یہ تو بالکل حیران کن ہی نہیں لگ رہی تھی۔ سلیقے سے تیار کیا بیٹا، نری سے بات کرتی حسین رضا کو محبت سے تھی۔

بخشل کی تو آنکھیں اٹنے کو تھیں۔ تو یہ قصہ ہے، صبح سارے منہ پر پاؤڑ سرخی مل کر پاگل پن کے دورے کا صرف ڈراما ہے۔ کھڑکی کے سرے سے پردے کو دیکھ کر وہ سرعت سے اٹھا۔ ڈراما نگ روم میں داخل ہوتے بخشل کی پیٹھ کو دیکھ کر وہ ڈر گیا۔

”آج ہم پکڑے گئے۔“ اس نے حمیدہ کو خوف زدہ لہجے میں بتایا۔

وہ کافی سالوں بعد اپنے آبائی گاؤں گھومنے آئی تھی پوری فیملی سمیت۔ وہیں زلخا سے اس کی دوستی ہوئی۔ زلخا ان کے پرانے نوکر کی بیٹی تھی۔ زلخا کی دلچسپ باتیں ان کو کبھی بھرناسی تھیں۔ وہی زلخا اک صبح آئی تو اپنے ساتھ اک نازک و خوبصورت سی لڑکی کو لے آئی۔

”مہرین بی بی! یہ ہماری خورشید خالہ کی بیٹی ہے۔ بہت بڑھی لکھی ہے اس کو ناں نہیں نوکری دلا دیں۔“ اس نے منت بھرے لہجے پر وہ مسکرائے بنانہ رہ سکی۔

”چھا کتنا پر بھا ہے۔“

”جی ایم اے فاسل کی تیاری ہے۔“ وہ اعتماد سے بولی۔

”بیٹھو کھڑی کیوں ہو؟“

وہ اس کے سامنے بیٹھ کر سی رہ بیٹھ گئی۔

”اوہو! زمین پر چھیڑ زلخا نے اس کی اس حرکت پر دو پٹا منہ پر رکھا۔

مہرین نے کافی دلچسپی سے ان دونوں کو دیکھا، علم و شعور نے اسے ان کے برابر کر دیا جو کئی کمین کھلاتے۔ اس کی تربیت کراچی کے ماحول میں ہوئی تھی اسے یہ بات بری نہ لگی۔

شام تک ان کے بیچ بے تکلفی بڑھ کر دوستی کی بنچ بچ چلی تھی۔

مہرین نے موبائل نمبر کا تبادلہ کرتے اسے یقین دلایا کہ وہ اپنی کزن حیا کی گارمنٹ فیکٹری میں اس کے لیے جاب کی کوشش کرے گی۔

اس کی آنکھوں پر بندھی پٹی نے موت کے خوف کو اور برصا دیا تھا، وہ ایسا قیدی تھا جو پچاسی گھاٹ جا رہا تھا جس کا جرم صرف اک بے یار و مددگار بھانجے کو پال پوس کر خوان کرنا تھا۔

پھر بھی اسے یہ رنج کھائے جا رہا تھا کہ مختصر کو اس نے آخری بار نہیں دیکھا۔

”کاش!“ وہ بڑبڑایا۔ ”میرے جنازے کو مختصر کا کاندھا نصیب ہوتا۔“

”فکر نہ کر حمیدہ تو عمر قید تو ضرور کالے گا پر موت کا مزا ادھر ہرگز نہیں۔“ پملوان ہنسا۔

”تیرے بڑے صاحب کا کیا بھروسہ پملوان جی! وہ تو سانپ ہے، تنگ رشتوں کو ڈس جانے والا، میں تو اک غریب مسکین آوی ہوں۔“

”ہاں بھی ٹھیک کہتے ہو۔ غریبی اور مسکینی سے بڑی بد نصیبی آج کل کوئی نہیں ڈرنے میں بھی نہیں یہاں نہ ملتا۔“ پملوان نے ہاں میں ہاں ملائی۔

”لگتا ہے رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔“ گاڑی کے اندر بڑھتی سردی کو محسوس کرتے گویا ہوا۔

”ہاں بھی حمیدہ! صبح کے لگ بھگ ہم بھی اپنی منزل پر پہنچ چکی جا میں گے۔“

بانی رات وہ گاڑی میں پملوان کے خراٹوں کی آواز سنتا رہا اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے، ہلنے چلنے کی مجال نہ تھی ورنہ ایسا پملوان جو فینڈ کار سیا ہو، کے قبضے سے جان چھڑا کر چلتی گاڑی سے چھلانگ لگانا کون سا مشکل کام تھا۔

رہ رہ کر کے ڈراموں کی کھانی یا سگریٹ کا دھواں اسے کسی تیرے فرد کی موجودگی کا پتا دیتا تھا۔

کتنے ہنس خندانوں پر بھی آجاتی ہے مگر اس رات وہ چاہنے کے باوجود سو نہیں پایا کہ موت کا خوف سر پر

سوار تھا۔

وہ گاڑی سے اترا، کچی زمین پر پاؤں پڑے گاڑی کے جانے کی آواز دور ہوئی۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو صبح کی پھیلتی روشنی میں آنکھیں چندھیا گئیں، جب کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”بخشل۔ تو یہاں۔“

”پتا ہے میری مرحومہ ماں مینے میں دوبار میرے لیے شامی کباب بنائی تھی۔“ وہ جذب سے اس کا ہاتھ پکڑتے بولا۔

”دوبار کیوں زیادہ کیوں نہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”ہماری حیثیت ایسی نہیں تھی کہ وہ روز میرے لیے گوشت لے سکتیں۔“ وہ لب بچ کر بولا۔

اسے اپنے بے ساختہ سوال کے بے ڈھنگے پن کا شدید احساس ہوا، خفت مٹانے کو وہ مرکز کینٹ کھنگالنے لگی۔

”ماموں جو پیسے روزانہ کے خرچے کے دیتے، اس سے چند روپے بچا کے رکھتیں، جب آوا کلو گوشت کے پیسے جمع ہو جاتے پھر شامی کباب یا بریانی بناتی۔“ وہ گزری یادوں کو کھنگالتے بولا۔

”دل کرتا ہے مختصر حسین! میں تمہاری ساری محرومیوں کا ازالہ کر دوں۔“ وہ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھوں میں جھانکتے محبت سے بولی۔

”تم ہونا میری محرومیوں کا ازالہ۔“ اس کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا کر لبوں پر رکھا۔ ”تمہیں یا کر تو یہ گلے تک نہیں ہوتا کہ زندگی میں اتنی مشکلات بھی تھیں۔ اگر تمہیں بھی تو وہ تمہارے وجود محبت کی اک جنبش سے ختم ہو گئیں۔“ اس کے لہجے میں جھانکتی خوشی نے اس کو سر پٹا سرشار کر دیا۔

”اور میرے وجود کو مکمل کرنے والے تم ہو اس سے پہلے میں ادھر و ادھر لیے بے گل پھرتی تھی، نہیں پا کر لگا دل اک کائنات بن گیا ہے۔“

ہوں، مگر پھر تمہارا وجود مجھے یہ یقین دلاتا ہے اپنی خوش نصیبی کا۔ میں خدا کا شکر بجالا کر اپنی تقدیر پر نازاں ہونے لگتا ہوں۔

”ذرا یہ شامی کباب میسٹ کرو تو اور زیادہ یقین آجائے گا۔“ مسکرا کے اس نے شامی کباب اس کے منہ میں رکھا۔

”اور وہ بھی تمہارے ان نفیس ہاتھوں کا بنا ہوا۔ زبردست یا۔ ایمان سے تم اگر زہر بھی گھول دو گی تو اس میں بھی ذائقہ آجائے گا۔“ وہ اسے گدگداتے بولا۔

”اف! کیا کر رہے ہو۔“ وہ گہرا کر پٹی۔ اس کی شرارت پر کھلکھلا کر ہنسی۔

باورچی خانے سے آتے تمقوں پر حسین رضائے مطہر ہوں کر پوی کو دیکھا۔

”بہت خوش ہوں ان کو خوش دیکھ کر۔“

”اللہ دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔“ حمیرا نے دل سے دعا کی۔

”تین! ارے بھی ہمیں بھی شامی کباب ملیں گے یا صرف اپنے میاں جی کو کھلاؤ گی؟“ حسین رضا ڈانٹنگ ٹینل برتیختے ہوئے بولے۔

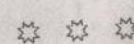
”انکل! آپ کو میں کھلاؤں گا۔“ منتظر نے کرشل ٹرے ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں بھی ہماری بیٹی تو اب صرف تمہیں ہی کھلائے گی، ہمیں تو بھول گئی۔“ حمیرا نے ہنستے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

”کوئی بات نہیں آپ لوگوں کا خیال رکھنے کو منتظر ہے ناں؟“ وہ بچن سے آتے شاشت سے بولی۔

”جی بندہ حاضر ہے۔“ منتظر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے کہا۔

وہ محبت سے اسے دیکھتے مسکرائی اور اس کی پلیٹ میں بریانی نکالنے لگی۔



”جی بھائی! تو پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا، زمین میں

سے لٹا کر میرا اسے گا؟“ ڈیرھ ماہ بعد حسین رضا کے آنے پر چائے کا کپ سامنے رکھتے اس نے استفسار کیا۔

”پانچ سو ایکٹر کے پیسے تجھے مل جائیں گے۔“ وہ چائے کا گھونٹ لیتے بولا۔

”پانچ سو ایکٹر بھائی! باقی زمین آپ بیچنے نہیں دیں گے کیا؟“ وہ مسکرایا۔

”باقی زمین کا کیا مطلب۔ تمہارے حصے کے بننے ہی پانچ سو ایکٹر ہیں۔“ اس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں۔

”کیا مطلب بھائی۔ چار ہزار ایکٹر میں سے صرف پانچ سو میرے حصے کے کیسے بنتے ہیں۔ جبکہ وارث صرف ہم دو بھائی ہیں۔“ وہ حیرانی سے گویا ہوا۔

”دیکھ حسین! جو زمین ابائی تھی وہ انہوں نے بیچ کھائی۔ ابائے شوق تو تم جانتے ہی ہو۔ بیشہ اماں کی زبانی ذکر سنتے آئے کہ جائیداد کا بیشتر حصہ انہوں نے عیاشیوں کے پیچھے لٹا دیا، باقی زمین میں نے اپنی محنت سے خریدی ہے۔“ وہ سگریٹ کا کش لگاتے بولا۔

”مگر بھائی اگر خریدی بھی ہے تو کس سے؟ اسی زمین سے کمار یا اماں کی جمع پونجی سے تو اس میں بھی میں برابر کا حصہ دار ہوں۔“ وہ بددل ہوا۔

”دیکھ حسین! ساری محنت میں نے کی ہے۔ پانچ سو ایکٹر کے پیسے لیتا ہے تو لے ورنہ یہ لے اپنی زمین کے کاغذات خود کر کمالی سے جائیداد بنا وارث بنانا تو بہت آسان ہے۔ مگر محنت کرنا بہت مشکل۔“ وہ طنز پر بولا۔

”بھائی! اگر میرا کاروبار پانچ سو ایکٹر کے پیسوں سے اشارت ہوتا تو میں آپ کو کچھ نہ کتا، مجھے تو اس سے آدھی رقم زیادہ چاہیے ٹیکسٹائل مل لگانے میں۔“ اس نے مصلحت سے کام لیا۔

”اب تو جو لاہوں والا کام کرے گا کیا ہو گیا ہے حسین رضا! اس سے تو بہتر ہے ملک بن کر اپنی آبائی زمین آباد کر۔“ اس کے چہرے پر غصے سے زیادہ نخوت کے آثار نمایاں تھے۔

”بھائی! میری سالوں کی پڑھائی تو اکارت جائے گی

اور ویسے بھی لڑکپن سے شہر کے ماحول میں رہا ہوں اب دیہات میں نہیں رہ سکتا۔“ اس کے چہرے پر تناؤ آگیا۔

”تمہاری مرضی ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”یہ بخشش کہاں چلا گیا؟“

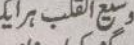
”اسے میں نے سووا سلف لانے کے لیے بھیجا ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں اسلام آباد جا رہا ہوں، ہفتہ لگ جائے گا۔“

”بھائی! کھانا تو کھا کر جاتے۔“ وہ اٹھ کر مصافحہ کرتے بولا۔

”نہیں کھانا میں اپنے دوست کے ہاں کھاؤں گا۔“

”اچھا ٹھیک ہے اللہ حافظ۔“



”کراچی جو کبھی کولاجی ہوتا تھا، مای گیروں کا اک چھوٹا سا قصبہ ارتقائی منزلوں سے گزر کر اک عالمی بندرگاہ بن کر بہت وسیع القلب ہر ایک کی پناہ گاہ بن چکا تھا، مای جزیرے گزر کر اپنے اندر ریڈ امپنی چھپانے کے باوجود آج تک اس کی کشش برقرار تھی۔

وہ کراچی جس کی سڑکیں کبھی روز دھوٹی جاتیں، ایسے دن بھی دیکھ چکا ہے جن میں اس کی سڑکیں خون سے نہلائی گئیں۔ ایسا خون آلود کراچی بھی پاکستان کی ہر قومیت کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ آج تک پناہ دیتا ہے، ہم بھی کراچی آئے تو کراچی ہی کے ہو کے رہ گئے۔“ مہرین نے اسے اپنے والدین کے ماضی کے بارے میں بتایا۔

وہ مہرین کے لان میں بیٹھی کراچی کی تاریخ دلچسپی سے سنتی رہی۔

”اس کی دہائی کے بعد یہاں صنعت کی تباہی شروع ہوئی، دہشت گردی بعد میں بھتہ خوری نے رہی سہی کسر نکال دی۔ آہستہ آہستہ یہاں سے ٹیکسٹائل انڈسٹری فیصل آباد منتقل ہو گئی، مگر آج بھی بیشتر ہیڈ آفسز کراچی میں ہی ہیں۔ اس شہر میں سب

کچھ ہے جس اک امن کی کمی ہے۔“ کراچی کے حالات پورے ملک کے لوگوں کو رنجیدہ رکھتے ہیں۔

ماہم نے گہری سانس بھری۔

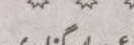
”ہم نے بھی اپنی ٹیکسٹائل ملیں جا کر فیصل آباد لگائیں۔ اب انکل حسین نے حیا کے نام گارمنٹ فیکٹری لگائی ہے، میں نے حیا سے بات کر لی ہے، تم کل جانا، وہاں منتظر تمہیں کہیں نہ کہیں ایڈجسٹ کر لے گا۔“

ملازم شام کی چائے کے ساتھ پکوڑے اور نمکور کھ گیا تھا۔

”تھینک یو مہرین! میں آپ ہی کی دوستی اور دلا سے پر سیا لکھتے ہیں یہاں تک چلی آئی ہوں۔“

وہ پکوڑوں سے لطف اندوز ہوتے شکر سے بولی۔

”ہاں بھی اب دوستی کی ہے تو نبھائیں گے بھی، چلو میں آج تمہیں کراچی کا سمندر دکھاؤں۔“



”تو تم نے ساری عمر یہاں گزار دی۔“ حمید دکھ سے بولا۔

”ہاں زندہ رہنے کا اک ہی چارہ تھا۔“ بخشش کے لہجے میں یاسیت تھی۔

”بھی بیوی بیٹی یاد نہیں آئیں؟“ حمید نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھا۔

”بہت۔ جی کرتا ہے یہاں سے بھاگ جاؤں۔ ان کو جا کر دیکھوں، ملوں، لہجہ لہجہ سوچتا ہوں اب بیٹی اتنی بڑی ہو گئی، اب یہ کر رہی ہوگی۔ وہ کر رہی ہوں، پڑھ رہی ہوگی۔“

”پھر بھاگے کیوں نہیں؟“

”اگر میں بھاگ جاتا تو میرے بیچ جانے سے پہلے انہیں قتل کر دیا جاتا۔“ اس کے چہرے پر اذیت تھی۔

”سوچتا گیا ہوا جو دور ہوں انہیں دیکھ نہیں پاتا مگر وہ بحفاظت خوش تو ہیں۔ ملک بہت ظالم ہے۔“ وہ نفرت سے بولا۔

ہیں۔ انسان کو انسانیت کے درجے سے کرانے والی بندہ پھر بندہ نہیں رہتا، خود کو خدا سمجھنے لگتا ہے۔
 ”نعمو یا اللہ!“ وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ بخشل کے چہرے پر طنز یہ مسکراہٹ آئی۔
 ”جب زندگی اور موت کے فیصلے بندہ اپنے ہاتھ میں لے لے تو بندہ بندہ نہیں رہتا، شیطان بن جاتا ہے۔ اللہ پاک بھی نہ کبھی تو ایسے ابلہوں کی رسی کھینچتا ہے، آخر موت تو انہیں بھی آتی ہے۔“
 حمید نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔
 ”اچھا حمید! میں ذرا ہل چکی ہوں اگلا آؤں۔“
 ”میں تمہارے ساتھ نہیں نکل سکتا؟“
 ”آج پہلوان سے پوچھتا ہوں۔ اگر اجازت دے دی تو کل تم بھی ساتھ چلنا۔“
 حمید کھڑکی کی سلاخوں سے اس کو باہر جاتے دیکھتا رہا، وہ چند فلائنگ دور پڑی چارپائی پر بیٹھا پہلوان سے بات کر رہا تھا۔
 ”پہلوان جی! حمید کی قید کب ختم ہوگی!“
 ”اے بخشل تو درویش آدمی ہے۔ قاتل بھروسہ۔ کبھی بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ حمید پر ابھی اعتبار نہیں۔ کچھ عرصہ گزرے پھر دیکھیں گے۔“
 ”مجھے تو آج تک یہ پتا نہیں کہ یہ گاؤں کس تحصیل میں آتا ہے، کبھی کسی سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، جب عمر ایسے ہی گزارنی ہے تو پھر کیا فائدہ۔“ وہ گہری سانس بھرتے ہوا۔
 ”ہاں۔ ہاں تب ہی تو تم پر اعتماد ہے۔“ بخشل جا کر برگد کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔

وہ اس کی شرٹ پر استری کر رہی تھی۔ منتظر گاؤں پہنچنے بال تو لیے سے پوچھتا اس کی پاس آیا۔
 ”اے ملازم ہوئے ہوئے خود کام کیوں کرتی ہو۔“
 ”منتظر! تمہارے کام کر کے مجھے خوش ہوتی ہے۔“
 مڑ کر آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے ہنس کر تویہ اس کے شانوں پر رکھا۔ اور شرٹ اس کے ہاتھوں سے

لے لی۔
 اس تو لیے میں اس کے محبوب کا لمس تھا۔ خوشبو تھی۔ وہ اک جذب کے عالم میں اسے سو گھٹنے لگی۔ منہ پر پھیرنے لگی۔ منتظر نے لف لف کنکس لگاتے اسے دیکھا۔
 ”میں تمہارے پاس ہوں، بہت قریب، دسترس میں، پھر انے جان چیزوں سے کیوں محبت کرتی ہو؟“
 ”اس میں تمہاری خوشبو ہے، یہ تویہ بڑا معطر لگتا ہے۔“
 ”یہی تو کہہ رہا ہوں جان! مجھ سے محبت کرو، میری پرچھائیوں سے نہیں۔“ وہ اسے شانے سے پکڑ کر قریب کرتے ہوا۔
 ”تم سے محبت کی وجہ سے ہی تو تمہاری ہر بات ہر چیز سے محبت ہے۔“ منتظر یہ گہری اس کی آنکھوں میں محبت روشنی بن کر چمکی۔
 منتظر نے فوراً مرت سے لب بھینچ کر آنکھیں موندیں۔ گہری سانس محبت بن کر اس کے چہرے سے نکل گئی۔
 ”اتنی محبت۔ میں پاگل ہو جاؤں گا حیا!“ وہ ٹھہر ٹھہر کے بولا۔ اس کے گچے میں پیاسے مسافر کی خشکن تھی جو پانی پائے سیراب ہو۔
 ”دروازہ دھک دھک ہوئی۔“
 ”بیگم صاحبہ اور صاحبہ جی آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔“
 ان دونوں کوناشے کی ٹیبل پر آتے دیکھ کر وہ دونوں مسکرائے۔
 ”بیٹا! حیا کے ساتھ تمہیں خوش دیکھ کر میری رگوں میں زندگی دوڑ جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے سارے گناہوں کا کفارہ ادا ہو گیا ہو۔“ وہ ان کے چروں پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے۔
 ”اور میں بھی اللہ لا لاکھ لا لاکھ شکر ادا کرتی ہوں جس نے میری بیٹی کی زندگی خوشیوں سے بھر دی ہے۔“
 حمیرا نے چائے کپ میں ڈالتے محبت سے دیکھا۔
 ”ہم دونوں اور ہماری زندگی آپ کے گناہوں کا

کفارہ نہیں، نیکیوں کا صلہ ہے بیٹا جان!“ حیا کے چہرے پر والدین کے لیے محبت ہی محبت تھی۔
 ”صحیح انکل! آپ لوگ تو فرشتہ صفت ہیں، اس بات کو مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے۔ ہر ماہ مخصوص رقم کے چیک مختلف فلا جی اداروں کو میں ہی ارسال کرتا ہوں۔“
 منتظر چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔
 ”ارے نہیں بیٹا! ہم تو گناہ گار ہیں۔ بس اللہ نے کچھ نیک کام کرنے کی توفیق دی ہے۔ ان میں سے ایک نیکی تم بھی ہو۔“ وہ بہت گہرے گچے میں بولے۔
 ”اور میں سمجھتا ہوں، میرے ماں باپ کی پتا نہیں کون سی نیکی ہے جو مجھے اتنی محبتیں ملی ہیں۔ کیوں آئی! اٹھک کہہ رہا ہوں نا؟“ اس نے تھوڑی خاموشی تھوڑی تم صم حمیرا کو مخاطب کیا۔
 ”ہوں۔ ہاں۔ ہاں!“ وہ اچانک اس سوال پر بوکھلا گئیں۔
 ان دونوں نے اپنے بزرگوں کو دیکھ کر محبت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”ہائے۔ چار ہزار ایکڑ میں صرف پانچ سو ایکڑ دے رہا ہے تمہیں۔ دیکھا حسین! تمہارا بھائی دعا کر رہا ہے تمہارے ساتھ۔ میں کتنی تھی نا جیسا تم اسے سمجھتے ہو، ویسا نہیں وہ۔“ اس نے لوہا گرم دیکھ کر ہتھوڑا رسید کیا۔
 ”مجھے خود یقین نہیں آتا، بھائی میرے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں۔“ وہ ناسف سے گویا ہوا۔
 ”تم تو ہو ہی بھولے۔ محبت کی پٹی اتار کر دیکھو تو تمہیں حسین رضا کی اصل صورت نظر آئے۔“ وہ نفرت سے بولی۔ ”پہلے تمہاری محبت پر قبضہ کیا، اب ملکیت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔“
 حسین رضائے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی خاموشی تیار ہی تھی کہ وہ منتظر تھا اس کی بات سے۔
 وہ زبیدہ کو بخشل کے ساتھ اسپتال میں چھوڑ کر

ایسا ماکہ تنہائی میں حمیرا سے صلح و مشورہ کر سکے۔ اس رات کے بعد وہ کافی محتاط ہو گئے تھے۔ حسین رضا کے آنے میں اک دن تھا۔ وہ زبیدہ کو جانے سے پہلے لیڈی ڈاکٹر کو اک بار دیکھانے کا مشورہ دے کر تھرا ہونا چاہتا تھا۔

جب سے حسین رضا گیا تھا۔ غصے کا لاوا ابل رہا تھا اس کے اندر۔ رہ رہ کر اسے غصہ آرہا تھا کہ وہ اتنے سال اپنا حق وصول کرنے کیوں نہ گیا۔ جائیداد کا فیصلہ ماں کی زندگی میں کیوں نہ کر لیا۔
 حمیرا نے بغور اس کی پیشانی پر شکنوں کے جال کو دیکھا۔
 ”دیکھو حسین، تمہارا بھائی دھوکے باز اور جھوٹا ہے۔ میں نے خود پھوپھی کو کتے سنا تھا کہ حسین کے حصہ کی زمین دو ہزار ایکڑ ہے اب وہ صرف پانچ سو پر تمہیں ترخا رہا ہے۔“
 مسلسل ضربوں پر لوہا نرم ہو رہا تھا۔

”میں سمجھتا تھا میرا بڑا بھائی جائیداد کو محنت محبت سے سنبھال بھی رہا ہے اور پھینچا بھی رہا ہے۔“
 ”وغلطی تو تمہاری ہی تھی، تم ہی کور چشم نکلے۔ اعتبار کے اندھے پن کا شکار۔ تم نے محبت و ملکیت دونوں کی خبر نہ رکھ کر خود پر ظلم کیا اور بے خبری میں مارے گئے۔“ وہ اس کے مضبوط گچے پر اسے دیکھتا رہ گیا۔

”میں کیا کرتا۔ تم میرے بھائی کی بیوی تھیں۔ یہ میری مجبوری اور بے بسی ہی تھی جس نے مجھے گاؤں آنے سے روکا۔ میں جائیداد وغیرہ کے معاملات کو بھی نہ دیکھ پایا۔ فرار کی راہ اختیار کی خود سے، تم سے حالات سے۔“ وہ دکھ سے گویا ہوا۔

”میں اس کی تھی ہی نہیں۔ رشتہ وہ ہوتا ہے جو انسان قبول کر لے، میرے دل، روح، ذہن، عقل نے اسے شروع دن سے ہی تسلیم نہیں کیا۔ تم بغاوت تو کرتے۔ میں ہر حال میں تمہارا ساتھ دیتی۔ میں کل بھی تمہاری تھی اور آج بھی تمہاری ہوں۔ میں کبھی بھی حسین کے ساتھ نہیں جاؤں گی اگر کسی نے ایسی

کوشش کی تو ماروں گی اسے بھی اور خود کو بھی۔ اس کا حتمی لہجہ اسے سوچنے پر مجبور کر گیا۔
”میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔“ وہ بے تاب ہوا۔ حیرانہ سا خند مسکرائی۔

”ہاں ہمارا ملاپ تو ہو کے ہی رہے گا، مگر فی الحال یہ سوچنا ہے کہ جائیداد میں پورا حصہ کیسے وصول کیا جائے۔“ وہ پرسوج انداز میں گویا ہوئی۔
”ہاں بہت سوچا ہے، مگر کوئی حل سمجھ میں نہیں آیا۔“ وہ پیشانی ملنے لگا۔

”حل تو ہے میرے ذہن میں بس تم راضی ہو جاؤ تو سارے مسئلے ختم ساری پریشانیں دور۔“ وہ پراسرار انداز میں بولی۔ حسین رضائے بغور اسے دیکھا۔
”کون سا حل؟“

”تم میرے منصوبے کے تحت عمل کرتے رہو، کوئی سوال نہ پوچھو۔“

اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر حسین نے لب بھیج کر بھنوس سیٹھرتے اسے دیکھا۔
”وعدہ؟“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔

وہ چند ٹانگیں خاموش رہا پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”ہاں پکا وعدہ اک مروگا۔“

وہ فائل کھولے بیرون ملک سے آنے والے مختلف آرڈرز کا معائنہ کر رہا تھا جب حیا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔
”متفقہ باقاس ہو؟“

”تمہارے لیے تو ہر مصروفیت چھوڑ سکتا ہوں۔“ اس نے فائل بند کر کے اسے دیکھا۔ وہ سامنے کھڑی لڑکی کی طرف متوجہ تھی۔

”یہ میری نئی سیکریٹری ہیں مس ماہم! جس کی تم نے سفارش کی تھی۔“ وہ اٹھتے ہوئے مسکرایا۔
”اچھا جس کے لیے مہینے کا تھا۔“

”ہاں اور“ مس ماہم! یہ میری وائف ہیں۔ حیا منتظر حسین۔“ اس نے تعارف کرایا۔

”جی السلام علیکم۔“ وہ سر کو جنبش دیتے ہوئے۔
”وعلیکم السلام!“ اس نے ہنستے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ”بھی جلدی میں ہوں ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔“

”جی جی ضرور۔ ضرور۔“ وہ حیا کے دوستانہ انداز پر اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے۔
”رانی سیکریٹری کو فارغ کر دیا؟“ گاڑی میں بیٹھے انتظار کیا۔

”نہیں وہ پریگنٹسی کی وجہ سے چار ماہ کی چھٹی پر ہے وہ آئے گی تو میں ماہم کو نہیں اور ایڈجسٹ کر لوں گا۔ فی الحال تو تمہارا حکم تھا سو قلیل ضروری تھی۔“ وہ گیتر لگاتے اسے دیکھ کر مسکرایا۔
”اچھا!“

وہ اس کی دلفریب مسکراہٹ کو کئی ٹانگیں محبت سے دیکھتی رہی۔
”کیا دیکھ رہی ہو؟“

”تمہارا ساتھ رہا تو زندگی کتنی حسین و خوشگوار گزرے گی۔“ وہ جذب سے گویا ہوئی۔
”ہوں!“ وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

”محبت کے سامنے ہر جذبہ ہر احساس فضول لگتا ہے۔“ منتظر کو دیکھتے اسے ماں کی بات یاد آئی۔
”ماں بننے کے بعد نہ آنکھ میں نیند اترتی ہے نہ دل میں سکون۔“

موجود غالب بے سکونی کو تھک کر پر سکون کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ماں کی ممتا بڑا عجیب جذبہ ہے ہر چیز پر دکھ بھلا دیتے والا۔
”ای بی بی آپ کی محبت کی شدت ہے ورنہ ہر ماں ایسی تو نہیں ہوتی۔“ اس نے ماں کے گلے میں بائیں ڈال کے کہا تھا۔

مگر اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ محبت کسی بھی رنگ میں ہو اس کے احساسات ایک جیسے رہتے ہیں۔ محبت کی قسمت میں بے چینی اور بے سکونی ہی لکھی ہے۔
”کیا سوچ رہی ہو؟“ منتظر نے اسے کم صدمہ دیکھ کر انتظار کیا۔

اس نے چونک کر اپنے ساتھ بیٹھے ڈرائیونگ

کرتے منتظر کو اسی محبت سے دیکھا۔
”تمہیں اور محبت کو۔“
اس نے گیتر لگاتے منتظر کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

برگد کی گھنی چھاؤں میں موٹے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھا بخشش منتظر تھا اس دیوانی جھلی لڑکی کا جو بارہا اس سے دعا مانگ گئی تھی کہ پہلوان کے جھلے بیٹے سے اس کی شادی ہو جائے۔

وہ ہر بار اس نمائی نار کو دیکھ کر مسکراتا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر فون نمبر لکھا تھا۔

”باباجی قسمی دعا کر میڈیا پریم مینوں مل جائے۔“ وہ آگئی۔
”میں وظیفہ پڑھوں گا تیری مراد بر آئے گی، مگر تجھے میرا ایک کام کرنا ہوگا۔“

”مجھے ہر شرط منظور ہے۔“ بے تابی اور سوا ہوئی۔
اس نے ارد گرد دیکھا۔ آئی گریموں کی دھپس اس بھی سے سنسان تھیں کوئی ذی روح نہ تھا۔
”مجھے ایک فون کرنا ہے۔ ایک دن کے لیے فون لا دے۔“

”بس۔ اتنی سی بات باباجی!“ وہ خوشی سے نہال ہوئی۔ ”یہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اس سے کہہ کر منگوادوں گی۔“
”ہاں مگر راز راز ہی رہے یوں۔ جیسے تمہارا راز میرے پاس راز ہے۔“ بخشش کی انگلی تنبیہا

اٹھی۔
”باباجی! اس کی تو فکر نہ کر۔ تو بس ہماری شادی کے لیے آج سے وظیفہ پڑھنا شروع کر دے۔“
”کر رہا ہوں۔“

”بہت بہت مہربانی باباجی!“
اس نے سامنے بیٹھی عورت کو نفرت سے دیکھا

تھا۔ اس کا خوب صورت، باوقار چہرہ اچانک بھیا نک ہوا جس پر خوسر کے سامنے منڈلا رہے ہوں۔
ماضی کی یادیں یادداشت کے کاؤڈ توڑ کر آوارہ ہوئیں۔ اس کی نمائی ماں جو کبھی سلائی مشین سے سر اٹھا کر خلا میں گھورتی۔ اکثر ایسا کرنے پر وہ ان کی خود کلامی سننے کی کوشش کرتا۔

”ڈائن ہے تو ڈائن۔ بھول بیڑی! تو نے میرا گھر اجاڑ دیا۔ میری زندگی برباد کر دی۔ تو سکھی نہیں رہے گی تو بھی سکھی نہیں رہے گی۔“

تب سے آج تک اسے اس ڈائن کی تلاش رہی تھی۔ وہ ڈائن آج اس کے سامنے تھی اور بے فکر، سکھی، خوش تھی۔

اس کا دل چاہا وہ اسے قتل کرے، مگر دوسرے ہی لمحے اس خیال کو جھٹک دیا۔ اسے ماموں تک پہنچنا تھا۔ حیا چائے لے کر آنے والی تھی اور اس کے آنے سے پہلے ہی وہ سرعت سے باہر نکل آیا۔

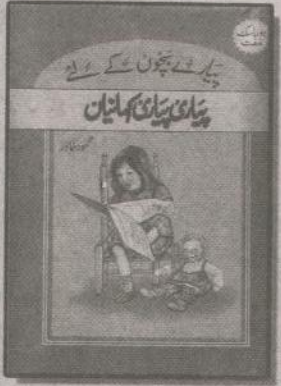
”منتظر!“ چائے کا کپ تھا۔ حیا سارے گھر میں اسے پکارتی اور ڈھونڈتی رہی۔
”آخر کہاں چلا گیا؟“

سیل فون بند جا رہا تھا۔
وہ لان میں لگے نئے پودوں کے بارے میں مالی سے معلومات لیتی رہی۔
”السلام علیکم۔ کیا ہو رہا ہے؟“ مہرین کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا اور کھل اٹھی۔

”ارے واہ! آج صبح ہی صبح کیسے راہ بھول گئیں۔“ وہ اس سے گلے ملنے لگی۔
”دانی! کو اسکول چھوڑنے گئی تھی، سوچا گھر جانے سے پہلے تم سے ملتی چلوں۔“ وہ لان میں پڑی کرسی پر بیٹھتی ہوئی۔ اس نے ملازم کو چائے لانے کا کہا۔

”ہاں یاد آیا۔ تم نے میرے کہنے پر اس لڑکی کو ملازمت دی بلکہ اس کی رہائش کا انتظام بھی کر دیا۔ اس کی ماں بہت دعائیں دے رہی تھی۔“

پیارے بچوں کے لئے پیاری پیاری کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں
پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے
آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 2 ماسک مفت

قیمت - 300/- روپے

ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

ملکتیہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

میں تمہاری شگفت میں لباسفر کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ
زندگی بھریا دگار رہے۔
اور واقعی ترین کاسفر ادا گار رہا۔
منتظر کی توجہ و محبت پر وہ خوشی سے جھوم جھوم
جاتی۔

☆ ☆ ☆
”تم تو واقعی میرا چاند ہو بیٹا! اتنی اچھی ملازمت اور
اتنا اچھا گھر۔“ خورشید فلیٹ میں گھومتے مسرور ہوئی۔
”ہاں! انسان کو شش کرے تو سب کچھ پاسکتا ہے
ابھی تو میرا ترقی کا سفر شروع ہوا ہے۔ یہ فلیٹ میری
منزل نہیں۔“ وہ عزم سے بولی۔
”ہاں اللہ تمہیں اپنے ارادوں میں کامیاب
کرے۔ مجھے تم پر واقعی فخر محسوس ہوتا ہے، کبھی سوچا
بھی نہ تھا کہ اپنا گھر بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ خوشی سے نم
آنکھیں پونچھنے لگیں۔
”ہاں یہ اپنا نہیں مگر میں چند سالوں میں اپنا بھی
خرید لوں گی۔“

”اے اللہ! ضرور اللہ تمہاری یہ امید بھی پوری
کرے گا، اچھا بیٹا یہ سلمان تم نے خریدا ہے؟“ وہ اک
اک چپ کو خور سے دیکھتے بولی۔
”نہیں اماں! یہ ڈیکوریشن مل گیا ہے۔“ وہ ہنستے بولی۔
”اب تو میں بھی آپا کو اپنے پیاس پلانوں کی اور جی بھر
کے ان کی خدمت کروں گی اور سارے احسانات کا
بدلہ چکاؤں گی۔“ خورشید آئندہ کے منصوبے بنانے
لگی۔
”ہاں اماں! ضرور۔“

☆ ☆ ☆
”پتا نہیں کیا ہوا اتنے دن ہو گئے نہ کوئی فون آیا نہ
منتظر میاں آئے۔ اللہ کرے خیریت سے ہو۔“
حمید کی سرگوشی پر بھٹنل نے دروازے کی طرف
دیکھ کر کھٹکی سے باہر دیکھا وہاں کسی کو نہ پا کر اطمینان
کی سانس لی۔
”مجھے ڈر ہے کہ جذبات میں آکر منتظر کوئی جذباتی

”ہی! میں اپنے شوہر کے پاس جا رہی ہوں، کہیں
اور نہیں آپ کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہیں۔“ وہ ان
کو منتظر دیکھ کر ہنستے ہوئے ان کے گلے میں بائیس ڈال
کر بولی۔
”ہاں بیٹا! میں ہوں اور ماؤں کا دل کبھی بھی اولاد کی
طرف سے مطمئن نہیں ہوتا۔“

”ای! یہ صرف آپ کا مسئلہ نہیں ہر محبت کرنے
والے کا مسئلہ ہے، میں بھی جان گئی ہوں یہ کیفیات۔
جب سے منتظر سے محبت کی ہے۔“ وہ گاڑی کا دروازہ
کھول کر بولی۔
”اللہ تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے اور ہمیشہ
ایک دوسرے سے اتنی ہی محبت کرو، زندگی ہنسی خوشی
گزرے۔“
”آمین، بالکل ایسے جیسے آپ کی اور بلیا کی۔“ وہ
شرارت سے ہلکھلائی۔
”اللہ کی پناہ میں۔“ انہوں نے کتے گاڑی کا دروازہ
بند کیا۔

☆ ☆ ☆
وہ تین دن اکٹھے اسلام آباد میں گھومتے رہے۔ اس
کے بعد وہ لاہور آگئے، وہ دن وہاں رہے، وہ خود ہی فون
کر کے ماں باپ کو خیریت کی اطلاع دیتی رہی، کیونکہ
منتظر نے اسے نیل آف رکھنے کو کہا تھا۔ اپنا بھی وہ بند
ہی رکھتا۔ وہ اکثر جھنجھلا کر کہتا۔
”یہ موبائل فون ایسی بلا ہے جس کے ہوتے کوئی
پرائیویسی نہیں رہتی۔ غلوٹ ہو یا جلوت، ہر وقت بچتا
ہی رہتا ہے۔ سواس کا بند رہنا ہی بہتر ہے جب تک ہم
ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔“
وہ اس کی باتوں پر کبھی ہی دیر ہنسی رہی۔ زیادہ تر
فون بند ہی رکھتی۔ ان کر کے ماں کو فون کرتی۔
وہ بذریعہ ٹرین ملتان جا رہے تھے۔
”ٹرین ہی کیوں؟“ اس نے حیرت سے منتظر کو
دیکھا۔
”ارے یار! وہ سفر تو گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے۔

”ان دعاؤں کا من لو منتظر جو اپنے آپ کو پہلا نر کا
انتا خیال رکھتا ہے۔“
”وہ ملیں گے تو ان کا بھی شکریہ ادا کروں گی۔“
”جھجھکس دوستوں میں شکریہ نہیں ہوتا۔ تم نے
اک کام کہا میں نے کر دیا۔ کوئی بڑی بات نہیں۔“

☆ ☆ ☆
وہ پریشان تھی۔ منتظر سے اک ہفتے سے کوئی
تفصیلی بات نہ ہو پائی تھی وہ مختصر بات کر کے فون رکھ
دیتا۔ ابھی ایک آدھ مہینہ پہلے پر خاں دیتا۔ اس کا میل اکثر
بند ملتا۔ وہ جھنجھلا جاتی۔ اس کی اتنی جدائی اس کے لیے
نا قابل برداشت تھی۔
ای روز اس سے منتظر کے بارے میں پوچھتیں۔ وہ
روزانہ انہیں مختلف ہمارے کام کی مصروفیت پیشینوں
کے سووے وغیرہ کا پتا کر مطمئن کر دیتی۔
ایسے محسوس ہوتا کہ ای اس کے چہرے پر لکھی
کوئی تجریر پڑھنا چاہتی ہیں۔ ان کی کیرد بڑھتی جا رہی
تھی۔ اس کے لیے ماں کا رویہ بھی حیران کن تھا۔ وہ
اس کی طرف سے شادی کے بعد کچھ زیادہ ہی پریشان
رہی تھیں۔

”شاید شادی کے بعد ماؤں کو یہ احساس زیادہ ستاتا
ہے کہ بیٹیاں اب پرانی ہو گئی ہیں کسی اور کے اختیار
میں کسی اور کی ماتحت، مگر میرے ساتھ تو ایسا کچھ نہیں
ہے۔ منتظر بے حد خیال رکھنے والا اور محبت کرنے والا
ہے۔“
وہ سوچ کر مطمئن ہو جاتی مگر اب منتظر کا بھروسہ
برداشت نہیں ہو رہا تھا۔
”میں چند دن کے لیے فارغ ہوں، تم فوراً پہلی
فلائٹ سے پہنچو، تاکہ کچھ وقت اکٹھے گھومنے پھرنے
میں گزاریں۔“
وہ فون پر وصل کی نوید سن کر فوراً پیکنگ میں جُست
گئی۔
”بیٹا! اپنا بہت خیال رکھنا اور مجھے اپنی خیریت کی
اطلاع دیتی رہنا۔“

قدیم نہ اٹھا مجھے۔ ”اک وہم اور دوسرے حید کے اندر سر اٹھانے لگا۔

”یار! کیوں ناامید ہوتے ہو۔ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔“ وہ اس کے خدشات کو نظر انداز کر کے بولا۔

”پتا نہیں اللہ کی رحمت کس وقت جوش میں آجائے“ وہ سارے ہند دروازے کھول دے۔

حید زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ ”میری تو پھر بھی خیر ہے تھوڑا عرصہ ہوا ہے قید کو مگر تم نے تو ساری عمر اس قید و بند میں گزار دی۔“ وہ ایک بار پھر مایوس ہوا۔

بغض خصل کے لبوں پر ہر اسرار مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے حید میاں! اگر میں قید نہ ہوتا تو نفسی چرخی بنا رہتا اس قید نے مجھے اللہ کے قریب کر دیا اس تمنا میں

میرا ہمزاد ہم دوست میرا رب ہمیشہ میرے ساتھ ہوتا ہے میں اپنے سارے دکھڑے اس کے سامنے بیان کرتا ہوں“ وہ میرے دل بے قرار پر اطمینان کا نزول فرماتا ہے

کوئی دکھ“ دکھ نہ رہتا“ کوئی قید قیدی نہیں رہتی۔ میں اس سے اپنی تمنائیں بانٹتا“ اس سے رحم مانگتا اپنی بیٹی کے لیے دعائیں مانگتا اور مجھے لگتا میرے رب نے میری

ساری دعائیں قبول کر لی ہیں۔ مجھے لگتا میری بیٹی جہاں بھی ہے بہت خوش ہے اور خوش رہے گی۔“

اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر حید کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”ہاں کہتے تو تم بھی ٹھیک ہو۔ یہاں کا بغض خصل اس بغض خصل سے یکسر مختلف ہے جو پی پلا کر راتوں کو گلیوں میں پڑا رہتا تھا۔“

”اور یہ بھی دیکھو کہ اللہ نے اس کے دل میں رحم ڈالا اور ہمیں زندہ رکھا۔ اس نے تمہیں بھی قتل نہیں کروایا۔ میرے ساتھ قیدی بنالیا۔“

”بے شک بغض خصل! بے شک۔ یہ میرے مالک کریم کا احسان ہے۔“ حید کے دل پر کچھ دیر پہلے چھائی اداسی کے بادل چھٹے گئے، یاسیت کی جگہ امید نے قدم

”پتا نہیں کیوں دل حیا کی طرف سے پریشان رہتا ہے، عجیب دوسرے وابہ گھیرے رہتے ہیں۔“ وہ انہیں دودھ کا گلاس تھماتے ہوئے بولیں۔

”کیوں کوئی ایسی بات ہو گئی ہے کیا؟“ انہوں نے بغور دیکھا۔

”نہیں بات تو کوئی نہیں ہوئی مگر۔“

”تو پھر خواہ مخواہ پریشانی کیوں؟“ انہوں نے بات درمیان میں کاٹ دی۔ ”حیا خوش ہے شوہر کے ساتھ۔ اسے کوئی مسئلہ نہیں۔“ انہوں نے چشمہ اتار کر مطالعے کے لیے کھولی کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

”یہی تو مسئلہ ہے کہ ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ وہ واقعی خوش ہے یا دھڑکتی ہے۔“

”فہم بیگم صاحبہ! آپ تو واقعی پاگل ہو گئی ہیں۔ وہم کا علاج مجھے غریب کے پاس کیا حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں ہوگا۔“ وہ دل کھول کر ہنسنے لگی۔

”اسی پاگل پن میں تو آپ کو پایا تھا۔“ وہ مصنوعی ناراضی سے بولیں۔

”جی ہاں اور ہمیں بھی پاگل کر دیا۔“ وہ متبسم ہوئے۔

”بڑا دانا سمجھتے تھے خود کو۔“ وہ مسکرائے جتانے والے انداز میں اترائیں۔

”ہاں جناب! آپ جیسی چاہنے والی ہو تو بندہ سب کچھ کر گزرتا ہے، کچھ بھی سوچے سمجھے بنا۔“

انہوں نے آخری بات خود کلامی کے انداز میں لمبی سانس بھر کر کہی۔

”کیا کما زور سے بولے تے۔“ وہ جھنجھلائیں۔

”حیا سے بات ہوئی تھی۔“ اس نے بات بدل دی۔

”ہاں۔“ صبح ہوئی تھی۔

”پھر اپنے سارے برے خیالات و خدشات نکال کر ڈسٹ بن میں پھینک دیں اور اب سونے کی

کوشش کریں۔“ انہوں نے — چادر اڑھتے نصیحت کی۔

وہ خاموشی سے اثبات میں سر ہلا کر سونے کے لیے دراز ہو گئیں۔

صحرا میں بنی اک عالیشان چوٹی تھی۔ جس کے لیے برآمدوں میں پرانی طرز کے ٹائلز لگے ہوئے تھے۔ اس کے اک شاہی بیڈ روم میں مختصر حسین سگریٹ پر سگریٹ ہی نہیں سلگا رہا تھا۔ خود بھی سلگ رہا تھا۔ حیا گم صم اسے تک رہی تھی۔

اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا اور آگے کیا ہونے والا تھا۔ تقدیر سے کہاں دھوکا کھا گئی۔ تب اس نے اپنے محبت بھرے دل کو امین بنایا اور میدان فیصلہ میں کود پڑی۔

”مختصر! میں نے تم سے محبت کی ہے، میں تمہارا ساتھ ہر قدم پر نبھاؤں گی۔“

”تم مجھ سے محبت کا ذکر نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔“ اک لمحے کو پلٹ کر اسے دیکھا۔ جھنجھلاہٹ اس کے ہر فعل سے مترشح تھی۔ وہ پھر کڑی سے باہر دیکھنے لگا۔

حیا دھیرے سے چلتی اس کی پشت پر آئی۔ حیا کی گہری سانسوں کی گرمی اس کے کانوں کی لوہوں کو چھوئی باہر کی ٹھنڈک میں مدغم ہو گئی۔

”کیا ہمارے بیچ اتنی دوری پڑ چکی ہے کہ محبت اذکار رفتہ ہوئی۔“ سرسری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”تمہارے اس رشتے اور محبت نے مجھ سے میرا عزیز ترین اکلوتا رشتہ اور محسن چھین لیا ہے حیا! وہ تپتی دھوپ بنا اس کو جھلسانے لگا۔

حیا نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

”ہم محبت کے مرید اپنی فہم و فکر سے سارے اچھے معاملات کو سلجھا دیں گے، ساری نا انصافیوں کی تلافی کر لیں گے مختصر! مجھے صرف تمہارا ساتھ درکار ہے۔“

اس کا وجود اس توہین آمیز رویے پر شعلوں کی زد

آکھڑی ہوئی۔ ”مختصر! صرف تمہاری محبت تمہاری وفا تمہارا اعتماد چاہیے مجھے۔“ اپنا ہاتھ اپنا سیت سے اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے چلتی ہوئی۔

اس نے آگ اگلی سرخ انگارہ بنی آنکھیں اس پر گاڑیں۔ تہتا ہاتھ اپنے کندھے پر رکھے اس کے ہاتھ پر رکھا زور سے پکڑا اور اٹھا کر اتنی ہی شدت سے جھٹک دیا۔

وہ لڑکھرائی۔

”جنہوں نے نفرت بوئی۔ جو بے وفائی کے مرتکب ہوئے۔ جو اعتماد و اعتبار کو پارہ پارہ کرنا جانتے ہوں۔ جنہیں رشتوں کا کوئی پاس نہیں۔“

وہ عسے سے ٹھہر ٹھہر کر لوٹا رہا۔

”کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ وہ مانگتے ہیں مجھ سے محبت و وفاء اور اعتماد؟“ وہ طنز بولتے استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

اس کا وجود اس توہین آمیز رویے پر شعلوں کی زد

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

تمہاری لکھی ہوئی

فرحت اشتیاق

قیمت - 300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی

ماہنامہ شعلات جون 2014

255

ماہنامہ شعلات جون 2014

254

254

254

میں آیا۔

عشق ہے ظاہر میں خوشبو کا سفر
راستہ جانا ہے انگاروں کے بچ
حیا حسین صرف اک رات کے فاصلے سے
خوشبوئے محبت کے سفر سے انگاروں کے بچ جھلس
ری تھی۔

وہ کوس رہے تھے اس دن کو جس دن فیصل آباد میں
ایک صبح اپنی گاڑی سے گراتے اس بھلے سے نوجوان
کو دیکھ کر آپس بہت کچھ یاد آگیا تھا۔ اس کا چلنا ہاتھ
اٹھا کر پسینہ پونچھے کا انداز انہیں کسی کی یاد دلا رہا تھا۔
قدرتی طور پر اسے کشش محسوس ہوئی۔ ڈرائیور کو
گاڑی روک کر کہنا وہ سڑک پر پاؤں پکڑے
ابھی تک درد کو ضبط کرنے کی کوشش میں مگن تھا اس
کی فائل کے کاغذات نیچے بکھرے تھے۔

”نوجوان! زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟“ انہوں نے
سن گلاسز اتار کر گاڑی کا دروازہ کھولتے پوچھا۔
”نہیں سہ! ہم غریب لوگ تو چوٹیں کھانے کے
عادی ہوتے ہیں۔“ وہ سرٹیکش چلتے فائل میں
رکتے بولا۔

اس کے طنز پر اعتماد لہجے پر حسین رضا کے لبوں پر
مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”او میرے ساتھ۔“ اس نوجوان نے چند سیکنڈ
سوچنے کے بعد ان کی آفر قبول کر لی۔

”کہاں ہے تمہاری منزل؟“

”جہاں نوکری مل جائے۔“

”اچھا۔“ وہ مسکراتے کیا کر رہے ہو آج کل۔“

”سراییم اے آنا مکس کے بعد روڈ ماٹری۔“

وہ لب بچتے مسکرائے اس کے بولنے کا انداز بھی
کسی کی یاد دلا رہا تھا۔

اپنی مشابہت پر انہیں ہمارا آیا۔
”کل دس بجے میرے آفس پہنچ جانا۔“ انہوں نے
اپنا وزینٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

”تھینک یو سہ! اس نے وزینٹنگ کارڈ جیب میں
ڈال کر ہلکا سا جھک کر مصافحہ کیا۔ ان کا دل چاہتا ہے
گلے لگائیں، اپنی خواہش پر خود حیرانی ہوئی، مگر اس کے
وجود سے اپنائیت کی خوشبو پھوٹ رہی تھی وہ اپنے
احساسات کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

سارے کانٹے راستے سے ہٹانے کے بعد ایک گواہ
ہی بچا تھا۔ جو راز آتشا بن چکا تھا۔ وہ اس کے قتل کا
ارادہ کر چکا تھا۔ وہ بھائی کے قتل کی دعوت دینے اپنے
دوست کے پاس گیا۔ وہاں میلا کی محفل بھی تھی۔
”اسلام کسی بے گناہ انسان کے قتل کی حمایت
نہیں کرتا۔ جس نے اک بے گناہ انسان کو قتل کیا۔ گویا
اس نے ساری انسانیت کو قتل کر دیا۔“
پتا نہیں کیا ہوا اسے لگا اس کے دل کو جیسے کسی غیبی
ہاتھ نے جکڑ لیا ہو اس کی حالت غیر ہو گئی۔ گھر آیا تو
حمیرا نے کہا۔

”جس اک آخری گواہ ہے۔ اسے بھی مروا دو تو ہتر
ہے۔“

”نہیں۔ اب اور قتل نہیں۔“ وہ فوراً بولا حمیرا
نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیا ہوا حسین رضا؟“ اس کی غیر ہوتی حالت پر وہ
گھبرا گئی۔

”میرا دل بہت پریشان ہے۔ پتا نہیں کیا ہو گیا
ہے۔“

”اچھا تم اس کو قید کروادو، تاکہ وہ کبھی ہمارا راز افشا
نہ کر سکے۔ تم اس وجہ سے پریشان ہونا؟“

وہ خالی خالی نگاہوں سے حمیرا کو تنکراتا رہا۔
”حسین رضا! ہمارا مستقبل بہت شان دار ہے، تم
خود بخود پریشان ہو رہے ہو۔ ہم نے اک دوسرے کو
پالیا ہے۔ ہماری محبت جیت گئی۔“

وہ آہستہ آہستہ اس کے زخموں پر پھارے رکھتی
دلا سے دیتی رہی۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

قرۃ العین خیر ماہی

سیرت



”بے جی! آپ کو کیا پتا کہ شہروں میں رہنا کتنا
مشکل ہے۔ تسی تھمرے پنڈوے سدے سدے
بندے! شہروں کی بھول بھلیاں کیا جانوس۔!“

آدھی آدھی پنچالی میں بات کرتی ہوئی سوہنی
نے صحن میں مشین لگائی ہوئی تھی۔ صحن کے کونے
بچھی چارپائی پہ بیٹھی بے جی پالک کے پتے توڑ رہی
تھیں۔ ہاتھوں کے ساتھ ساتھ سوہنی کی زبان بھی
مسلل چل رہی تھی۔ بے جی اس کی سانس تھیں۔ جو
گاؤں سے چار دن پہلے اپنے چھوٹے بیٹے احمد کے گھر
رہنے آئی تھیں۔ ان کی باقی آل اولاد گاؤں میں ہی مقیم
تھی۔ احمد کو شہر میں رہنے کا شوق شروع سے ہی تھا۔
اس نے بمشکل بی اے پاس کیا اور کسی فیکٹری میں
نوکری پر لگ گیا۔

انھوں پاس سوہنی بچ میں بہت سوہنی تھی۔
صورت کی بھی اور مزاج کی بھی۔ اسی لیے بے جی اپنے
لاڈلے بیٹے کے لیے سوہنی کو بہت چاؤ سے دلن بنا کر گھر
لے آئیں۔

احمد نے دو کمروں کا چھوٹا سا گھر کرایہ پر لے لیا تھا،
اور شادی کے بعد سوہنی کو شہر لے آیا تھا۔ شروع کے
دن ہر ایک کی طرح ان کے بھی بہت اچھے گزرے۔ نہ
کوئی فکر نہ کوئی فاقہ۔ دونوں ایک دوسرے میں مگن
بہت خوش تھے۔ زندگی بہت پرسکون اور اس کا آنے
والا ہر پرل خوشی کے ہزار رنگ لے کر آتا تھا۔

مکھوت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب ذمہ داریوں
کا سورج آگن میں جھکنے لگا تو اس کی گرم جتنی دھوپ
زندگی کے بے فکری کے رنگوں کو اڑانے لگی تھی۔
آگے پیچھے ہوئے تین بچے عموں کے ساتھ بڑھتی

ان کی ضرورتیں، مہنگائی، خرچے، خواہشیں، سب
آپس میں ایک دوسرے سے ٹکراتے لگے تھے۔

احمد کی قلیل آمدنی میں اتنے خرچے پورا کرنا سوہنی
کو بہت مشکل لگتا تھا۔ مگر جیسے تیسے کر کے گزارہ ہو
رہا تھا۔

سوہنی کے تینوں بچے جن کی عمریں بالترتیب بڑی
فاطمہ سات سال، زین چھ سال اور سب سے چھوٹی

آصفہ پانچ سال کی تھیں۔ تینوں بچے اسی محلے کے
اسکول میں جاتے تھے۔

سوہنی کو اب اکثر ہی اپنا گاؤں بہت یاد آتا تھا۔
گاؤں کی کھلی فضا، خالص چیریں رشتوں کا خلوص و پیار

۔۔۔ جو میاں کی زندگی میں ناپید تھا۔ دو کمروں کا یہ گھر
اب تنگ پڑنے لگا تھا۔ چھوٹا سا صحن جس میں گھر کے
اکثر کام یہیں بیٹھ کر نمٹائے جاتے تھے۔ بچے اکثر کھینچنے

سے رہ جاتے تھے۔ وہ جب کبھی بھی گاؤں جاتے تھے تو
وہاں بہت مزے کرتے تھے۔ بے جی کا گھر کافی بڑا اور

کھلا تھا۔ دو بیٹوں اور ان کی آل اولاد کے ہونے کے باوجود گھر میں کافی جگہ اور گنجائش تھی۔ اس لیے بے جی کی تینوں بیٹیاں بھی آئے روز آتی ہوتیں۔ احمد کبھی بھی ضد کر کے ماں کو اپنے پاس لے آتا تھا۔ مگر بے جی کا دل بھی احمد کے چھوٹے اور بزرگ گھر میں گھبراتا تھا۔ مگر وہ احمد کی خوشی اور پوتے پوتیوں کی چاہ میں ہر دوسرے مہینے چکر لگاتی تھیں اور دس پندرہ دن رہ جاتی تھیں۔ وہ اپنے ساتھ بڑی بہت سی سوغاتیں بھی لاتی تھیں۔ سوہنی کی بھی اپنی ساس سے بہت بچی تھی۔ کیونکہ بے جی نے ہمیشہ سوہنی کو ایک بیٹی کی طرح ہی سمجھا تھا۔ کچھ سوہنی کو بھی رشتوں کا بہت لحاظ و محبت تھا۔ سورشٹوں کی گاڑی بہت سکون سے رواں دواں تھی۔ ابھی بھی سوہنی بے جی کے سامنے اپنے دو کھڑے رو رہی تھی۔ جسے بے جی چہرے پہ ہلکی مسکراہٹ لیے سن رہی تھیں۔

”بے جی! میں اتنی احتیاط کرتی ہوں بجلی استعمال کرنے میں مگر کبھی بھی بل اتنا آتا ہے کہ احمد ہر بار مجھے ڈانٹتے ہیں۔ اب بھلا بتاؤ کیا میں بجلی جان کر زیادہ استعمال کرتی ہوں۔“

سوہنی کپڑے اچھی طرح نچوڑ نچوڑ کر بالٹی میں رکھتی جا رہی تھی۔ ابھی یہ بالٹی اٹھا کر اسے چھت پہ جانا تھا تاکہ کپڑے چھت پہ پھیلا سکے۔

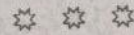
”بے جی! آپ بیٹھو! میں کپڑے ڈال کر آتی ہوں۔ چھت پہ۔ ساتھ ہی اپنے پیچھے بھی دیکھ آؤں گی۔ بھوک پیاسی بیٹھی ہوں گی بے چاری چڑیاں۔“

سوہنی جلدی جلدی بولتی بیڑھیاں چڑھنے لگی۔ چھت میں ایک کونے میں چھوٹے چھوٹے تین چار پیچھے رکھے ہوئے تھے۔ جس میں مختلف قسم کے پرندے تھے۔ چڑیوں اور طوطوں کی تعداد زیادہ تھیں۔ سوہنی ان کے دانے پانی کا بہت دھیان رکھتی تھی۔ سوہنی کے فارغ ہو کر آنے تک بے جی سالابھون چکی تھیں۔ بے جی بہت چاق و چوبند اور ہر وقت متحرک رہنے والی خاتون تھیں۔ سوہنی کے کتنے ہی کام

انہوں نے خود ہی اپنے سر لے لیے تھے۔ حالانکہ سوہنی بہت منع کرتی تھی مگر بے جی ان سنی کر کے لگی رہتیں۔ بے جی کچھ دنوں سے دیکھ رہی تھیں کہ سوہنی اکثر ہی احمد سے کسی نہ کسی بات کو لے کر الجھنے لگتی تھی۔

احمد بھی مرد تھا۔ باہر سے تھکا ہارا آتا تو سوہنی کی ذرا سی بات یہ بھی بھڑک اٹھتا۔ اس طرح دونوں میں ان بن رہنے لگی تھی۔ گھر کا ماحول بے جی کو خوشگوار ہوتا تھا وہ خاموش اور سہما سہما رہنے لگا تھا۔

بے جی کافی دنوں سے سوچ رہی تھیں کہ کن لفظوں میں سوہنی کو سمجھائیں کہ ان کی بات اسے بری بھی نہ لگے اور وہ سمجھ بھی جائے۔ احمد بیٹا تھا اس کے لیے ماں کا حکم بھی کافی تھا اور ویسے گھر کو پرسکون رکھنے اور اس کا ماحول خوشگوار بنانے میں عورت کو زیادہ قربانی دینی پڑتی ہے۔ عورت کے مہراور برداشت سے ہی گھر جنت بنتے ہیں۔ جس کی تلاش اور تمنائیں ہر مرد رہتا ہے۔



اس دن موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہوا کی مستیاں اپنے عروج پہ تھیں۔ سوہنی بے جی کے پاس بیٹھی ان کی ہدایت کی روشنی میں زمین کی قیص کا ڈھ رہی تھی۔ بے جی کے ہاتھ میں بہت صفائی تھی۔ سوہنی بھی بے جی کی زیر نگرانی کچھ نہ کچھ سیکھتی رہتی تھی۔ تینوں بچے پاس ہی کھیل رہے تھے۔ سوہنی وقتاً فوقتاً ان تینوں بھی نظر ڈال رہی تھی اور بے جی سے باتوں میں بھی مشغول تھی۔

”ارے یہ کیا کر رہے ہو۔۔۔ ہٹو وہاں سے۔“

سوہنی نے تینوں بچوں کو بچوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھا تو انہیں منع کرنے لگی مگر تب تک چھوٹی آصفہ نے غلطی سے پیچھے کا دروازہ کھول دیا تھا اور اس میں مقید چڑیاں اڑنے کو برتو لے لگیں۔

سوہنی بھانگی ہوئی پیچھے تک آئی۔ تینوں بچے پاں کے غصے سے ڈر کر پیچھے بھاگ گئے۔ سوہنی چڑیوں کو

پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ ان میں سے کچھ کو بے جی نے واپس پیچھے میں ڈال پائی۔

”آئے دو آج ان کے باپ کو۔۔۔ وہ ہی خبر لیں گے ان تینوں کی۔ بہت بدتمیز اور شرارتی ہو گئے ہیں۔“

سوہنی ہوا کے زور سے لڑتی اور دھڑکا رہی تھی۔

”کیا ہوا بے جی! آپ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟“

سوہنی نے بے جی کو اپنی طرف پر سوچ لگا ہوں سے دیکھتے پایا تو بولی۔

”سوہنی! تمہیں نہیں لگتا کہ تم نے زبردستی ان پرندوں کو قید کر کے ان کے فطری حق سے محروم کر دیا ہے۔“

بے جی نے کہا تو سوہنی اچھٹے سے بولی۔ ”یہ کیا بات ہوئی ہے جی! میرا شوق ہے پرندے پالنا۔ ان کی دیکھ بھال کرنا۔“

سوہنی نے کہا تو بے جی بے ساختہ بولیں۔ ”جیسے تمہیں شوق ہے اپنے چھوٹے چھوٹے مسکوں کو بھی پرندوں کی طرح قید کرنے کی کوشش کرتے رہنا۔“

”میں سمجھی نہیں آپ کی بات۔“ سوہنی نے ہوا سے اڑتے اپنے بالوں کی چند لٹوں کو کان کے پیچھے کیا اور بے جی کی طرف دیکھ کر بولی۔

”سوہنی! کبھی تم نے غور کیا ہے پترا! یہ مسئلہ بھی ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے یہ پرندے۔ جس طرح پرندوں کو قید کرنے کی کوشش میں تم ہلکان ہو رہی ہو اسی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں اور مسکوں کے پیچھے بھاگنے اور انہیں پکڑنے کی کوشش میں ہم ایسے ہی الجھے اور ہلکان ہوتے رہتے ہیں۔“

سوہنی پترا پترا چھوٹی چھوٹی باتوں اور مسکوں کو لے کر سارا دن چلائی رہتی ہے اور احمد کو بھی سنا سنا کر پریشان کر دیتی ہے۔ ان مسکوں کو آنے والے وقت پہ بھروسہ کر کے چھوڑ کر دیکھ۔ اس رتبے ہر چیز کا صلہ دے رکھا ہے۔ اگر غلطی سے تو آسانی بھی اسی کی طرف سے آتی ہے۔“

بے جی نے غم صم۔ کھڑی سوہنی کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر بے جی۔۔۔ پرندوں کو آزاد کر دینے کی بات تو

مجھ سے مراد مسکوں کو آزاد کر دینے ہیں یا ان سے کیسے آزادی حاصل کر سکتے ہیں؟ ہر انسان اپنے کل کو بہتر بنانے کے لیے سوچتا ہی ہے۔ اس میں غلط کیا ہے؟“

”پترا دیکھ! جب تک سانس چلتی ہے یہ مسئلے مسائل اسی طرح آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کا کوئی مستقل حل تو ہوتا نہیں ہے تو کیوں نہ ہم اپنے عمل اور کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی ذات پہ بھروسہ کر کے توکل کو اپنا کر اپنے مسکوں کو بھی آزاد فضاؤں میں پرندوں کی طرح اڑا دیں۔ ان کے بارے میں سوچنے سے یا کڑھنے سے پریشان رہنے سے وہ فوراً ختم تو نہیں ہو جائیں گے۔“

بے جی نے نرمی اور محبت سے کہا تو سوہنی نے آگے بڑھ کر سب بچوں کے دروازے کھول دیے۔ جن میں مقید پرندے آزادی پاتے ہی پھر کر کے اڑ گئے۔

”بے جی! ایسے نال۔۔۔!“

سوہنی نے اڑتے پرندوں کو دیکھتے ہوئے کہا تو اس کے انداز پہ بے جی مسکرا دیں۔

”ہاں ایسے ہی۔۔۔“ بے جی نے سوہنی سے کہا وہ ان کے پاس بیٹھ کر دوبارہ قیص کا ڈھنے لگی۔ سوہنی سمجھ چکی تھی کہ مسکوں پہ ایک دوسرے سے الجھنے کے بجائے انہیں آنے والے کل کی فضاؤں میں آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ جو ذات سب دے سکتی ہے وہ اسباب بھی خود ہی پیدا کر دیتی ہے۔ بس اس پہ توکل کر کے عصر سے اچھے وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔

”بے جی! تمہیں بڑے جتنے ہو۔“ سوہنی بے ساختہ بے جی سے لپٹی خاص پنجابی سمجھ میں بولی۔

”بہت بچی۔۔۔“ بے جی نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور اسے قیص مکمل کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے خالی بچوں کی طرف بڑھ گئیں۔ پیچھے میں نہ سہی مگر آزاد اڑتے پرندوں کے لیے چھت پہ دانے اور پانی تو کھانا تھا نا۔۔۔



شام ہو کر

پھر نا ہی اگر لکھا ہے قسمت میں
تو اس میں دیر کا ہے کی
چلو اس پل اسی لمحے پھرتے ہیں
ابھی تم آنکھ جھپکو گے
ابھی میں ہاتھ اپنے دل پہ رکھوں گی
ابھی تم مجھ سے کہہ دو گے
جدا ہیں راستے اپنے، مگر تم حوصلہ رکھنا
پھر نا ہی اگر لکھا ہے قسمت میں
تو اس میں دیر کا ہے کی
چلو اس پل اسی لمحے پھرتے ہیں
فاخرہ بیگم

سرو صنوبر شہر کے مرتے جلتے ہیں
سارے پرندے، ہجرت کرتے جلتے ہیں
جھوٹی سچی تعبیروں کی خواہش میں
کیسے کیسے خواب بکھرتے جلتے ہیں
کیسے کیسے یاروں کا بہروپ کھلا
کیسے کیسے خول اُترتے جلتے ہیں
ان حالات کب اپنے آپ کو دیکھا تھا
کہنے کو دن رات گزرتے جلتے ہیں
ماں مٹی نے خون مانگا تھا ادبیٹے
پانی سے تالاب کو بھرتے جلتے ہیں
کبھی کبھی کوئی ایسا مسافر آتا ہے
رستے اپنے آپ سنورتے جلتے ہیں
شہر غزل کی گلیوں میں دلگیر ترے
تجھ سے تیری باتیں کرتے جلتے ہیں
احمد فراز

میرے شہروں کو کس کی نظر لگ گئی
میری گلیوں کی رونق کہاں کھو گئی
روشنی بجھ گئی، آگہی سو گئی
ہم تو نکلے تھے ہاتھوں میں سورج لیے
رات کیوں ہو گئی؟
رات کیوں ہو گئی طالبانِ سحر؟
ہم سے کیوں روشنی نے یہ پردہ کیا
کیوں اندھیروں نے رستوں پہ سایا کیا
آؤ سوچیں ذرا!
آگہی سے پرے روشنی کے بنا
بتنے امکان ہیں سارے مرجائیں گے
جو بھی تخلیق ہے، وہ بکھر جائے گی
زندگی اپنے جہرے سے ذبح جائے گی
طالبانِ سحر! آؤ سوچیں ذرا، آؤ دیکھیں ذرا
آرزو کے ستاروں سے دمکا ہوا
پہنچ روشنی کس طرح پھٹ گیا
کون سا موڑ ہم سے غلط کٹ گیا
پھول رُت میں خزاں کس طرح چھا گئی؟
تج کیا ہو گئی؟
ہم تو نکلے تھے ہاتھوں میں سورج لیے
رات کیوں ہو گئی؟
احمد اسلام امجد

وہاں کی روشنیوں نے بھی ظلم ڈھلے بہت
میں اس گلی میں اکیلا تھا اور سائے بہت
کسی کے سر پر کبھی ٹوٹ کر گرا ہی نہیں
اس آسمان نے ہوا میں قدم جمائے بہت
نہ جانے رُت کا تصرف تھا یا نظر کا فریب
کلی وہی تھی مگر رنگ جھللائے بہت
جو موتیوں کی طلب نے کبھی ادا اس کیا
تو، ہم بھی راہ سے کسکر سیٹ لائے بہت
بس ایک رات ٹھہرنا ہے، کیا گھر کیجیے
مسافروں کو فیضمت ہے یہ سرائے بہت
جی رہے گی نگاہوں پہ تیرگی دن بھر
کہ رات خواب میں تارے اُتر کے آئے بہت
شکیب کیسی اُڑان، اب وہ پر ہی ٹوٹ گئے
کہ زیرِ دام جب آئے تھے، پھر پھلے بہت
شکیب جلال

پہلا اصول

ایک بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹور کے مینجر نے ایک سیلز مین کو آفس میں بلا کر ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے کہا۔

”میں یہاں سے دیکھ رہا تھا کہ تم ایک گاہک سے لڑ رہے تھے۔ تمہیں تو دکان داری کا پہلا اصول ہی معلوم نہیں کہ گاہک کی کسی بھی بات کی کبھی تردید نہیں کرتے۔ وہ جو بات کہے، تمہیں جواب میں یہی کہنا چاہیے کہ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔“ اس کے بعد وہ اپنی بات سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ویسے وہ گاہک کہہ کیا رہا تھا؟“

سیلز مین نے سر جھکا کر جواب دیا۔
”سرا وہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے مینجر سے بڑا گدھا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔“

مک علی۔ گجرات

ٹھوس ثبوت

تیز رفتاری کے جرم میں ایک صاحب کا چالان ہوا اور انہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے کہا ”جناب عالی! میں تو صرف تیس کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا تھا۔“

”کیا تم اپنی بات کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو؟“

مجسٹریٹ نے دریافت کیا۔
”جناب! ثبوت کے طور پر صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ اس وقت میں اپنی بیوی کو لینے اپنے سسرال جا رہا تھا۔“ ان صاحب نے جواب دیا۔

انپلا سرفراز۔ ہجرت کالونی

کنجوسی

اسکاٹ لینڈ کا ایک کاشت کار باشندہ نہایت کنجوس تھا۔ گیہوں کو فروخت کرنے کے بعد وہ پوسٹ آفس پہنچا، تاکہ اپنی بیوی کو ٹیلی گرام بھیج سکے۔ اس نے ٹیلی گرام کی عبارت لکھی۔

”گیہوں کو خاصے منافع پر فروخت کر دیا ہے۔ میں کل آ رہا ہوں تمہارے لیے تحفے کر۔“
پوسٹ آفس والے کو یہ عبارت پکڑاتے ہوئے اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے پیغام واپس لے لیا اور خود سے مخاطب ہوا۔

”منافع کے بارے میں لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ میں نقصان میں تو فروخت کروں گا نہیں۔“ سو اس نے عبارت کے وہ الفاظ کاٹ دیے اور دوبارہ مضمون باندھا۔
”گیہوں کو فروخت کر دیا ہے۔“

یہ لکھ کر وہ دوبارہ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ ”یہ لکھنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں اسی کام کے لیے شہر آیا ہوں۔“

اس نے یہ جملہ بھی قطع کر دیا اور دوبارہ لکھا۔
”تمہارے لیے تحفے کر۔“

یہ جملہ لکھ کر پھر سوچ میں پڑ گیا۔ ”کیوں۔ یہ کوئی سا لکھ یا تہوار کا موقع تو نہیں ہے۔“

لہذا یہ الفاظ بھی اس نے کاٹ دیے۔ اس کے بعد اس نے ٹیلی گرام کے پیسے جیب میں واپس رکھے اور خوشی خوشی پوسٹ آفس سے باہر آ گیا۔
”گھر جا کر خود ہی بتا دوں گا سب۔“

سیمار اشرف۔ جی ٹی روڈ

غلط

تعمیراتی کمپنی کے ایک بڑے منصوبے میں مکانوں کی طرز تعمیر یکساں تھی۔ ایک نئی فیملی اس آبادی میں منتقل ہوئی اور اپنے مکان میں اودن نصب کروایا۔ کچھ دنوں بعد اودن والوں کی دکان پر فون موصول ہوا۔

”جناب! کچھ دن قبل ہم نے آپ سے اپنے گھر میں اودن نصب کروایا تھا۔ وہ اٹھاڑنا پڑے گا۔ کیونکہ وہ آپ نے غلط گھر میں لگا دیا ہے۔“
”غلط گھر میں۔“ دکان کے مالک نے حیرت سے کہا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے۔ آپ لوگ خود وہاں موجود تھے۔“

”وہ بات تو ٹھیک ہے جناب! اور اصل۔ ہم خود غلط گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔“ مالک مکان نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

مہوش اسلم۔ ٹھٹھہ

مقام شکر

پولیس نے ڈاکوؤں سے مقابلے کے بعد جنگل کا محاصرہ ختم کیا تو ڈی ایس پی نے انسپٹر سے پوچھا۔
”ہماری تقری پوری ہے نا؟“ انسپٹر نے اثبات میں جواب دیا مگر ڈی ایس پی نے تشویش سے دوبارہ بولا۔
”تم نے اچھی طرح تفتی کر لی تھی نا؟“

”جی ہاں سر! میں نے خوب اچھی طرح تفتی کر لی تھی۔“ انسپٹر نے بھرپور یقین سے جواب دیا۔
”شکر ہے۔“ ڈی ایس پی نے اطمینان کی سانس لی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ میں نے جس بھگتے ہوئے سائے پر گولیاں برسائی تھیں وہ ڈاکو ہی تھا۔“

عرفانہ فاروق۔ کھاریاں

انشورنس پالیسی

”سر! آپ ہماری ایک انشورنس پالیسی لے لیں۔ دوسری مفت ملے گی۔“ اس نے اپنے سینے ایک زبردست پیش کش کی۔

”مگر میں مر گیا تو؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔
”پہلی کے پیسے پہلی بار مرنے پر۔ دوسری کے پیسے دوسری بار مرنے پر۔“ وہ نہایت اطمینان سے بولا۔
”میرا لاف انشورنس لینے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں تعطیلات پر جا رہا ہوں۔“ میں نے برامان کر قطعیت سے کہا۔

”آج چھوٹا بچہ انشورنس کروالیں۔“ اس نے فوراً دوسری پیش کش کر ڈالی۔

”میرا چھٹیوں پر دوسرے جہان جانے کا پروگرام ہے۔“ میں نے طعنے لگا کر کہا۔

”خوب۔ بہت خوب۔ ہم اسلامی انشورنس بھی کرتے ہیں۔“ وہ میرے غصے سے متاثر ہوئے بغیر خوش دلی سے بولا۔

”رہنے دو بھائی۔ میں جہنم جا رہا ہوں۔“ میں سخت بے زار ہو کر بولا۔

”سر! پھر آپ ہماری ہیلتھ انشورنس پالیسی لے لیں۔“ وہ متانت سے بولا۔ ”یہ آگ سے جلنے والے زخموں کو کور کرتی ہے۔“

مہرین نعمان۔ اسلام آباد

گھر والا

راستے میں ایک صاحب کو اپنے دوست مل گئے۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ صاحب پریشان ہو کر دوست سے کہنے لگے۔

”اوہو۔ یہ کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری۔ آؤ میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔“

”رہنے دو۔ میں ابھی گھر سے ہی آ رہا ہوں۔“ دوست نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

فریال صلا اللہ۔ سائٹ ایریا

نغمہ کا دولہا

دلہن رخصت ہو رہی تھی۔ رشتے دار خواتین اور

دلہن کی سہیلیاں گلے مل کر رو رہی تھیں۔ وہیں ایک لڑکی ایک کونے میں کھڑی بجائے رونے کے غصے سے دانت پیس رہی تھی۔

”کیا بات ہے تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔ کیا تمہیں نغمہ کی پرخصتی کا دکھ نہیں ہو رہا۔“ دوسری سہیلی نے ناک پونچھتے ہوئے کونے میں کھڑی لڑکی سے پوچھا۔

”دکھ کرے میری جوتی۔“ لڑکی نے غصے سے کہتے ہوئے ساتھ ہی پیر بھی زور سے زمین پر مارا۔

”جو سلوک نغمہ نے میرے ساتھ کیا۔ کوئی دشمن بھی نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ مجھے سے کتنی تھی۔ ندیم سے جتنی ترش روی سے پیش آؤ گی۔ اتنا ہی اس کے اندر تمہارے لیے جذبہ محبت بڑھے گا۔“

”ندیم کون؟“ سہیلی رونابھول کر حیرت سے پوچھنے لگی۔

”نغمہ کا دوہلا۔“ لڑکی نے دوبارہ دانت پیسے۔

حسنہ عدنان۔ گلستان جوہر

سرکاری افسر

ایک صاحب بستر لینے لینے کسی کام سے بچوں کو آوازیں دے رہے تھے مگر کوئی بچہ ان کی بات نہیں سن رہا تھا۔ بیگم بھی وہیں موجود تھیں۔ وہ بھی لاپرواہی سے ایک طرف بیٹھی رہیں۔ شوہر کی برواشت سے باہر ہوا تو طنز کہنے لگے۔

”بیگم! مجھے لگتا ہے ہمارے بچے کسی ہوٹل کے پیرے نہیں گے۔ جب بھی انہیں بلانا ہوں، حاضری نہیں ہوتے۔“

”بیان سنبھال کر بات کرو۔“ بیگم غضب ناک ہو کر بولیں۔ ”یہ دو کٹے کی نوکریاں تم خود کرنا۔ میرے بچے سرکاری افسر بنیں گے۔ وہ کسی کی نہیں سنیں گے۔ خواہ ان کا باپ ہی کیوں نہ ہوں۔“

جویریہ عدنان۔ گلستان جوہر

بوریت

”ڈاکٹر صاحب! میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے بہت

زیادہ بولنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اتنی کہ میں اپنے آپ سے بھی باتیں کرنے لگی ہوں۔“

خاتون نے ماہر نفسیات سے اپنی پریشانی بیان کی۔

”اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔“ ماہر نفسیات نے آنکھیں سکوڑ کر پوچھا۔

”ڈاکٹر صاحب! بہت زیادہ باتیں کر کے میں اپنے آپ کو کتا بور کرتی ہوں۔ آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہے۔“ خاتون رونکھی ہو کر بولیں۔

ماہر جنین۔ لیبرا سکواز

گھر کی مرغی

سیکرٹری نے اپنے پاس کے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

”سر! ایک خاتون آپ سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔“

”کیا وہ خوب صورت ہے؟“ پاس نے اشتیاق

بھرے لہجے میں پوچھا۔

”جی ہاں! انتہائی خوب صورت اور دلکش۔“

سیکرٹری نے جواب دیا۔

”اچھا۔ اسے اندر بھیج دو۔“ پاس نے کہا اور

جلدی جلدی اپنے پال سنوارنے لگا۔ جب وہ عورت ملاقات کر کے چلی گئی تو پاس نے اپنے سیکرٹری کو طلب کیا۔

”تم احمق تو نہیں ہو۔“ پاس نے غصے میں کہا۔

”اس بد صورت عورت میں تمہیں حسن کہاں سے نظر آیا تھا؟“

”میں محض خواہ ہوں سر!“ سیکرٹری نے

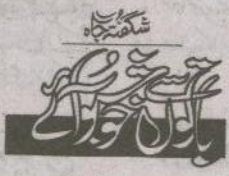
لجاجت سے کہا۔ ”انہوں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ ان

کے انداز سے میں سمجھا کہ وہ آپ کی بیوی ہیں۔“

”وہ میری بیوی ہی تھی۔“ پاس نے آہستہ سے

کہا۔ ”جاؤ وچ ہو جاؤ۔“

فوزیہ سعید۔ گلشن اقبال



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابو جری جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

”مجھے نصیحت فرما دیجیے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کبھی کسی کو گالی نہ دینا۔“

حضرت ابو جری فرماتے ہیں اس کے بعد میں نے

کبھی کسی کو گالی نہیں دی نہ آزاد کو نہ غلام کو نہ اونٹ کو نہ بکری کو۔

یہ حق حکومت

ایک دن سخت گرمی والی دوپہر حضرت عمرؓ تنہا

جنگل کی طرف جا رہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے

دوڑے دوڑے دیکھا تو پہچان لیا کہ امیر المومنین ہیں۔ قریب جا کر

دریافت فرمایا۔

”امیر المومنین! اس سخت گرمی اور ٹوئیں کہاں جا

رہے ہیں؟“

فرمایا: بیت المال کا ایک اونٹ کم ہو گیا ہے اس

کی تلاش میں جا رہا ہوں۔“

انہوں نے عرض کیا: ”کسی خادم کو کیوں نہ بھیج دیا؟“

فرمایا: قیامت میں سوال مجھ سے ہوگا، خادم سے

نہیں۔“

عرض کیا: ”پھر تھوڑی دیر توقف کر کے تشریف لے

جائیے، خدا کی قسم کہ ہوجائے۔“

فرمایا: ”جہنم کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے۔“

یہ کہہ کر انہی اونٹوں کو تشریف لے گئے۔

غیبہ الطبر۔ لاہور

اللہ کی رحمت سے نہ مایوس ہو،

امید کے متعلق بیسیوں کہانیاں ہیں مگر ابو علی ناقد

کی کہانی سب سے عجیب ہے۔ یہ امیر المومنین متعدد کی خلافت کے عہد میں جیل کے قیدیوں کو کھانا پہنچانا تھا۔

وہ بیان کرتا ہے کہ ایک دن مجھے قید خانے میں

ایک ایسے قیدی سے سابقہ پڑا جس سے انتہائی بے رحمی

سے سلوک کیا جاتا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں

اور پیروں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔ اور لوہے کی ایک

بہت بڑی تل اس کی گرد پر لگی جاتی تھی۔

میں نے اس سے اس با مشقت سزا کا سبب پوچھا

تو اس نے جواب دیا۔

”بالکل بے گناہ ہوں اور کسی اور مجرم کا خمیازہ

مچلتا رہا ہوں۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک رات بیٹنی

کے بازار میں ایک دوست کے ہاں میری دعوت تھی۔

کلنے سے فارغ ہو کر دیر تک میں اور وہ دوست ابھر

ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب تین دن سے ستیا تو ہیں

رضعت ہو کر اپنے گھر چلا آیا۔ بازار میں پہنچا ہی تھا کہ

کو تو دل انداس کے سپاہیوں نے مجھے گرفتار کر لیا۔

بات یہ تھی کہ اس رات ایک شخص قتل کر دیا گیا تھا

اور اس کی لاش مذکر کے اس حصے میں پڑی تھی جہاں

سپاہیوں نے مجھے دیکھا تھا۔ ان کو غلط فہمی ہوئی کہ

قاتل میں ہی ہوں۔ چنانچہ مجھے پکڑ لیا اور کو تواری میں لے

جا کر بہت مارا پٹا کہ اسے جرم کا اقرار کر لیں مگر چونکہ

یہ جرم میں نے نہیں کیا تھا اس لیے میں ہلکا سا کرتا

رہا۔ جب وہ کسی طرح میرا جرم ثابت نہ کر سکے تو مجھے

قید خانے بھیج دیا۔

میرے عزیز واقربا بغلہ کے بڑے بڑے لوگوں

میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے میری بے گناہی کی

شہادتیں دیں، اس لیے میں پچاسی کی سزا سے نجات

گیا مگر قید سے نہ چھوٹ سکا۔ چنانچہ سولہ سال سے

لیکن اس تکلیف کے باوجود اللہ کے فضل و کرم سے باور
نہیں ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ایک نہ ایک دن میں آزاد
ہو جاؤں گا اور اس دوزخ سے نکل کر نادی احوال
کا سانس لے سکوں گا۔
الوعلیٰ ناقد کہتا ہے کہ میں اور وہ قیدی ابھی باقی
میں مصروف تھے کہ ان میں شور و غل کی آوازیں آئیں۔
معلوم ہوا کہ قید خانے کا دواخانہ توڑ دیا گیا ہے اور جیلر
کو قتل کر کے قیدیوں کو رہا کر دیا گیا ہے۔ میں اور
میرا ساتھی بھی باہر نکلے اور میں اس کی امید کی انتہا اور
یک یہ ایک اس کی کامیابی پر تعجب کرتا ہوں اس سے
رضعت ہوا۔
عاش۔ گرجہ

ہمیں علوت ہے حرف بننے کی،
اپنے آپ سے محبت کرنا اتنا سنگین لگتا نہیں
جتنا اپنے آپ سے لاپرواہی ہے۔
(شکیکسیر)
عبد حامد کو مرنے سے پہلے مار دیتا ہے۔
(بقراط)
محبت، احسانات کی تفسیر کا نام ہے۔
(بروس لیئر)
غلطی مان لینے سے انسان کا ذہن ہی بوجھ کم ہو جاتا
ہے۔
(سائرس)
جب صورت حال خطرناک ہو تو دانا لوگ خاموش
رہتے ہیں
(جان سلزمن)
قلم کا زخم بہت گہرا ہوتا ہے۔ یہ زخموں کو موت
کی نیند سلا سکتا ہے۔ مرنے والے کو زندگی محسوس ہے۔
(جان شیلر)
جس چیز کی ضرورت نہیں اس کی جو محبت کرو۔
(سقراط)
سیدھے راستے کی دہاڑی سے اندیشے نہ کرو۔
(سقراط)
ٹھوکر لگنے سے پہلے جو ہوشیار ہو جائے، وہ
کامیاب ہوتا ہے۔ (سقراط)

معاشرے میں باغیوں کا وجود ضروری ہے ورنہ
سب کا ایک جیسا ہونا کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔
(ڈی جے این رائٹ)
کچھ چیزیں جلد کھو جانے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔
اس لیے چیزوں کو کھونے کا فن سیکھ کر خوش
رہنے کا فن سیکھیں۔ (الزبتھ بشت)
ساگھ بننے میں تیس سال لگتے ہیں اور یہ ساگھ
پانچ منٹ میں برباد ہو جاتی ہے۔
(واین بٹ)
زندگی میں میری کامیابی کا راز یہ ہے کہ میں پندرہ
منٹ پہلے اپنے کام پر موجود ہوتا ہوں۔
(روز ویلٹ)
جسمانی بد صورتی کے علاوہ بھی بد صورتی کی بہت
سی قسمیں ہیں۔ مثلاً احمق ہونا، جاہل ہونا، لالچی
ہونا، ہوس پرست ہونا۔
(آکٹس بکسلی)
جس کا ارادہ بخیرہ اور اسل ہے وہ دنیا کو اپنے
ساحلے میں ڈھال سکتا ہے۔
(جان سائرس)
سیدہ نسبت زہرا۔ کہوڈ پکا
کہاوتیں،
زندگی صرف نسل کے لیے ہوتی ہے اور اچھا نام
ہمیشہ کے لیے۔
(جاپانی کہاوت)
کامیابی وہ سیرھی ہے جس پر جیبوں میں ہاتھ
ڈال کر نہیں چڑھا جا سکتا۔ (امریکی کہاوت)
ذہن ایک پیرا شوٹ کی طرح ہوتا ہے کہ اسے
کھولیں گے تو یہ کام کرے گا۔
(روسی کہاوت)
کسی کی خوشیوں میں شریک ہونے سے اس کی
خوشیاں دوگنی ہو جاتی ہیں اور کسی کے غموں
میں شریک ہونے سے غم آدھے ہو جاتے ہیں۔

(سوئٹ لینڈ کی کہاوت)
سوئے ہوئے کتے کو سوار ہونے دو، بیدار ہو کر وہ
یقیناً آپ پر چڑھنے لگا۔
(ترکی کہادت)
اگر تم خود ترقی نہیں کر سکتے تو دوسروں کو ترقی کرتے
کرتے دیکھ کر انھیں ہندمت کرو۔
(جرمن کہاوت)
خوار اور عورت کی چلتی ہوئی زبان کو دو کنا
ہی اصل بہادری ہے۔
(روسی کہاوت)
دوتی ہوئی عورت اور بیدار بحث کی باتوں پر
کبھی اعتبار مت کرو۔
(جاپانی کہاوت)
گر شاہ۔ کہوڈ پکا
زبان کے لگائے ہوئے زخم،
کسی بگ ایک لڑکا رہتا تھا، انتہائی اگھر مزاج اور
غصے سے بھرا ہوا۔ اسے لاشی کرنا تو آسان کام تھا
ہی نہیں۔
ایک دن اس کے باپ نے ایک بھائی میں کچھ کیلیں
ڈال کر اسے دیں کہ آئندہ جب تم آجائے آجائے سے بھر
ہو جاؤ یا کسی سے اختلاف رائے ہو جائے تو گھر کے
باغچے کی دیوار پر جا کر ایک کیل گاڑ دیا کرو۔
لڑکے نے پہلے دن باغچے کی دیوار پر ستیس کیلیں گاڑیں
لیکن اگلے دن سے اس نے بار بار باغچے میں جا کر دیوار پر
کیلیں ٹھونکنے کے بجائے اپنے آپ پر پتھر پھینک کر شروع کر
دیا اور روزانہ دیوار پر گاڑی جانے والی کیلیوں کی تعداد کم سے
کم ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ایک دن اس نے ایک بھی کیل دیوار
میں نہ گاڑی شام کو لڑکے نے باپ کو خوشی سے بتایا کہ اس
نے آج ایک بھی کیل دیوار میں گاڑنے کے لیے استعمال نہیں
کی۔
باپ نے غصی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہا۔
"ٹھیک ہے مگر آج سے تم ایک اور کام کرو، جس
سارے دن میں تم اپنے آپ پر مکمل کنٹرول رکھ لو اس دن

جا کر دیوار سے ایک کیل واپس نکال لیا کرنا۔"
اس کام میں بہت سے دن تو لگے مگر آخر کار وہ دن
آ پہنچا جب لڑکا دیوار سے ساری کیلیں واپس باہر لیٹ چکا
تھا۔
باب لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر اسے باغچے کی دیوار کے پاس
لے گیا اور کہا
"دیکھ اپنے ٹھک تم نے اس عرصے میں اپنے غصے اور
مزاج پر قابو پا کر بہت اچھی کارکردگی دکھائی ہے، مگر اس
دیوار کو دیکھو جس پر کیلیوں کے گمانے اور اٹھانے سے
پڑے والے پتھر نشانہات، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہ گئے ہیں۔
اور یہ دیوار اب دوبارہ بھی دیسی نہ ہو سکے گی جس طرح
کہ پہلے تھی۔ بالکل اسی طرح جب تم اپنے معاملات میں
دوسروں سے اختلاف رائے کے دوران باغچے کی حالت
میں تند و تیز باتیں، طعن و تشنیع یا بد زبانی کرتے ہو تو ان
پر بالکل ایسے ہی گہرے اور بُرے اثرات چھوڑ دیتے ہو
جا ہو تو جو کسی کے پیٹ میں گھونپ دو۔ خبر سے لگا ہوا
زخم مندمل ہو جائے گا، تمہاری معافی اور التجا سے اس
شخص کے ساتھ تمہارے تعلقات بھی دوبارہ بحال ہو جائیں
گے مگر خبر کے زخم کے اثرات ہمیشہ باقی رہیں گے۔ زبان
کے لگے ہوئے زخم کو خبر کے لگے ہوئے زخموں سے بھی زیادہ
دلوں پر گہرے اثرات رکھتے ہیں۔ دوست نایاب ہیرن
اور بیش قیمت جواہرات کی مانند ہوتے ہیں۔ بہتر ہے
کہ اپنی زبان کو قافلوں رکھنا کہ اس کے لگائے ہوئے
گھاؤ مندمل نہیں ہوں گے۔"
(فرانز ڈے اسپیل - روزنامہ جہاد)
دین،
مسجد ہی فقط اللہ کا گھر نہیں، اس کے باہر ایک دوسری
مسجد بھی ہے۔ اس سے بہت بڑی، جس کا نام ذلیل ہے۔
جس طرح چھوٹی سی مسجد میں آدمی ہر کام اور ایک ایک
حرکت اللہ کی ہدایت کے مطابق انجام دیتا ہے اس طرح
اس مسجد سے باہر بھی آدمی اپنے سارے معاملات اور
تعلقات اللہ تعالیٰ کے فرمان کے بموجب قائم رکھے تو یہی
عبادت ہے اور اسی کا نام دین ہے۔
تحریر: فیصل آباد

عکس کی دنیا

فوزیہ ٹریٹ
مجھے ضبط نہ ہو پر غرور تھا، میرے آسوں نے وفائی کی
میرے دل پر غرور تھا، میری جہنم سے ٹک گئے
مجھے چھوڑ دیں کہ نہ حال نہیں میری لڑائی کے ہاتھ سے
مجھے اعتراف شکست ہے میرے باقی راہ میں شکست
آتم امتثل
میرزا اب اپنے پیری اکھن کے حوالے کر کے
تو کہاں ہے مجھے سینوں کے حوالے کر کے
مجھ کو معلوم تھا اک روز چلا جائے گا
وہ مری عمر کو یادوں کے حوالے کر کے
سیدہ نسبت زہرا
اک اوصاف عشق کا قصہ چڑھا اور شام کچھ دھلنے لگی
گھر کا کھر بڑھا چلا میں سے بھر گیا اور شام کچھ دھلنے لگی
موسم ہرماں کی ڈھلی آخری بے رنگ شاموں کے بیچ
زخم لہکے درد سادل میں اٹھا اور شام کچھ دھلنے لگی
حسہ شاہ کھٹکا
کیسے جی سکتے اگر بل کر کرتے احتساب
زیست کی خاطر بہت کچھ دگر دگر کرنا ہی تھا
آمد اجالا
کوئی روٹے اگر تم سے اُسے فوراً منا لینا
اناک جنگ میں اکثر جلدائی جیت جاتی ہے
نویہ
مجھے منزلوں سے عزیز تر تیری راہ گزرو کی ساتھی
کہ کبھی میں میرے نصیب میں ابھی میری ساتھی
خانیہ ایم اعوان
اہل نظر کے محنت میں کس نے یہ کلمہ دیا
رہتا کسی کے ساتھ، محنت کسی کے ساتھ
ہوتی ہے اس کے دل کو کسی اور کی طلب
رکھتی ہے عمر بھر اسے قسمت کسی کے ساتھ

شفیق شان شاہ
اُس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑی تو عروس ہوا
بہی وہ جگہ ہے جہاں راستہ بدلنے سے
رضانہ کوثر
سوچتے ہیں بنا ہی ڈالیں اب
کوئی فرق اداس لوگوں کا
سیدہ نسبت زہرا
کرو چھوڑے کوئی وعدہ کبھی نہ پھرنے کا
تمہیں کیا فرق پر تباہے پھرنے میں، تمہیں
گر دیا شاہ
ہے آج بھی ہماری انا کا دی مزاج
مشکل ہے اپنے درد کا اظہار آج بھی
فوزیہ ٹریٹ
مجھے محنت کرنا نہیں آتا
مجھے محنت کے ہوا کچھ نہیں آتا
زندگی گزرائے کے دوستی طے ہیں محنت
ایک مجھے نہیں آتا، ایک مجھے نہیں آتا
نوال افضل گھمن
یہ غلبہ عرش بریں نہیں کہاں پاؤں دکھوں زین نہیں
تیرے دیے ہوئے کے شوق ہے جو ہاں نہیں تو کہیں نہیں
کسی بت تراش نے شہر میں مجھے آج کتنا بدل دیا
میرا چہرہ میرا نہیں رہا یہ جبین بھی میری جبین نہیں
رضوانہ شکیل راؤ
کیا حسن اتفاق ہے ان کی گئی ہیں ہم
اک سام سے گئے تھے کہ ہر کام سے گئے
ارم کمال
انا کا معاملہ دوستوں تھا ورنہ حقیقت میں
اسے میری 'مجھے اس کی کمی محسوس ہوتی ہے

ثالثہ اکبر
پاس خاطر تھا اسیری میں ہمیں صیاد کا
ورنہ ہوتا دام سب ٹکڑے اگر پر مارتے
لاریب
ظلم سے نسل پڑے جسے تن میل کرے
یہ عمل ہم میں ہے بے علم پرندوں میں نہیں
ہم جو انسانوں کی سی تہذیب لیے بھرتے ہیں
ہم ساوحتی کوئی جنگل کے درندوں میں نہیں
نیلورس
دیے جو بام پر رکھے تھے میں نے بچہ گئے سارے
اسی تارک شب میں اُس کو میرے گاؤں آنا تھا
وہ جب اوجھل ہوا تو ہم بھی اپنے آپ سے چونکے
اسے آواز دینا تھی اسے واپس بلانا تھا
نادیہ عباس دیا
عمر بھر کا حساب کر ڈالا
اس نے پھر لاجواب کر ڈالا
ہم خزاں کا اجازت منظر تھے
چوہ کے اس نے گلاب کر ڈالا
کائنات اصغر بوزدار
اس رات توٹے ہوئے تاروں کی گرج میں
ہم کتنی دیر چلتے رہے کچھ بتا نہیں
کب تک ہم اپنے ان بے فتنوں کی کریمیاں
فرق ہوئے چلتے رہے کچھ پتا نہیں
زینت نذر
بھرنے لیں، ہوا کہ دل کیا نہیں رہے
وہ بھی انا پرست تھا میں بھی انا پرست تھا
نخبہ اکرم
میرے دیکھے ہوئے پہنے کہیں لہریں نہ لے لیاں
گھر ورنہ ریت کے سنا کر توڑ دیتا ہوں
قدیم اب تنگ وہی پچھن ہی توڑ دیتا ہوں
قصص کو چھوڑ دیتا ہوں پرندے چھوڑ دیتا ہوں
آسیہ جاوید
حال پر میرے توجہ، میری ہر بات پہ جی
اب جو ہے مجھ پہ غنایت بھی اسی تو نہ تھی

شاہ
بھرنے لیں، ہوا کہ ساتھ تیرا چھوڑنا پڑا
ثابت ہوا کہ لازم و ملزوم کچھ بھی نہیں
حسنہ حبیب
تکیا غضب ہے کہ اُس کی خاموشی
مجھ سے باتیں ہزار کرتی ہے
فاطمہ
اُس کی صورت کو جب سے دیکھا ہے
میری آنکھوں پہ لوگ مرتے ہیں
نوال افضل گھمن
مجھے موسموں کے سراب میں بھی بام وعدے عذاب میں
وہاں عمر ہم نے کتنا دی جہاں سانس لینا محال تھا
کہیں خونِ دل سے گھلا تھا تیرے سالِ بچہ کا ساخنہ
وہ ادھوری ڈائری کھو گئی وہ بچلے کون سا سال تھا
مریم خان
کتنی بل تکی ہے وہ رت جنبہ بھی وہ نہیں رہے
دل پہ تیرے فراق کے صدمہ بھی وہ نہیں رہے
یہ بھی ہوا کہ تیرے بعد شوق سفر نہیں رہا
جن پہ بچھے ہوئے تھے دل رتے بھی وہ نہیں رہے
عروہ خان
انا پرست ہے اتنا کہ بات سے پہلے
وہ اٹھ کے بند میری ہر کتاب کر دے گا
نینی صفت
تھی میری تباہی میں کچھ دوستوں کی بھی سائنس
دوڑ یہ اجڑے کا موسم تو نہیں تھا
سیدل آصف
تیرے گرد ہے میری دعاؤں کا دائرہ
میں تیری عافیت کی مبارک گیر ہیں
مریم آتم امتثل
زخم دینے کا انداز کچھ ایسا ہے
زخم دے کر پوچھتے ہیں اب حال کیسا ہے
کسی ایک سے گلہ کیا کہنا اے دوست
ساری دنیا کا مزاج ایک جیسا ہے



ہے اور ایک بیوی کے لیے یہ بڑا امتحان ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے شوہر کی شادی کروائے۔
 ”وہی کے موضوعات پر کئی سیریز بن چکی ہیں مگر اس کی انفرادیت یہ تھی کہ اس میں ایک پڑھے لکھے گھرانے کو دکھایا گیا تھا۔“
 ”بالکل۔ تب ہی تو سارے کام ممبروں شکر سے ہوئے، مگر اس کی کم عمری تو ہمیشہ میری دشمن ہی رہی جبکہ میں اس کے ساتھ مخلص تھی۔“
 ”تو کیا ابھی بھی یہ روایات پائی جاتی ہیں اور زمانہ اتنی ترقی کر گیا ہے پھر بھی اسے زندہ رکھا ہوا ہے؟“
 ”مسئلہ یہ ہے کہ انسان کتنا ہی پڑھ لکھ کیوں نہ جائے اپنی روایات کے تابع ہی رہتا ہے اور یہ روایات ابھی بھی ہیں۔ کبھی بڑی عمر کی لڑکی اس کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے تو کبھی بہت ہی چھوٹی عمر کی لڑکی ایک بوڑھے آدمی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ یہ فرسودہ رسم و رواج

دستیک دستیک دستیک

شاہین کرشن

ہیں ان کا خاتمہ ہونا چاہیے ورنہ لڑکیاں تو جیتے جی مرجائیں گی۔“

”ممانیہ! آپ نے ہمیشہ پونڈی رول کیے شاید ”سیرزادی“ میں پہلی بار نگیشو رول کیا۔ یہ کردار طبیعت کے خلاف تھا؟“

”کوئی رول فنکار کی طبیعت کے خلاف نہیں ہوتا۔ کیونکہ فنکار نام ہی ایسی شخصیت کا ہوتا ہے جو ہر رول کرنا جانتا ہو۔ تو اسیرزادی کا رول مجھے اچھا اور عام روئین سے ذرا ہٹ کے لگا۔ اس لیے میں نے کر لیا اور اس کا بھی بہت اچھا ریسائٹ ملا۔ ایک طرف ”نم“ سے ہمدردیاں مل رہی تھیں تو دوسری طرف

ثانیہ سعید

”بیوی کی کیا حال ہیں۔“

”جی اللہ کا شکر ہے۔“

”نم اور اسیرزادی۔ بیک وقت دو سیریز آن ایئر ہوئے۔ ایک میں نگیشو رول اور دوسرے میں پونڈی رول تھا۔ ریسائٹس کس کا زیادہ اچھا تھا؟“

”ریسائٹس تو دونوں کا ہی بہت اچھا تھا۔ ایک میں مظلوم بیوی کا جو اپنے سے کم عمر شوہر کو بہت ناز و نعم سے پالتی ہے اور پھر جب وہ جوان ہو جاتا ہے تو خوشی خوشی اس کی شادی کر دیتی ہے۔ لوگوں نے بہت زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا کہ آپ کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی

”اسیرزادی“ سے نفرت۔ تو یہ سب کچھ تو چلتا رہتا ہے۔“

”اور جھکا جان میں طوائف کا کردار؟“

”ہاں اسے بھی لوگوں نے بہت پسند کیا تھا اور مجھے بہترین اداکاری کا گلس ایوارڈ بھی ملا تھا۔ بس زندگی کے تجربات اور مشاہدات کا پتوڑ ہم تو پیش کر دیتے ہیں۔ لوگ پسند کرتے ہیں تو خوشی ہو جاتی ہے مجھے پہلا ”ہم“ ٹی وی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔“

”تقید و تعریف کو انجوائے کرتی ہیں؟“

”نہ صرف انجوائے کرتی ہوں بلکہ سیکھتی بھی بہت کچھ ہوں۔ صحیح تو کہا جاتا ہے ہم فنکار ساری عمر سیکھنے کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔“

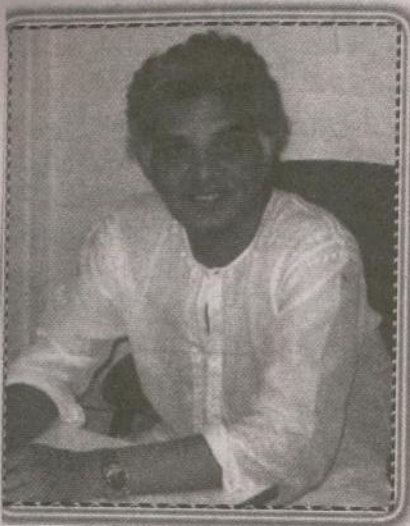
”جس طرح ایک ڈاکٹر ساری عمر پڑھنے کے عمل سے گزرتا رہتا ہے۔ خیر، یہ بتائیے سال میں ایک یا دو سیریز کیوں کرتی ہیں؟“

”میں کام کا یہ دو صورتوں میں اٹھاتی ہوں، ایک تب کہ میں ذہنی طور پر کام کے لیے آمادہ ہوتی ہوں اور دوسری جب کوئی بہت ہی اچھا اور میری پسند کا رول ہوتا ہے کیونکہ میرا نہیں خیال کہ اداکاری اتنا آسان کام ہے کہ اسکرپٹ پڑھا اور پر فارم کر دیا۔ اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا پڑتا ہے۔“

”آپ نے آنکھ کھلتے ہی والد صاحب کو تھپڑ کرتے دیکھا لوگوں کے لیے کام کرتے دیکھا۔ تو آپ کے بھی یہی خواب تھے کہ والد کے نقش قدم پر چلوں؟“

”خواب تو بے شک یہی تھے کہ والد کے نقش قدم پر چلوں، کیونکہ بہت کم عمری سے والد صاحب کے پروڈیوس کردہ تھیٹر میں کام کر رہی ہوں، مگر اس کے علاوہ بھی میری یہ خواہش تھی کہ میں کسی اور شعبے میں نام پیدا کروں۔ تدریس یا میڈیسن کے شعبے میں جاؤں، مگر پھر تھیٹر میں اور اس کے بعد ٹی وی

پروگراموں میں اتنی زیادہ مصروف ہو گئی کہ تدریس اور میڈیسن کا خیال چھوڑ دیا اور سائیکولوجی میں ماسٹرز



کیا۔“

”ظہار کا موثر ذریعہ تھیٹر کو کہا جاتا ہے ٹی وی کو نہیں؟ جبکہ ٹی وی تو ہر گھر میں ہوتا ہے؟“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں، لیکن آپ نے شاید یہ بات محسوس کی ہوگی کہ ٹی وی ڈرامے ایک ہی نشست میں بیٹھ کر نہیں دیکھے جاتے۔ پھر وہ کئی کئی اقساط پر مبنی ہوتے ہیں جبکہ تھیٹر کم دورانیہ کا ایک مکمل ڈرامہ ہوتا ہے۔ لوگ توجہ کے ساتھ دیکھتے ہیں اور اچھی باتوں کو دل میں اتراتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ فوری ریسائٹس بھی تھیٹر سے ہی ملتا ہے۔ آڈینس کو بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کیا اچھا ہو رہا ہے اور فنکاروں کو بھی

اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ جو پیغام دینا چاہتے ہیں وہ لوگوں تک پہنچ رہا ہے یا نہیں۔“

”یعنی آپ کے کہنے کا مقصد ہے کہ تھیٹر کے ذریعے معاشرے میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔“

”بالکل لائی جاسکتی ہیں۔ میں بہت موثر ذریعہ سمجھتی ہوں تھیٹر کو۔“

ثانیہ سعید 20 اگست 1975ء میں پیدا

ہوئیں اور تقریباً ”دس سال کی عمر سے اس فیلڈ سے وابستہ ہیں اور اب یہی ان کا پروفیشن ہے۔ ثانیہ کی شادی 1999ء میں شاہد شفاعت کے ساتھ ہوئی اور یہ اپنی ازدواجی زندگی میں بہت خوش ہیں۔ فیوجے میں ان کا ارادہ فلموں میں کام کرنے کا بھی ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ کردار بھی اچھا ہو اور فلم کی اسٹوری بھی جان دار ہو، جبکہ فی وی ڈراموں سے وہ کافی مطمئن ہیں۔

تئوریہ جمال

”آج کل کیا مصوفیات ہیں؟“
”آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں آج کل ڈراما پروڈکشن میں ہوں۔ تین چار ڈراما سیریلز کے لیے کام کر رہا ہوں اور خود بھی پرفارم کروں گا۔“
”آج کل کے ڈرامے کیا کیسائیت کا شکار نہیں ہیں۔“

”بالکل ہیں۔ موضوعات تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں، بس پیش کرنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ یہ ڈرامے ہمارے معاشرے کے عکاس نہیں ہیں۔“
”چھینلو زیادہ آگے ہیں یا افرائی بہت ہو گئی ہے۔“

”افرائی زیادہ ہو گئی ہے، پہلے کہانی پر بہت توجہ دی جاتی تھی، کوشش کی جاتی تھی کہ کوئی کہانی کسی دوسری کہانی سے پیچ نہ کرے۔ مگر اب ایسا نہیں ہے۔“

”سنائے اب تو سیٹ پہ اسکرپٹ ملتا ہے اور کام شروع ہو جاتا ہے؟“

”ایسا بھی ہے۔ لیکن فنکار محنت کرتے ہیں، لیکن پہلے کی بات کچھ اور تھی پہلے تو ہر سہل پہل جی بہت توجہ دی جاتی تھی۔ مگر اب نہیں۔“

”کیا معیار گرا ہے؟“
”میں نہیں سمجھتا کہ مکمل طور پر معیار گرا ہے، کیونکہ اچھے اور برے ڈرامے تو ہر دور میں ہوئے ہیں

اور اب بھی ملتا جلتا۔ چنانچہ بہت سے ڈرامے بہت معیاری اور بہت اچھے ہیں۔“
”آپ نے ڈراما سیریل ”جانگوس“ سے شہرت پائی۔ اب بھی لوگ اس حوالے سے پچھتے ہیں؟“
”جی جی۔ بالکل۔ پچھتاتے ہیں۔ گزرنے زمانے کے ڈراموں کو تو لوگ آج تک یاد رکھتے ہیں۔ ہوتے ہی اتنے اچھے تھے ڈرامے اور پھر کاظمی شاہی سے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر۔“

”اور گھر میں سب ٹھیک ہیں۔ آپ کی بیگم۔ بچے وغیرہ۔“

”جی اللہ کا شکر ہے۔ سب ٹھیک ہیں اور گزشتہ پانچ چھ سال سے جاپان میں ہی ہیں۔“

”اچھا۔ کیا کراچی کے حالات سے گھبرا کر آپ نے ان کو جاپان بھیج دیا؟“

”ارے نہیں اصل میں میری بیٹیاں جاپان میں

تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور بیٹا امریکا میں۔ تو بچوں کی وجہ سے بیگم کو وہاں شفٹ ہونا پڑا۔ ورنہ تو ہم ایک عرصے سے پاکستان اور کراچی میں تھے۔“
”تو آپ؟ اپنے پروفیشن کی وجہ سے؟“

”میرے یہاں رہنے کی دودھیات ہیں ایک تو جیسا آپ نے کہا کہ میرا پروفیشن ہے پھر میری ماں یہاں رہتی ہیں اور مجھے اپنی ماں سے بہت پیار ہے انہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ ہاں، جاپان میرا تانا بانا لگا رہتا ہے۔“

”بچے آپ کی فیلڈ میں آئے؟“

”نہیں۔ ایک بیٹی صحافی ہے اس نے صحافت پڑھی ہے، ایک کی شادی کر دی ہے اور ایک بیٹا ہے۔ اس کے بارے میں تو میں نے آپ کو بتا ہی دیا ہے۔“

”بیگم کو اور دو آئی ہے؟“

”ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ اب تو وہ بہت اچھی اردو بول سکتی ہے اور میں اپنی بیوی کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ وہ نہ صرف ایک اچھی بیوی ہے بلکہ بہت اچھی

ماں بھی ہے۔ میں بہت خوش ہوں اپنی لائف میں۔“
”اور ہمیشہ خوش رہیں۔ ان شاء اللہ جلدی آپ کا تفصیلی انٹرویو کروں گی۔“
”ان شاء اللہ۔“

عابدہ پروین

بہت زمانہ ہو گیا عابدہ پروین صاحبہ سے بات کیے ہوئے۔ مگر ان کی کچھ باتیں آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہیں۔

”کس عمر سے گارہی ہیں اور کب احساس ہوا کہ گلے میں سُر ہے؟“

”والد صاحب بتاتے ہیں کہ جب تین سال کی تھی تو کچھ نہ کچھ گاتی رہتی تھی، والد کو احساس ہوا کہ بیٹی کے گلے میں تو سُر ہے اور اگر ابھی اس کی تربیت کی گئی تو یہ بہت نام پیدا کرے گی اور ان کی تربیت اور محنت کام آئی۔“

”گویا گھٹی میں موسیقی ہے۔“

”جی۔ بالکل گھٹی میں ہے میوزک۔ والد صاحب خود بہت بڑے گلوکار تھے ان کا اپنا اسکول تھا اور بہت لوگ ان سے میوزک سیکھنے کے لیے آتے تھے۔“

”عارفانہ کلام کی طرف رجحان رہا۔ وجہ؟“

”ہمارے گھر کا ماحول بہت ادبی اور مذہبی تھا تو جیسا گھر کا ماحول ہو، بچہ بھی اسی کا عادی ہو جاتا ہے۔“

”ملک سے باہر جاتی ہیں تو کیا محسوس کرتی ہیں؟“

”بہت اچھا محسوس کرتی ہوں کیونکہ دوسرے ملکوں میں بھی میرے چاہنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور میں تقریباً ”دنیا کے سارے ممالک میں جا چکی ہوں اور اپنے فن کا اظہار بھی کر چکی ہوں۔“

”صرف اپنے پاکستانی ہی شرکت کرتے ہیں آپ کے پروگرام میں؟“

”میرے پروگرام میں ہر وہ شخص وہ خواتین و

حضرات شرکت کرتے ہیں جن کو عارفانہ کلام سے لگاؤ ہے اور جو اردو زبان کو سمجھتے ہیں۔“
”ایوارڈ کی تعداد کتنی ہو گئی ہوگی؟“

”ماشاء اللہ کافی ایوارڈز مل چکے ہیں۔ مثلاً ”شاہ عبداللطیف بھٹائی ایوارڈ“ جو کئی سال تک ملتا رہا۔ اس کے علاوہ حضرت شاہ قلندر ایوارڈ، پرائڈ آف پرفارمنس، مگر بی بی ایوارڈ، ہلال امتیاز اور بھارت کا لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔“

”صوفی شعراء کے علاوہ کن شاعروں کو بہت شوق سے پڑھتی ہیں آپ؟“

”صوفی شعراء کے علاوہ میں پروین شاکر، فیض احمد فیض، احمد فراز، عبید اللہ علیم، نصیر تہاں اور احمد فراز کا کلام بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔“

”صرف شاعری سے شغف ہے یا نثر سے بھی لگاؤ ہے۔“

”ارے بیا کیوں نہیں لگاؤ ہوگا، مجھے تو بڑھنے کا بہت شوق ہے۔ میں زیادہ تراش افغان احمد بانو قدسہ، منو بھائی اور ہر اچھا لکھنے والا مجھے پسند ہے اور میں انہیں پڑھتی رہتی ہوں۔“

”بچوں نے آپ کا اثر لیا؟ میرا مطلب ہے کہ انہیں میوزک سے لگاؤ ہے۔“

”میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ بیٹے اور ایک بیٹی کی شادی ہو چکی ہے اور میں ماشاء اللہ سے نالی بھی ہوں اور دوا دی بھی ہوں۔ جہاں تک شوق کی بات ہے تو بچوں کو شوق ہے، مگر ابھی اس فیلڈ میں نہیں آئے ہیں۔“

”ایک بار آپ نے کہا تھا کہ آپ ایک میوزک اکیڈمی قائم کریں گی تو پھر کیا سوچا اس بارے میں؟“

”ہاں ان شاء اللہ ضرور۔ اپنی آرٹ گیلری میں میوزک کی ٹریننگ ضرور دوں گی۔“

”آرٹ گیلری؟“

”جی آرٹ گیلری جو کہ اسلام آباد میں ہے اور یہاں لمبوسات، جیولری اور ہنر مند گھڑی نمائش وغیرہ ہوتی ہے۔“

شعاع کے ساتھ

ادارہ

توبہ نور بھاول نگر

شعاع کو ہم نے ایسے دریافت کیا جیسے کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔ یعنی بے خبری میں۔ ارے بھئی ہمارے ارد گرد، آگواڑے، پھوڑے، دور یا نزدیک کہیں بھی کوئی ڈائجسٹ نہیں پڑھتا اس کے باوجود ہم اس کے ”بے قاعدہ“ سے ”باقاعدہ“ قاری بن چکے ہیں۔ تو دریافت ہی کیا ہے؟

ہوا کچھ یوں کہ ہمیں ایک تھا بادشاہ ٹائپ کمائیاں پڑھنے اور سننے کا بہت شوق تھا۔ اور شازی ایک دن فرماتی ہیں۔ ”یار پاپا! میں نے بھی ایک کمائی پڑھی تھی“

سناؤں؟ اور پھر کمائی سنائی شروع کر دی۔

”ٹیک گھر میں کافی سارے گزرتے تھے ان میں سے ایک ناراض ہو کر گھر چھوڑ کر چلا گیا اس کی بہن بہت روتی تھی وغیرہ اور اس سے آگے میں نے پڑھی ہی نہیں۔

اب وہ محترمہ تو اطمینان سے بیٹھ گئیں لیکن میں مصیبت میں گرفتار ہو گئی کہ پتا نہیں آگے کیا ہوا؟ خیر کافی خواری کے بعد وہ کتاب ملی تو پتا چلا کہ وہ بھائی ہی آئندہ زندگی میں رونے والی بہن کے مجازی خدا ثابت ہوتے ہیں کیونکہ وہ بھائی نہیں بلکہ پچازاد تھے۔ یہ تو ابتدا تھی اس کے بعد تو چراغوں میں روشنی نہ رہی، سمجھ آئی یا نہ آئی کبھی ہاتھ لگنے والا کوئی خواتین یا شعاع چھوڑا نہیں۔

جہاں تک بات ہے دلچسپ واقعہ کی توجہ نہ کبھی بھی ایسا ہوتا ہے کہ دل سینے میں چپ ہو جاتا ہے ہر جانب اک اندھیرا گھپ ہو جاتا ہے۔

آہو جی! کچھ ایسی ہی صورت حال بنی تھی کہ امی نے کسی کام کے لیے مجھے آواز دی میں وہیں سے رسالہ رکھ کر چلی گئی۔ میرے ایک انگل جی چلے آئے اب مسئلہ یہ تھا کہ ہم تو ان سے چوری چوری رسالہ پڑھتے تھے۔

خیر ادھر وہ اندر داخل ہوئے ادھر میں نے چھوٹی بہن کو اشارہ کیا کہ ”اسے چھپا دو“ پہلے تو اس نے توجہ نہیں دی مگر جب آنکھوں ہی آنکھوں میں منت شفت کی تو وہ محترمہ بالکل غواست اٹھیں۔ رسالہ اٹھایا اتنے میں انگل جی بھی سر پر پہنچ گئے اور وہ بھی عین میری آنکھوں کے سامنے رسالہ لہرا کر کہتی ہیں۔

”ایہ چھپانا ہے؟“ میں نے تو سنی ان سنی ہی کر دی جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ آخر کار محترمہ کو ہم پر ترس آئی گیا وہ رسالے کو اندر چھپا آئیں اور جب ہم اپنا کام مکمل کر کے واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ”مضی سی پی“ جو ہمارے گھر مہمان آئی ہوئی تھی۔ رسالہ عین انگل جی کے سامنے رکھے ”مضی سی پی“ دیکھ رہی تھی اور ہم؟

”ہم ہنس دیے ہم چپ رہے منظور تھا پڑھنا“ لیکن اس دن انگل جی نے مجھے کچھ بھی نہ کہا (ظاہر ہے ساری محنت انہوں نے اپنی آنکھیں سے دیکھی تھی)

2۔ یہ تو بالکل ٹھیک کہا گیا ہے کہ ”افسانوں کی دنیا میں سب جھوٹ نہیں ہوتا“ بلکہ میرا تو خیال ہے کچھ بھی جھوٹ نہیں ہوتا۔ آپ پڑھتے جائے زندگی کے مختلف رخ آپ کے سامنے کھلتے جائیں گے کہیں رنگینیاں ہیں شوخیاں ہیں تو کہیں خون کی ہولیاں کسی

کی چوٹیاں کندم کے سیر پر یکس یا کسی غریب کے محنت سے بنائے گئے تاج کسی امیر کی شان میں مزید اضافہ کرنے پہنچ جائیں۔ جھوٹ تو کچھ بھی نہیں ہوتا بس آگاہی مصیبت بن جاتی ہے۔ صدیوں کا سفر اپنے سر پر لا دنا آسان تو نہیں؟

ایسی تو کئی تحریریں ہیں جو دل پر نقش ہیں۔ جیسے ”بیاباں میں ہے لالہ منظر کب سے“۔ دل من مسافرمین، میں نیل کرایاں نیلکلاں کو تو پڑھ کر آنکھیں چمک چمک پڑیں اور ”رفص جنوں“ کو تو گویا سانس روک کر پڑھا تھا۔ بشری جی! بہت کم پڑھا ہے آپ کو مگر۔

”دل بھول نہیں پاتا۔“ اس کے علاوہ عمیرہ احمد، جبین سٹریٹ، تنزیلہ ریاض (جو اب نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ہیں) کا فائزہ افتخار اور اس کے علاوہ بھی کافی ساری رائٹرز ہیں جن کی تحریریں انٹ نقش چھوڑ جاتی ہیں۔

اور ہاں عالیہ بخاری کے لیے تو میں کہوں گی کہ مجھے لگتا ہے انہیں لکھنے کے لیے بالکل محنت نہیں کرنا پڑتی ہوگی۔ لفظ خود بخود ہی نوک قلم سے نکل کر ابھرتے ہیں اور بڑی بڑی باتیں سادہ سادہ انداز میں بتائے چلے جاتے ہیں۔

اور نگہت سیما جی! سن لیجئے کہ میں آپ کی تحریریں کبھی رات کو نہیں پڑھتی، ہمیشہ صبح ہونے کا انتظار کرتی ہوں کیونکہ مجھے لگتا ہے پھر میں سو نہیں پاؤں گی۔ اور نمرق! آپ کے لیے تو بس جنت کے پتے ہی بہت سے پاتوں کا ذکر نہ بھی کیا جائے تو۔

3۔ خویاں اور خامپاں؟ جتنا تو دیتی ہوں پر علیحدہ خود ہی کر لیجئے گا براے مولا۔

تو جناب! سب سے بڑی غامی توبہ ہے کہ چھوٹی سی بات پر آسانی سے مینوں تک کڑھ سکتی ہوں۔ بقول شائستہ ”تمہیں پریشان رہنے کی عادت ہے۔ خیر“ ”لوگوں کا کیا ہے کہ نہ ہو۔“

جی بھر کے غیر مستقل مزاج ہوں کوئی ایسا کام آج

نہیں کرتی جو کل ہو سکتا ہو۔ (یعنی ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں) منتظم مزاج نہیں ہوں بڑی سے بڑی بات آسانی سے ہضم کر لیتی ہوں ہر انسان میں خوبصورتی تلاش کر لیتی ہوں۔ کبھی کسی کا برا نہیں چاہا اور عمل کم کرتی ہوں بلکہ زیادہ کرتی ہوں۔ اتنی بہت ہیں؟ خود ہی اپنا تجربہ کیا ہے کسی سے مدد نہیں لی (پوچھتی تو لون سا کسی نے پتا دیا تھا) ہاں تحریر لی جملہ۔

لوگ کہتے ہیں کہ میں سمجھ دار ہوں۔ پتا نہیں، شاید ”لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے“

4۔ ساون میں تو بس دل چاہتا ہے کہ نیا شعاع ہو اور بس۔ نیا سے مراد ہے پہلے پڑھا ہوا نہ ہو ورنہ کچھ عرصے تک یہ بھی پتا نہ تھا کہ اس کے ٹائٹل پر کس طرح کے مناظر ہوتے ہیں۔ اب تو اللہ کا شکر ہر ماہ دونوں (شعاع، خواتین) باقاعدگی سے پڑھ لیتے ہیں (میرا بیٹی کی مہمانی سے)

جہاں تک دلچسپ واقعہ کا ذکر ہے تو ایک دفعہ کچھ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

سلک جی ایل جی

تیت - 300 روپے

منگوئے کا ہاتھ

ملکہ عمران ڈائجسٹ

37، اندہ بازار، کراچی 32735021

یوں ہوا کہ بڑا اہم نیٹ تھا اور سر نے دھمکی دی تھی ”جو کل نہ آیا وہ پھر نہ آئے“ لیکن جیسے ہی کل آئی ساتھ ہی بارش آگئی اور میں نے اطمینان سے کل کر لی سر کو کہ سر جی! اتنی تیز تو بارش ہو رہی ہے نیٹ تو نہیں ہو گا؟ جولیا ”انہوں نے بھی بتایا کہ بیٹا بیٹی نیٹ تو شروع بھی ہو چکا ہے۔ اب بارش بھی سر یوں کی تھی تو سب نے ہی کہا کہ ”چھوٹو“ اتنی بارش میں کہاں نیٹ ہونے لگا ہے، بیٹھ جاؤ آرام سے۔

لیکن میری ایک سچر نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ”با ادب“ بالیوڈ گلیڈا میں نے کتابیں اٹھائیں اور اور ”ہمت عورتوں مدد خدا“ کے تحت باہر آگئی مین روڈ تک پہنچتے پہنچتے جس نے بھی دیکھا، مشکوک نظروں سے ہی دیکھا۔ اس کی وجہ شاید میری ڈرننگ بھی ہو۔ اس دن میں نے بلیک ٹراؤزر کے ساتھ بلیو قمیص پہنی تھی کہ وہ بلیک کوٹ اور بلیک ہی شال میں بالکل ہی چھپ گئی تھی۔ اتفاق کی بات جو تا اور بلیک بھی بلیک تھا۔ اور بادلوں کے ساتھ دن بھی بلیک بلیک سا ہو رہا تھا۔

اب ایسے مشکوک موسم میں، ایسی مشکوک ڈرننگ کے ساتھ سب نے مشکوک نظروں سے ہی دیکھا تھا بغیر ہمیں کیا؟ لیکن جناب ہماری لاپرواہی اس وقت اڑ چھو ہوئی جب ایک زبردست سادھا کا عین دائیں جانب ہوا، سچی بات ہے اس وقت تو لگا تھا گویا سر رہی ہوا ہے۔ ساتھ ہی یاد آ گیا کہ لوگ کہتے ہیں۔ بلیک رنگ پر آسانی بھلی کرتی ہے۔ اب ہمیں یوں ہی محسوس ہوا کہ آسانی بھلی کر رہی ہے اور اب پتا نہیں گھر والے پہچان بھی پائیں گے یا نہیں؟

ہم شاید اس سے آگے حساب کتاب تک بھی پہنچتے پہچانک پیچھے سے آواز آئی۔ ”جانا ہے؟“ پیچھے مڑ کر دیکھا تو یہ رسک والا تھا۔ اب جانا تو تھا مگر حواس گم تھے یہ بتانا مشکل ہو رہا تھا کہ جانا ہے اور یہ بھی بھول چکا تھا کہ کہاں جانا ہے؟ خیر آہستہ آہستہ حواس بیدار ہوئے تو منزل کے بارے

میں بتایا اور ساری ہمت جمع کر کے رسک میں بیٹھ گئے اور اس کے بعد اوھر اوھر دیکھا تو پتا چلا کہ وہ دن تھی جس کا ٹائر پھٹ گیا تھا۔ اور ہمارے جو اس گم کر گیا تھا۔ ارے! یہ بھی کوئی ڈرنے والی بات تھی؟ ”پانی راستہ یہ ہی سوچتے رہیے۔ جب ”منزل مقصود“ پر پہنچی۔ تو پتا چلا ابھی دنیا سے فرماں برداری ختم نہیں ہوئی کیوں کہ پوری کلاس ہی حاضر تھی جب ہم پہنچے تو ہمیں بھی خالی خالی نظروں سے دیکھا گویا کہہ رہی ہوں۔

”ہم تو ڈوب گئے تم کو پکارا کب تھا“ تب تو ہمیں آنکھیں پڑھنے کا ہوش ہی نہیں تھا مگر جب نیٹ سامنے آیا تو وہی نگاہوں کا مضمون اچھی طرح سمجھ میں آیا تھا۔

ویسے ہمیں بزم میں آتے کسی ”میر“ نے نہیں بس کلاس نے ہی دیکھا تھا اس کے باوجود ”چراغوں میں روشنی نہ رہی“ اور فتنہ جتنا ”پوری کلاس نے موبائلز کی روشنی میں نیٹ مکمل کیا پتا نہیں آئیڈی کے UPS وغیرہ کیا ہوئے؟

”رات گئی بات گئی۔“ والا معاملہ نہیں ہوا بلکہ جب نتیجہ آیا تو۔

”چشم متاب بھی عجب کی جگہ خوں روئی“ پسندیدہ کتابیں تو بہت سی ہیں بلکہ نصابی کتابیں بھی پسندیدہ ہوتیں اگر ابن انشا کی بتائی ہوئی کتابوں جیسی ہوتیں جس کا ذکر انہوں نے نمند کیا ہے، کے عنوان سے کیا ہے۔

ویسے ”عشق قاق“۔ اندھیری رات کے مسافر۔ ”شاہن“ کو کافی دلچسپی ہے پڑھا اور کچھ دن پہلے بشری رحمن کی ”حب“ پڑھی تھی وہ بھی اچھی لگی۔ پسندیدہ اشعار میں یہ شعر بھی شامل ہیں۔

جو اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کر ملتے ہیں صراحی سرنگوں ہو کر بھرا کرتی ہے بیتانہ



گل صفہ سہیل



استقبال

لاڈل مہرین سید بیٹی کی پیدائش کے بعد برطانیہ سے واپس پاکستان آگئی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل وہ ڈیپوری کے سلسلے میں برطانیہ گئی تھیں اور تقریباً ”دو ماہ قبل انہوں نے ایک بیٹی کو جنم دیا تھا مہرین! آپ کو مہرین جونیر کی پیدائش مبارک ہو! مہرین کے سرسالی رشتہ داروں نے اس موقع پر بہت خوشی کا اظہار کیا اور ان کا بھرپور استقبال بھی کیا۔ مہرین سید کچھ عرصہ آرام کے بعد شوزیز کی سرگرمیوں کا آغاز کریں گی۔

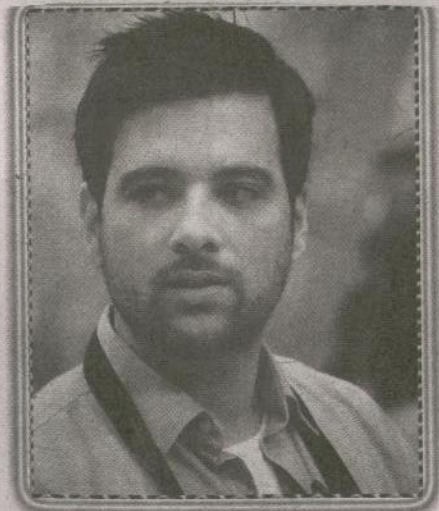
سُہرا دور

ہمارے زیادہ تر فنکار یہی رونا روتے نظر آتے ہیں

کہ انہیں کام نہیں ملتا لیکن میکان فو الفقار نے اس روایت کو توڑتے ہوئے کہا ہے کہ ”میر اس وقت سُہرا دور چل رہا ہے۔ میں اس وقت ڈراما انڈسٹری میں بہت مصروف ہوں۔ میرے کئی ڈراموں کی شوٹنگ چل رہی ہیں اور کئی ڈرامے آن ایر ہیں۔“ میکان نے مزید کہا کہ ”وقت کے ساتھ ساتھ ہر شعبے میں تبدیلی ضروری ہے اور وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو وقت کے ساتھ اپنے آپ کو تبدیل کر لیتے ہیں (تبدیلی کے ساتھ اپنی اصل شناخت بھی ضرور رکھنا چاہیے ورنہ؟) ہماری ڈراما انڈسٹری اس وقت عروج پر ہے اور یہاں انٹرنیشنل معیار کے مطابق ڈرامے تخلیق کیے جا رہے ہیں۔ (جی ہاں انڈیا اور ترکی کے ڈرامے) ہاں بے شک ڈراموں کا ایک دور تھا جب بہترین ڈرامے ہوا کرتے تھے (جب ہی تو یونائیٹڈ سٹیٹس میں ہمارے ڈرامے دکھا کر اداکاری سکھائی جاتی تھی)۔

مخت

بھلا بتائیے اب خبر یہ ہے کہ گلوکارہ فریحہ پرویز نے اسارت رہنے کے لیے جم جوآن کر لیا ہے۔ (فریحہ اب



مزید اسارتیں کس لیے بھیجی؟ وہ ایک معروف جم میں روزانہ تین گھنٹے ایگرسائز کرتی ہیں (تین گھنٹے فریجہ ریاض کرلیٹیں تو گانا ہی سیکھ لیتیں) فریجہ اس حوالے سے کہتی ہیں کہ ”میں خود کو اسارت رکھنے کے لیے یہ محنت کر رہی ہوں کیونکہ شوہر میں خود کو اسارت رکھنا بہت ضروری ہے“ صحیح کہا آپ نے لیکن ہمیں حیرت ہے کہ ہماری اداکارائیں کیوں نہیں یہ جم جوائن کرتی ہیں۔ جبکہ انہیں تو چوبیس گھنٹے ہی ایگرسائز کی ضرورت ہے۔

وجہ

شمعون عباسی نے اپنی فلم ”گلدہ“ میں مرکزی کردار کے لیے ہمایوں سعید کی جگہ اداکار شان کو کاسٹ کر لیا ہے۔ شمعون عباسی نے یہ فیصلہ شان کی فلم وار کی کامیابی کے بعد کیا ہے (ہمایوں کی بھی تو ”میں ہوں شاہد آفریدی“ کامیاب ہوئی تھی) گلدہ گزشتہ دو سالوں سے کافی تیاریوں تک محدود تھی مگر اب بالآخر اس کی شوٹنگز کا آغاز ہونے والا ہے۔ (ابھی بھی ہونے والا ہے۔؟) مزے کی بات ہے کہ شمعون نے



ہمایوں کی جگہ شان کو کاسٹ کیا ہے جبکہ خود شان نے اپنی فلم ارچر کے لیے ہمایوں سعید کو کاسٹ کر لیا ہے اور ان کے مقابل ہیروئن کا کردار ادا کر سکی گی حمیمہ ملک (اوہو تو یہ وجہ بھی شمعون صاحب!)

بات نگلی کی تو پھر۔۔۔

چینلز کو ہر طرح کی آزادی ہے جو چاہیں دکھائیں (میڈیا آزاد جو ہے بھی) یکسپاس میں ویٹا ملک کی حرکتیں ایک چینل سے دکھائی گئیں پھر اداکارہ کی ”قدرتی“ لباس میں تصاویر بھی میڈیا نے چوبیس گھنٹے میں اڑتالیس بار دکھائیں اور کوئی چینل بھی اس میں پیچھے نہیں رہا۔ حد تو یہ ہے کہ ایک چینل نے ایک مذہبی پروگرام کی میزبانی بھی ان اداکارہ کے سپرد کر دی، جہاں وہ لوگوں کو مذہبی مسائل کے بارے میں بتاتی نظر آئیں۔ حد یہ کہ انڈیا کو خوش کرنے کے لیے پاکستان کی ایک خفیہ ایجنسی کا نام بھی اپنے بانو پر لکھوا لیا۔ اس حرکت کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پاکستان کے تمام چینلز ان کا بیٹکٹ کر دیتے لیکن اس



کے بجائے انہوں نے انٹرویو کی سیریز شروع کر دی۔ خاتون کو اپنے دفاع میں بولنے کا بھرپور موقع فراہم کیا۔ محترمہ نے ماہر پیر آزادی کی حمایت کی اور مطالبہ کیا کہ اس کے لیے خاص طور پر قانون سازی کی جائے۔ ہم کی نمائش کو انہوں نے اپنی شخصی آزادی قرار دیا۔

کوئی بھی چینل ایسا نہ تھا جنہوں نے اس اداکارہ کے انٹرویو اور ایک خیالات عوام تک پہنچانے کا فریضہ انجام نہ دیا ہو۔ بعض چینلز سے تو دو دو تین بار انٹرویو نشر ہوئے جو شاید کسی دانش ور، کسی عالم، کسی سیاست دان کے بھی نشر نہ ہو سکے۔

پھر انہوں نے شادی کا اعلان کیا تو ان کی شادی کی تقریبات اس طرح دکھائی گئیں جیسے لیڈی ڈیٹا کی شادی ہو۔ شادی کے بعد میاں صاحب کے انٹرویو کی سیریز شروع ہوئی۔ سارے چینلز باری باری یہ سعادت حاصل کرتے رہے۔ شائستہ لودھی۔

انتا آگے بڑھیں کہ دوبارہ شادی ہی منعقد کرادی۔ ویٹا ملک سے اپنی محبت و عقیدت کا مظاہرہ انہوں نے منقبت لگا کر کیا۔ جو کی مقبولیت مخالفین کو کھٹک رہی تھی۔ ایک چینل نے اس کو دکھایا اور بار بار دکھایا (یعنی جو توہن شائستہ لودھی نے ایک بار فرمائی تھی وہ بار بار اس کے مرتکب ہوئے) پھر کیا تھا، سارے چینلز پر باہمی اخوت کا وہ مظاہرہ دیکھنے میں آیا کہ اللہ دے بندہ لے انہوں نے بھی سنگ ہاتھوں میں اٹھا لیے جو سر سے پیر اس گنگا میں نہائے ہوئے تھے۔ چند انکسوز کو چھوڑ کر جو واقعی صحافی ہیں سب نے خوب سنگ ملامت برساتے حالانکہ جو کچھ شائستہ لودھی نے کیا وہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا، یہ منقبت اس چینل پر جو سب زیادہ غیرت و حمیت کا مظاہرہ کر رہا ہے چار بار اسی شادی بیاہ کے پچھورین اور انچھل کو دیکھ کر ہر چکی ہے اور ایک چینل پر تو باقاعدہ بھگتہ بھی ڈالا جا چکا ہے اس وقت بھمرا اور کبیل آپریشن کی گولیاں کھا کر سوئے ہوئے تھے؟

پیشہ وارانہ رقابت میں چینلز اور انکسوز کے جو اصل چہرے سامنے آئے وہ بہت افسوسناک ہے۔ بہتری اسی میں ہے کہ یہ لوگ تھوڑی احتیاط سے کام لیں ورنہ۔

بات نگلی کی تو بہت دور تک جائے گی۔

کچھ ادھر ادھر سے

☆ فریڈر مودی سے ہجرت کے مسئلہ فسادات کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ انہیں ہجرت میں مسلمانوں کی مارے جانے کا ویسا ہی افسوس ہے جیسے کسی کتے کے بچے کے مارے کچلے جانے پر ہوگا۔

(اکانو مسٹ لندن)

☆ حالات کے پیش نظر اس کا امکان بہت کم ہے کہ فوج ایک بار پھر شرب خون مارے کیونکہ خزانہ بھی خالی ہے اور عوام اب تک حکومت سے پوری طرح مایوس نہیں ہوئے ہیں۔

(روزنامہ جسارت)

☆ پرویز مشرف نے گزشتہ انتخابات میں الیکشن کمیشن کے سامنے اپنے جو گوشتارے داخل کیے تھے ان میں ان کے نقد اثاثے ان کے اپنے بیان کے مطابق 645 ملین تھے۔ جس میں 2012ء میں انہوں نے 129 ملین روپے کا اضافہ ظاہر کیا یعنی 1290 لاکھ روپے۔ اس کے علاوہ اسلام آباد میں چک شنداد کی جنت کراچی گوار اور دوسرے شہروں میں پلاٹس اور لندن میں اپنی جائیداد کا ذکر نہیں کیا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ پچھلے تین برس سے انہوں نے ایک مٹری کا انکم ٹیکس ادا نہیں کیا۔

(کرودیش آصف جیلانی۔ لندن)



میلے کی گھڑی جو ٹہری ہے

نایاب جیلداری

مجھے یاد ہے۔ ہر سال ای نئے گرم کپڑے چادریں جوتے جریاں اور سوٹر جیتی تھیں۔ وہ ہر سیزن میں اپنی چیزیں ”حق داروں“ کو دے دیتا تھا۔ یادوں کے کرب انگیز سیل رواں میں اس کی ”سقاوت“ کا بڑا مواد تھا۔ جب ہم ساتھ تھے تو بہت لڑتے تھے۔ جب جدا ہوئے تو بہت روتے تھے۔ ہمارے دل کی دھڑکنیں اس کی ہر کال سے بندھی تھیں۔

ہر گرمیوں میں وہ بیمار ہو جاتا تھا۔ جب وہ بیمار ہوتا تو خدمت کروانے کے لیے مجھے یاد کرتا تھا۔ جب جیل میں گیا تو لاڈ اٹھوانے والے اور اٹھانے والے چھوٹ گئے۔

اس نے کہا۔ ”تذ کیا ہوتی ہے پہلے نہیں پتا تھا۔ اب پتا چل رہا ہے۔“

زندگی میں ”زندہ“ کے بارے میں کبھی گمان خیال اور وہم تک نہیں آتا تھا۔ زندان کو برت کے اس کا شعور آیا۔ زندان کیا ہے؟ تباہی، دکھ، کرب اور اکیلے پن کا گڑھ۔ جس میں چہرے نظر آتے ہیں۔ کوئی اپنا نظر نہیں آتا۔

زندان کی تشریح اس سے بڑھ کے کیا؟ جب دن دیکھنے کو دل چاہے تو دن نظر نہ آئے۔ جب رات دیکھنے کو دل چاہے تو رات دکھائی نہ دے۔

بیرک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آنے جانے کی آزادی تھی۔

جب ہائی کورٹ میں ضمانت کی تاریخ نکلتی۔ صبح سے لے کر رات کی تاریکی تک اس سسک سسک کر

تیرگی کے گولوں میں کھوئی ہوتی صبح تلاش مشکل ضرور تھا۔ تاہم ناممکن ہرگز نہیں تھا۔ پھر بھی اتنا حوصلہ اتنا صبر اور اتنی برداشت کہاں سے آتی؟ مرنے والوں یہ صبر آجاتا ہے، پھرنے والوں یہ نہیں۔ پھر جب آٹھ دیدار کے لیے ترس رہی ہوں۔ آٹھ بھی ماں کی۔ جس میں انتظار کالی کی طرح جم رہا تھا اور تیرہ جتنی کا کوئی انت نہیں تھا۔ ہر سال عید آتی اور بنا آہٹ کیے گزر جاتی اور وہ اپنی یادیں گھٹوں کی صورت بھیجتا قیدیوں سے موتیوں کے کپ بٹوا بٹوا کر۔ یہ میری بہن کے لیے جس کے پشت بھر کے بال۔ وہ پوچھتا۔ ”لے کے ہیں یا نہیں؟ اتنا پیارا کپ کیسے لگے گا؟“

میں نے کہا۔ ”غم نہ کھا۔ کسی تیرک کی طرح سنبھال رکھا ہے۔ بچی بڑی ہوئی تو دکھاؤں گی۔“ وہ ہنسنے لگا۔ اس کی بھی زندگی کا اٹاٹا اور پوری زندگی کا سرمایہ ہے۔ یہ کون نہیں جانتا تھا؟ ایک دن امی نے حسرت سے کہا۔ ”کب آو گے بیٹا۔“

کہنے لگا۔ ”امی! جیل خانے کے تالے جب کھلیں گے۔ اللہ نے چاہا تو ضرور کھلیں گے۔“

آواز میں ہمت اور جوان مردی ہوتی۔ سوز و گداز میں ڈوبی آواز۔ اکثر ایسے گائے سنا تھا۔ اس کی آواز میں ایک سحر تھا۔ ہاتھ کا بہت کھلا۔ جو آیا خرچ دیا۔ خود یہ نہیں دوسروں سے۔ ابو سے فرائض کر کے مستحق قیدیوں کے لیے استعمال کی چیزیں منگواتا۔

تھک جاتی اور کان ضمانت مسترد ہونے کی خبر سن کر دل وحشی کو دہلانے لگتے۔ امید، آس اور لگن دے دے کی آخری لوکی طرح کانٹے لگتی تھی۔ تاہم دعا ہے کہ کبھی ہلکا نہیں پڑا تھا۔ جین زندہ اور سلامت تھا۔

اس دنیا میں کوئی غروب آخری نہیں۔ ہر غروب کے بعد ایک نیا سورج طلوع ہوتا ہے۔ بشرطیکہ آدمی اپنی شام کو صبح میں بدلنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ ہر خط اور جیل سے آنے والی فون کال کے بدلے میں لفظوں کے حوصلہ افزا امرت کو لونڈو نہ قطرہ قطرہ سامعوں میں پکانا بھی بیخبر آں کے مترادف تھا۔

جواباً وہ صلیب، مضبوطی، استحکام، استواری کے سارے اسباق بھول جاتا۔ اس کی بھیگی آواز میں جیل خانوں کے نوٹے ہوتے، تباہی کی کال ہوتی۔ ٹھنڈ سے ٹھنڈا دینے والی راتوں کی ٹھنڈک ہوتی۔ جسم کو جھلسا دینے والی گرمی کی گراہٹ ہوتی۔

صلیب صرف ”چلیپا کا نشان“ نہیں ہوتی جو ”دار“ یہ چڑھتے ہیں، سولی دار ہوتے ہیں۔ ان سے صلیب کی تشریح تو چھی جائے تو صرف ایک لفظ ”موت“ کا ہر اس بھول اور لفظوں سے ٹپکتا ہے۔

منصف کے سامنے بند کمرے میں ”حکم کی تاریخ“ یہ موت و حیات کا فیصلہ سننا بھی ایک قیامت تھا۔ جب سا بھٹی (دوست) کو سزائے موت کا حکم ہو گیا اور ”اسے“ عمر قید کی سزا۔ آسو گئے تو نہیں تھے، پر اندر کہیں اتر ضرور گئے۔ دکھ عمر قید کی سزا کا نہیں تھا۔ باپ کے جھکے کندھوں پہ جدا ہونے کے بار لا دینے کا تھا۔

میانوالی جیل خانہ زندہ لوگوں کے لیے برزخ کے سوا کچھ نہ تھا۔ سردی میں لحاف کی اجازت نہ تھی۔ آدھا کبل نیچے بچا کے آدھا اوپر لے کر نیند کو آوازیں دینا بل صراط سے گزرنے کے برابر تھا۔ ماں نے سنا تو ترنپ ڈھکی۔ دو اور کبل بھیجے۔

”ایک نیچے بچھایا کرو“ ایک اور لیا کہ۔ ٹھنڈ نہ اترے تو ایک اور اوپر لو۔ ”ٹھنڈ پھر بھی نہ کم ہوئی۔“

ماں نے پوچھا تو آرام سے بتایا۔ ”دو کبل بیرک میں بھجوا دیے ہیں۔ دو میاں بیوی ہیں نا امی! ان کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ بھی ہے۔ بے چارے بہت غریب تھے۔ ان کی تو ملاقات کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ بس انہیں دے دیئے۔“

میرا بھائی ایسا ہی دیالو ہے۔ امی چیزیں پکا پکا کے بھیجتیں۔ وہ بانٹ بانٹ کے نہ تھکتا۔ ساری جیل کا دلارا تھا میرا بھائی۔ ہاتھ اٹھانے والے اتنے ہاتھ تھے۔ پھر بھی دعا قبولیت کی معراج سے کوسوں دور تھی۔ تب تاہم تھے ہم انسان۔ یہ جانا ہی نہیں۔ دعا تو کب کی قبولیت کا شرف پائی۔ اب تو بس انتظار باقی ہے کہ جیل خانے میں لکھا ہوا اس کے جسے کارنق ابھی باقی تھا۔ آس میں ڈولتے فون، بھی بکھار کے لکھے خط۔ بس ایک سی پکار، ایک سی پکار، ایک سی التجا۔

”امی! میری بیٹی امی! نہ رو کر اس امی! آپ ڈھے گئیں تو میں ڈھے جاؤں گا۔ آپ کے آنسو مجھے ملیا میٹ کرتے ہیں۔“

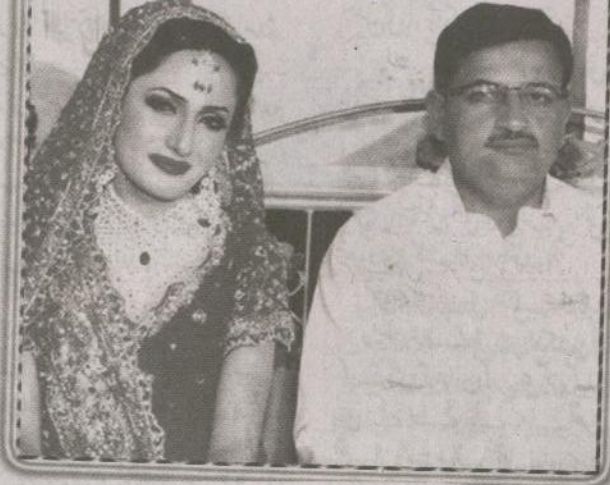
اس کے لہجے کا کرب، دکھ، اداسی، غم اور حسرت۔ خون کے آنسو رلائی تھی۔ امی رات رات بھر بیٹھ کے وظائف کرتیں۔ سوا سو الاکھ آیت کریمہ پڑھا۔ درود، نعت کی محفلیں، قرآن خوانی، دعائیں، طویل تر عبادتیں، نوافل، وظائف۔ پانچ سالوں میں کوئی ایک دن کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا تھا جو امی نے اپنا کوئی ایک بھی وظیفہ چھوڑا ہو۔

ایک دفعہ امی بیمار ہو گئیں تو رات دو بجے اس کی کال آئی۔ امی تھک تھک رہیں، وہ گھبرا گیا۔

”بھابھی کو کیوں جانے دیا۔ بچو کو بلا لائیں۔ امی آپ اکیلی ہیں۔ اتنی بیمار ہیں۔ میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔“

وہ بے حد پریشان اور متشکر ہوا۔ رات تین بجے پھر فون آگیا۔ چوری چھپے، دھیمی آواز میں بولتا ہوا۔ خوف ڈر ہراس۔ کوئی آنے جانے امی نے ڈانٹا۔

”کیوں بار بار کال کرتے ہو، کوئی آجائے گا۔“ وہ



شادی مبارک ہو نازہ لیلقت ہمارا صدف جلیل

بشری گوئل

اڑنی ایک تجربے ہمارے اربابوں پر اوس ڈال دی کہ وہ لوگ شادی پر صرف چند قریبی لوگوں کو ہی انوائٹ کر رہے ہیں۔ ہیں۔ تو کیا ہم قریبی لوگ نہیں ہیں؟ افسوس کے ساتھ صدہ بھی ہوا۔

ریجہ اور شہرمارے ہمارے لیے اسٹینڈ لیا اور پرنکٹ کا اعلان کر دیا کہ اگر ہماری خالہ لوگ نہیں آئیں گی تو پھر کوئی بھی نہیں۔ اور بچے اکثر اپنی بات منوالیتے ہیں۔ سلیتے اور ہنر سے اور ضد سے۔ اور ہم جوش و خروش سے تیاری میں مصروف ہو گئے سرشام مہندی کے فنکشن میں شرکت لائٹ سا پروگرام۔ دونوں بھایاں، عظمیٰ اور کلثوم بھاگ دوڑ میں مصروف تھیں۔ کلثوم ہماری بڑی بہن ہیں اور عظمیٰ کزن۔ ارم نظر نہیں آ رہی تھی، اعظم شوکت اور آصف کی اکلوتی بہن ارم کو تو پیش پیش ہونا چاہیے تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ ارم اپنی بیٹی کو تیار کر کے خود تیار ہو رہی تھی کہ اس کی داوی ساس کے انتقال کی خبر

جب سے ہوئی ہے شادی، آنسو بہا رہا ہوں۔ آفت گلے پڑی ہے، اب تک بھا رہا ہوں قارئین کرام۔ کچھ لوگوں کے شادی کے حوالے سے ایسے ہی نظریات و خیالات ہوتے ہیں۔ جب خود شادی شدہ ہو جاتے ہیں تو دوسروں کو ڈراتے ہیں، روکتے ہیں کہ شادی نہ کرنا یا رو پچھتاؤ گے ساری لائف۔ یا شادی ایسے لٹو پور کے جو کھائے پچھتائے، جو نہ کھائے پچھتائے۔ لیکن پھر بھی باز کوئی نہیں آتا، بھی اگر پچھتاہی شراؤ کھا کے ہی پچھتاہی گے۔ آصف بھائی کی شادی ہمارے خاندان کی بہت بڑی خوشی تھی۔ ہم حیران ہی تو رہ گئے تھے جب سنا کہ آصف بھائی کی شادی ہو رہی ہے۔ بھائی کی شادی کا مسئلہ بڑے سالوں سے التوا کا شکار تھا۔ بہر حال شادی ہو گئی ہے۔ فرحت نے اسلام آباد سے فون کر کے مجھے یہ اطلاع دی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔

ہو۔ اس نے جیل میں مٹھائیاں بانٹی تھیں۔

جس شب برادری میں بیٹھ کر مدعی نے راضی نامے کا اقرار کیا اسی شب صبح کی اطلاع جیل میں بھجوا دی تھی اور پوری رات جیل میں جشن منایا گیا تھا۔ اس کے ساتھی کہتے ہیں کہ ”خوشی اس بات کی ہے تم زندان سے نکل رہے ہو۔ غم اس بات کا ہے کہ ہم پھڑپھڑ رہے ہیں۔ پھر بھی یہ دھجھو ڈاگوارا ہے ہمیں۔“

یہ الفاظ داد شاہ کی زندگی کے پانچ سالوں کا کرب بیان کرنے کے لیے بہت کم ہیں۔ پھر بھی میری اپنی بہنوں سے گزارش ہے۔ جو میرے دکھوں میں شریک رہیں۔ جن کی دعاؤں میں میرے دیر کا ذکر آیا۔ جن کی دعاؤں میں میرے داد کا نام آیا۔ جن کے لبوں نے میرے بھائی کی اسیری کے ختم ہونے کی دعا کی۔ جنہوں نے پچھلے پانچ سال سے میرے ساتھ رابطہ رکھا۔ میرے بھائی کے لیے رب کائنات سے رہائی مانگی۔ کوٹ چھتے سے لے کر کراچی تک۔ پنجاب سے

لے کر سندھ تک۔ اتنی طویل دعاؤں کے حصار میں رہنے والا سید شہزاد عباس (داد شاہ) اپنی بہنوں کی دعاؤں کے طویل اتنی طویل مدت کے بعد عقرب اپنی ماں سے ملنے آ رہا ہے۔ وہ قارئین جو مجھے جانتے بھی نہیں، پھر بھی میرے لیے دعا گو ہیں اور وہ دوست جو مجھے جانتے ہیں اور میرے لیے دعا کا حصار چھتے ہیں۔ میں ان سب کی تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

خصوصی طور پر امتعلیٰ آبی کی جنہوں نے خانہ کعبہ میں میرے بھائی کے لیے خصوصی دعا کی تھی۔ میں ان کی محبت کا اپنے معمولی الفاظ سے شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔ سدرہ صدیقی، نرگس قاسمہ، گوئل، میرا پیارا بھائی گلریز حیدر اور حسن۔ میں آپ سب کا خواتین ڈائجسٹ کے توسط سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آپ سب کے نام میری ایک دعا۔

فضل خدا کا سایہ تم پر رہے ہمیشہ ہر دن چڑھے مبارک، ہر شب بخیر نرے



گھبرا رہی تھیں۔
”ہی! میں تو مسجد گیا تھا آپ کے لیے دعا کرنے آپ کو آرام آیا؟ دیکھیں، میں نے اتنی دعا کی ہے۔ نفل بھی مانے ہیں۔“

دھیمی آواز میں ماں کے لیے اتنی بے قراری تھی کہ امی کے آنسو گرنے لگے۔ حیرت انگیز طور پر امی کا ورد ختم ہو گیا۔ اس کی دعا میں اتنی تاثیر تھی کہ امی کی تکلیف رفع ہو گئی تھی اور وہ امی کو چپکے چپکے ہٹا رہا تھا۔
”ہی! میں ایسی جگہ پہ کھڑا ہوں۔ یہاں کوئی نہیں آسکتا۔ دروازے کی کنڈی لگا رکھی ہے۔ امی! یہاں اتنی بدبو ہے کہ کھڑا رہنا دشوار ہے۔ اتنی غلیظ سانس اٹھ رہی ہے۔ تعفن اور بدبو سے معدہ اٹنے کو ہے۔ پاپ سے گند اپنی رس رہا ہے۔ ٹوٹے پاپ اور گند کی سے اٹھتے کڑے پس کھڑا ہوں۔ ٹوٹی ٹھول رکھی ہے، تاکہ آواز باہر نہ جائے۔ آپ کی طبیعت پوچھنے کو فون کیا ہے۔ مجھے کیسے نیند آتی۔ آپ بیمار جو ہیں۔“

ناک دبا دیا کر سانس لینا کتنا دشوار تھا اس کے لیے۔ امی جانتی تھیں۔ امی کا دل بھر بھر آیا۔ ان کا بیٹا خوشبو کا دیوانہ ہے۔ جیل میں پرنیوم کی اجازت نہیں تھی۔ وہ پھول منگوا لیتا تھا۔ خوشبوؤں سے عشق کرنے والا اپنے کٹر والی لیٹرن کا دروازہ بند کر کے چوری چوری ماں کو فون کیا کرتا تھا۔ زندگی نے آنا آنا کے اسے لوہا بنا دیا۔

جب وہ جیل گیا تب اس کی مسیبتیں بھگ رہی تھیں۔ وہ نو عمر لڑکا تھا۔ بچے ذہن کا نا بھجھ بھجھ۔ جیل میں پانچ سال گزارنے کے بعد ہر نسل، ہر رنگ کے بندوں سے ملنے کے بعد اس پہ کیسے کیسے ”رنگ“ چڑھے ہیں؟ یہ تو ساتھ رہنے کے بعد بتا جیے گا۔ اس کی زندگی کے پانچ سال کی کمال اتنی مختصر نہیں جو چند لائٹوں میں سمیٹ سکوں۔ جو اس پہ بہت چلی ہے۔ اس داستان کو چند اوراق میں سمیٹا بھی نہیں جا سکتا شاید صفحے ختم ہو جائیں اور لفظ ہاتھ میں نہ آئیں۔ وہ کہتا ہے۔ ”پانچ سالوں میں مجھے دو خوشی کی خبریں ملیں۔ جب میرا بھانجا ہوا اور جب میرا بھتیجا

آئی۔ انا اللہ وانا علیہ راجعون۔ زندگی کے ساتھ موت کا رشتہ برحق ہے۔
ارم سنتے ہی چلی گئی تھی، پھر جنازے کے بعد صہیب کے ہمراہ ہی لوئی۔ آصف بھی جنازے میں شرکت کے لیے چلا گیا اور لوگ فنکشن کے لیے اس کو پوچھ رہے تھے۔ بڑی بوڑھی خواتین ہائے وائے کرتے لگیں کہ بایں کے دوہا کو جنازے میں کیوں بھیج دیا؟

جنازے کے فوراً بعد ارم، صہیب اور آصف آگئے۔
ہم پلاؤ پلاؤ گلے میں ڈال کر۔ آصف بھائی کے ساتھ بیٹھ کر تصویریں بنوا رہے تھے۔
”ہم لوگ اگر شادی میں شامل نہ ہوتے تو یہ فوٹو شوٹ کون کرتا ہے نا اعظم بھائی؟“

”ہاں جی۔ آپ کی بڑی مہربانی، اب جی بھر کے تصویریں بنوائیں۔“ وہ ہنستے ہوئے خود بھی کمرے کے سامنے آ بیٹھے۔ ارم اور وہ دونوں بھائی اپنی وادی اور ابو کے ساتھ تصویریں بنوا رہے تھے اور اداس بھی تھے۔
یقیناً خوشیوں بھری اس گھڑی میں اپنی اپنی اور ماموں کی کمی محسوس کر رہے تھے۔ ایسے خوشی کے موقعوں پر دنیا چھوڑ جانے والے شدت سے یاد آتے ہیں اور آنکھ نم ہو جاتی ہے۔
ارم کی بیٹی عیدین اور شوکت بھائی کا ابراہیم بہت پیارے لگ رہے تھے۔

ربیعہ، بنیلہ، حشر، مشاعل، حریم، ساریہ، نور نوال، شہرناو، چمنی، لڑکیاں بڑی پیاری لگ رہی تھیں۔ فریٹش اور خوش باش بھی۔ سب نے مل کر ڈانس کے ہلکے پھلکے مظاہرے کیے۔

”جن لوگوں نے زبردستی شادی میں شمولیت کی ہے، وہ بھی ذرا درمیان میں آئیں نا۔“ اعظم بھائی ہماری طرف متوجہ تھے۔ پھر نگہت اور عمروں، بہن، بھائی نے عثمان بھائی کی کمی کو پورا کرنے کے لیے مل کر خوب صورت ڈانس کیا اور تازیہ حسن اور زویب

حسن کی یاد تازہ کر دی۔
رات گئے تک محفل جی رہی۔ صبح زبردست ناشتے سے فارغ ہو کر ہر کوئی تیار ہو رہا تھا۔ دوہا راجہ کی روایتی ڈریس کے بغیر گلے میں پھولوں کا ہار ڈالے نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہا تھا، ہر نظر میں ستائش تھی اور ہر لب پر دماغی خوشیوں کی دھواں۔
شریاریا چاچو کا شہ بالا بیٹا ہوا تھا۔

شفیع بھائی کی بیوی آمنہ سے ملاقات خوشگوار رہی۔
ریٹائرمنٹ کے ہال میں فنکشن تھا۔ جلدی جلدی کرتے بھی آدھا دن گھر ہی گزر گیا۔ جب ہال پہنچے تو وہی دیکھے بھالے جانے پہچانے تھوڑے سے لوگ تھے۔ ہال البتہ صاف ستھرے اور بہت پرسکون ماحول میں کھانا کھایا گیا اور دیگر رسموں کے بعد چند گاڑیوں پر سوار ہو کر تھوڑے سے بارانی۔ بھلولال روانہ ہوئے۔ شادی ہال میں ہمارا شاندار استقبال ہوا اور وہی آئی بی پرو تو کول دیا گیا۔

نازش اور موش دونوں بہنیں بہت پیاری لگ رہی تھیں، نازک، معصوم اور خوب صورت۔ چروں پر آنسوؤں کی لکیریں، غم کے نقوش اور ضبط کی کوشش میں بار بار جھپکتی آنکھیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ جانے والوں کی یاد کتنی زور آور ہوتی ہے۔ ضبط کرتے کرتے بھی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ ان کی امی بھی اداس، غم زدہ اور بہت پریشان لگ رہی تھیں۔ کیونکہ کچھ ہی عرصہ قبل نازش کے ابو کی وفات ہوئی تھی۔

ابھی رخصتی میں کچھ دیر تھی، لیکن شام گہری ہو رہی تھی، سو ہم گھر واپس آگئے اس دعا کے ساتھ کہ اللہ آصف بھائی اور نازش کو ہمیشہ شاد و آباد اور خوش باش رکھے اور سب خاندان والوں کی خوشیاں قائم رکھے۔ (آمین)

☆

انوکھا شہر

ہندوستان کی تاریخ شہنشاہوں، بادشاہوں، راجوں اور مہاراجوں، نوابوں اور حکمرانوں کے کارناموں، فتوحات، شکستوں، مہمات اور سلطنتوں اور رجواڑوں کے عجیب و غریب حالات، واقعات اور حیرت انگیز انکشافات سے الٹی پڑی ہے۔

ناصر الدین خلجی، سلطان غیاث الدین خلجی کا بیٹا تھا۔ اقتدار کی ہوس میں اس نے اپنے باپ کی پیرانہ سالی اور اس کی طولانی عمر سے تنگ آ کر غریب پار زہر دینے کی کوشش کی۔ آخر کار بوڑھے باپ کے قتل کے بعد ناصر الدین خلجی نے من مانی شروع کر دی اور اس کے مہمات پسند اور رنگین مزاج ذہن نے ایک انوکھا منصوبہ بنایا۔ اس نے ایک انتہائی خوب صورت اور دیدہ زیب شہر بنانا شروع کر دیا۔ جس کے کوچہ و بازار، روٹیں، خیابان، باغ اور تالاب، نہریں، آبشار، جھیلیں، جھرنے، محرابیں، خوب صورت مکانات، محلات اور دروایم بہترین صنایع کے شاہکار تھے۔ اس شہر کی خوب صورتی کا کوئی ہمسر نہ تھا۔

اس شہر کے انتظام و انصرام اور آباد کاری کے لیے اس نے اپنی مملکت کی تمام خوب صورت عورتوں اور نوجوان خیراتوں کا چناؤ کیا۔ ان کو انتظامی خدمت اور عمدے سونے اور انیس اس شہر میں آباد کیا۔ اس شہر میں مردوں کا داخلہ ماسوائے بادشاہ کے ممنوع تھا۔
ملکہ اور شہزادوں کے خوب صورت محل اور حویلیاں شہر کی رنگ کے تھے، جبکہ دوسری خواتین عمال اور وزاری عہدوں پر فائز خواتین کے مکانات تقریبی رنگ کے تھے۔ زنانہ پولیس اور محافظ فوجی خواتین کے

مکانات سنگ سرخ سے بنائے گئے تھے۔ غرض کہ تاجر، دکان دار، اساتذہ، طالبات، کاریگروں کی رہائش گاہیں مختلف دیدہ زیب رنگوں سے سجی تھیں۔

اس شہر کے مثال میں کوئی مسجد، مقبرہ یا خانقاہ نہیں تھی۔ مدرسے، مکتب اور درس گاہیں تھیں۔ مگر وہاں علم و ادب کے بجائے رقص و موسیقی، آرائش کیسو، افزائش حسن، زیورات سازی، عطر سازی اور فنون لطیفہ کی تعلیم و تدریس دی جاتی تھی۔ ہر سال فوجی پریڈ، مقابلہ حسن اور فیشن پریڈ ہوا کرتی تھی۔ بادشاہ اور ملکہ کو سلائی دی جاتی تھی اور ان کی خدمت میں نذریں پیش کی جاتی تھیں۔

جان بچانے کا انعام اور سزا

بادشاہ عیش و عشرت کا دلدادہ تھا۔ اس کی شراب نوشی اور رنگین روز و شب کے افسانے مشہور تھے۔ ایک مرتبہ حوض خاص میں نہاتے ہوئے بادشاہ سرمستی کی کیفیت میں غوطہ لگاتے ہوئے حوض کے گہرے حصے کی طرف چلا گیا اور ڈبکیاں کھانے لگا۔ پانی، ناک اور حلق کے راستے جسم کے اندر چلا گیا۔ وہ ڈوبنے لگا تو اس کو نکالنے کی کوشش یوں کامیاب نہ ہو سکی کہ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ کوئی اس کے قریب نہ آ سکا۔ جب وہ بے ہوش ہو گیا اور اس کا جسم غرق ہو گیا تو ماہر غوطہ خور کینڑوں نے اسے بالوں سے پکڑ کر باہر نکالا اور بڑی کوشش کے بعد اس کو ہوش میں لایا گیا۔ کئی گھنٹے بعد جب اس کے ہوش ٹھکانے آئے اور پورا واقعہ اس کے گوش گزار کیا گیا تو اس نے پہلے تو جان بچانے پر ان وفادار کینڑیوں کو انعام و اکرام سے نوازا، لیکن پھر اس قصور پر کہ بادشاہ کے بال پکڑ کر

خواتین دا بجسٹ

جون 2014 کے شمارے کی ایک جھلک



● "سائرہ رضا" کا مکمل ناول "محبت دار" کی صورت

● صدف آصف کا مکمل ناول "دھول گیا بھر کا دن"

● تنزیلہ یاس کا مکمل ناول "عہد الست"

● عفت رحمان اور عزیزہ سید کا ناول

● میراجید فرح بخاری، مجربین اعجاز اور کینز نور علی

کے افسانے

● ماہ تمام... آصف یاس کے طویل ناول کی آخری قسط

● ٹی وی فنکارہ "سیرا حسن" سے باتیں

● ٹی وی فنکارہ "ماہین خالد" سے ملاقات

● مصنفین سے سروے اور دیگر مستقل سلسلہ شامل ہیں

جون 2014 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے آج ہی خرید لیں۔

ماہنامہ شعاع جون 2014 287

مرمری محرابیں اور پائے دان آنسوں اور باہمی وادتی کی صنایع کا نمونہ تھے۔ ملکہ عالیہ اور شہزادیوں سے لے کر اعلا سے اولیٰ کنیوں کے لباس انتہائی دیدہ زیب اور فاخرانہ تھے اور حسب مراتب مختلف معیار رنگوں اور مختلف نمونوں کے ملبوسات پر مبنی تھے۔ ہر درجے کی کنیوں اور خادماؤں کی خوشبوئیات اور عطر مختلف اور الگ قسم کے ہوتے تھے۔ دیوان خاص اور دیوان عام ان متنوع اور مسکور کن خوشبوؤں سے ہمیشہ مہکتے رہتے تھے۔

ملکہ معظمہ اور بادشاہ کے لیے زر نگار تخت اور مرصع کرسی رکھی رہتی تھی۔ جس کے نیچے چاندی کے سکوں کا چوڑا تھکا۔ مقابلہ حسن کے انعقاد کے بعد جو دو شیرائیں بادشاہ کی نظروں میں بیچ جاتیں ان کو اعلا اور مرکزی عہدوں پر ترقی دے دی جاتی اور بادشاہ سال بھر ان کے ساتھ رنگ رلیاں مٹاتا تھا۔

بادشاہ کی تفریح کے لیے کئی میل کے رقبے پر پھیلی ایک شکار گاہ بنوائی گئی تھی۔ جس میں جنگلی پرندے، چوپائے مثلاً "ہرن" بارہ سنگھ، نیل گائے، جنگلی بکرے اور سانپھو وغیرہ چھوڑے گئے تھے۔ اس میں تربیت یافتہ شکاری خواتین کا ایک عملہ موجود رہتا تھا۔ ایک بہترین نشانہ باز چست و چالاک خواص میر شکار تھی۔

عمیدین کے موقع پر یہ بازار منعقد کیا جاتا تھا۔ جس میں دکانوں کے خوب صورت اسٹال لگائے جاتے تھے۔ اس پورے بازار کو رنگ برنگی جھنڈیوں، جھاڑ، فانوس اور پھولوں سے سجایا جاتا تھا۔ طرح دار، خوب صورت اور ماہر تھوک اور خوردہ فروش خواتین دکان دار اعلا طبقے کی خواتین کو خریداری کی طرف مائل کرتی تھیں۔ یہ بازار تین دن اور بعض مرتبہ ایک ہفتے جاری رہتا تھا۔ ایک دن بادشاہ اور ملکہ کے دورے اور خریداری کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ بڑھتے ہوئے شہر کی آبادی پندرہ ہزار سے بھی تجاوز کر گئی۔

میں چوسر کے مقام پر ہمایوں کو گھسٹ دے کر سوری حکومت کی بنیاد ڈالی تھی۔ وہ قرون وسطی کا ایک بہت بڑا منتظم حکمران تھا۔ حکومت سنبھالتے ہی اس نے نظم و نسق، سماجی بہبود اور عدل و انصاف کے قیام کے لیے ملک کو انتظامی حلقوں میں تقسیم کر دیا۔ اپنے ملک کے چپے چپے سے واقف ہونے اور لوگوں کے حالات جاننے کے لیے اس نے ملک کے طول و عرض کے دورے شروع کیے اور سفر کرتے کرتے وہ ریاست بھوپال میں مالوے کے شہر مانڈو پہنچ گیا۔ شہر کے مقدم نے علاقے کی تاریخ اور حالات بیان کرتے ہوئے اس عجیب و غریب شہر کا بھی ذکر کیا جو ناصر الدین خلجی نے آباد کیا تھا اور اس کے نزدیک پہلو اور گھناؤنے باب کے سبب مورخین نے اس کو عوام سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ البتہ مقامی لوگوں اور ان کی نسلوں کو اس شہر اور اس کے بدنام ماضی کے حالات بخوبی معلوم تھے۔ مقدم کے اہل کاروں نے شیر شاہ سوری کو اس کے بانی کی قبر لاکھڑا کیا۔

شیر شاہ سوری حالات سننا جاتا تھا اور غم و غصے سے بچ و تاب کھاتا جاتا تھا۔ پھر اسے ضبط کا یار اندر رہا اور اس نے اپنے مصاحبوں اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ اس مزار کی ڈھنوں سے خیریں اور اس کی شکل بگاڑیں اور آئندہ کوئی لوہر کار نہ کرے۔

بہمانگیر نے بھی شیر شاہ سوری کے اجتماع میں اپنے جوتے سے قبر کی خبر لی، جس کے بعد اس کے اہل کاروں اور مصاحبوں نے ٹھوکروں، لاثیموں اور لالٹوں سے قبر توڑ پھوڑ دی اور سب مردہ بادشاہ پر آواز بلند لعنت اور نفرین کرنے لگے۔ شہنشاہ جہانگیر نے جو پہلے ہی غیظ و غضب سے بھر ہوا تھا، حکم دیا کہ اس بد بخت بادشاہ کی قبر کھود کر اس کی لاش کو جلا دیا جائے۔ ہر کیف اپنے ایک شیر کے سمجھانے پر بادشاہ نے اپنی رائے بدل دی اور لاش کو دریا برد کر دیا۔

شہابی محل اور دربار

بادشاہ اور ملکہ کے دربار خاص کے ستون، سنگ

کھینچنے سے اس کی لمبائی ہوتی، ان سب وفادار کنیوں کو جنہوں نے اس کی جان بچائی تھی، قتل کر دیا۔ دوسری مرتبہ جب ایسا ہی واقعہ پیش آیا تو کسی نے اسے باہر نکلنے کی جرات نہ کی اور بادشاہ سلامت غوطے کھا کھا کر ڈوب گئے اور تہ نشین ہو گئے، حتیٰ کہ بادشاہ کی موت واقع ہو گئی۔ لیکن کسی نے اس کی موت کے یقین سے پہلے اسے نکالنے کی ہمت نہ کی۔

بادشاہ کی آنکھ بند ہوتے ہی عورتوں کا یہ انوکھا شہر اپنی موت آپ مر گیا۔ عالی شان محلات، حویلیوں اور مکانات پر امرا اور رؤسا قابض ہو گئے۔ عورتوں کے نظم و نسق کا تمام نظام درہم برہم ہو گیا۔ اثر و رسوخ امرا و رؤسا اور اعلا درباری عہدے دار اپنی من پسند اور خوب صورت عورتوں کے مالک بن گئے۔ شہر کے گلی کو پے درپے ان ہوئے۔ باغات، شکار گاہ اور محلات بھی ویران ہو گئے اور صنف نازک پر مشتمل پندرہ سے بیس ہزار آبادی والا شہر ویران اور ٹھنڈا بن گیا اور اس کی داستان قصہ پاریدار ہو گئی۔

شیر شاہ سوری نے 1540ء میں قنون کی جنگ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے جنہوں کے لیے خوب صورت ناول

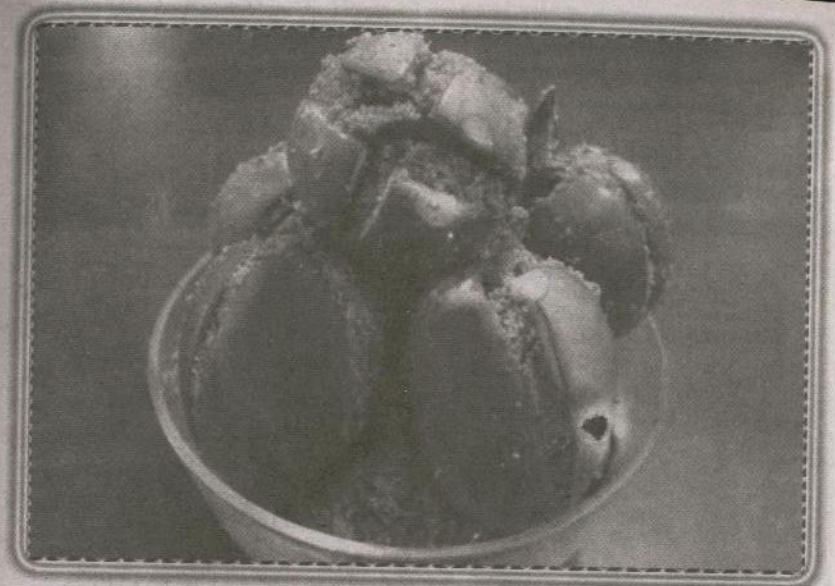
سای بھول گئی تھی

لاحتجہ جلیں

قیمت - 300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ فون نمبر 32735021 37 اردو بازار، کراچی

ماہنامہ شعاع جون 2014 286



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

ووکی لائبریری اینڈ فریمنگ پوائنٹ
سائنڈ سسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
اور پرانے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے
دکان نمبر 13 صد بازار ہری پور

آدم کا بھرواں اچار

اجزا :

کچے آدم
بھٹی سونف
میتھی دانہ
ثابت دھنیا
ہلدی پیسی مرچ
کلو بجی
نمک
سرسوں کا تیل

ڈھائی کلو
آدھا پاؤ
چھ کھانے کے چمچے
چار کھانے کے چمچے
ایک ایک چھٹانک
تین کھانے کے چمچے
حسب ذائقہ
ڈھائی لیٹر

ترکیب :

سخت سمٹھائی والی کیریوں کے چار چار ٹکڑے اس اجزا :

طرح کریں کہ وہ بالکل الگ نہ ہو جائیں۔ جڑی رہیں۔
سمٹھائی نکال کر پھاگول پر نمک اور ہلدی لگا کر جو بیس
گھنٹوں کے لیے چھوڑ دیں۔ نمک ہلدی لگانے سے
کیریاں پانی چھوڑ دیں گی۔ وہ اضافی پانی نکال دیں۔
سونف، میتھی، کلو بجی اور ثابت دھنیا موٹا موٹا کوٹ میں
اور پھاگول میں یہ مسالا بھر دیں۔ مرتان میں ڈال کر
اوپر سرسوں کا تیل ڈال دیں۔ مرتان کو تین چار دن
دھوپ لگائیں۔ پھر اچار کو کسی برتن میں نکال کر اچھی
طرح ہلائیں۔ دوبارہ مرتان میں ڈال کر مزید دو دن کے
لیے رکھ دیں۔ آم کا مزے دار بھرواں اچار تیار ہے۔

خشخاش گوشت

گوشت
لہسن اور ک پیٹ
پیاز
پسی خشخاش
زیرہ مرچ
گرم مسالا ہلدی
دہی
پسی مونگ پھلی
نمک
تیل

ایک کلو
ایک کھانے کا چمچ
تین عدد
آدھا کپ
ایک ایک چائے کا چمچ
آدھا آدھا چائے کا چمچ
تین چوتھائی کپ
ایک کھانے کا چمچ
حسب ذائقہ
حسب ضرورت

ترکیب :

گوشت میں دہی، نمک، مرچ، ہلدی، زیرہ لہسن
اور ک پیٹ مٹس کر کے رکھ دیں۔ تیل میں پیاز
سنہری کریں اور سبز الائچی کے ساتھ گوشت ڈال کر ہلکی
آنج پر پکائیں۔ گوشت گل جائے تو خشخاش، مونگ
پھلی اور گرم مسالا ڈال دیں۔ تیل الگ ہونے تک
پکائیں پھر بھون لیں۔ ایک کپ پانی ڈال کر شوربہ
بنائیں اور پانچ منٹ تک ہلکی آنج پر رکھ دیں۔ پھر
تافان یا پچتاویں کے ساتھ پیش کریں۔

گر مہا

اجزا :

کیریاں
گڑ
لونگ الائچی
سوئی
کھی ر تیل

دو عدد
آدھی پیالی
چار چار عدد
تین کھانے کے چمچے
دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

تیل گرم کر کے لونگ کرکڑائیں اور کیری کی
قاشیں کاٹ کر ہلکی سی مل کر نکال لیں۔ اسی تیل میں
سوئی اور الائچی ڈال کر ہلکا سا بھونیں، پھر دہی جو لے
سے اتار لیں۔ پانچ منٹ بعد چار کپ پانی ڈال کر آہستہ
آہستہ چمچہ ہلائیں، تاکہ سمٹھالیاں نہ بنیں۔ کیری اور

کرکڑ ڈال کر دوبارہ ہلکی آنج پر پکائیں۔ جب گڑ ٹھکل
جائے تو سمٹھیں گڑ مہا تیار ہے۔

آلو بخارے کا مرہ و شروت

اجزا :

آلو بخارے
چینی
املی
کالا نمک

تین پاؤ
سوا کلو

ایک چھٹانک

حسب ضرورت

آدھا کلو آلو بخارے دھو کر ایک گلاس پانی کے
ساتھ ہلکی آنج پر پکائیں۔ بالکل نرم ہو جائیں تو ڈوٹی
سے دبا کر سارا ٹوکڑا نکال لیں۔ ملل کے کپڑے سے
چھان لیں۔ چمچے ہوئے آمیزے میں آدھا کلو چینی
ڈال کر دوبارہ پکائیں۔ پانی خشک ہو جائے آمیزہ یکجان
اور گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں۔ ٹھنڈا کر کے محفوظ
کر لیں۔ آلو بخارے کا مزے دار مرہ تیار ہے۔

بقیہ ایک پاؤ آلو بخاروں کو املی اور تین گلاس پانی
کے ساتھ پکائیں۔ گاڑھا ہو جائے تو ملل کے کپڑے
سے چھان لیں۔ چمچے ہوئے پانی کو بقیہ تین پاؤ چینی کے
ساتھ دوبارہ اتار پکائیں کہ ایک تار کا قوام بن جائے۔
اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ بوقت استعمال کالا نمک اور برف

ڈال کر پیش کر دیں۔ خوبانی کا میٹھا

خشک خوبانی

شکر

کریم

بادام

ایک کپ

آدھا کپ

پانچ کھانے کے چمچے

حسب ضرورت

خوبانی کو دو ٹکڑے کر کے تھوڑے سی پانی میں چھپا
سات گھنٹوں کے لیے بھگو دیں، پھر اسی پانی کے ساتھ
ہلکی آنج پر دس منٹ تک پکائیں۔ نرم ہو جائے تو شکر
ڈال کر ڈھکن ڈھک دیں۔ چاہیں تو بلینڈر میں ڈال کر
باریک پیسٹ بنالیں، ورنہ ہاتھ سے ہلکا ہلکا میس
کر لیں۔ پیالے میں نکال کر ٹھنڈا کریں، پھر کریم اور
کترے ہوئے بادام چھڑک کر سجاوٹ کریں۔



موٹیوں جیسے دانت

☆ آپ جو بھی ٹوٹھ پیسٹ استعمال کرتے ہیں اس معمول کے ٹوٹھ پیسٹ کو برش پر لگانے کے بعد اس پر برائے نام ہیکنگ سوڈا چھڑک لیں۔ واضح رہے کہ ایک سوڈا وہ ہوتا ہے جو کپڑوں کی دھلائی میں استعمال ہوتا ہے جسے زیادہ واضح الفاظ میں کاسٹک سوڈا کہا جاتا ہے اسے کھانے پینے میں یا دانتوں پر لگانے میں ہرگز ہرگز استعمال نہ کریں۔ دوسری قسم کا سوڈا جسے کھانے والا سوڈا کہتے ہیں اور عموماً اسے روٹی اور دوسری اشیائے خورد و نوش میں استعمال کیا جاتا ہے اسے آپ ٹوٹھ پیسٹ پر چھڑک کر ہفتے میں صرف ایک بار تقریباً دو منٹ تک دانتوں پر برش کریں تو آپ کو فرق واضح نظر آئے گا۔

☆ کیو یا سگترے کے جھلکے عموماً لوگ ضائع کر دیتے ہیں۔ آپ اس جھلکے کے اندرونی سفید حصے کو اپنے دانتوں پر پانچ منٹ تک ملیں۔ آپ کو فوری طور پر تپا چل جائے گا کہ آپ کے دانت پہلے سے زیادہ چمک دار ہو گئے ہیں۔

☆ ان دنوں بازار میں اسٹریپری وافر دستیاب ہے کھانے کے علاوہ آپ ایک اسٹریپری اپنے دانتوں کی صفائی کے لیے بھی استعمال کر لیں۔ ایک اسٹریپری کو دانتوں سے چکیں اور اسے دس منٹ تک دانتوں پر ملیں، آپ کو فوری فرق محسوس ہوگا۔

☆ نارل یا کھوپرے کے تیل میں تھوڑا سا ہیکنگ سوڈا شامل کریں اور اس آمیزے سے اپنے دانتوں کو معمول کے مطابق برش کریں۔ اس سے آپ کے دانت سفید تر بھی ہوں گے اور مضبوط بھی ہو جائیں گے۔

☆ کیو اور سگترے موسی پھل ہیں۔ مگر کیلا ہر موسم میں دستیاب ہوتا ہے۔ آپ تیلے کے جھلکے کے اندرونی حصے کو بھی اپنے دانتوں پر مل سکتے ہیں۔ جھلکے کو ملنے کے بعد پندرہ منٹ تک کلی نہ کریں بعد میں دانت صاف کر لیں۔ دانت زیادہ چمک دار نظر آئیں گے۔

☆ پلاؤ اور برائی کو خوشبودار بنانے کے لیے جو خاص قسم کے خشک پتے استعمال کیے جاتے ہیں انہیں آپ ”تیج پت“ کے نام سے جانتے ہوں گے۔ یہ پتے دانتوں کو سفید اور چمک دار بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک پتے کو دانتوں سے چاکر پیسٹ جیسا بنالیں اور پھر اسے انگلی سے ملیں پھر کلی کر کے پہلے اور موجودہ دانتوں کا فرق ملاحظہ کریں۔

وزن کم کرنے کے لیے

کریم موسم گرما کی سبزی ہے۔ خواتین یہ بات پڑھ کر بہت حیران ہوں گی کہ کریم موٹاپا دور کرتا ہے۔ آپ اس کی سبزی بنا کر ہفتے میں تین بار کھائیں۔ کریم لے سکا کر اس کا سفوف بھی طبیب کی ہدایت کے مطابق روزانہ کھایا جاتا ہے۔ تاہم یہ سفوف دو گرام سے زیادہ نہ استعمال کیا جائے اور اپنے ڈاکٹر سے مشورے کے بعد ہی کھایا جائے۔ اس کے استعمال سے وزن کم ہوتا ہے اور جلد شفاف ہوتی ہے۔

کیڑے بہت تیرا!



Care
کریم بلیچ

جس میں شامل Aloe Vera اور Milk Protein
نرمی کے لئے گوارا، نہ وہ ریش، نہ وہ جلن



چھوڑ دیں آپ بھی چمکتا اور لہکتا کیڑا کریم بلیچ

پہلے میں جلتی تھی، پھر میں نے اپنا